رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

”مَنْ يَقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“

”جس نے میری طرف وہ بات منسوب کی جو میں نے نہیں کہی ہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے“

(بخاری: ۱۰۹)

موضوع اور منکر روایات

ڈاکٹر سید سعید احسن عابدی

تقدیم

ڈاکٹر شعیب نگرامی

مكتبة بيت السلام - الرياض

بسم اللہ الرحمن الرحیم

❀❀❀ توجہ فرمائیں! ❀❀❀

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب............

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اَپ لوڈ (UPLOAD) کی جاتی ہیں۔
- متعلقہ ناشرین کی اجازت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات کی نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

❋❋❋ تنبیہ ❋❋❋

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر
تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں

ٹیم کتاب وسنت ڈاٹ کام

webmaster@kitabosunnat.com

www.KitaboSunnat.com

سلسلہ: یہ حدیث نہیں ہے (۲)

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"مَنْ يَقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبوأ مقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"

"جس نے میری طرف وہ بات منسوب کی جو میں نے نہیں کہی ہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے" [بخاری: ۱۰۹]

موضوع اور منکر روایات

حصّہ دوم

ڈاکٹر سیّد سعید احسن عابدی

تقدیم

ڈاکٹر شعیب نگرامی

ناشر

مکتبة بیت السلام - الریاض

فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر

عابدي، سيّد سعيد أحسن

الروايات الموضوعة والمنكرة- الجزء الثاني./ سيّد سعيد أحسن عابدي.- الرياض، ١٤٢٩هـ

٥٢٨ ص؛ ١٧ × ٢٤ سم

ردمك: ٣ – ٠٩٤٧ – ٠٠ – ٦٠٣- ٩٧٨

(النص باللغة الأوردية)

١- الحديث الضعيف ٢- الحديث الموضوع أ- العنوان

ديوي ٦, ٢٣٢ ١٤٢٩/٤٢١٤

رقم الإيداع: ١٤٢٩/٤٢١٤

ردمك: ٣ – ٠٩٤٧ – ٠٠ – ٦٠٣- ٩٧٨

بار اوّل

1429ھ - 2008ء

ناشر و تقسیم کار

مکتبہ بیت السلام

پوسٹ بکس: 16737 الریاض: 11474 سعودی عرب

فون: 4460129 فیکس: 4462919

موبائل: 0542666646-0505440147

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

کتاب ''موضوع ومنکر روایات'' جلد دوئم میرے انتہائی عزیز دوست ڈاکٹر سید سعید احسن عابد کی صدر شعبہ اردو جدہ ریڈیو کی احادیث مطہرہ صلی اللہ علی صاحبہا کے دفاع میں اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے، اس کتاب پر خود ڈاکٹر عابد کا اپنا انتہائی عالمانہ اور محققانہ مقدمہ ہے جس کے بعد کتاب کا تعارف کرانے کی قطعی ضرورت نہ تھی لیکن بھلا ہو کتاب کے ناشر حافظ عابد الٰہی سلمہ ڈائریکٹر بیت السلام ریاض کا جو کسی کے بہکاوے میں آکر میرے نا اہلی کے باوجود کتاب کا تعارف کرانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی۔ حافظ عابد سلمہ مشہور محقق اور عالم دین علامہ احسان الٰہی مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں جو میرے چھوٹے بھائی پروفیسر یونس نگراتی مرحوم کے مدینہ یونیورسٹی میں ہم سبق تھے، قصبہ نگرام لکھنؤ اور مرکز علم وادب لاہور کے مابین اس مستحکم علمی رشتہ کے علاوہ حافظ عابد سلمہ کی کتاب وسنت سے متعلق علوم کی سرپرستی اور ان کی نشر واشاعت کے پیش نظر یہ سطریں تحریر کی جارہی ہیں۔

کتاب ''موضوع ومنکر روایات'' کی انفرادیت کو سمجھنے کے لئے احادیث مطہرہ کی اہمیت اوران کی شریعت اسلامی میں قدر ومنزلت سمجھنا انتہائی ناگزیر ہے احادیث نبوی قرآن کریم کے بعد ہماری شریعت اسلامی کا دوسرا بنیادی ماخذ ہے اور سورۃ الحشر کی آیت نمبر ے میں ان پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، احادیث مطہرہ کی اسی اہمیت کے پیش نظر امام شافعی نے لکھا ہے کہ اگر احادیث نہ ہوتیں تو ہم قرآن کریم کو سمجھ ہی نہ سکتے تھے اور امام ابن قیم کا کہنا تھا کہ جس نے احادیث کا انکار کیا تو اُسے دین کے بارے میں قطعی طور پر نہ صرف معلومات نہ ہوں گی بلکہ وہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کی تکذیب کا بھی مجرم ہوگا، اور ابن حزم رحمہ اللہ رقمطراز ہیں کہ جس شخص نے یہ کہا کہ وہ قرآن کے علاوہ احادیث پر یقین نہیں رکھتا ہے وہ امت کے متفقہ فیصلے کے بموجب دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

احادیث مطہرہ ﷺ کی اس اہمیت اور قدر ومنزلت کے پیش نظر ترمذی کی حدیث نمبر

2666 ابو داود کی حدیث نمبر 4105 اور مسند احمد کی حدیث نمبر 130 قابل مطالعہ ہیں۔ پہلی صدی ہجری کے اواخر سے اسلامی عقائد کو مسخ کرنے کی نامراد مہم کے ضمن میں احادیث کے ساتھ دست درازی کا سلسلہ شروع ہوا اور وضع احادیث کے فتنہ نے جنم لیا اور ایسی خود ساختہ احادیث کا انبار لگ گیا جن کا مقصد صحیح احادیث کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنا اور ان کے راویوں کی شخصیتوں کو مجروح کرنا تھا، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''منہاج السنۃ'' کی جلد اول میں ایک حدیث گھڑنے والے حماد بن سلمہ کا ایک قول نقل کیا ہے جس میں اس کا کہنا تھا کہ جب ہم یکجا ہوتے اور کوئی چیز ہم کو پسند آجاتی تو ہم اس پر حدیث کا لیبل لگا کر صحیح احادیث کے مجموعوں میں شامل کر دیتے۔ ان موضوع احادیث کے حوالے سے ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی مرحوم نے اپنی کتاب ''السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی'' میں لکھا ہے کہ تقریباً تین لاکھ ایسی گھڑی احادیث ہیں جو اس گستاخ اور فحش ادب کا نمونہ ہیں جس کی بنیاد پر یہودیوں نے اپنے انبیاء کرام کی اجتماعی اور ازدواجی زندگی کی تصویر کشی کر کے ڈالی تھی۔ احادیث نبویہ کے خلاف اس ناپاک مہم کا توڑ کرنے اور ان کی حفاظت کے خاطر ہمارے محدثین رحمہم اللہ نے مختلف علوم وفنون کو مرتب کیا اور ایسے قواعد وضوابط مرتب کیے جن کے ذریعے کھرے کھوٹے اور سچ وجھوٹ کے درمیان فرق کیا جا سکے ان قواعد وضوابط میں ''اسماء الرجال'' جرح وتعدیل اور مصطلحات الحدیث خاص طور سے قابل ذکر ہیں جن کے ذریعے احادیث نبویہ میں شامل لاکھوں من گھڑت اور جھوٹی احادیث کی نشاندہی کی گئی دوسری جانب محدثین رحمہم اللہ نے احادیث نبویہ کے مجموعوں سے ان روایات اور جھوٹی ومن گھڑت خود ساختہ احادیث کو نکالنے کا اہم علمی ومحققانہ کام بھی کیا۔ جناب عبد العلیم السّلفی نے ''کیا تضعیف حدیث انکار حدیث ہے؟'' ماہنامہ ''طوبیٰ'' دہلی جنوری ۲۰۰۲ء میں اپنے مضمون میں مذکورہ موضوعات پر اہم اور قابل مطالعہ کتابوں کی فہرست دی ہے۔

کتاب ''موضوع ومنکر روایات'' جو اردو داں طبقہ کے لئے لکھی گئی ہے اس کی علمی اہمیت وانفرادیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں برصغیر میں احادیث نبویہ کی تعلیم وتدریس اور ان کی نشر واشاعت پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالنا انتہائی ضروری ہے۔

برصغیر پہلی صدی ہجری ہی میں اسلام کی روشنی سے منور ہو چکا تھا اور یہ سرزمین صحابہ کرام اور تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بابرکت قدموں سے بھی محروم نہیں رہی، مشہور تابعی، ''ربیع بن صبیح السعدی البصری'' پہلی صدی ہجری کے آخر میں ہندوستان تشریف لائے اور وہ نواب صدیق حسن خان مرحوم کی کتاب ''ابجد العلوم'' کے بموجب برصغیر کے پہلے محدث تھے''۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آفتاب اسلام کی پہلی کرنیں برصغیر کے ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھ سکیں اور طلوع اسلام کے چار سو سال بعد درہ خیبر سے ملک گیری اور جنگی صلاحیتوں سے مالا مال اسلام کے ایسے پیامبر آئے جو خود کتاب وسنت اور توحید خالص سے اچھی طرح واقف نہ تھے اور توحید خالص کا وہ دین رحمت جو تمام ادیان اور نظامہائے حیات پر غالب ہونے کے لئے آیا تھا وہ برصغیر پہنچ کر مشرکانہ عقائد کے انبار میں دب کر رہ گیا اور سبط وحی سے توحید خالص کا جو صاف وشفاف چشمہ رواں ہوگیا تھا گنگا وجمنا کی آمیزش نے اسے گدلا کردیا توحیدی عقائد شرک کی آلودگیوں میں لت پت ہوگئے۔ نیز اسلامی عقائد کو تصوف اور دیدانتی فلسفوں نے مسخ کردیا۔ ہر طرف بدعتوں کی گرم بازاری میں منطق الطیر، کلیلہ دمنہ اور انوار سہیلی نامی کتاب پڑھنے والے مسلم صوفیا نے وحدۃ الوجود کے مشرکانہ نظریہ کی نہ صرف تبلیغ کی بلکہ کتاب وسنت کی تحقیر کے بھی مرتکب ہوئے۔ ان گمراہ صوفیوں نے قبروں پر چراغاں کرنے کے فتاوی کی لفظی پرستش کرنے میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کردیں۔ سلطنت مغلیہ میں تصوف کے بینر تلے قرآن وحدیث کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی جو نامراد کوشش کی گئی ان کی نشاندہی مجدد الف ثانی نے اپنے مکاتب میں اور ملا بدایونی نے اپنی کتاب منتخب الالباب میں کی ہے۔ دبستان مذاہب، اور تذکرہ صوفیا نامی کتابوں کے بموجب تصوف کے سلسلہ ''روشنیہ'' کے روح رواں پیر روشن میاں بایزید انصاری جنہوں نے اپنے اوپر نزول وحی کا بھی دعوی کیا تھا وہ ان روایتوں کو جو اس زمانے میں احادیث کے نام سے مشہور تھیں ان کو بنیاد بنا کر اپنے گمراہ کن صوفیانہ عقائد پیش کرتے تھے، پیر روشن نے توحید خالص مخالف اپنے صوفیانہ عقائد کا ذکر اپنی خود نوشت سوانح حیات ''حالنامہ'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے جس کا قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری میں موجود ہے۔ ملا بدایونی نے اپنی کتاب ''منتخب التواریخ'' کی جلد دوئم میں

سلطنت مغلیہ کے ابتدائی عہد میں صوفیوں کی فکری آوارگی کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صوفیوں نے وحدۃ الوجود کا راگ الاپ کر ابن عربی کی تصانیف سے ایسی چیزیں لائے جن سے مذہبی وفکری آزادی کا سبق ملتا ہے اور انہوں نے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی ایسی تاویلیں کیں کہ خود شہنشاہ اکبر حیران رہ گیا، لیکن جب زمین تپتی ہے تو بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے چنانچہ دیوی و دیوتاوں کی سرزمین پر پہلی بار توحد خالص کا علم بلند کرنے کی سعادت احمد بن عبدالاحد فاروقی سرہندی، مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کو حاصل ہوئی جنہوں نے کفر وشرک کی اندھیاری اور تصوف کے طوفان میں کتاب وسنت کی شمع روشن کی اور توحید خالص کی سربلندی کی لیے وہی طریقہ کار اپنایا جو احمد بن حنبل اور امام ابن تیمیہ رحمہما اللہ نے اپنے زمانوں میں اپنایا تھا یہاں پر مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے صاحب علم معاصر شیخ عبدالحق محدث رحمہ اللہ کا ذکر انتہائی ضروری ہے کیونکہ انہیں کی ذات سے ہندوستان میں علم حدیث کو زندگی ملی اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچہ عام ہوا انہوں نے علم حدیث پر کئی کتابیں لکھیں عربی میں ان کی کتاب ''لمعات'' ہے جو مشکاۃ کی شرح ہے اس کے دیباچے میں انہوں نے حدیث کی مختلف قسموں اور علم حدیث پر تبصرہ کیا اور طویل اقتباسات دے کر بقول نواب صدیق حسن خاں مرحوم فقہ حنفی کو احادیث کے مطابق ثابت کیا ہے، شیخ عبدالحق محدث رحمہ اللہ جنہوں نے تقریباً ایک سو کتابیں لکھیں وہ برصغیر کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے سیرت نبوی پر ''مدارج النبوۃ'' نام کی بارہ سو صفحے کی ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا علمی پایہ اب تک مسلّم ہے۔

اورنگ عالمگیر رحمہ اللہ جو برصغیر میں ناموس ملت کا آخری پاسبان تھا اس کی وفات ۱۱۱۸ھ میں ہوئی لیکن اس کے جانشین ایسے کمزور اور بودے تھے کہ نصف صدی کے اندر دیکھتے دیکھتے سلطنت مغلیہ کا اقتدار ختم ہوگیا بدعات اور مشرکانہ رسوم جو اورنگ زیب رحمہ اللہ کی کوششوں سے دب گئے تھے ازسر نو منظر عام پر آنے لگے۔ باطنیت جو برصغیر میں ایران سے ہمایوں کا لایا ہوا تحفہ تھی پھر سے سر چڑھنے لگی، صوفیا اپنی پرانی روش پر قائم رہے مدرسوں کا نظام تقلید جامد کے اصول پر اپنی ڈگر پر چلتا رہا اور کتاب وسنت سے بے پرواہی اپنے حال پر قائم رہی ان حالات میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے آنکھیں کھولیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ ایک

فروری ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے جو سیاسی اعتبار سے اسلام کا عہد زوال تھا لیکن مذہبی و علمی اعتبار سے اصلاح وتجدید کا زمانہ بھی یہی تھا چنانچہ جس سال شاہ صاحب رحمہ اللہ پیدا ہوئے اسی کے قریب اسلام کا دور جدید کا دوسرا بڑا مصلح ومجدد شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ ریگستان نجد میں ظہور پذیر ہوا، شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے علمی وفکری کارناموں کا ذکر ہمارا موضوع نہیں ہے لیکن ان کے تجدیدی مشن کی ان بنیادوں کا ذکر ضروری ہے جو کتاب ''موضوع ومنکر روایات'' کا محور ہیں۔ وہ بنیادیں یہ ہیں۔

۱- بارہویں ہجری سے قبل برصغیر کے علمی ودینی حلقوں میں قرآن کریم کی تعلیم تقریباً نصاب سے خارج تھی، شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اصول تفسیر پر ایک گراں قدر کتاب ''الفوز الکبیر'' لکھ کر کتاب اللہ کے درس ومطالعہ کی دعوت دی اور قرآن کریم کے معانی کا فارسی میں ترجمہ کرکے عام لوگوں کو قرآن حکیم پڑھنے اور سمجھنے کی راہ کھول دی اور ساتھ ہی یہ ترجمہ وقت کی ضرورت بھی تھا کیونکہ پرتگیزی مشینری جو سلطنت مغلیہ کے ایوان اقتدار میں کینسر کی طرح پھیلی ہوئی تھی ان کے قرآن کریم پر ظالمانہ اعتراضات کا جواب دینے کے لئے ان علماء کے لئے ضروری تھا جو بغیر سمجھے بطور تبرک قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

۲- انہوں نے تقلید جامد کے خلاف آواز بلند کرکے تحقیق واجتہاد کے عملی نمونے پیش کئے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اور ''الانصاف'' میں انہوں نے اس موضوع پر بحث کی جس کو پڑھنے سے ذہن خود بخود کتاب وسنت کی طرف مائل ہوتا ہے اور طبیعت تقلید جامد کی طرف قطعی راغب نہیں ہوتی۔

۳- شاہ صاحب رحمہ اللہ سے قبل اور ان کے زمانے میں اسلامی مدارس صرف فقہ نحو وصرف اور منطق پر زور دیتے تھے لیکن شاہ صاحب نے حدیث نبوی کا خزانہ عام کرنے کے لئے علم حدیث پر انتہائی اہم کتابیں لکھیں انہوں نے مؤطا کی شرح فارسی وعربی دونوں زبانوں میں لکھی عربی شرح کا نام ''المسوی'' اور فارسی کا ''المصفی'' رکھا اور عوام کے لئے ''چہل حدیث'' النوادر من الحدیث۔ اور الدر الثمین فی مبشرات الرسول الکریم ﷺ'' نامی کتابیں لکھیں، شاہ صاحب رحمہ اللہ کی ایک نہایت اہم کتاب ''رسالۃ انصاف فی بیان سبب الاختلاف'' ہے۔ جس میں انہوں نے محدثین کے مجموعوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اجتہاد وتقلید کے مسئلہ پر

روشنی ڈالی اور ان وجوہات کا ذکر کیا جن کی بنا پر مسلمانوں میں تقلید کا رواج عام ہو گیا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے حالات کی پوری طرح اصلاح کی کیونکہ جس سیلاب کو عالمگیر جیسا دور اندیش شخص نہ روک سکا اس کا سد باب ایک مذہبی عالم سے کس طرح ہو سکتا تھا اس جلیل القدر عالم کی کوششوں سے اتنا ہوا کہ انہوں نے اس سیلاب جس میں مغلوں کا تخت وتاج بہہ گیا اس میں انہوں نے قوم کو قرآن وحدیث فہمی کی نعمت عظمیٰ عطا کی اور یہ واضح کیا کہ اسلامی درسگاہوں سے فقہ ومنطق کا آنے والا سیلاب مذہبی کشمکش میں قطعی مفید نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ''کتاب وسنت'' کی قوت کی ضرورت ہے جو فقہ منطق سے نہیں بلکہ قرآن وحدیث سے حاصل ہوتی ہے۔ ولی اللہ کی تحریک نے اسلامی عقائد کے دفاع کے لئے ایسا نظام قائم کر دیا جو انیسویں صدی کی مذہبی کشمکش میں ہماری سب سے بڑی ڈھال رہا، شاہ صاحب رحمہ اللہ کی ان گراں قدر خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ ہم شاہ صاحب رحمہ اللہ کو محض اپنی تقلید پسندی کی وجہ سے امام نہیں کہتے ورنہ جہاں تک ان کی تبحر علمی، مجتہدانہ نظر، اور کتاب وسنت کی اشاعت کے سلسلے میں ان کی خدمات ہیں وہ انہیں امام کا درجہ دیتی ہیں۔

برصغیر کے مذکورہ علمی رجحانات اور احادیث نبویہ کی نشر واشاعت کی کوششوں کے جائزہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم حدیث کے سلسلہ میں ہمارے علماء رحمہ اللہ کی خدمات کو قطعی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن ساتھ ایسی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ خزانہ حدیث کو عام کرنے کے سلسلہ میں صرف احادیث کے ترجموں، شرحوں اور حواشی ہی پر اکتفا کیا گیا۔ ہمارے جن علماء نے احادیث کی کتابوں کا ترجمہ یا ان کی شرحیں لکھی انہوں نے ان احادیث کو جن کو محدثین ومحققین ساقط جانتے تھے اور خوش الحان واعظوں اور صوفیوں کے ملفوظات کو بھی احادیث کے مجموعوں میں شامل کر دیا، موضوع ومنکر روایات پر محققانہ کام ہونے کے حوالے سے فارسی میں دو اور عربی میں صرف ایک کتاب کا ذکر ملتا ہے پہلی دو کتابوں یعنی ''تذکرۃ الموضوعات در بیان احادیث موضوعہ'' اور قانون الموضوعات فی فکر الضعفاء کے مصنف شیخ محمد بن طاہر پٹنی متوفی ۱۵۷۸ء تھے اور تیسری عربی کتاب ''الآثار المرفوعۃ فی الاحادیث

الموضوعہ'' مولانا عبدالحی لکھنوی مرحوم کی ہے مذکورہ کتابوں کی نشاندہی نواب صدیق حسن خان مرحوم نے اپنی کتاب ''اتحاف النبلاء'' میں کی ہے۔

موجودہ پر آشوب اور پر فتن دور میں صرف قرآن حکیم کی مصداقیت ثابت نہ کرنے پر انسانیت دشمنی ذرائع ابلاغ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، بلکہ ساتھ ہی دوسری جانب احادیث مطہرہ سے متعلق مختلف اور متضاد نظریات سامنے آرہے ہیں، برصغیر میں ''فتنہ انکار حدیث'' سلطنت مغلیہ میں مذہبی بے راہ روی کا منطقی نتیجہ تھا ۱۹۲۰ء یہ فتنہ نئے لباس میں ظاہر ہوا اس مولود خبیث کی پرورش لکھنؤ کے نیاز فتحپوری کے نگار خانے میں ہوئی اور یہ فتنہ آج اس وقت باضابطہ اور منظم ہوکر سرگرم عمل ہے دوسری جانب ضعیف، موضوع اور منکر روایات پر مبنی فضائل کی کتابوں کا انبار لگایا جارہا ہے جن میں غلط نظریات وخیالات اور غیر شرعی امور کے لئے جو لوگوں کے ذہن ودماغ میں راسخ ہوچکے ہیں ان غیر صحیح روایت سے مواد فراہم کیا جاتا ہے۔

فتنہ انکار حدیث پر ہمارے علماء نے جو محققانہ کام کیا وہ دین حنیف کی فکری تاریخ میں ایک سنہرے باب کا اضافہ ہے لیکن موضوع ومنکر روایات کی محققانہ دلائل کے ذریعے نفی پر اردو میں شاید ہی کوئی کتاب ہو اس کار خیر کی سعادت میرے محترم دوست ڈاکٹر سید سعید احسن عابد کو حاصل ہوئی۔

پیش نظر کتاب ''موضوع ومنکر روایات'' کی جلد دوئم ہے ڈاکٹر عابدی نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے جلائے ہوئے چراغوں سے اپنا چراغ جلا کر پانچویں صدی ہجری میں موضوع ومنکر روایات کی نشاندہی کرنے کے طریقہ کو اپنا کر احادیث مطہرہ کے دفاع میں بیشمار راتیں آنکھوں میں کاٹ کر یہ نفیس اور اپنی نوعیت کی منفرد کتاب اردو لائبریری کو بطور تحفہ دی اس کتاب کی انفرادیت کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر عابدی نے ان بد عقیدگیوں فکری آوارگیوں اور مشرکانہ رسم ورواج کو اپنا موضوع سخن بنایا جو اسلام کی عالمگیر دعوت وپیغام کو مسخ کرنا چاہتی ہیں کتاب میں موضوع ومنکر روایات بلکہ اسرائیلیات پر مبنی نام ونہاد صلحائے نے امت کی ان غیر ذمہ دارانہ کتابوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو مسلمانوں کو کتاب وسنت سے دستبردار ہونے کی دعوت دے رہی ہیں اور آج کل

بعض ٹی وی چینلوں پر نمودار ہونے والے ان علمائے سو کے چہروں پر سے بھی نقاب اٹھایا گیا ہے جو اپنے گمراہ کن عقائد کی تبلیغ کے لیے دیو مالائی قصوں کو احادیث کی عبا پہنا کر مسلمانوں کو تعویذ وگنڈوں میں جکڑنا چاہتے ہیں اور جن کے بارے میں اقبال عظیم نے کہا تھا:

وہ لوگ جنہیں پاس شریعت بھی نہیں ہے
پہنے ہوئے بیٹھے ہیں شخصیت کے لبادے

۲- کتاب میں حدیث سازوں قصہ گو واعظین گمراہ صوفیا کے عقائد پر تاریخی وعلمی دلائل وشواہد کی روشنی میں بحث کرنے کے علاوہ انبیاء کرام علیہم السلام، خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین اور ائمہ رحمہم اللہ کے ان فضائل ومناقب کی حقیقت بیان کی گئی ہے جو منبر ومحراب کے پیشہ ور واعظوں کی تقریروں اور مینہ کی طرح برسنے والے کتبوں کا سرمایہ ہیں۔

۳- کتاب ''موضوع ومنکر روایات'' میں عقائد وایمانیات کے حوالے سے اسلام کے نام پر توحید خالص کے منافی کاموں درگاہوں پر ہونے اور غیر اللہ کو وسیلہ بنا کر جہنم کی راہ اختیار کرنے کا کتاب وسنت سے ماخوذ دلائل سے ابطال کیا گیا ہے۔

۴- کتاب میں ڈاکٹر عابدی نے نام ونہاد صلحائے امت کی موضوع ضعیف اور منکر روایات کی پرستش کی نشاندہی کرتے ہوئے توحید خالص کے منافی ان عقائد کا علمی دلائل کے ذریعے ابطال کیا ہے جنہیں علمائے سو نے مسلمانوں کو بطور تحفہ دیا ہے یہودیوں کی قبر پرستی کی لعنت ہندوؤں کے شرادہ کو مشرف باسلام کر کے دسواں اور چالیسواں، ہندوؤں کی جنم آشٹمی اور عیسائیوں کے کرسمس کو مشرف بہ اسلام کر کے عید میلاد النبی کو مذہب کا جز قرار دینا انہیں علمائے سو کا کارنامہ انجام ہے جو آج بھی اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے مشرکانہ عقائد کو گلے لگانے کی دعوت دے رہے ہیں۔

۵- نور محمدی، نبی رحمت ﷺ کی بشریت اور آپ کی وفات اہل بدعت علماء وصوفیاء کا محبوب موضوع ہے جسے گمراہ واعظ اسرائیلیات پر مبنی روایتوں کا سہارا لے کر پرکشش اور دلفریب بنا کر پیش کرتے چلے آرہے ہیں ڈاکٹر عابدی نے موضوع سے متعلق تمام احادیث یا منکر روایات کا عالمانہ انداز میں علمی حوالوں کے ذریعے ابطال کر کے عید میلاد النبی کے موقع پر

تر وتازہ گلدستے سجانے والوں، کافوری شمعوں کے خوبصورت فانوس اور برقی روشنی کے بکثرت کنول سجانے والوں کو یہ بتادیا کہ نور محمدی کا عقیدہ ایک خرافاتی عقیدہ ہے اور قرآنی کریم کی زبان میں آپ ﷺ نے اپنی بشریت کی متعدد بار یقین دہانی فرمائی ہے اس لئے آپ ﷺ سے سچی محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں اور قدم قدم پر آپ ﷺ کا اتباع کیا جائے اور اطاعت کی جائے کیونکہ وہ محبت جو سنت رسول اللہ ﷺ پر عمل کرنا نہ سکھائے وہ محض دھوکہ اور فریب ہے وہ محبت جو رسول رحمت ﷺ کی اطاعت وپیروی نہ سکھائے وہ محض جھوٹ اور نفاق ہے۔

۶۔ کتاب میں ولی کون ہے؟ لوح محفوظ، روح کی حقیقت، جادو کیا ہے، صور پھونکنے والا فرشتہ کون ہے؟ فرشتوں کی حقیقت اور انبیاء کرام علیہم السلام کے قصوں سے متعلقہ تحریریں بڑی فاضلانہ ہیں اور متعلقہ موضوعات کے سلسلہ میں شک وشبہات میں مبتلا حضرات کے لئے یہ مباحث چراغ راہ ہیں۔

۷۔ خواتین کے سلسلہ میں اسلام کی رہنمائی سے جو لوگ ناواقف ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں خواتین کو مناسب درجہ نہیں دیا گیا ہے، ان کے ذہنوں میں طرح طرح کے شبہات ہیں جن کی بنیاد مخالفین اسلام کی تحریروں اور گمراہ کن بیانات پر ہے، ڈاکٹر عابد نے اپنی کتاب میں اس حساس اور اہم موضوع پر صحیح احادیث کی روشنی میں سیر حاصل بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے خواتین کو ہر جہہ عزت واحترام کی نظر سے دیکھا ہے وہ اسلام کی نظر میں جس طرح مکمل انسان ہیں اسی طرح انہیں جملہ سماجی حقوق حاصل ہیں جن کی بنیاد پر وہ معاشرے کی ترقی وتحفظ میں کلیدی کردار ادا کرسکتی ہیں۔

آیئے آخر میں کتاب ''موضوع ومنکر روایات'' کے اسلوب وبیان پر بھی ایک نظر ڈالی جائے۔

اردو کو دنیا کی تیسری اسلامی زبان کہا جاتا ہے اور برصغیر میں اسلامی فکر ودعوت کا اظہار فارسی کے بعد اردو ہی کے ذریعہ ہوا، اردو نثر کے اسلوب متعدد نقطہ نظر اور روایات کے حامل ہیں مثلاً ایک روایت کا حامل بیسویں صدی کی دوسری دہائی کا وہ دینی ادب تھا جسے روایتی علماء نے

عیسائیت اور آریہ سماج کے اسلام پر اعتراضات کے جوابات دینے کے لئے تیار کیا تھا جس میں زبان کی صحت کا پورا اہتمام تو ضرور تھا مگر اسلوب کے حسن کی زیادہ فکر نہیں کی گئی تھی۔

دوسری روایت کے بانی سرسید ہیں انہوں نے دینی ادب کی اس روایت صف کر ایک نئی راہ نکالی ان کی نثر سادہ اور صاف ستھری ہے انہوں نے خالص مذہبی امور کے ساتھ معاشرتی، سیاسی، اور علمی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ شبلی گو بنیادی طور پر اس دوسری روایت سے متعلق تھے مگر ان کے قلم نے ایک نئی اور زیادہ حسین اور متوازن روایت قائم کی، انہوں نے اپنی نثر کو عربی فارسی ادب کے جاندار اجزاء سے مالا مال کیا اگر سرسید کے سامنے شعوری یا غیر شعوری طور پر وکٹورین تمدن اور وکٹورین ادب کی قدریں تھی تو شبلی نے اپنی نگاہیں عباسی دور کی تہذیب اور فارسی کی ادبی روایات پر مرکوز کیں شبلی کی نثر میں سادگی وضاحت کے ساتھ رنگینی اور شیرینی کا عنصر بھی موجود ہے۔

ڈاکٹر عابد کی کتاب کا اسلوب علیگڑھ اسکول اور شبلی کی نثری روایات کا جامع تو ضرور ہے اس میں سرسید کی نثر کی سادگی اور شبلی کی وضاحت تو ضرور ہے لیکن تازگی اور شگفتگی کے عنصر کی کمی ہے۔

ڈاکٹر عابد کی تحریر میں فکری نظم وضبط تو ضرور ہے لیکن عربی آمیز بوجھل عبارتیں غیر عربی داں طبقہ کو اس منفرد کتاب سے خاطر خواہ استفادے سے محروم بھی کر سکتی ہیں، کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اس امر پر توجہ کی ضرورت ہے کام یقیناً بہت صبر آزما ہوگا لیکن کتاب کی افادیت اور مقبولیت میں ممد ومعاون ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر عابد کی عربی آمیز بوجھل اسلوب کے باوجود ان کی تحریروں میں احادیث مطہرہ کا جذبہ اور ان کی محققانہ ذات کی جھلک بخوبی دیکھی جاسکتی ہے، شخصیت کے اسی نمو کو اقبال نے خون جگر کیا ہے، اور میر آسن نے اسے خون دل سے تعبیر کیا ہے اور جس تحریر میں شخصیت کا اظہار نہ ہو اسے اسلوب وبیان کی کسی بھی تقسیم میں کوئی مرتبہ نہیں مل سکتا ہے۔

ڈاکٹر شعیب نگرامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

باب اوّل: غیبیات

باب دوم: قصص الانبیاء

باب سوم: حج اور زیارت مدینہ

باب چہارم: معاشرت

***

فہرست موضوع و منکر روایات

فہرست صحیح احادیث

***

خطبہ مسنونہ

((إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ[1]، وَنَسْتَغْفِرُهٗ[2]، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا[3] وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا[4]، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ[5]

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ ﴾[6]

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ○ ﴾[7]

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ○ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ○ ﴾[8]

أَمَّا بَعْدُ : فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهُدٰى هُدٰى مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ[9] وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ ، أَلضَّلَالَةُ فِي النَّارِ))[10]

---

[1] [3] [4] [5] صحیح مسلم، کتاب الجمعہ ،باب تخفیف الصلاۃ والجمعہ : ۲۰۰۸،

[6] [7] [8] ابوداؤد، کتاب النکاح ، باب في خطبة النكاح : ۲۱۱۸ (نَحْمَدُه کے بغیر) مسند احمد ۳۹۳/۱ (اِنَّ اور نَحْمَدُہ کے بغیر) جامع الترمذی ،کتاب النکاح ،باب ماجاء فی خطبة النکاح : ۱۱۰۵ (نَحْمَدُه کے بغیر) ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح: ۳۱۴۹ تصحیح فضیلۃ الشیخ الالبانیؒ وقال: حدیثٌ صحیحٌ [2] جامع الترمذی ،حوالہ سابقہ [6] آل عمران : ۱۰۲

[7] النساء : ۱ [8] الاحزاب : ۷۰۔۷۱

[9] فَاِنَّ کُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ...... کے الفاظ مسند احمد ۱۲۷/۴ (جلدنمبر ۵) کے ھیں۔

[10] صحیح مسلم : ۲۰۰۵

ترجمہ خطبہ مسنونہ

بلا شبہ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ہم اس کی تعریف کرتے ہیں۔اس سے مدد مانگتے اور اسی سے ہم بخشش طلب کرتے ہیں۔ہم اپنے نفسوں کے شر اور اپنی بداعمالیوں سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ جسے اللہ (سیدھی) راہ سجھا دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں (ہوسکتا۔) میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ،وہ اکیلا ہے ،اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔اور تمہیں موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔"...... "اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور (پھر) اس (جان) سے اس کی بیوی کو پیدا کیا۔پھر ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پیدا کر کے (زمین پر) پھیلا دیے۔اور ڈرو اللہ سے کہ جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے (حاجت براری کے لیے) سوال کرتے ہو اور ناطہ توڑنے سے (بھی ڈرو) بلا شبہ اللہ تمہارے اوپر نگہبان ہے۔"

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور بات سیدھی (سچی) کہا کرو۔(ایسا کرو گے تو) اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح کردے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔اور جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کی،اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔"

حمد وصلوٰۃ کے بعد: یقیناً تمام باتوں سے بہتر اللہ کی کتاب ہے۔تمام طریقوں سے بہتر طریقہ محمد (رسول اللہ ﷺ) کا ہے۔اور تمام کاموں سے بدترین کام وہ ہیں جو (دین اسلام میں) اپنی طرف سے وضع کیے جائیں۔دین میں ہر نیا کام بدعت اور ہر بدعت گمراہی ہے۔گمراہی کا انجام جہنم کی آگ ہے۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ

اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بے پایاں فضل و احسان ہے کہ اس نے ''موضوع اور منکر روایات'' کی پہلی جلد کو مختلف طبقہ ہائے فکر و خیال اور مذہب و مسلک میں حسن قبول عطا کرنے کے بعد مجھے اس کی دوسری جلد قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی توفیق بخشی۔ اس موقع پر میں جو خوشی اور مسرت محسوس کر رہا ہوں، اس کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اس کتاب کی پہلی جلد کا مطالعہ کرنے والے بعض محترم قارئین کے دو تاثرات ایسے ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے۔

(۱) پہلا تاثر یہ ہے کہ کتاب میں اسلام کے مختلف شعبوں سے متعلق جس کثرت سے ضعیف، موضوع اور منکر روایات کی مثالیں پیش کی گئی ہیں، ان سے ان لوگوں کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہدایت کے لیے قرآن کافی ہے اور حدیث کی ضرورت نہیں۔ ان کے خیال میں دین کا جو عقائدی اور عملی ماخذ ہو جس سے متعلق ہزاروں کی تعداد میں روایات وضع کر کے اور گھڑ کر گھروں میں پھیلائی جا چکی ہوں، اس کے اس حصے پر جس کی صحت اور رسول اکرم ﷺ سے اس کی نسبت کا حکم لگایا گیا ہے یا لگایا جاتا ہے کس طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

(۲) دوسرا تاثر یہ ہے کہ ذکر و اذکار اور فضائل و مناقب کے باب میں پھیلی ہوئی اور زبان زد موضوع اور باطل روایات کو رواج دینے کا سب سے زیادہ ذمہ دار ''صوفیا'' کو قرار دے کر اس طبقے پر ظلم کیا گیا ہے، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ تصوف سے نسبت رکھنے والوں میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے بزرگوں کی بھی رہی ہے جنہوں نے علم حدیث میں بڑا نام پیدا کیا ہے اور ان کا شمار محدثین میں ہوتا ہے۔ تو کیا یہ بات قرین عقل ہے کہ جو لوگ حدیث کے پاسبان، محافظ اور خادم رہے ہوں وہی ایسے اقوال، عبارتوں اور روایات کو پھیلانے کے بھی مرتکب رہے ہوں جن کی نسبت نبی اکرم ﷺ سے صحیح نہیں ہے؟

کتاب کا مطالعہ کرنے والے بعض احباب کے یہ دونوں تاثرات بظاہر بڑے وقیع ہیں اور ان کو بنیاد بنا کر بعض مستند اور مسلمہ حقائق تک کو رد کیا جا رہا ہے، لیکن امر واقعہ کے تناظر میں یہ دونوں تاثرات بلکہ اعتراضات کسی گہری سوچ کے ترجمان نہیں ہیں، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

جہاں تک حدیث یا سنت کے دین کا دوسرا ماخذ ہونے کا مسئلہ ہے، تو یہ کوئی اجتہادی یا قیاسی مسئلہ

نہیں ہے جس میں کسی غلطی کا بھی امکان ہو۔ بلکہ قرآن پاک نازل کرنے والے اللہ نے صریح الفاظ میں اپنے رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا جس طرح رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان مسلمان ہونے کی بنیادی شرط ہے، ٹھیک اسی طرح آپ کے ارشادات کو دین کا دوسرا ماخذ ماننا بھی مسلمان ہونے کی شرط ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ ﴾ [الاحزاب:٣٦]

''کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کس معاملے کا فیصلہ کر دے تو انہیں اس معاملے میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔''

مطلب یہ ہے کہ کسی بھی مسلمان کے لیے کسی بھی معاملے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم اور فیصلے کے مقابلے میں اپنی رائے اور پسند پر عمل کرنا جائز نہیں۔ جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ اللہ و رسول کا نافرمان شمار ہوگا۔

صرف یہی نہیں بلکہ اگر کوئی مسلمان رسول اللہ ﷺ کے کسی حکم اور فیصلے سے اپنے دل میں تنگی محسوس کرے تو اس کا ایمان محل نظر ہے:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ ﴾ [النساء:٦٥]

''نہیں، اے نبی! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ تم کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں اور سر تسلیم خم کر دیں۔''

نبی کریم ﷺ کے فرائض منصبی میں جس طرح اللہ کی کتاب کی آیتوں کو سنا دینا تھا، ٹھیک اسی طرح کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا اور لوگوں کا تزکیہ کرنا بھی تھا۔

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾

[آل عمران:١٦٤]

”درحقیقت اللہ نے اہل ایمان پر اس وقت بہت بڑا فضل فرمایا جب ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو اس کی آیات ان کو سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، بلاشبہ اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔“

ظاہری بات ہے کہ تزکیہ اور تعلیم ”تلاوت کتاب“ کے علاوہ ہے۔ یعنی نبی معلّم ﷺ اہل ایمان کو صرف کتاب اللہ کی آیتوں کو سنا دینے پر اکتفا نہیں فرماتے تھے بلکہ اپنے ارشادات سے اللہ کی کتاب کی تشریح بھی فرماتے تھے اور اپنا عملی نمونہ پیش کر کے ان کا تزکیہ اور ان کی اصلاح بھی کرتے تھے اور ان کو پاک بھی کرتے تھے۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ مبلغ عن اللہ تھے، آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے احکام اللہ کے احکام تھے اور آپ کی عملی زندگی کتاب اللہ کی ترجمان تھی، اس لیے آپ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔

فرمایا: ﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ [النساء:۸۰]

”جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔“

معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن پاک شرعی حجت ہے اسی طرح حدیث بھی شرعی حجت ہے۔ اور حدیث کا انکار کرنے والا خود قرآن کا منکر ہے۔ کیونکہ نبی ﷺ کی یہ حیثیت قرآن نے متعین کی ہے۔

مسلمانوں میں جس گروہ نے سب سے پہلے انکار حدیث کا فتنہ پیدا کیا یا حدیث کے شرعی ماخذ ہونے کو مشکوک بنانے کی کوشش کی وہ معتزلہ کا گروہ تھا۔ معتزلہ اہل علم اور اہل قلم تھے۔ وہ جہاں تمام متداول نقلی اور عقلی علوم میں مہارت رکھتے تھے وہیں زبان و بیان پر بھی حیرت ناک قدرت رکھتے تھے۔ معتزلہ نے فہم دین کے لیے عقل کو غیر معمولی اہمیت دی اور عقائد اور غیبی امور کو بھی عقل کے ذریعہ سمجھنا چاہا۔ اور جب اس راہ میں صحیح احادیث کو مزاحم پایا تو...... یا تو ان کا انکار کر دیا، یا نبی کریم ﷺ سے ان کی نسبت کو مشکوک قرار دے دیا۔

دوسری طرف انہی معتزلہ نے فہم دین میں عقل کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے عقل کے فضائل میں حدیثیں گھڑ کر لوگوں میں پھیلانے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ اپنے نہاں خانہ دل میں یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ اپنے باطل افکار و تصورات کو اس وقت تک پھیلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ اسی ذریعہ علم کا سہارا نہ لیں جس کی حجیت کو وہ اپنے مقاصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کر رہے تھے۔ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مصداق بن گئے:

﴿ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ﴾ [النمل:١٤]
''سراسر ظلم اور غرور کے نتیجے میں انہوں نے اس کا انکار کیا حالانکہ ان کے دل اس کا یقین رکھتے تھے۔''

لیکن معتزلہ اپنے ان دونوں مقاصد میں سے کسی بھی مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ نہ ان کا انکارِ حدیث برگ و بار لایا اور نہ عقل کے فضائل میں ان کی گھڑی ہوئی روایات قبولیت حاصل کر سکیں۔ محدثین نے ایک ایک کر کے ان کی وضع کردہ حدیثوں کے تار و پود بکھیر دیے اور علمی دلائل سے یہ بھی ثابت کر دیا کہ عقل اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود عقائد اور ایمانیات کی توجیہہ کرنے سے قاصر ہے اور غیبیات تک اس کی رسائی نہیں ہے۔ نیز یہ کہ عقل کے فضائل میں ایک بھی صحیح حدیث نہیں ہے۔

معتزلہ کے علاوہ مسلمانوں میں جو دوسرے فرقے پیدا ہوئے انہوں نے بھی اپنے باطل اور گمراہ عقائد و افکار کی تائید میں اور ان کو رواج دینے کے لیے حدیثیں وضع کیں، کیونکہ ان سب کو دین کے اہم اور بنیادی ماخذ ہونے کی حیثیت سے حدیث کی قدر و قیمت کا پتا تھا اور ان کو یہ معلوم تھا کہ حدیث کی تائید کے بغیر وہ اپنی کسی بات کو دینی رنگ دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ جو چیز جتنی زیادہ اہم اور قیمتی ہوتی ہے اسی کے بقدر اس میں جعل سازی بھی کی جاتی ہے۔

رہی یہ بات کہ دین کے مختلف شعبوں سے متعلق ہزاروں کی تعداد میں ضعیف، منکر اور موضوع روایات کے پھیل جانے کی وجہ سے وہ حدیثیں بھی مشکوک ہو گئیں جن کی نسبت رسول اکرم ﷺ سے صحیح ہے۔ تو یہ بات علم حدیث کے کسی گہرے مطالعہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کی پھیلائی ہوئی ہے جو حدیث کو شرعی ماخذ نہیں مانتے یا کم از کم جن کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن پاک میں جو عقائد، عبادات اور شرعی احکام بیان ہوئے ہیں ان کو حدیث کے بغیر سمجھا جا سکتا ہے۔

اوپر بیان کردہ دعویٰ کے غلط ہونے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ دین کے مختلف شعبوں سے متعلق کتابوں میں درج اور لوگوں میں زبان زد جتنی بھی ضعیف، منکر اور موضوع روایات ملتی ہیں وہ سب ریکارڈ میں آ چکی ہیں۔ علمائے حدیث نے ان روایتوں کی اسناد اور ان کے متون اپنی کتابوں میں درج کر کے ان کے ساقط الاعتبار ہونے اور ان کے ناقابل استدلال ہونے کو واضح کر دیا ہے اور جن راویوں نے ان کی روایت کی ہے یا جن کے ذریعہ ان کو وجود ملا ہے ان میں سے ''ہر ایک'' کے مکمل کوائف ''علم الرجال'' کی کتابوں میں پوری علمی دیانت داری کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں بلکہ عین

حقیقت ہے کہ محدثین کا گروہ دنیا کا وہ مقدس گروہ ہے جس نے راویوں کی جرح و تعدیل اور ان کی ثقاہت اور عدم ثقاہت کے بیان میں راویوں کے زہد و ورع، ان کے صلاح و تقویٰ اور ان سے اپنی قرابت اور رشتہ داری جیسی کسی بھی چیز کو رکاوٹ نہیں بننے دیا ہے۔ اگر کسی کو ثقہ کہا ہے تو صرف اس وجہ سے کہ وہ ثقاہت اور اپنی روایت میں قابل اعتماد ہونے کی جملہ صفات سے متصف تھا، اس وجہ سے نہیں کہ وہ بہت بڑا بزرگ، متقی، عبادت گزار اور زاہد تھا یا وہ فلاں محدث کا باپ، بیٹا یا استاد تھا۔

اسی طرح جس راوی کو نا قابل اعتبار، ضعیف، منکر، متروک اور حدیثیں گھڑنے والا قرار دیا گیا ہے تو اسی وقت جب اس کے حالات کا تتبع کرے، اس کی ذہانت، قوت حافظہ، اخلاقی حالت، صدق گوئی اور حاضر دماغی جیسے تمام اوصاف میں سے ہر چیز کو پرکھا اور جب وہ ان صفات سے عاری ملا یا ان میں سے کسی سے متصف ملا اور کس سے عاری تو اسی کی روشنی میں اس کو ضعیف اور نا قابل اعتبار قرار دیا۔ اور یہ بھی بیان کر دیا کہ فلاں راوی فلاں سبب سے نا قابل اعتبار یا نا قابل استدلال تھا جس کو اصطلاح میں ''جرح مفسر'' کا نام دیا گیا ہے۔ رہے ضعیف، منکر اور موضوع روایتوں کے ''متون'' اور ان کی عبارتیں تو قرآنی آیات اور صحیح احادیث کی روشنی میں رکھ کر ان کو ضعیف اور نا قابل اعتبار قرار دیا گیا ہے۔

ایسی کتابیں جو نا قابل اعتبار روایتوں کے بیان کے لیے خاص ہیں وہ کثیر تعداد میں ہیں اور ان کے عالی مرتبت مصنفین کا شمار حفاظ حدیث میں ہوتا ہے۔ اسی طرح جن کتابوں میں حدیث کے راویوں کی جرح و تعدیل سے بحث کی گئی ہے ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، جن میں پوری تفصیل سے راویوں کی ثقاہت و عدم ثقاہت کو بیان کیا گیا ہے اور ہر راوی کی مرویات کو مثال میں پیش کر کے ان کی سندوں کو بیان کرتے ہوئے ہر سند کے راویوں کی ثقاہت اور عدم ثقاہت کا حکم لگایا گیا ہے اور ہر راوی کے بارے میں علمائے جرح و تعدیل کے اقوال کو مکمل دیانت داری کے ساتھ انہی کے الفاظ میں نقل کر دیا گیا ہے۔

اگر کسی روایت کی سند کے راوی تو ثقہ ہیں، مگر اس سند اور روایت کے متن میں کوئی ایسی مخفی علت ہے جو روایت کو مجروح بنا رہی ہے تو علل الحدیث کے ماہر محدثین نے اس کو کھول دیا ہے اور اگر روایت کی سند کے تمام راوی تو ثقہ ہیں اور سند کی تمام کڑیاں بظاہر متصل اور مربوط بھی نظر آ رہی ہیں، لیکن حقیقت میں وہ متصل نہیں ہیں بلکہ درمیان سے کوئی کڑی غائب ہے تو ائمہ فن نے اس کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔

ائمہ حدیث کی وسعت معلومات کا یہ حال تھا کہ ان کو حدیث کے ہر راوی کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ اس سے کتنی حدیثیں مروی ہیں۔ یا فلاں راوی سے فلاں راوی نے کتنی حدیثیں روایات کی ہیں۔ یا

کسی روایت میں کون سا راوی منفرد ہے اور وہ کون سے راوی ہیں جن کی روایت حدیث میں انفرادیت یا تفرد قابل اعتبار تھا اور کن کا نہیں؟

دین کے مختلف شعبوں سے متعلق موضوع اور منکر روایتوں کی وجہ سے صحیح احادیث کے بھی مشکوک اور نا قابل اعتبار ہونے کے دعویٰ کے غلط ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ صحیح حدیثوں کے مجموعے معلوم و معروف ہیں۔ مثال کے طور پر صحیحین کے بارے میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔

''محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ صحیحین کی وہ تمام حدیثیں جن کی سندیں متصل ہیں اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب، مرفوع ہیں وہ قطعی طور پر صحیح ہیں اور صحیحین کے مصنفین سے ان کی نسبت بھی تواتر سے ثابت ہے۔ لہٰذا صحیحین کی قدر و قیمت گھٹانے والا، نئی راہ نکالنے والا...... مبتدع...... اور اہل ایمان کے سوا دوسروں کے طریقے کی پیروی کرنے والا ہے۔[1]

واضح رہے کہ صحیحین کی بعض حدیثوں کی صحت کے بارے میں بعض علمائے حدیث سے منسوب جو اقوال ملتے ہیں وہ یا تو بعض حدیثوں کے بعض فقروں یا الفاظ سے متعلق ہیں' پوری حدیث یا اس کی سندوں سے متعلق نہیں ہیں۔ یا وہ صحت کے اس مقام اور درجے پر نہیں ہیں جس کے التزام کا ان کے عالی مرتبت مصنفین نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا۔

صحیحین کے علاوہ موطا امام مالک، سنن اربعہ، مسند امام احمد، صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان کی بیشتر اور غالب حدیثیں صحیح ہیں اور ان میں درج جن حدیثوں کی صحت مختلف فیہ ہے یا جو صحیح نہیں ہیں ان کو ان کی سندوں کے ذریعہ اہل علم بڑی آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں۔

اس وضاحت سے ان لوگوں کے دعویٰ کی جڑ کٹ جاتی ہے جو یہ تأثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ دین کے مختلف شعبوں سے متعلق ہزاروں کی تعداد میں ضعیف، منکر اور موضوع روایات کے پھیل جانے کی وجہ سے وہ حدیثیں بھی نا قابل اعتماد اور مشکوک ہوگئی ہیں جو محدثین کے نزدیک صحیح سندوں کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے کہ محدثین نے تمام ساقط الاعتبار راویوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر علم الرجال کی کتابوں میں ان کے نام ثبت کر دیے ہیں۔ اسی طرح تمام ضعیف، منکر اور موضوع روایتوں کو ان کی پوری سندوں کے ساتھ نا قابل اعتماد، ضعیف، منکر اور موضوع روایتوں کی کتابوں میں درج کر دیا ہے۔

اسی طرح عقائد، عبادات، تفسیر، سیرت پاک، تاریخ اور فضائل و مناقب وغیرہ کی کتابوں میں جو

---

[1] حجة الله البالغه، ص ٣٨٦، ٣٨٧، ج:١

حدیثیں بطور استدلال نقل کی گئی ہیں ان تمام کی خالص علمی تخریج کر کے ہر حدیث کی صحت وسقم کو بیان کر دیا گیا ہے۔ اس طرح دین کے کسی بھی شعبے سے متعلق تحقیقی کتابیں لکھنے والوں کے لیے یہ بات نہایت آسان ہوگئی ہے کہ وہ ہر موضوع کے بارے میں حد درجہ قابل اعتماد حدیثیں معلوم کر سکتے ہیں۔

برصغیر کے ملکوں میں بعض شہرت یافتہ مصنفین نے اپنی کتابوں میں جو یہ دعوے کیے ہیں کہ محدثین اور ائمہ جرح وتعدیل نے راویوں کی توثیق اور تصنیف مسلکوں کی بنیاد پر کی ہے تو یہ دعویٰ جہاں محدثین جیسے مقدس گروہ کے بارے میں ان کے برے گمان کی پیداوار ہیں وہیں ان کے علمی افلاس اور علم حدیث سے ان کے نابلد ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ اس جھوٹ اور افتراء کا پردہ چاک کرنے کے لیے علم الرجال کے موضوع پر کسی بھی مستند کتاب کا مطالعہ کر لینا کافی ہے کیونکہ اس میں کسی بھی راوی حدیث کی ثقاہت اور عدم ثقاہت بیان کرتے ہوئے اس کے فقہی مسلک کو بنیاد بنانا تو درکنار اس کا ذکر بھی نہیں ملے گا۔ البتہ گمراہ فرقوں سے تعلق رکھنے والے راویوں کے حالات بیان کرتے ہوئے اس طرح کے الفاظ ضرور ملیں گے: اس میں تشیع تھا، یا وہ رافضی تھا، یا خوارج سے تعلق رکھتا تھا یا ''ارجاء'' کا عقیدہ رکھتا تھا وغیرہ۔

اب رہا دوسرا تأثر جو اس کتاب کی پہلی جلد میں جھوٹی اور موضوع روایتوں کے بیان کے ضمن میں بار بار اہل تصوف کے ذکر کے بارے میں پیش کیا گیا ہے تو وہ صحیح ہے لیکن جھوٹی، باطل اور موضوع روایتوں کی ترویج میں ان کے ''اشتراکِ عمل'' کا دعویٰ کر کے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا گیا۔ ظلم تو تب ہوتا جب اس سے ان کا دامن پاک ہوتا، جب کہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اہل تصوف نے دین کے مختلف شعبوں سے متعلق اپنی تصنیفات کو اس ضعیف، منکر اور موضوع روایتوں سے بھر دیا ہے جن سے ان کے عقائد و افکار کی تائید ہوتی ہے۔

دراصل تصوف کتاب وسنت سے ماخوذ مسلک حیات نہیں بلکہ اسلام کے بالکل متوازی طریقۂ حیات ہے۔ اگرچہ اس میں اسلامی باتیں بھی ہیں اور یہ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ تصوف کی امہات الکتب کا صحیح اور سنجیدہ مطالعہ اس کے غیر اسلامی یا اسلام کے متوازی طریقہ حیات ہونے پر دلالت کرتا ہے اور خود علماء تصوف نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تفہیمات الٰہیہ اور فیوض الحرمین میں تحریر فرماتے ہیں:

''اللہ تک پہنچانے والے راستے دو قسم کے ہیں: ایک تو وہ ہے جسے وحی الٰہی اور تعلیمات انبیاء

نے بتایا ہے اور دوسرا وہ ہے جسے الہام اور معارفِ اولیاء نے متعین کیا ہے[1]...... اللہ تک پہنچنے کے دو راستے ہیں: ایک راستہ تو وہ ہے جو نبی ﷺ کے واسطے سے خلق تک پہنچا ہے۔ اور دوسرا راستہ وہ ہے جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان براہ راست ہے۔ اس جہت سے کہ وہ اس کے وجود میں لانے سے وجود میں آیا اور اس کے فیضان سے اس کو ظہور ملا ہے۔ اس راستے اور طریقے میں کوئی درمیانی واسطہ نہیں ہے۔''[2]

شاہ ولی اللہ کی ان دونوں وضاحتوں سے اتنی بات تو معلوم ہوگئی کہ طریق نبوت کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے کا طریقہ ہے جس کا یقین انسان خود کر سکتا ہے۔ اس مسئلے کو مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے خاص انداز میں زیادہ صراحت سے بیان کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب: شریعت و طریقت'' میں لکھا ہے: سلوک دو قسم پر منقسم ہے: سلوک نبوت اور سلوک ولایت۔ اور ہر ایک کے آثار و خواص جدا جدا ہیں......

اس کے بعد مولانا نے ایک دوسرے سے متوازی دو خانے بنائے ہیں، جن میں سے پہلے خانے کے اوپر ''آثارِ سلوکِ ولایت'' کا عنوان قائم کیا ہے اور دوسرے خانے کے اوپر ''آثارِ سلوکِ نبوت'' کا۔ اور ہر عنوان کے تحت نمبروار اس کے آثار بیان کیے ہیں۔[3]

جس طرح ''طریق ولایت'' اپنے اعمال واشغال میں طریق نبوت کے اعمال واشغال سے مختلف ہے اسی طرح اپنے مقاصد میں بھی اس سے مختلف ہے۔

طریق ولایت کے اعمال واشغال کا مقصد وصول الی اللہ اور فنا فی اللہ بیان کیا جاتا ہے جب کہ شریعت محمدی اور طریق نبوت کا مقصد کتاب وسنت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان کی تخلیق اس لیے ہوئی ہے کہ وہ اپنے خالق کی عبادت کرے اور اس عبادت سے اس کا مقصد اپنے خالق کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہو۔ جیسے کہ قرآن میں ارشاد ہے:

﴿ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ

[1] تفہیمات الٰہیہ ص ۲۸ بحوالہ بدعت وضلالت کے محرکات ص ۲۷،۲۴۔ دین کا قرآنی تصور ص ۱۹۰

[2] فیوض الحرمین ص ۵۰ بحوالہ بدعت وضلالت کے محرکات ص ۲۷،۲۴۔ دین کا قرآنی تصور ص ۱۹۰

[3] دیکھئے: اشرف علی تھانوی کی ''شریعت وطریقت'' ص ۴۵۔۴۷

الْعٰلَمِیْنَo ﴾ [الانعام:۱۶۱-۱۶۲]

''اے نبی اعلان کرو کہ بے شک میرے رب نے مجھے سیدھے راستے کی ہدایت کی ہے جو درست دین اور ابراہیم کی ملت ہے کہ جو اللہ کے لیے یکسو تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔ اے نبی! کہہ دو، بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا صرف اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔''

اس ارشاد الٰہی سے دو چیزیں معلوم ہوئیں: (۱) طریق نبوت یا شریعت محمدی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کی متعین کردہ ہے۔ (۲) شریعت محمدی کے تمام اعمال اور عبادتیں صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اور صرف اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہیں۔

دراصل اسلام میں ''طریق ولایت'' نام کی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ صوفیا کا ذہنی اختراع ہے اور کسی ''ولی'' کی صفت کے طور پر ''ولایت'' کا بھی کوئی ذکر قرآن پاک میں نہیں آیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر صرف ایک جگہ اس کا ذکر ہے (الکہف: ۴۴) جس سے مراد اللہ تعالیٰ کا مطلق اختیار اور اس کی مطلق بالادستی ہے۔ البتہ قرآن پاک میں ''ولی'' اور اس کی جمع ''اولیاء'' کا ذکر متعدد بار آیا ہے مگر ''اولیاء اللہ'' کی تعریف صرف ایک جگہ آئی ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَo الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَo ﴾ [یونس:۶۲-۶۳]

''آگاہ رہو، درحقیقت اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کسی خوف کا موقع ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے تھے۔''

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ''ولی'' کوئی مافوق البشر یا کوئی غیر معمولی انسان نہیں ہوتا بلکہ ہر مومن اور متقی اللہ تعالیٰ کا ولی ہے۔ اسی وجہ سے امام ابوجعفر وراق طحاوی رحمہ اللہ عقیدہ طحاویہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

((اَلْمُؤْمِنُوْنَ كُلُّهُمْ اَوْلِيَاءُ الرَّحْمٰنِ وَأَكْرَمُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَطْوَعُهُمْ وَأَتْبَعُهُمْ لِلْقُرْآنِ))[1]

''تمام مومنین رحمٰن کے دوست ہیں اور ان میں جو سب سے زیادہ اللہ کا مطیع اور قرآنی

[1] عقیدہ طحاویہ ص ۲۲

تعلیمات کا متبع ہے وہ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ باعزت ہے۔''

معلوم ہوا کہ ولی یا ولایت کی صفت سے متصف ہر وہ شخص ہے جو اللہ و رسول کا مطیع و فرماں بردار ہو اور کتاب و سنت کے احکام اور تعلیمات کی پیروی اور اتباع کرے۔ نہ کہ وہ جو طریق نبوت یا شریعت محمدی کے متوازی اور مقابل کوئی اور طریقہ ایجاد کرے۔ اس تناظر میں ''طریق ولایت'' اللہ تعالیٰ تک لے جانے والا اور پہنچانے والا نہیں بلکہ اس سے دور کرنے والا راستہ اور طریقہ ہے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل قرآن میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ط ﴾ [الانعام:۱۵۳]

''اور بلاشبہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ لہٰذا تم اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر مت چلو ورنہ وہ تم کو اس (اللہ رب العالمین) کے راستے سے دور اور منتشر کر دیں گے۔''

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ اللہ کے ہاں مقبول دین صرف اسلام ہے۔ تمام انبیاء اور رسولوں کا دین بھی اسلام تھا اور نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کا دین بھی اسلام ہے اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے گا تو اللہ کے ہاں وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔[1]

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ نظریاتی تصوف سے متعلق تھا لیکن یہ دکھانے کے لیے کہ تصوف کی کتابوں میں کثرت سے ضعیف، منکر اور موضوع روایتوں سے کیوں استدلال کیا گیا ہے، اسلامی عقائد اور اعمال کے بارے میں صوفیا کے نقطہ نظر کی وضاحت ضروری ہے۔

یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں عقائد کا باب سرفہرست ہے اور اسلامی عقائد کی روح عقیدۂ توحید ہے جس پر ایمان کے بغیر کوئی بھی عمل قابل قبول نہیں ہے۔

عقیدہ توحید کے بارے میں ارباب تصوف کی رائے پیش کرنے سے پہلے مختصراً توحید کو واضح کر دینا چاہتا ہوں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ صوفیا کا عقیدۂ توحید وہ نہیں ہے جس کی دعوت کتاب و سنت میں دی گئی ہے اور جس توحید کی دعوت دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے۔

چنانچہ کتاب و سنت کی نصوص کے تتبع سے اس توحید کے تین اجزاء کا ثبوت ملتا ہے جس کی دعوت دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور رسول بھیجے اور اپنی کتابیں نازل فرمائیں:

---

[1] آل عمران: ۱۹، ۸۲، ۸۵

(۱) توحید ربوبیت...... جس کا مطلب ہے کہ کسی شخص کے مومن اور مسلم ہونے کے لیے یہ بنیادی شرط ہے کہ اس شخص کا اس بات پر ایمان ہو کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی خالق و مالک، رازق، اپنی تمام مخلوقات کے امور کی تدبیر کرنے والا اور ان کا نگہبان و محافظ اور دنیا و آخرت میں ان کے تمام معاملات میں تنہا صاحب تصرف ہے اور کائنات کے انتظام و انصرام میں اس کے ساتھ نبیوں، ولیوں، فرشتوں اور جنوں وغیرہ میں سے کوئی بھی شریک نہیں ہے۔

توحید کی اس قسم کا اقرار ہر دور میں کفار و مشرکین بھی کرتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں ایسی بے شمار آیات ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ کفار و مشرکین توحید ربوبیت کے قائل تھے۔ لہٰذا صرف توحید ربوبیت کے اقرار سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا۔

(۲) توحید الوہیت...... یا توحید عبودیت کا مطلب ہے: اس بات پر ایمان لایا جائے کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے۔ لہٰذا صرف اسی کی ذاتِ مقدس ہی اس بات کی سزاوار ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور عبادت کی ہر صورت و شکل اور ہر نوع کو اس کے لیے خاص رکھا جائے۔

اللہ تعالیٰ ہی ہمارا معبود برحق ہے۔ اس لیے کہ صرف وہی ہمارا خالق و رازق ہے۔ صرف وہی ہماری حاجت روائی کرتا ہے۔ وہی ہماری مشکل کشائی کرتا ہے اور وہی ہمیں بیماریوں سے شفا دیتا ہے وغیرہ۔

قرآن پاک میں سب سے زیادہ زور اسی توحید الوہیت پر دیا گیا ہے جس کی دعوت تمام انبیاء اور رسولوں نے دی ہے۔ کیونکہ ہر دور اور ہر زمانے میں اہل کفر و شرک اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور عبادت ہی میں شرک کا ارتکاب کرتے تھے۔ اس طرح توحید الوہیت کے اقرار اور اس کے مطابق عمل کرنے میں توحید ربوبیت بھی داخل ہے۔ لیکن توحید ربوبیت میں توحید الوہیت داخل نہیں ہے ورنہ مشرکین جو توحید ربوبیت کے قائل تھے، الوہیت اور عبادت میں شرک کے مرتکب نہ ہوتے۔

دراصل قرآن نے توحید ربوبیت کو توحید الوہیت کے لیے بطور دلیل بیان کیا ہے۔ یعنی قرآن پاک میں کفار و مشرکین کو مخاطب کرکے بار بار یہ فرمایا گیا ہے کہ جب تمہیں معلوم ہے اور تم یہ اقرار کرتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور خالق نہیں ہے۔ اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے جو تمہیں نفع و نقصان پہنچا سکے تو پھر تم اس کو چھوڑ کر دوسروں کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ یا اس کے ساتھ دوسرے معبود کیوں ٹھہراتے ہو؟

لیکن کفار و مشرکین یہ جانتے اور مانتے ہوئے بھی الوہیت اور عبادت میں شرک کرتے تھے کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی ان کا خالق و مالک اور رب ہے اور وہ اپنے اس شرک کی توجیہہ یہ کرتے تھے کہ ہم اپنے

معبودوں کی عبادت ان کو مستقل بالذات معبود سمجھ کر نہیں کرتے ہیں، بلکہ ان کو اپنے اور اللہ کے درمیان واسطہ سمجھ کر ان کی عبادت کرتے ہیں۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [الزمر:۳]

''اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب تر کر دیں۔''

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں یہ واضح فرما دیا کہ اس کے ہاں جو عبادت مقبول ہے وہ بے آمیز اور خالص عبادت ہے۔ اس کے نزدیک وہ لوگ بھی مشرک ہیں جو اس کے ساتھ دوسروں کو بھی معبود مانتے ہیں اور وہ بھی جو غیر اللہ کی عبادت، ان کو واسطہ سمجھ کر کرتے ہیں۔

دراصل اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے یا اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے اس کے مقرب بندوں میں سے کسی کو واسطہ بنانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ایسا کرنے والا اللہ تعالیٰ کی غیر محدود اور مطلق قدرت و اختیار اور اس کے بندوں کے احوال کا مکمل علم و واقفیت رکھنے کے بارے میں ناقص اعتقاد رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ واحد یکتا کے علم و قدرت کو مخلوق کے علم و قدرت پر قیاس کرکے دوسروں کا سہارا لیتا اور ان کو سفارشی بناتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا علم، اس کی قدرت اور اس کی تمام رحمت مخلوقات کو گھیرے ہوئے ہے: جیسا کہ اللہ کریم فرماتے ہیں:

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ﴾ [البقرہ:۱۸۶]

''اے نبی! اگر میرے بندے تم سے میرے بارے میں پوچھیں، تو میں ان سے قریب بھی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔''

مطلب یہ ہے کہ میرا علم میرے بندوں کو محیط ہے ان کے دلوں میں ابھرنے والے خیالات تک سے میں واقف ہوں اور ان کی دعاؤں اور فریادوں کو فوراً سنتا بھی ہوں اور ان کی ضرورتوں اور حاجتوں کو فوراً پورا کرنے پر قدرت بھی رکھتا ہوں۔ پھر کتنے نادان ہیں وہ لوگ جو اس کو چھوڑ کر بے اختیار ہستیوں اور نقص و عیب سے متصف مخلوقات کو پکارتے اور ان سے اعانت طلب کرتے ہیں۔

(۳) توحید کا تیسرا حصہ اور جزء توحید اسماء و صفات ہے۔ یعنی اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ

کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں اس کے جو اسمائے ذات وصفات بیان ہوئے ہیں وہ سب حق ہیں۔ لہٰذا ان اسماء میں کوئی تحریف وتبدیلی کیے بغیر اور ان کی کوئی مثال اور کیفیت بیان کیے بغیر ان کو تسلیم کیا جائے اور یہ ایمان رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اسمائے ذات وصفات میں اپنی کسی بھی مخلوق کی مانند نہیں ہے جیسا کہ فرمایا: ''لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ [الشوریٰ:۱۱]''

''اس کی مانند (ذاتِ اقدس وصفات عالیہ میں) کوئی بھی چیز نہیں ہے۔ اور وہی (سب سے زیادہ) سننے والا، دیکھنے، جاننے والا ہے۔'' اور جب اللہ تعالیٰ کو پکارا جائے تو اس کے اسماء ہی کے ذریعہ پکارا جائے۔

﴿ وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ط ﴾ [الاعراف:۱۸۰]

''اللہ ہی کے لیے ہیں عمدہ نام، سو اس کو انہی ناموں سے پکارو''

اللہ تعالیٰ کے تمام اسمائے ذات وصفات ایسے ہیں جو اس کی عظمت وکبریائی، اس کے تفوق و برتری، اس کے تقدس و پاکیزگی، اس کی بے پایاں رحمت وشفقت اور اس کی صفات کمالیہ پر دلالت کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ انسان اپنے ذہن میں اللہ کے بارے میں جو تصور رکھتا ہے اسی کے مطابق اس کو نام بھی دیتا ہے۔ اسی لیے جہاں اللہ تعالیٰ کے تمام اسمائے ذات وصفات پر ایمان لانا ضروری ہے وہیں اس کو اپنی طرف سے کوئی نام دینا بھی حرام ہے:

﴿ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ٥ ﴾ [النحل:۷٤]

''اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو، کیونکہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''

اوپر توحید کے تینوں اجزا کو قدرے تفصیل سے اس لیے بیان کر دیا گیا ہے تاکہ اہل تصوف اللہ تعالیٰ کی جس توحید کا عقیدہ رکھتے ہیں اس کو سمجھنے اور اس پر صحیح یا غلط ہونے کا حکم لگانے میں آسانی ہو جائے۔

تصوف کی کتابوں میں عام طور پر عقائد کی بحث نہیں ملتی بہت کم ایسی کتابیں ہوں گی جن میں عقائد کا تذکرہ کیا گیا ہوگا۔ اور اگر کسی کتاب میں عقائد کی بحث ملے گی بھی، تو صرف عقیدۂ توحید سے۔ جن صوفیا نے توحید سے بحث کی ہے ان میں ابو اسماعیل انصاری ہروی کا نام سرفہرست ہے انہوں نے اپنی کتاب ''منازل السائرین'' میں توحید کی تین قسمیں بیان کی ہیں: (۱) عوام کی توحید (۲) خواص کی توحید (۳) خاص الخواص کی توحید۔

لکھتے ہیں: توحید کی پہلی قسم عوام کی توحید ہے جو بذریعہ شواہد درست اور صحیح ہے۔ یہی وہ ظاہری اور

واضح توحید ہے جس سے شرک اعظم کی نفی ہوتی ہے۔[1]

شیخ ہروی نے جس توحید کو عوام کی توحید قرار دیا ہے وہ توحید الوہیت ہے جس کی دعوت اللہ تعالیٰ کے حکم سے تمام انبیاء اور رسولوں نے اپنی قوموں کو دی اور جس کی دعوت اللہ کے آخری اور محبوب رسول محمد ﷺ نے اپنی قوم کو دی۔ یعنی "لا اله الا الله......" اللہ کے سوا کوئی اور معبود برحق نہیں ہے۔ اور اسی توحید کی دعوت نبی کریم ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب کو ان کی وفات کے موقع پر ان الفاظ میں دی تھی:

((يَا عَمِّ! قُلْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، كَلِمَةً أَشْهَدُ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللّٰهِ))

"چچا جان لا الہ الا اللہ کہیے (نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر اللہ) یہ ایک ایسا کلمہ ہے جس کے ذریعہ میں اللہ کے ہاں آپ کے حق میں ایمان کی گواہی دوں گا۔"

ایک دوسری روایت میں ہے:

((كَلِمَةً أُحَاجُّ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللّٰهِ))

"یہ ایک ایسا کلمہ ہے جس کے ذریعہ میں اللہ کی بارگاہ میں آپ کے ایمان کی دلیل پیش کروں گا۔"[2]

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ))

"جو اس حال میں مرے گا کہ اس کو اس بات کا یقین ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود برحق نہیں ہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔"[3]

توحید الوہیت یا کلمہ اخلاص: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ...... ایک ایسی کنجی ہے جس کے ذریعہ ایک انسان "قصر اسلام" میں داخل ہوتا ہے اور اسی کے ذریعہ اس دنیا سے بحالت ایمان رخصت ہوتا ہے۔ اس توحید الوہیت کو عوام کی توحید قرار دینے سے یہ لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ سید المرسلین ﷺ اور آپ سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء اور رسول نیز انبیاء کے بعد دنیا کی مقدس ترین جماعت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عوام کے درجے کے مؤحد رہے تھے۔ خواص اور خاص الخواص تو وہ صوفیا ہیں جنھوں نے

---

[1] بحواله مدارج السالكين ص ٣٧٥۔ ٣٨٠ ج: ٣

[2] صحيح بخاری/ ج: ١٣٦٠۔ ٣٨٨٤، ٤٦٧٥، ٤٧٧٢، ٦٦٨١۔ صحيح مسلم/ ح: ٢٤

[3] صحيح مسلم/ ح: ٢٦

کتاب وسنت سے آزاد ہو کر اپنے ذہن ودماغ سے نیا دین اور اس کے عقائد اور احکام گھڑ لیے ہیں۔

شیخ ابواسماعیل ہروی نے توحید کی دوسری قسم یعنی خواص کی توحید کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''توحید کی دوسری قسم جو حقائق کے ذریعہ وجود میں آتی ہے خواص کی توحید ہے۔ جس کا مفہوم ہے کہ ظاہری اسباب کو کالعدم کردیا جائے۔ عقلی حجت بازیوں اور شواہد سے تعلق جوڑنے سے بلند ہوجایا جائے۔ بایں معنی کہ مؤحد کی نظر نہ تو توحید کے سلسلے میں کسی دلیل پر جائے، نہ وہ توکل کے سلسلے میں کسی سبب پر اعتماد کرے اور نہ نجات کے سلسلے میں کسی وسیلے کو اختیار کرے......''[1]

ہروی نے خواص کی جس توحید کی تعریف پیش کی ہے اس کا ہر لفظ نہایت مبہم اور اپنے مدلول میں حد درجہ غیر واضح ہے۔ کیونکہ یہ ایک خیالی توحید ہے جس کا عالم خارجی میں کوئی وجود نہیں ہے، نہ اس کو کتاب وسنت کی تائید حاصل ہے اور نہ آئمہ اسلام نے اس کو اپنی عملی زندگی میں اپنایا ہے۔

خواص کی اس توحید میں پہلی چیز ظاہری اسباب سے صرف نظر کرلینا ہے جبکہ ظاہری اسباب میں اعمال بھی داخل ہیں اور اسلام نے جن اعمال کا حکم دیا ہے اور ان کو فرض قرار دیا ہے ان کا انکار اور ان کو ترک کردینا کفر ہے۔

شیخ ہروی کی یہ بات صحیح ہے کہ توحید کے اثبات میں عقلی حجت بازیوں سے دور رہا جائے کیونکہ اس طرح کے امور میں عقل کی رسائی بہت محدود ہے۔

لیکن توحید کے مسئلے میں کسی دلیل کو نہ دیکھنے سے اگر انسانی دلیل مراد ہے تو یہ بات صحیح ہے۔ لیکن خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنی توحید کے جو دلائل دیے ہیں ان پر غور وتدبر سے دل کے یقین و اذعان کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ''آفاق وانفس'' میں غور و تدبر کرنے کا حکم دیا ہے۔

انہوں نے توحید کے تقاضوں کے ضمن میں اسباب پر توکل سے بلند ہو رہنے اور نجات کے لیے کسی وسیلہ اور ذریعہ کو خاطر میں نہ لانے کی جو بات کہی ہے؟ وہ خالص صوفیانہ نقطہ نظر کی ترجمان ہے۔ اس عالم اسباب میں اسباب کو اس طرح عمل میں لانا کہ اعتماد اسباب کے خالق پر رہے عین اسلام ہے۔ اسی طرح آخرت کی کامیابی اور دوزخ سے نجات کے لیے اعمال شرط کا درجہ رکھتے ہیں۔ قرآن پاک میں ایمان

[1] مدارج السالکین/ ص ۳۸۷، ج:۳

اور عمل صالح کو لازم وملزوم قرار دیا گیا ہے۔

شیخ ہروی نے خاصان خاص یا خاص الخواص کی توحید جس چیز کو قرار دیا ہے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

رہی توحید کی تیسری قسم تو وہ ہے جس کو اللہ نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ جو اس کے مقام و مرتبے کے لحاظ سے اس کے شایان شان ہے۔ اس توحید کی صرف ایک جھلک اس نے اپنے برگزیدہ بندوں میں سے کچھ لوگوں کے باطن کو دکھائی ہے اور پھر ان کی زبانوں کو اسے بیان کرنے سے گونگا بنا دیا ہے اور دوسروں تک اسے پھیلانے سے ان کو درماندہ کر دیا ہے۔[1]

یہ پوری عبارت حد درجہ گمراہ کن اور صوفیا کی غیر اسلامی ذہنیت کی ترجمان ہے۔ کیونکہ جو چیز مطلوب ہو اس کا ممکن الحصول ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ توحید کا اقرار بندوں سے مطلوب ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام انبیاء اور رسولوں کو اس بات کا مکلف بنایا تھا کہ وہ اپنی قوموں میں توحید کو پھیلائیں اور عام کریں۔ اب اگر اللہ کے نبی اور رسول نعوذ باللہ توحید کے بیان سے عاجز اور ان کی زبانیں اس توحید کا وصف بیان کرنے سے گونگی تھیں تو پھر وہ ان سے مطلوب کیونکر ہو سکتی تھی؟!

قرآن تو یہ صراحت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور محبوب بندے اس کے انبیاء اور رسول تھے اور ان رسولوں میں اس کے ''اولو العزم'' رسولوں کا درجہ دوسروں سے بلند تھا اور ان سب سے افضل حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت محمد خلیل اللہ وحبیبہ صلوات اللہ وسلامہ علیہما تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان تمام برگزیدہ بندوں کے دلوں میں جس توحید کی شمع روشن کی اور جس کے الفاظ ان کی مبارک زبانوں سے جاری کرائے وہی کامل ترین توحید تھی جس کو انہوں نے نہایت واضح طریقے سے بیان کیا۔ اس کے اوصاف بتائے اور اپنی قوموں کو اس کی دعوت دی۔

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں شیخ ہروی کے درج ذیل اشعار:

مَا وَحَّدَ الْوَاحِدَ مِنْ وَاحِدٍ ۔۔۔ إِذْ كُلُّ مَنْ وَحَّدَهُ جَاحِدٌ
تَوْحِيْدُ مَنْ يَنْطِقُ عَنْ نَعْتِهِ ۔۔۔ عَارِيَةٌ أَبْطَلَهَا الْوَاحِدُ
تَوْحِيْدُهُ إِيَّاهُ تَوْحِيْدُهُ ۔۔۔ وَنَعْتُ مَنْ يَنْعَتُهُ لَاحِدٌ

واحد کی توحید تو کسی نے بیان ہی نہیں کی کیونکہ جس نے اس کی توحید بیان کی وہ اس کی توحید کا

[1] مدارج السالکین/ ص ٤٠١، ج:٣

انکاری ہے۔

اس شخص کی توحید جو اس کا وصف بیان کرے صداقت سے عاری ہے، جس کو خود ذات واحد نے باطل قرار دے دیا ہے۔

اس نے خود اپنی توحید بیان کی ہے۔ وہی اس کی توحید ہے اور جو شخص اس کی توحید کا وصف بیان کرے وہ راہ راست سے ہٹا ہوا ہے۔''

کفر سے عبارت ہیں۔ اور ان لوگوں کے عقائد کے ترجمان ہیں جو''اولیاء اللہ'' کے ساتھ اللہ کے اتحاد اور ان کے اندر اس کے حلول کر جانے کے قائل ہیں۔ یہی عقیدہ نصاریٰ بھی رکھتے ہیں۔ لیکن حلول اور وحدۃ الوجود کے قائل صوفیا نصاریٰ سے بھی زیادہ برے ہیں۔ کیونکہ نصاریٰ صرف حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق حلول کے قائل ہیں جبکہ صوفیا کا عقیدہ ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ اپنے تمام منتخب اور برگزیدہ بندوں کے دلوں میں حلول کر گیا ہے۔ اس طرح ان کے اندر اپنے حلول اور ان کے ساتھ اپنے اتحاد سے اپنی توحید بیان کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ''توحید بیان کرنے والے اور وہ جس کی توحید بیان کرتے ہیں۔ دونوں ایک ہو چکے ہیں۔

﴿ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ۝ ﴾

''بڑی (سخت اور کفریہ) بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ یہ لوگ بالکل جھوٹ کہہ رہے ہیں۔''

صوفیا میں تو ایسے لوگ بھی گزرے ہیں کہ جب ان پر اعتراض کیا گیا کہ آپ لوگوں کی بیان کردہ توحید اس توحید کے خلاف ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے تو انہوں نے یہاں تک کہہ دیا:

قرآن تو سارے کا سارا شرک ہے۔ توحید تو وہ ہے جو ہم کہتے ہیں[1]!!

کہا جا سکتا ہے کہ سارے صوفیا تو حلول اور وحدۃ الوجود کے قائل نہیں ہیں، بلکہ معدودے چند ہی ایسا عقیدہ رکھتے ہیں جبکہ ان کی اکثریت ایسا عقیدہ نہیں رکھتی، تو یہ بات کسی حد تک صحیح ہے۔ کیونکہ جن صوفیا نے حلول اور وحدۃ الوجود کے مسئلے میں سکوت اختیار کیا ہے یا اس کی نکیر کی ہے وہ ان لوگوں کے لیے اپنے دلوں میں نہ صرف یہ کہ نرم گوشے رکھتے تھے اور اب تک رکھتے ہیں بلکہ ان کو''اولیاء اللہ'' میں شمار کرتے ہیں۔ ان کی مدح سرائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ایسی صورت میں وہ حلول اور

[1] مدارج السالکین/ ص ۴۰۷، ج:۳

وحدۃ الوجود کا عقیدہ رکھنے والوں کے مؤید ہوئے۔

جب صوفیا کے نزدیک "توحید الوہیت" عوام کی توحید قرار پائی تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کلمہ اخلاص "لا الہ الا اللہ" عوام کا ذکر قرار پایا جس کو زبان نبوت "افضل الذکر" قرار دے چکی ہے جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا۔ اس طرح تصوف اپنی اصل تشکیل میں طریق نبوت...... شریعت محمدی...... کا مغایر، اس کی توحید، اسلامی توحید کی مخالف اور اس کا ذکر کتاب وسنت میں بیان کردہ ذکر کی ضد ثابت ہوا جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ کا ذکر عبادت ہے اور عبادت وہی مقبول ہے جو مطابق شرع ہو۔ یعنی جس کا طریقہ اللہ نے یا اس کے رسول نے بتا دیا ہو۔ یہ چیز شہادتین میں داخل ہے۔ بایں معنی کہ جب کوئی یہ گواہی دیتا ہے: "لا الہ اِلا اللّٰہ" اللہ کے سوا کوئی اور معبود برحق نہیں وانّ محمّدًا رسولُ اللّٰہ...... اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو وہ یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کو بھی معبود نہیں بنائے گا اور اس کی عبادت اس طریقے سے کرے گا جو طریقہ اللہ نے خود یا اس کے رسول نے بتا دیا ہے۔ اور محمد ﷺ کو اللہ کا رسول ماننے کا مطلب یہ اقرار ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ مبلغ عن اللہ ہیں۔ آپ نے جو خبر دی ہے وہ سچ ہے اور جو احکام دیے وہ واجب الاطاعت ہیں۔ اور عبادت کا جو طریقہ آپ نے بتا دیا ہے صرف وہی صحیح اور قابل عمل ہے۔ نبی مکرم ﷺ کے سوا کسی بھی انسان کا بتایا ہوا طریقۂ عبادت مردود اور نا قابل عمل ہے۔

احادیث میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی متعدد شکلیں اور متعدد صیغے بیان کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہتے ہیں:

میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((أَفْضَلُ الذِّكْرِ: لاَ اِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَفْضَلُ الدُّعَاءِ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ))[1]

"بہترین ذکر: لا الہ الا اللہ ہے اور بہترین دعا الحمد للہ ہے"

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((أَفْضَلُ مَا قُلْتُ أَنَا وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ قَبْلِيْ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ))[2]

---

[1] جامع ترمذی/ ح: ۳۳۸۳، ابن ماجہ/ ح: ۳۸۰۰

[2] مؤطا الإمام مالک کتاب القرآن/ ح: ۳۲۔ کتاب الحج/ ح ۲۴۶۔ جامع ترمذی/ ح: ۳۵۸۵۔ الفاظ ہیں: خير الدعاء دعاء يوم عرفة وخير ما قلت انا والنبيون من قبلي......

''بہترین بات جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء نے کہی یہ ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں ہے۔ ملک اس کا ہے، تعریف اس کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَقِنُوْا مَوْتَاكُمْ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ))[1]

''اپنے قریب الرگ عزیز کو ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' پڑھنے کی تلقین کرو''

ایک طرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات ہیں تو دوسری طرف صوفیا ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ''لا الہ الا اللہ'' عوام کا ذکر ہے۔ خواص کا ذکر یہ ہے کہ اسم مفرد اللہ کا ورد کیا جائے اور خاص الخواص کا ذکر یہ ہے کہ اسم ظاہر کے بجائے مضمر ''یاھو'' کا ورد کرے۔[2]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اسم مفرد کے ذکر کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

اسم مفرد چاہے وہ اسم ظاہر ہو یا اسم مضمر مکمل کلام نہیں ہے اور نہ مفید جملہ ہے۔ اس سے نہ ایمان کا تعلق ہے اور نہ کفر کا۔ نہ اس سے امر کا مفہوم نکلتا ہے اور نہ نہی کا۔ اس کا ذکر نہ تو اسلاف میں سے کسی نے کیا ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مشروع قرار دیا ہے۔[3]

صوفیا کے جو تین بڑے سلسلے ہیں: قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ...... ان میں اس اسم مفرد کے ذکر کی مشق کرائی جاتی ہے۔

سلسلۂ قادریہ میں اس کا طریقہ یہ ہے کہ سالک اسم ذات اللہ کی ضرب لگائے یعنی لفظ ''اللہ'' کو مد کے ساتھ کھینچ کر زور سے ایک ضرب میں ادا کرے...... جب اس کی مشق ہو جائے تو اسی اسم ذات کو دو ضربوں کے ساتھ ادا کرے۔[4]

مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی اسم ذات کے ذکر کا طریقہ بتایا ہے، لکھتے ہیں:

اسم ذات کا ذکر اس طرح کرے کہ اللہ اللہ کے ذکر کے موقع پر اول حرف ہائے لفظ اللہ کو پیش اور دوسرے ہائے لفظ اللہ کو ساکن کرے۔ یعنی جزم دے اور آنکھیں بند کر کے اور سر کو داہنے مونڈھے پر لا

---

[1] صحیح مسلم/ ح: ۹۱٦، ۹۱۷۔ ابوداؤد/ ح: ۳۱۱۷۔ جامع ترمذی/ ح: ۹۸۳۔ سنن نسائی/ ح: ۱۸۲۵۔ سنن ابن ماجہ/ ح: ۱٤٤٤

[2] العبودیہ ص ۹٦

[3] ص ۹۷

[4] تصوف اور شریعت ص ۵۸، ج:۱

کر لفظ مبارک اللہ: اللہ کی دونوں ضرب جہر اور قوت سے دل پر مارے۔ اس ذکر اسم ذات دوضربی کو چھ سو بار دمادم کرے۔[1]

ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری نے اپنی کتاب ''تصوف اور شریعت'' میں ''سلسلہ قادریہ'' کے مطابق اسم ذات کے ذکر بالجہر اور لا الہ الا اللہ کے ذکر کے جو طریقے لکھے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

سالک اسم ذات: اللہ کی ضرب لگائے۔ یعنی لفظ 'اللہ' کو مد کے ساتھ کھینچ کر زور سے ایک ضرب میں ادا کرے۔ ایسا کرتے وقت اسے قلب وحلق کی ساری قوت لگا دینی ہوتی ہے۔ جب اس کی مشق ہو جائے تو اسی اسم ذات کو دو ضربوں کے ساتھ ادا کرے...... پھر ذکر نفی و اثبات کی ابتدا کرے۔ یعنی لا الہ نفی الا اللہ اثبات کو اس طرح ادا کرے جیسے یہ لفظ ناف سے نکال کر اپنے داہنے کندھے تک کھینچ رہا ہو۔ پھر لفظ اللہ کو اس طرح ادا کرے جیسے یہ لفظ پیشانی سے نکال رہا ہو اور آخر میں ''الا اللہ'' کو بھرپور قوت سے ادا کرے۔ یہ الفاظ ادا کرتے وقت خود کو ایسے عالم میں محسوس کرنے کی کوشش کرے جہاں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہ مطلوب ہے اور نہ محبوب۔ بلکہ اس کے سوا کچھ بھی موجود نہیں ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

ان دونوں اذکار کی مدد سے ذہن اللہ تعالیٰ پر مرکوز ہو جائے گا اور عشق الٰہی کی آگ دل میں بھڑک اٹھے گی۔[2]

شریعت وطریقت میں اسم مفرد کے ذکر بالجہر اور تصوف وشریعت میں اسم ذات اور کلمۂ اخلاص کے ذکر کے جو طریقے بتائے گئے ہیں کیا، ان کا کوئی ثبوت کتاب اللہ اور نبی اکرم ﷺ کے عمل اور صحابہ کرام کے عمل سے ملتا ہے؟ نہیں۔ اور کیا کلمۂ اخلاص کے ذکر کا مقصد اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت میں کہیں اشارۃً بھی یہ بتایا گیا ہے کہ مومن اللہ کے سوا کسی اور کو مطلوب ومحسوس نہ کرے بلکہ اللہ کے سوا کچھ بھی محسوس نہ کرے؟

یا یہ بتایا گیا ہے کہ مومن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو اپنا رب اور معبود نہ مانے اور اپنے دل کو غیر اللہ کی ربوبیت اور الوہیت کے خیال سے بالکل پاک کر لے؟!

پھر کیا کتاب وسنت میں کہیں ایک بار ہی سہی ''دل میں عشق الٰہی کی آگ بھڑکانا'' عبادت کا مقصود

---

[1] شریعت اور طریقت ص ۲۷۱

[2] ص ۵۸، ج ۱

قرار دیا گیا ہے؟ بلکہ کیا اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات میں ایک بار بھی اس لفظ ''عشق'' کا ذکر کہیں آیا ہے؟ قطعاً نہیں۔ تو پھر شریعت میں ایک غیر مطلوب چیز کے حصول کے لیے ایک غیر شرعی عمل کیونکر جائز ہوسکتا ہے؟ مطلوب ہونا تو دور کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب تو یہ کہتی ہے کہ مومن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے اور اس کو اللہ تعالیٰ کا محبوب بنانے کا واحد ذریعہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے اور رسول محمد النبی الکریم ﷺ کی شریعت کی بے چون وچرا پیروی ہے اور آپ کے نقش قدم پر چلنا۔

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ط ﴾ [آل عمران:۳۱]

''اے نبی! کہو، اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا''

صوفیا کہتے ہیں کہ صحابہ کرام کو رسول اکرم ﷺ کی صحبت اور رفاقت سے توجہ الی اللہ میں یکسوئی حاصل ہوجاتی تھی اور دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی شمع روشن رہتی تھی۔ لیکن عصر نبوی کے بعد نبی ﷺ کی صحبت و رفاقت ممکن نہیں رہی اس لیے بزرگان دین نے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی روشنی باقی رکھنے اور توجہ الی اللہ میں یکسوئی قائم رکھنے اور غیر اللہ کی محبت سے ان کو پاک رکھنے کے لیے ''ذکر بالجہر'' کے طریقے ایجاد کیے ہیں۔

ارباب تصوف کی اس بات سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول ﷺ کے ذریعہ انسانوں کے لیے جو شریعت نازل کی ہے اور اس میں اپنی عبادت کے جو طریقے بتائے ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد ناکافی ہو چکے ہیں اور بعد کے زمانوں میں تا قیامت نام نہاد بزرگان دین کو یہ حق حاصل ہوگیا ہے کہ وہ دلوں کے روگ اور بیماریوں کے علاج کے لیے حسب حال علاج تجویز کرتے رہیں۔ اب اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر ''تکمیلِ دین'' کا کیا مطلب ہے؟ جس کا اعلان اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کر دیا ہے۔ (المائدہ:۳) اور یہ دعویٰ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ ''اسلامی شریعت قیامت تک کے لیے صالح ہے''۔

درحقیت صوفیا کا یہ دعویٰ کہ عصر نبوی میں رسول اکرم ﷺ کی صحبت و رفاقت دلوں کی بیماریوں کے علاج کے لیے کافی تھی اور اس کے ذریعہ تعلق مع اللہ کی نعمت حاصل ہوجایا کرتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور رفاقت کے ذریعہ توجہ الی اللہ میں یکسوئی قائم رہتی تھی۔ یہ دعویٰ صوفیانہ تصور دین کا غماز ہے اور امر واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حالت ایمان میں جن خوش نصیبوں کو اللہ تعالیٰ

کے محبوب رسول ﷺ کی رفاقت حاصل تھی وہ انبیاء اور رسولوں کے بعد اس زمین پر بسنے والوں میں سب سے زیادہ مقدس لوگ تھے۔ لیکن ان کا یہ تقدس اور دوسروں پر ان کی اس فضیلت کا سبب صرف نبی کریم ﷺ کی صحبت و رفاقت نہیں بلکہ نبی معظم ﷺ کی کامل اطاعت اور پیروی تھی:

﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۠ ﴾ [الاعراف:۱۵۷]

''پس جو لوگ اس پیغمبر (محمد رسول اللہ ﷺ) پر ایمان لائے اور اس کی حمایت و نصرت کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ نازل کی گئی درحقیت وہی فلاح یاب ہیں''

یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ صحابہ کرام میں ایسے لوگ بھی تھے جن کو رسول اکرم ﷺ کی صحبت و رفاقت ہمہ وقت حاصل نہیں تھی۔ یعنی وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ سے احکام و تعلیمات لے کر اپنے قبیلوں میں واپس چلے جاتے اور نبی مکرم ﷺ کی تعلیمات پر حرف بحرف عمل کرتے۔ خود مدینہ منورہ کے اندر بسنے والوں میں بھی جہاں ایسے صحابہ کرام تھے جن کو دن رات نبی ﷺ کی رفاقت حاصل ہوتی وہیں ایک بہت بڑی تعداد ایسے صحابہ کرام کی بھی تھی جو اپنے کاروبار حیات میں مشغول ہوتے اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور احکام پر عمل پیرا رہتے مگر سیرت کی کتابوں سے اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ جن صحابہ کرام کو آپ کی زیادہ رفاقت حاصل تھی وہ ان لوگوں سے افضل تھے جن کو یہ رفاقت کم حاصل ہوتی دراصل فضیلت کا معیار یہ تھا کہ کون اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا زیادہ مطیع و فرماں بردار ہے۔

اوپر یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ ذکر عبادت ہے اور اسلام میں عبادت کے قبیل کی جتنی چیزیں ہیں وہ جزئیات کی حد تک مکمل ہیں اور کسی بھی قادری، چشتی اور نقشبندی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ تعلق مع اللہ کو مضبوط بنانے کے لیے کسی طرح کا ذکر تجویز کرے۔ اور جو ایسا کرے گا تو اس کا بتایا ہوا طریقۂ ذکر باطل، گمراہی اور مردود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد آنے والوں کو کتاب و سنت پر مضبوطی سے جمے رہنے کی تعلیم دی ہے، نئی راہیں نکالنے کی نہیں۔

تصوف کی چوتھی چیز جو اسلام کے توحیدی مزاج کے لیے مہلک زہر ہے وہ اس کا ''تصور شیخ'' ہے۔ اس تصور نے صوفیا میں شیخ کی عقیدت میں غلو کے جراثیم پیدا کیے۔ پھر یہ غلو پیر پرستی میں تبدیل ہو گیا، جس کے نتیجے میں عالم اسلام میں عموماً اور برصغیر میں خصوصاً مشہور اولیاء اللہ اور صلحائے امت کی قبریں

بت کدوں میں تبدیل ہو گئیں۔ تصور شیخ کے بارے میں مولانا اشرف علی تھانوی تحریر فرماتے ہیں:

''شیخ کی صورت اور اس کے کمالات کے زیادہ تصور کرنے سے اس سے محبت پیدا ہو جاتی ہے اور نسبت قوی ہوتی ہے اور قوت نسبت سے طرح طرح کی برکات حاصل ہوتی ہیں...... اصل مقصودِ تصور حق تعالیٰ کا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ چونکہ مرئی نہیں ہے اس لیے جن لوگوں کی قوت فکر یہ ضعیف ہوتی ہے ان کو یہ تصور جچتا نہیں۔ کیونکہ ان کے ذہن میں خیالات بہت آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یکسوئی حاصل کرنے کے واسطے تصوّرِ شیخ تجویز کیا گیا ہے کیونکہ یہ علاج بالضد ہوتا ہے۔ یعنی خیال کے دفع کرنے کے لیے دوسرے خیال کو ذہن میں جمایا جائے گا خواہ وہ کوئی خیال ہو۔ پس ان خیالات مختلفہ کے دفع کرنے کے واسطے ہر دیکھی ہوئی چیز کا تصور کافی ہے جس پر خیال جم سکے۔ لیکن ان سب خیالات میں سے شیخ کا تصور انفع ہے کہ وہ محبوب ہونے کی وجہ سے ذہن میں زیادہ جمے گا۔ اس لیے دفع خیالات میں زیادہ مؤثر ہوگا۔

تصوّرِ شیخ کوئی بالذات مطلوب نہیں ہے، صرف توجہ الی اللہ کے وقت جو وساوس مجرد کا ہجوم ہوتا ہے وہ قطع وساوس کے لیے ہے، اس سے یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے، پھر اس یکسوئی سے توجہ الی اللہ کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس استعداد کو مقصود میں صرف کرنا اور جب مقصود حاصل ہو جائے تو پھر ان ہیئات و قیود کی ضرورت نہیں رہتی۔[1]

توجہ الی اللہ یا اللہ تعالیٰ کی عبادت کے موقع پر خصوصیت کے ساتھ دوران نماز ذہن و دماغ میں وسوسوں کے پیدا ہونے سے اگرچہ یکسوئی باقی نہیں رہتی مگر یہ انسان کا چونکہ اختیاری فعل نہیں ہے اسی وجہ سے کتاب وسنت میں اس پر کوئی وعید نہیں آئی ہے اور نہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کہیں یہ فرمایا ہے کہ ذہن و دماغ میں وسوسوں کی حالت میں نماز باطل ہو جاتی ہے اور عند اللہ مقبول نہیں ہوتی۔ لہٰذا ایک مومن کو چاہیے کہ وہ توجہ الی اللہ یا عبادتوں کے موقع پر اپنے ذہن کو اس بات پر مرکوز رکھے کہ وہ اپنے معبود حقیقی اور اپنے رب کی بارگاہ میں کھڑا ہے جو اس کی تمام حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہے۔ اس خیال کو بار بار تازہ کرتے رہنے سے بہت حد تک یکسوئی آ جاتی ہے۔ لیکن ذہن و دماغ میں یکسوئی پیدا کرنے کا جو ''علاج بالضد'' صوفیا نے تجویز کیا ہے کہ ''ذہن میں شیخ کے تصور کو جما لیا جائے'' تو اس پر یہ مثل صادق آتی ہے۔

''گئے تھے زکام کی دوا لینے اور لے آئے جذام''

جو شخص بھی سلیم الفطرت اور توحید آشنا ہوگا وہ ''تصور شیخ'' کی بات سنتے ہی اس پر شرک اور بت

---

[1] شریعت اور طریقت/ص: ۲۸۵

پرستی کا حکم لگادے گا۔ جیسا کہ سید احمد شہید نے شاہ عبدالعزیز سے بیعت کے موقع پر ''تصور شیخ'' کی تلقین کے جواب میں فرمایا تھا:

''حضرت اس میں اور بت پرستی میں کیا فرق ہے؟ اس میں صورت سنگی اور قرطاسی ہوتی ہے اور اس میں صورت خیالی۔ جو دل میں جگہ پکڑ لیتی ہے اور اس کی طرف توجہ اور اس سے استعانت ہوتی ہے''[1]

کس قدر مبنی بر صداقت اور حق کا ترجمان تھا سید صاحب کا تبصرہ! اور اس کے جواب میں شاہ عبدالعزیز نے حافظ شیرازی کا درج ذیل شعر پیش کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان کے پاس کتاب وسنت کی کوئی دلیل نہیں ہے جیسا کہ سید صاحب نے فرمایا تھا:

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید — کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسم منزلہا

کون پیر مغاں اور کون شیخ یہ مقام رکھتا ہے کہ اس کے حکم کی اطاعت کی جائے اور اللہ سے تعلق جوڑنے اور اس کی طرف توجہ میں یکسوئی پیدا کرنے کے لیے ''شیخ کے بت'' کو ذہن میں جما لیا جائے۔ ایسا تو اللہ تعالیٰ کے سب سے محبوب بندے اور اشرف الخلق ﷺ کے حق میں بھی جائز نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے موقع پر آپ کی ذات مبارک کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جائے۔ تو پھر کس من گھڑت مقبول بندے اور ولی کے حق میں جائز ہو سکتا ہے؟!

اب آیئے ذرا دیکھیں کہ پیران پیر مولانا رومی کیا فرماتے ہیں:

پیر کامل صورت ظِل علی — یعنی دید پیر دید کبریا
ہر کہ پیرو ذات را یکجا ندید — نے مرید و نے مرید نے مرید

پیر کامل ذات بلند (اللہ تعالیٰ) کا پرتو ہے۔ یعنی پیر کو دیکھنا ذات کبریا کو دیکھنا ہے۔

جو کوئی پیر اور ذات الٰہی کو ایک مقام پر نہ دیکھے وہ مرید نہیں، مرید نہیں، مرید نہیں ہے۔

دراصل تصور شیخ اور عقیدت شیخ کا نشہ اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ مولانا تھانوی کے ہاتھ پر بیعت کے بعد ''سیرت النبی ﷺ'' کے مصنف کی زبان سے اس طرح کے اشعار نکلنے لگے تھے۔

پا کر تجھے اپنے کو میں بھول گیا ہوں — ہر سود و زیان دوسرا میں بھول گیا ہوں
جس دن سے مرے دل میں تری یاد بسی ہے — ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں
آتا ہے خدا بھی ترے صدقے میں مجھے یاد — گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں[2]

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص ۱۳۱، ج ۱
[2] بحوالہ دین تصوف وطریقت ص: ۸۱

صوفیا کے نظریہ حلول اور وحدۃ الوجود کا سب سے بڑا مظہر یہی تصور شیخ ہے۔ حلول اور وحدۃ الوجود کے مؤید تو تمام صوفیا نہیں ہیں۔ یا کم از کم بظاہر نہیں ہیں لیکن تصور شیخ کے تو سب مؤید ہیں۔ بلکہ یہ تصور تو سب کا مشترکہ عقیدہ ہے۔ اسلام میں بڑوں کے احترام اور توقیر کی تاکید آئی ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا))[1]

''وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کی تعظیم واحترام نہ کرے''

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيَعْرِفْ شَرَفَ كَبِيْرِنَا))[2]

''وہ ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کی عظمت و شرف نہ پہچانے''

ایک انسان بڑا اپنے علم ومعرفت کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے اور اپنے مقام ومرتبے کے اعتبار سے بھی۔ اپنے عہدے اور منصب کے اعتبار سے بھی اور اپنی عمر کے اعتبار سے بھی۔ اور کسی بڑے آدمی کے احترام وتوقیر کرنے اور اس کی قدر ومنزلت پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ معاملات کرتے وقت اور اس کو مخاطب بناتے ہوئے اس کی بڑائی کا لحاظ کیا جائے اور جس مقام ومرتبے پر وہ فائز ہے اس کو گھٹایا نہ جائے۔ لیکن اس احترام وتوقیر کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کی پرستش کی جائے یا اس کی ہر بات کو واجب الاطاعت سمجھا جائے اور اس کی باتوں کو کتاب وسنت کے بالکل متوازی سند کا درجہ عطا کیا جائے۔

جہاں تک عبادت وپرستش اور اس قبیل کی چیزیں ہیں مثلاً: استمداد واستعانت، مشکل وقت میں پکارنا، عبادت اور توجہ الی اللہ کے وقت اپنا مرکز خیال بنانا...... تو ان سب کی سزاوار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کے سوا کسی اور کی مستقل اور غیر مستقل عبادت اور بندگی، عبادت کے وقت اس کو مرکز خیال بنانا اور اس کی رضا اور خوشنودی چاہنا شرک اعظم ہے۔ چاہے وہ نبی ہو، ولی ہو، پیر ہو، اور امیر وحاکم ہو، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴾ [الزمر:۲]

''اے نبی! ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ لہٰذا تم اللہ کی عبادت

---

[1] جامع ترمذی/ ح:۱۹۱۹ [2] جامع ترمذی/ ح:۱۹۲۰

بندگی کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے کرو۔''

دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بندگی میں کسی اور کی بندگی شامل نہ ہو۔ اس بندگی سے اس کے سوا کسی اور کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ شامل نہ ہو اور اس کے سوا کوئی اور مرکز توجہ و خیال نہ ہو۔

اس سورت میں آگے چل کر اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿ قُلْ اِنِّي اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ ﴾ [الزمر:١١]

''اے نبی کہہ دو! مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت اس کے لیے دین کو خالص کر کے کروں''

اللہ تعالیٰ نے اپنی اس خالص اور بے آمیز عبادت کا حکم اہل کتاب کو بھی دیا تھا:

﴿ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ ط ﴾ [البينه:٥]

''اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت دین کو اس کے لیے خالص کر کے اور بالکل یکسو ہو کر کریں''

تصوف کی کتابوں میں عبادت، تزکیہ نفس اور ریاضت وغیرہ کا مقصد اللہ کی معرفت، اس کے وصال اور دیدار وغیرہ کو قرار دیا گیا ہے جبکہ کتاب و سنت میں کہیں ایک جگہ بھی عبادت کا یہ مقصد نہیں بتایا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس ایمان اور عمل صالح کا مقصد رضائے الٰہی، اللہ کی مغفرت، آخرت کی فلاح، جنت کا حصول اور جہنم سے نجات کو قرار دیا گیا ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ط ﴾ [الفتح:٢٩]

''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ تم انہیں رکوع سجدہ کرتے ہوئے دیکھو گے کہ وہ اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں''

﴿ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ط ﴾ [الحديد:٢٠]

''اور آخرت میں سخت عذاب اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے''

﴿ وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اُعِدَّتْ

لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ [آل عمران:۱۳۳]

''اور جلدی لپکو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین اور آسمانوں کے برابر ہے، جو اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے''

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ [النساء:۱۳]

''...... جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسے ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے''

مشرکین اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں شرک نہیں کرتے تھے۔ قرآن پاک میں ایک سے زیادہ مقام پر یہ صراحت ہے کہ کفار و مشرکین صرف اللہ تعالیٰ کو ہی کائنات کا رب، خالق، مالک، رازق، نظام عالم کا مدبر و منتظم مانتے تھے اور مصائب و آفات کے موقع پر اپنے تمام خود ساختہ بتوں کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالیٰ کو پکارنے لگتے اور اسی سے فریادیں کرنے لگتے تھے۔

لیکن صوفیا اللہ تعالیٰ کی توحید الوہیت و معبودیت میں شرک کے ساتھ اس کی ربوبیت میں بھی اپنے من گھڑت ''اولیاء اللہ'' کو شریک مانتے ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں اور مرشدوں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں مخلوق کے امور ہیں جن میں وہ تصرف کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں۔ عام لوگوں کی یا اپنے مریدوں اور پیروکاروں کی مشکلات کو ختم کر سکتے ہیں۔ ان کی مصیبتوں اور بلاؤں کو دور کر سکتے ہیں۔ کسی بھی تصوف کی کتاب اور کشف و کرامت یا فضائل و مناقب کی کتاب میں بزرگان دین کے فضائل کے باب کے مطالعہ سے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ مصائب و آفات کے موقع پر اور آڑے وقت میں بھی اولیاء اللہ سے استعانت کے اس قدر واقعات ملتے ہیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و اختیار اور اولیاء اللہ کی قدرت و اختیار میں معمولی سا بھی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

ابتدائے اسلام میں رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت سے لوگوں کو منع فرما دیا تھا کیونکہ سابقہ قوموں میں شرک کی بیماری صلحاء اور بزرگوں کی قبروں کی زیارت کی راہ سے آئی تھی، جب ان قبروں کو مزارات اور عبادت گاہوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں کے دلوں میں عقیدۂ توحید راسخ ہو گیا اور یہ اندیشہ باقی نہ رہا کہ وہ اہل قبور سے کسی طرح کی کوئی امید وابستہ کر سکتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے اس مقصد کے لیے لوگوں کو قبروں کی اجازت دے دی کہ اس سے موت اور آخرت کی یاد

تازہ ہوتی ہے۔ چونکہ یہ مقصد ہر طرح کی قبروں کی زیارت سے حاصل کیا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ مشرکین کی قبروں کی زیارت سے بھی، اس لیے نبی مکرم ﷺ نے زیارت کے لیے کسی قبر کی تخصیص نہیں فرمائی۔ مگر بعد میں جب صلحائے امت اور بزرگان دین کی عقیدت میں غلو کی بیماری پیدا ہوگئی تو اولاً زیارت کے لیے ''نام نہاد'' اولیاء اللہ اور بزرگوں کی قبروں کو مخصوص کر دیا گیا۔ ثانیاً ان قبروں کی زیارت کے موقع پر انہی اعمال کا ارتکاب ہونے لگا جن سے محفوظ رکھنے کے لیے ابتداء میں مسلمانوں کو زیارت قبور سے منع فرمایا گیا تھا۔

برصغیر کے ملکوں میں قبروں کو مزارات میں بدلنے اور بزرگوں کے مزارات کے پاس میلہ اور عرس لگانے، قبروں کے پاس مراقبہ کرنے اور اہل قبور سے استعانت و استمداد کرنے، ان سے مصائب و مشکلات کے ازالے کی درخواست کرنے، بیماریوں سے شفا اور اولاد طلب کرنے کا کام اہل تصوف اور ان کے معتقدین نے شروع کر دیا اور انہوں نے ہی مسلمانوں میں یہ عقیدہ پھیلا کر کہ ''اولیاء اللہ بعد از وفات بھی اپنے فیوض و برکات کی بارش جاری رکھتے ہیں'' مسلمانوں میں قبر پرستی کی وباء پھیلا دی۔ اس طرح برصغیر کی سرزمین درگاہوں، آستانوں، مزارات اور خانقاہوں سے بھر گئی جہاں توحید کی بجائے شرک کی تعلیم دی جاتی ہے اور کھلے عام مشرکانہ اعمال کا ارتکاب کیا جاتا ہے اور برصغیر کے جن مسلمانوں کو حج و زیارت کے مواقع ملتے ہیں ان کی اکثریت زیارت مسجد نبوی کے موقع پر، نبی اکرم فداہ ابی و امی ﷺ کی قبر مبارک کے پاس شرعی سلام کے علاوہ رسول اللہ ﷺ سے دعائیں بھی مانگتی ہے اور آپ سے فریادیں بھی کرتی ہے جو ائمہ اسلام کے نزدیک بالاجماع حرام ہے۔

تصوف کی کتابوں میں صوفیا کے فضائل و مناقب کے ضمن میں کشف، الہام، غیبی امور کے مشاہدے، اور دل میں علوم و معارف کے نزول وغیرہ کا ذکر بہت ملتا ہے۔ اور ان کو نہ صرف یہ کہ مستقل ذرائع علم کا درجہ حاصل ہے، بلکہ ان کی بنیاد پر بہت سی حلال چیزوں کو حرام اور حرام چیزوں کو حلال قرار دے لیا گیا ہے۔

صوفیا کو ان کے دعویٰ کے مطابق یہ کشف و الہام اور قلبی معرفت ان کی خود ساختہ ریاضتوں سے حاصل ہوتی ہے۔ متعدد صوفیا نے اسی کشف و الہام کی بنیاد پر اپنے آپ کو ''مجدد امت'' کے طور پر متعارف کروایا ہے۔ مثال کے طور پر شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ کے نام کے ساتھ ''مجدد الف ثانی'' اس لیے لکھا جاتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ تھا: ''اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام ان کو اپنے زمانے کا مجدد بنایا ہے''۔

صاحب الہام کے لیے حدیث میں "محدَّث" کی تعبیر استعمال ہوئی ہے جس کی جمع "محدَّثون" ہے۔ یہ تحدیث کا اسم مفعول ہے۔ تحدیث کے معنی کسی صحیح بات کو دل میں ڈال دینے اور الہام کرنے کے ہیں۔ اس طرح محدَّث وہ شخص ہوتا ہے جس کے دل میں کوئی صحیح خیال یا بات ڈال دی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَقَدْ كَانَ فِيمَا قَبْلَكُمْ مِنَ الْأُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ، فَإِنْ يَكُ فِي أُمَّتِي أَحَدٌ، فَإِنَّهُ عُمَرُ))[1]

"تم سے سابقہ قوموں میں صاحب الہام یا صحیح خیال رکھنے والے لوگ ہوا کرتے تھے اور اگر میری امت میں ایسا کوئی ہے تو وہ عمر ہیں رضی اللہ عنہ۔"

یہی حدیث درج ذیل الفاظ میں بھی مروی ہے:

((لَقَدْ كَانَ فِيْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيْلَ رِجَالٌ يُكَلَّمُوْنَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُوْنُوْا أَنْبِيَاءَ، فَإِنْ يَكُنْ مِنْ أُمَّتِي مِنْهُمْ أَحَدٌ فَعُمَرُ))

"درحقیقت تم سے پہلے بنو اسرائیل کے جو لوگ گزرے ہیں ان میں ایسے مرد ہوتے تھے جن سے کلام کیا جاتا تھا، بغیر اس کے کہ وہ نبی ہوں اور اگر میری امت میں ایسا کوئی ہوگا یا ہے تو وہ عمر ہیں" (رضی اللہ عنہ وارضاہ)

چونکہ سابقہ قوموں نے اپنے انبیاء پر اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعتوں کو بھلا دیا تھا یا ان میں تحریفات کر ڈالی تھیں اس لیے ان میں جو صالح لوگ ہوتے اور ان کے سامنے راہِ حق مشتبہ ہو جاتی یا حق و باطل کے خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے ان کو صحیح بات کا سراغ نہ ملتا تو اللہ تعالیٰ بذریعہ الہام، کشف یا قلبی واردات کے ان کی رہنمائی فرما دیتا۔ رہی اسلامی شریعت تو یہ ہر طرح کی تحریفات سے قیامت تک کے لیے محفوظ ہے۔ اس کے دونوں بنیادی ماخذ کتاب و سنت مکمل طور پر محفوظ ہیں۔ لہٰذا مسلمان کسی بھی مسئلہ کے بارے میں اللہ و رسول کا حکم معلوم کرنے کے لیے الہام، کشف یا قلبی واردات کے محتاج نہیں ہیں۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے سابقہ قوموں میں الہام اور غیبی خطاب سے موصوف لوگوں کے وجود کے لیے یقینی ذریعۂ بیان "لقد کان" اختیار فرمایا ہے اور اس امت میں کسی صاحب الہام کے ہونے کے

---

[1] صحیح بخاری/ ح: ۳۴۶۹، ۳۶۸۹۔ صحیح مسلم/ ح: ۲۳۹۸

لیے حرف شرط "اِن" استعمال فرمایا ہے جو حرف ''تشکیک'' ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اگر اس امت میں ایسا کوئی ہوا یا ہے کہ جس کو بذریعہ الہام یا بذریعہ کشف یا صحیح خیال کے ذریعہ مشتبہ امور اور معاملات میں صحیح بات کی رہنمائی کر دی جائے گی تو وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہوں گے۔

زبانِ نبوت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحب الہام ہونے کی شہادت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان اور دل پر حق غالب تھا[1] اور شیطان ان پر اثر انداز ہونے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔[2]

(۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوا اس امت میں کوئی ایسا صاحب الہام نہیں ہوگا جس کے الہام، قلبی واردات اور خیالات کو شیطان کی دراندازی سے محفوظ قرار دیا جا سکے۔

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں اس امت سے نسبت رکھنے والے صلحاء اور بزرگوں سے کشف والہام کے جو واقعات منسوب ہیں یا جن کی زبانوں سے ایسے جملے صادر ہوئے ہیں، جیسے کہ: اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ حکم دیا، اللہ تعالیٰ نے مجھے اس منصب پر فائز کیا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے مطلع فرمایا وغیرہ وغیرہ۔ ان کے صلاح وتقویٰ اور روحانی فضیلت پر دلالت نہیں کرتے بلکہ ان کی کمزوریوں یا دوسرے لفظوں میں ان کے ''ہفوات'' پر دلالت کرتے ہیں۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

بہت سے لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ "حَدَّثَنِي قَلْبِي عَنْ رَبِّي" میرے دل نے مجھ سے میرے رب کے حوالہ سے بیان کیا......'' تو یہ صحیح ہے کہ کہنے والے سے اس کے دل نے بیان کیا، لیکن کس کی نسبت سے؟ اس کے شیطان کی نسبت سے یا اس کے رب کی نسبت سے؟ اور جب اس نے یہ کہا: میرے دل نے مجھ سے میرے رب کی نسبت سے بیان کیا تو اس نے اس بات کو اس ذات سے منسوب کیا جس کے بارے میں اس کا یہ علم نہیں ہے کہ اسی نے اس سے وہ بات بیان کی ہے۔ ایسی صورت میں اس کا یہ دعویٰ جھوٹ ہے۔ اس امت کے جو صاحب الہام اور مبنی برحق خیال سے موصوف تھے، انہوں نے بھی کبھی ایسی بات نہیں فرمائی، بلکہ وہ اس طرح کی بات زبان سے نکالنے سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے کاتب نے جب ایک دن یہ لکھا کہ یہ وہ بات ہے جو اللہ نے امیر المومنین عمر بن خطاب

[1] دیکھئے: جامع ترمذی/ ح: ۳۶۸۲

[2] دیکھئے: صحیح بخاری/ ح: ۳۶۸۳۔ صحیح مسلم/ ح: ۶۲۰۲

(رضی اللہ عنہ) کو دکھائی ہے تو اس سے فرمایا: اس عبارت کو مٹا دو اور لکھو: یہ عمر بن خطاب کی رائے ہے۔ اگر یہ درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر غلط ہے تو عمر کی طرف سے جس سے اللہ اور اس کے رسول بری ہیں۔[1]

تصوف کی کتابوں میں کشف و الہام کی طرح ''علم لدنی'' کا ذکر بھی بہت ملتا ہے جس سے اہل تصوف کی مراد علم ربانی یا علم الٰہی ہے جو اللہ کے مقرب بندوں کو منجانب اللہ کسی واسطہ کے بغیر حاصل ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لیے فکر و استنباط اور اجتہاد کی ضرورت نہیں پڑتی اور اس علم سے موصوف انسان اور غیب کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔

"لَدُنِّیْ ......لدن" اور واحد متکلم کی ضمیر ''ی'' سے مرکب ہے۔ لدن کے معنی ہیں: پاس، نزدیک۔ یہ لفظ ظرف مکان ہے جو ''عند'' کا مترادف ہے لیکن اس میں ''عند'' کے مقابلے میں قرب کا مفہوم زیادہ ہے۔ کتاب و سنت میں بطور اصطلاح ''علم لدنی'' کا ذکر نہیں ملتا۔ قرآن پاک میں صرف ایک جگہ اس کا استعمال ہوا ہے جو حضرت خضر علیہ السلام سے متعلق ہے ارشاد ربانی ہے:

﴿ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًاo ﴾

[الکهف:٦٥]

''(موسیٰ اور اس کے ساتھی کو) ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ ملا جس کو ہم نے اپنی خاص رحمت سے نوازا تھا اور اس کو اپنے پاس سے ہم نے ایک خاص علم عطا کیا تھا''

اس آیت مبارکہ میں "عَبْدًا" سے مراد حضرت خضر علیہ السلام ہیں جیسا کہ صحیح احادیث میں صراحت ہے۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ نے جس خاص علم سے نوازا تھا وہ شرعی علم نہیں بلکہ تکوینی علم تھا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بعض غیبی حقائق سے آگاہ فرما دیا تھا اور اسی علم کی روشنی میں انہوں نے وہ تین کام کیے تھے جن پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا تھا۔ اگر وہ شرعی کام ہوتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان پر اعتراض نہ کرتے۔ کیونکہ ایک جلیل القدر رسول ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام تمام شرعی علوم سے واقف تھے اور شرعی علوم جن ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں وہ قرآن پاک کی درج ذیل آیت میں بیان کردیے گئے ہیں:

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌo ﴾ [الشوری:٥١]

---

[1] مدارج السالکین ص: ٤٠، ج١

''کسی بشر کے شایان شان یہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے بات کرے سوائے اس کے کہ وہ بات بذریعہ وحی ہو یا پردے کے پیچھے سے یا وہ کوئی پیغام پہنچانے والا فرشتہ بھیجے جو اس کے حکم سے اس کو وحی کرے جو اللہ چاہتا ہے۔ بے شک وہ برتر اور صاحبِ حکمت ہے''

حضرت خضر علیہ السلام سے متعلق اللہ تعالیٰ نے صرف یہ بات فرمائی ...... وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا...... اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔'' جس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ علم عطا کرنے میں کوئی واسطہ اور ذریعہ نہیں استعمال فرمایا۔ لیکن مذکورہ فقرے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس علم کی نوعیت کیا تھی؟ البتہ حضرت خضر علیہ السلام کے تصرفات سے یہ بات واضح فرمادی کہ ان کے اس علم کا تعلق اسرار کائنات سے تھا اور یہ قصہ بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ تعلیم دی ہے کہ اس مادی دنیا میں ان کو بعض اوقات بظاہر جن نقصانات اور جن مصائب کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے وہ اپنے پیچھے بڑی حکمتیں رکھتے ہیں، لہٰذا ان پر صبر سے کام لینا چاہیے۔

بات صرف اتنی ہی تھی۔ لیکن حضرات صوفیا نے حضرت خضر علیہ السلام کو عطا کیے جانے والے مذکورہ علم سے ''علم لدنی'' ایجاد کر لیا اور خود فریبی میں مبتلا ہو گئے۔ دنیا کو اس فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو صوفیا خاص مقام پر پہنچ جاتے ہیں ان کو بھی وہ ''علم لدنی'' حاصل ہو جاتا ہے جو حضرت خضر علیہ السلام کو حاصل تھا اور اس طرح وہ شرعی علوم اور ان کے تقاضوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ لیکن اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تا قیامت محفوظ کر دیے جانے کے بعد نہ تو کوئی نام نہاد ''علم لدنی'' کا محتاج ہے اور نہ کتاب و سنت کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کے مقابلے میں اس کا کوئی اعتبار ہے۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جب یہ پوچھا گیا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کوئی خاص علم دیا ہے تو فرمایا:

((لَا، وَالَّذِي فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ، إِلَّا فَهْمًا يُؤْتِيهِ اللّٰهُ عَبْدًا فِي كِتَابِهِ))[1]

''نہیں، اس ذات کی قسم جس نے بیج کو پھاڑا اور جان کو پیدا کیا، سوائے اس فہم کے جو اللہ کسی بندے کو اپنی کتاب کے بارے میں عطا کرتا ہے''

معلوم ہوا کہ ''علم لدنی'' صوفیا کی ذہنی اختراع ہے جو ان کے خاص ذوق و پسند کی ترجمان ہے۔ اور جس طرح انہوں نے اپنے ذوق و پسند سے بہت ساری عبادتیں اور ریاضتیں ایجاد کر ڈالی ہیں اسی

[1] صحیح بخاری/ ح: ۱۱۱۔ صحیح مسلم/ ح: ۱۳۷۰

طرح ''علم لدنی'' کے نام سے یہ علم وضع کر لیا ہے جو ان کے دعویٰ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے مقرب اور خاص بندوں کو کسی واسطہ اور ذریعہ کے بغیر عطا کیا جاتا ہے اور اس کی بنیاد پر ان کو کائنات کے بہت سے اسرار معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی وجہ سے ان کو ایسے تصرفات کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے جو بظاہر شرعی احکام سے ٹکراتے ہیں مگر وہ اللہ کی مرضیات کے خلاف نہیں ہوتے۔ تو یہ دعویٰ فریب نفس کے سوا کچھ اور نہیں ہے اور بقول امام ابن القیم رحمہ اللہ کے:

اگر کوئی ''علم لدنی'' ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عبودیت، اس کے احکام کی پیروی، صدق مع اللہ اس کی بے آمیز عبادت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت و پیروی کا نتیجہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کتاب وسنت کے فہم کے دروازے کھول دیتا ہے...... رہا اس شخص کا علم جو کتاب وسنت سے بیگانہ ہو اور ان کے احکام کی پابندی نہ کرے تو وہ ''لدنی'' ضرور ہے مگر نفس، خواہش اور شیطان کے پاس سے......[1]

تصوف کے بارے میں دلائل و براہین کی زبان میں اتنی تفصیل سے اس لیے گفتگو کی گئی ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اس کا ماخذ کتاب وسنت نہیں بلکہ خاص ذوق ہے۔ اور اگر اس میں بہت ساری باتیں کتاب وسنت سے ماخوذ ملتی بھی ہیں تو صرف وہی جو صوفیانہ مزاج سے ہم آہنگ ہیں یا ہم آہنگ بنا دی گئی ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کی نظر میں کتاب وسنت پر عمل کر کے ہی کوئی انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب اور مقرب بندہ بن سکتا ہے۔

اوپر کی وضاحتوں کے بعد یہ دعویٰ کہ:

اولین صوفیا نے تصوف کی عمارت قرآن وسنت اور صحابہ کرام کے عمل ہی پر اٹھائی۔ طریقت ہو یا معرفت، زندگی کا نقطہ نظر ہو یا دین کا تصور، ہر جگہ انہوں نے قرآن وسنت ہی کو سامنے رکھا......[2]

امر واقعہ کا ترجمان نہیں ہے، کیونکہ تصوف کے خمیر میں عقیدۂ توحید خالص کی گنجائش نہیں ہے، جبکہ اسلام کی روح توحید خالص ہے۔ مزید یہ کہ طریقت اور معرفت نہ اسلامی اصطلاحیں ہیں اور نہ قرآن و حدیث کی نصوص سے مستنبط۔ اسی طرح زندگی کا جو نقطہ نظر کتاب وسنت نے دیا ہے وہ اس نقطہ نظر سے مکمل طور پر مختلف ہے جو تصوف نے دیا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ تصوف میں بہت سی باتیں قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں جن میں سے کچھ تو اپنی اصلی شکل میں ہیں اور زیادہ تر تصوف کے خراد پر چڑھا کر کچھ سے

---

[1] مدارج السالکین/ ص: ۳۷۷، ج:۲ [2] مقدمہ تصوف اور شریعت ص: ۱۲، ۱۳

کچھ بنا دی گئی ہیں۔

تابعین اور تبع تابعین کے دور میں جن ائمہ کا نام تصوف سے منسوب ملتا ہے تو دراصل صرف اس وجہ سے کہ ان کو صوفیا میں شامل کر لیا گیا۔ اس لیے کہ زہد و ورع اور تسلیم و رضا وغیرہ میں بظاہر وہ صوفیا سے مشابہہ تھے۔ رہے صوفیانہ عقائد اور نظریات تو ان سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ مثال کے طور پر امام سفیان ثوری رحمہ اللہ متوفی ۱۶۱ھ کا نام بھی صوفیا کے ضمن میں ملتا ہے۔ تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ طریق ولایت سے تعلق رکھتے تھے۔ یا طریقت کے نام سے ان کا کوئی صوفیانہ مسلک تھا۔ نہیں بلکہ وہ اپنے ہم عصر محدثین کے عقائد رکھتے تھے۔ البتہ زہد و ورع اور کثرت عبادت وغیرہ میں ان سے ممتاز تھے۔

اس کے برعکس ابوالقاسم جنید متوفی ۲۹۷ھ صوفیا میں ''سید الطائفہ'' کے لقب سے مشہور ہیں۔ وہ توحید کے مفہوم تک سے نا آشنا تھے۔ ان کا دعویٰ ہے:

قدیم کو حادث سے علیحدہ کر دینے کا نام توحید ہے۔[1]

یہ کون سی توحید ہوئی؟ اللہ تعالیٰ کی ذات کو حدث سے پاک اور منزہ کرنا تو حق ہے، مگر اس کا توحید سے کیا تعلق؟ یونانی اور غیر یونانی فلاسفر کہ جو اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ حق سے دور تھے وہ بھی یہ کہتے تھے کہ: ''اللہ واجب الوجود ہے جو قدیم ہے اور حدث سے پاک ہے۔''

دراصل ''قدیم'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں شامل نہیں ہے بلکہ اس کو علمائے کلام نے اپنی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر استعمال کیا ہے اور اس سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی سے بھی پہلے سے ہے۔ لیکن اس لفظ ''قدیم'' سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ یہ جدید کی ضد ہے جو مرورِ وقت کے ساتھ قدیم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یعنی ''قدیم'' اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ اس سے پہلے ''عدم'' نہیں تھا۔ قرآن پاک میں چاند کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴾ [یٰس:۳۹]

''اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دوبارہ پرانی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے''

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ''ازلیت'' کے لیے اپنا نام "الاول" رکھا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ [الحدید:۳]

---

[1] مدارج السالکین/ ص: ۳٤٦، ج:۳

''وہی اول ہے اور وہی آخر اور وہی ظاہر ہے اور وہی باطن اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔''

اس کی بہترین تفسیر وہ طویل دعا ہے جو پیارے نبی ﷺ نے اپنی لخت جگر سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اس وقت سکھائی تھی جب وہ آپ کی خدمت میں ایک خادم کی درخواست لے کر حاضر ہوئی تھیں۔ اس دعا کے آخر میں ہے:

((أَللّٰهُمَّ أَنْتَ الْأَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَأَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْس بَعْدَكَ شَيْءٌ، وَأَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ، وَأَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْس دُوْنَكَ شَيْءٌ))[1]

''اے اللہ! تو ہی پہلا ہے کوئی تجھ سے پہلے نہیں۔ تو ہی آخر ہے کوئی تیرے بعد نہیں۔ تو ہی ظاہر ہے کوئی تجھ سے اوپر نہیں۔ اور تو ہی باطن ہے کوئی تجھ سے مخفی نہیں''

چونکہ اللہ تعالیٰ کی حسی اور عقلی معرفت محال ہے اس لیے وہ ماورائے حواس وعقل ہے۔ نہ تو حواس کے ذریعہ اس کو محسوس کیا جاسکتا ہے اور نہ عقل اس کی کنہہ اور حقیقت تک رسائی حاصل کرسکتی ہے۔ اس تناظر میں تصوف کی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی معرفت یا عرفان الٰہی کی جو باتیں ملتی ہیں وہ صوفیانہ ''بڑ'' کے سوا کچھ بھی نہیں۔ البتہ ایک صادق الایمان مؤمن کو اللہ تعالیٰ کی صفاتی معرفت ضرور حاصل ہوتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان فرمادی ہیں ان کے ذریعہ اور انہی کے دائرہ میں اس کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان صفات اور اس کے صفاتی ناموں میں غور وتدبر سے یہ ایمان ویقین قوی سے قوی تر ہوتا چلا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں واحد واَحد...... ایک اور یکتا ہے۔ وہ اپنی مخلوق سے جدا اور بے مثل ہے۔ اس نے اپنے آپ کو جن صفات سے موصوف اور جن ناموں سے موسوم کیا ہے وہی اس کے کمال کی سچی تعبیریں ہیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''جس نے اللہ تعالیٰ کے جملہ اسمائے حسنیٰ میں سے ۹۹ ناموں کو سمجھ کر یاد کرلیا اور ان کے تقاضوں کے مطابق عمل کیا وہ جنت میں جائے گا''[2]

واضح رہے کہ جس طرح اہل تصوف کے یہاں وہ توحید کبھی بھی محل توجہ واہتمام نہیں رہی جس کی دعوت نبی مکرم ﷺ نے دی اور جس سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور جس کی دعوت اس کے تمام انبیاء اور رسول دیتے رہے تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے اسمائے ذات وصفات کا تذکرہ بھی

---

[1] صحیح مسلم/ ح: ٢٧١٣، ٦٨٨٩، ٦٨٩١

[2] دیکھئے: صحیح بخاری/ ح: ٦٤١٠۔ صحیح مسلم/ ٢٦٧٧

تصوف کی کتابوں میں نہ ہونے کے برابر ہے بلکہ سارا زور مراقبوں اور ریاضتوں کے ذریعہ عرفان الٰہی حاصل کرنے پر دیا جاتا ہے۔ یہ من گھڑت مراقبے اور ریاضتیں نہ تو اللہ تعالیٰ کی معرفت سے ہمکنار کرسکتی ہیں اور نہ ان کے ذریعہ اس صحیح اور سیدھی راہ کو ہی معلوم کیا جاسکتا ہے جس پر چل کر ایک انسان اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور اس دنیا کے بعد دوسری زندگی میں فلاح و کامرانی حاصل کرسکتا ہے۔

ابھی میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کے رد میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بیشتر صوفیا نے اپنی کتابوں میں کتاب و سنت کی کامل پیروی کرنے، شریعت کے آداب اور رسول اللہ ﷺ کے ''اسوہ حسنہ'' پر مضبوطی سے کاربند رہنے کی بڑی تاکید کی ہے۔ تصوف کی کتابوں میں عبادات اور مسنون اذکار پر بڑا زور دیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تصوف کے بہت سارے تضادات میں سے ایک تضاد یہ بھی ہے جس کو تصوف کی کتابوں اور صوفیا کے اقوال و افعال میں بکثرت دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تصوف چونکہ سراسر ذوق و احساس کی پیداوار ہے اور اس کا کوئی واضح اور متعین ماخذ نہیں ہے اس لیے جب کسی صوفی پر کبھی دین و شریعت کے احکام کی پیروی کا رنگ یا جذبہ غالب ہوتا ہے تو وہ کتاب و سنت کی تعلیمات کی پابندی کی باتیں کرنے لگتا ہے، تلاوت قرآن کے اجر و ثواب بیان کرنے لگتا ہے اور حکم اخلاص کی اہمیت اجاگر کرنے لگتا ہے مگر جوں ہی اس کی ذاتی پسند اس پر غالب آجاتی ہے اور اس کا صوفیانہ رنگ شوخ ہوجاتا ہے تو اس کی زبان سے ایسی باتیں بھی نکلنے لگتی ہیں:

جس کسی نے تین چیزیں کیں وہ دنیا کی طرف مائل ہوگیا، جس نے معاش کے لیے کاوش کی، عورت سے شادی کی یا حدیث کی کتابت کی۔[1]

اس عبارت کو اگر کھول دیا جائے تو یہ مطلب ہوگا کہ معاذ اللہ نبی مکرم ﷺ، صحابہ کرام، ائمہ حدیث وفقہ دنیا دار لوگ تھے۔ اس طرح کے تضادات و خیالات اور من گھڑت باتوں اور دعوؤں سے تصوف کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

تصوف کے بارے میں یہ بحث مکمل نہ ہوگی اگر ان اثرات میں سے بعض کا سرسری جائزہ نہ پیش کردیا جائے جو صوفیا نے غیر صوفیا پر لاشعوری طور پر ڈالے ہیں۔

جو لوگ تصوف کے خلاف ہیں یا نظریاتی طور پر صوفیا کے مؤید نہیں ہیں ان کی تحریروں میں بھی نبی

---

[1] تصوف اور شریعت ص ١٦ ج ١۔ یہ قول تصوف کے ایک بہت بڑے بزرگ ابوسلمان عبد الرحمٰن بن احمد دارانی کی طرف منسوب ہے۔

اکرم ﷺ، بزرگان دین اور صلحائے امت کی ''وفات'' کی جگہ ''وصال'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ بادی النظر میں یہ محض ایک لفظ ہے جو موت اور وفات کا مترادف لفظ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف ایک لفظ نہیں ہے بلکہ ایک فکر اور نظریہ کا ترجمان ہے۔ یہ لفظ جس شخص کے لیے بولا جاتا ہے اس کے بارے میں کہنے والا اپنا یہ نقطہ نظر بیان کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ یا فلاں بزرگ عشق الٰہی کے ذریعہ اپنی ذات سے فانی اور خدا کی ذات سے واصل ہو گئے۔

قرآن پاک اور احادیث میں محبت اور اس کے بعض مترادف مثلاً مَوَدۃ اور خلہ وغیرہ کا ذکر تو آیا ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی ''عشق'' کا ذکر نہیں آیا۔ جس کا سبب یہ ہے کہ محبت اور مَوَدت وغیرہ نہایت پاکیزہ جذبے سے عبارت ہیں جبکہ ''عشق'' نفسانی جذبے کو کہتے ہیں۔ عقیدہ طحاویہ کے شارح علامہ ابن ابی العز نے عشق کو بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی صفت اور اللہ تعالیٰ کے لیے بندوں کی صفت قرار نہ دیے جانے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بتایا ہے کہ عشق ایسی محبت کو کہتے ہیں جو شہوت کے ساتھ کی جائے۔[1] اور امام اللغۃ ابو ہلال عسکری اپنی کتاب "الفروق فی اللغۃ" میں لکھتے ہیں:

''عشق اس شدید خواہش کا نام ہے جو معشوق سے اپنی مراد حاصل کرنے کے لیے عاشق کے دل میں ہوتی ہے''[2]

عشق کے مفہوم اور مزاج کے بارے میں اوپر دو مستند عالموں کے اقوال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ دنیا کا کوئی بھی انسان اپنی محرم عورتوں...... جیسے ماں، بہن، پھوپھی اور خالہ وغیرہا کے حق میں یہ لفظ استعمال نہیں کرتا۔ لیکن تصوف کی پوری عمارت اسی عشق پر قائم ہے اور اس کے وضع کردہ تمام اعمال، کردار، اذکار، مراقبوں اور ریاضتوں کا مقصد اللہ تعالیٰ کا وصال اور اس کی ذات میں فنا ہو جانا ہی ہے۔ صوفیا کے نزدیک دراصل عاشق مرتا نہیں بلکہ واصل ہو جاتا اور پردہ کر لیتا ہے وغیرہ۔

صوفیا اور غیر صوفیا دونوں نبی اکرم ﷺ کی تعریف و توصیف اور فضائل و مناقب کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

نبی مکرم محمد رسول اللہ ﷺ اللہ کے بعد سب سے بڑے اور افضل ہیں اور اسی سلسلے میں درج ذیل مصرع نے ضرب المثل کی شکل اختیار کر لی ہے:

بعد از خدا بزرگ توی قصہ مختصر

---

[1] شرح العقیدۃ الطحاویہ ص ١٦٥ [2] الفروق فی اللغۃ ص: ١١٦

تو کیا ایسا کہنے والوں کے نزدیک (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ بھی مخلوق کی صف میں شامل ہے یا رسول اللہ ﷺ بشریت کے مقام سے بلند ہو کر الوہیت کے درجے پر پہنچ گئے ہیں؟ کیونکہ ایسا حکم ہمیشہ ایسی دو یا اس سے زیادہ چیزوں پر لگایا جاتا ہے جو ایک ہی نوع اور قسم سے تعلق رکھتی ہوں اور ان میں سے ایک دوسری سے افضل ہو۔ تصوف سے متاثر سیرت نگاروں اور مفسرین نے رسول اکرم ﷺ کی حیات پاک کے قبل از بعثت یا نبوت کے مرحلے کو ''ولایت'' سے تعبیر کیا ہے۔ اوپر یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ''ولایت'' صوفیا کی گھڑی ہوئی اصطلاح اور نبوت کے متوازی ہے۔ لیکن اولاً تو قرآن پاک میں ولایت کا ذکر صرف ایک بار آیا ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر نہ کہ اس کے کسی رسول یا مقرب بندے کی صفت کے طور پر۔

ثانیاً: اگر اس کو اللہ تعالیٰ کے کسی مقرب بندے کی صفت قرار دیا جائے تو قرآن پاک میں اولیاء اللہ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان کی روشنی میں ''ولایت'' سے ایمان اور تقویٰ کی صفت مراد ہوگی اور یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ کسی انسان پر مومن اور متقی ہونے کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب وہ مکلّف ہو اور اللہ و رسول کا مطیع ہو۔ اب جہاں تک نبی مکرم ﷺ کے قبل از بعثت یا نبوت کے مرحلے کا تعلق ہے تو اس میں آپ شرعی احکام کے مکلّف نہیں تھے بلکہ ایمان اور احکام کے مجموعے: ''کتاب کے مفہوم تک سے ناواقف تھے۔'' ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوحًا مِنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ ﴾ [الشوری:٥٢]

''اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف ایک روح وحی کی ہے۔ تمہیں کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں؟ لیکن اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ اور یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہو''

قرآن پاک کے اس نہایت صریح، واضح اور دوٹوک اعلان کے بعد سیرت نگاروں اور مفسرین نے صوفیانہ افکار سے متاثر ہو کر نبی کریم ﷺ کے ایمان اور شرائع سابقہ خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے مطابق عبادت کرنے کی جو بات لکھی ہے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ قبل از

بعثت رسول اللہ ﷺ اس شریعت سے نہ صرف یہ کہ واقف تھے بلکہ اس کے مکلّف بھی تھے۔ جبکہ قرآن پاک کی مذکورہ آیت اس کی نفی کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ''بدء الوحی'' کی حدیث میں ''یَتَحَنَّثُ'' کا لفظ آیا ہے جس کی تفسیر امام زہری نے ''یتعبد'' کی ہے۔[1] لیکن اس تعبد کی کوئی بھی تفصیل کسی حدیث میں بیان نہیں ہوئی ہے۔ نہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے کبھی قبل از بعثت غار حراء میں اپنے ''تعبد'' کا ذکر فرمایا اور نہ آپ سے آپ کے کسی صحابی نے اس کے بارے میں کبھی کچھ دریافت کیا۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ مکہ کی مشرکانہ زندگی، مکہ میں ہر طرف پھیلی ہوئی اخلاقی اور معاشرتی برائیوں اور کمزوروں اور بے سہارا لوگوں پر روا رکھے جانے والے ظلم و جور سے نبی مکرم ﷺ کے پاکیزہ دل میں اضطراب اور جو بے چینی پیدا ہوگئی تھی اس پر قابو پانے اور سکون قلب کی خاطر آپ کوئی ایسا عمل انجام دیتے رہے ہوں جس کی تعبیر ام المومنین رضی اللہ عنہا نے ''تَحَنّث'' سے فرمائی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مرحلے میں نبی ﷺ کے احوال و کیفیات کے لیے لفظ ''ضالاً'' کی تعبیر استعمال فرمائی ہے۔ جس کے معانی قرآنی سیاق وسباق اور اس مرحلے میں نبی معظم ﷺ کی کیفیات اور آپ کے ذہنی و قلبی اضطراب کی روشنی میں ناواقفِ راہ، حیران و پریشان، صحیح راہ سے لاعلم وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴾ [الضحی:۷]

''اور کیا اس نے تم کو ناواقفِ راہ نہ پایا پس راہ دکھائی''

لیکن یہ سب کچھ صرف دین وشریعت کے حوالہ سے تھا جس کو انسان خود نہیں معلوم کرسکتا، چاہے وہ آگے چل کر کوئی بہت بڑا نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہونے والا ہو۔ لیکن اس مرحلے میں رسول اکرم ﷺ کی حیات پاک شرک اور بت پرستی سے بالکل پاک تھی اور بچپن سے لے کر منصب نبوت و رسالت سے سرفراز کیے جانے تک آپ جاہلیت کے اعمال، رسوم اور طور طریقوں سے ہمیشہ دور رہے۔

اسی طرح رسول اکرم ﷺ قبل از بعثت کے زمانے میں بھی فضائل اخلاق کی سب سے بلند چوٹی پر فائز تھے اور تمام انسانی کمالات سے متصف تھے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول محمد بن عبد اللہ ﷺ کے اخلاقی فضائل اور انسانی کمالات کی فہرست بیان کرنے کی بجائے ان کو ایسے معانی سے پُر ایک فقرے میں بیان فرما دیا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری/ ح: ٦٩٨٢

﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ [القلم:٤]

''اور اے نبی، بے شک تم خلق عظیم پر فائز ہو''

اس قرآنی شہادت کے علاوہ نبی اکرم ﷺ پر پہلی وحی کے نزول کے موقع پر خوف اور گھبراہٹ دور کرنے اور اندیشوں کے اثرات کم کرنے کے لیے آپ کی غمگسار اور وفا شعار رفیقہ حیات ام المومنین سیّدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے خود آپ سے آپ کے جو اوصاف حمیدہ بیان فرمائے ان میں سے ہر وصف بجائے خود مکمل ایک کتاب کا عنوان بن سکتا ہے۔

لیکن اہل تصوف نے بعثت سے متصل قبل والے زمانے میں نبی اکرم ﷺ کی غار حرا میں خلوت گزینی اور کئی کئی راتیں نامعلوم عبادت میں گزارنے کو جو اہمیت دی ہے اور اس سے اپنی ذہنی وفکری اور بدنی ریاضتوں اور مراقبوں، نیز انسانی آبادیوں سے دور جا کر گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر ذکر وفکر کی صحت پر جو استدلال کیا ہے اور کرتے ہیں وہ چند وجوہ سے ان کے حق میں نہیں بلکہ ان کے خلاف ہے۔

۱...... نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے اس مرحلے کا کوئی بھی عمل امت کے کسی بھی فرد کے لیے شرعی نمونۂ عمل نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس وقت تک آپ نبوت و رسالت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے ورنہ کتاب وسنت میں اس کو بیان کیا جاتا۔

۲...... نبی مکرم ﷺ کو ملنے والی نبوت غار حرا میں آپ کی عبادت و ریاضت کا نتیجہ نہیں بلکہ عطیہ الٰہی تھی۔

۳...... کوئی شخص اپنے خود ساختہ مراقبوں، روحانی ریاضتوں اور ذکر وفکر کے ذریعہ کوئی طریقۂ رشد و ہدایت نہیں معلوم کرسکتا۔

۴...... اسلامی شریعت کے دائرے سے باہر رہ کر نہ کوئی ذکر وفکر، روحانی ریاضت اور تزکیۂ نفس علم و معرفت پر منتج ہوسکتا ہے اور نہ عند اللہ مقبول ہے۔

بعثت سے قبل رسول اکرم ﷺ کے کسی طرح کا علم و معرفت نہ رکھنے، طریق رشد و ہدایت نہ جاننے، ایمان اور کتاب کے مفہوم سے ناواقف ہونے میں آپ کی تنقیص قطعاً نہیں ہے۔ کیونکہ آپ تمام سابق انبیاء اور رسولوں کی طرح بشر تھے اور کوئی بھی بشر ماں کے پیٹ سے علم و معرفت کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی قدر ہے:

﴿ وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ [النحل:٧٨]

''اور اللہ نے تم لوگوں کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنا دیے تا کہ تم شکر ادا کرو''

صرف یہی نہیں کہ دین و شریعت اور ایمان و کتب آسمانی سے متعلق نبی ﷺ کو نبوت سے قبل کوئی علم حاصل نہیں تھا بلکہ پہلی وحی الٰہی کے نزول سے چند لمحے پہلے تک آپ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ آپ اس دین فطرت پر تو بلا شبہ قائم تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے اور شرک سے آپ کی ذات اطہر یکسر پاک تھی مگر آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ نبوت کیا ہے اور نبی کیا ہوتا ہے؟ اسی وجہ سے پہلی بار حضرت جبریل علیہ السلام کی غار حرا میں آمد اور سورہ العلق کی ابتدائی آیات کے نزول کے موقع پر آپ گھبرا گئے۔ جیسا کہ ''بدء الوحی'' کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

عربی زبان میں متکلم کے سوا مخاطب اور غائب کے لیے ضمائر تعظیمی نہیں ہیں۔ یعنی اگر بذریعہ ضمیر کسی غیر موجود فرد واحد کا ذکر کیا جائے یا مخاطب کا تو اس کے لیے ضمیر واحد ہی استعمال ہوتی ہے چاہے اس سے مراد کوئی بڑا انسان ہو یا چھوٹا۔ البتہ متکلم کے لیے ضمیر تعظیمی کا استعمال عربی زبان میں پہلے ہی سے ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن پاک جو قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے متعدد مقامات پر جمع متکلم کی ضمیر منفصل ''نَحْنُ''..... ہم۔ اور افعال کے ساتھ ضمیر متصل، جیسے خَلَقْنَا..... ہم نے پیدا کیا۔ دونوں صورتوں میں استعمال کی ہے جو واحد متکلم کے لیے ضمیر تعظیمی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ واحد اور احد یعنی ایک اور یکتا ہے۔

لیکن اردو زبان میں جس طرح واحد متکلم کے لیے ضمیر تعظیمی ''ہم'' ہے اسی طرح واحد غائب اور واحد مخاطب کے لیے ''آپ'' ہے۔ غائب اور مخاطب کے لیے ضمیر تعظیمی اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب مخاطب اور غائب عمر، علم و فضل اور مرتبہ و منصب میں کہنے والے سے بڑا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق اور رب ہے کہ جس میں انسان، جن اور فرشتے نیز دوسری تمام مخلوقات اور اشیا شامل ہیں۔ انسانوں میں اس کے محبوب اور مقرب بندے اس کے نبی اور رسول ہیں۔ ان نبیوں اور رسولوں میں محمد عربی ﷺ اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ محبوب اور مقرب بندے ہیں۔

یہ بات تو عقلاً اور شرعاً صحیح اور مناسب اور قرین قیاس ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کی عموماً اور رسول اکرم ﷺ کی خصوصاً تکریم فرمائے۔ ان پر انعام و اکرام کی بارش کرے اور ان پر اس کی نظر عنایت زیادہ ہو۔ مگر اس کی ذات مقدس کہ جس کا کوئی ہم مثل اور ہم رتبہ نہیں ہے اس سے بہت بلند و برتر

ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کی تعظیم اور اس کا ادب واحترام کرے۔

بلاشبہ رسول اکرم ﷺ سید البشر اور افضل الرسل ہیں۔ آپ کی ذات پاک تمام مسلمانوں کے نزدیک نہایت ہی قابل احترام، قابل تعظیم اور قابل ادب ہے اور آپ سے جان و مال اور آل و اولاد سے زیادہ محبت کرنا صحت ایمان کی شرط ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور الوہیت میں آپ کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ قرآن پاک از اول تا آخر اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے اپنے آخری رسول اور نبی محمد بن عبد اللہ ﷺ پر نازل فرمایا ہے تا کہ آپ اس کو لوگوں کو تک پہنچا دیں اور خود اس پر عمل کر کے اس کی عملی تفسیر پیش کر دیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے اور رسول ﷺ کو بہت سے مقامات پر مخاطب بھی کیا ہے اور آپ کو جہاں بہت سی باتوں پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے وہیں بہت سی باتوں کے کرنے سے منع بھی فرمایا ہے۔

اگر کسی کو کسی چیز کا حکم دیا جائے تو اس کے لیے فعل ''امر'' استعمال کیا جاتا ہے اور اگر کسی کو کسی چیز سے روکا جائے تو اس کے لیے فعل ''نہی'' استعمال کیا جاتا ہے۔

فعل امر اور نہی اس وقت ''حکم'' اور ''فرمان'' کے معنی دیتا ہے جب اس کا صدور بڑے کی طرف سے چھوٹے کے لیے ہو۔ لیکن اگر کوئی اپنے بڑے سے فعل امر اور نہی کے ذریعہ کوئی چیز طلب کرے تو اس کو درخواست، التماس یا گزارش کہتے ہیں۔ چونکہ عربی زبان میں فعل امر و نہی کے صیغے بڑے سے چھوٹے اور چھوٹے سے بڑے کے لیے ایک ہی طرح کے ہیں اس لیے مخاطب اور مخاطب کے رتبہ و مقام کے اعتبار سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کہاں حکم ہے اور کہاں درخواست۔

لیکن اردو زبان میں دونوں صورتوں کے لیے الگ الگ تعبیرات ہیں۔ مثلاً اگر باپ اپنے بیٹے سے، استاد اپنے شاگرد سے، مالک اپنے غلام سے اور حاکم اپنے ماتحت سے کچھ طلب کرے، کوئی کام کرنے کو کہے یا کسی کام سے روکے تو اس کی یہ طلب حکم اور فرمان کا درجہ رکھتی ہے۔ جیسے سچ بولو، جھوٹ مت بولو۔ اور اگر کوئی چھوٹا اپنے بڑے سے کوئی چیز طلب کرے تو یہ درخواست، التماس اور گزارش ہے۔ جیسے میری مدد فرمایے۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھے محروم نہ کیجیے اور مجھے اجازت دیجیے وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کے حق میں ہمارا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ وہ ہمارا خالق و مالک اور رب ہے۔ ہم سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ عموماً اور اپنے آخری نبی محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ خصوصاً اپنے بندوں کو جو احکام دیے ہیں وہ انہی کے فائدے کے لیے ہیں۔ بندوں کے ان پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ تو کیا اس عقیدہ اور ایمان

کی روشنی میں یہ بات صحیح ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے قطع نظر اس کے کہ اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے، کوئی درخواست کرے یا اس سے کوئی التماس کرے؟ کیونکہ کسی سے کوئی اس وقت درخواست اور التماس کرتا ہے جب وہ اس کا محتاج ہو اور اللہ تعالیٰ کی ذات تو اس سے منزہ اور پاک ہے۔

لیکن گزشتہ تیس چالیس برسوں میں قرآن پاک کے جو اردو ترجمے شائع ہوئے ہیں ان میں ''امر و نہی'' کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے اور رسول ﷺ کی تعظیم اور آپ سے درخواست اور التماس کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ المائدہ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ يَآأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط ﴾ [المائدہ:٦٧]

''اے رسول! پہنچا دیجیے جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو نہیں پہنچایا آپ نے اس کا پیغام......''

واضح رہے کہ یہ قرآن پاک کی نہایت ہی اہم آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو یہ حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا جو کلام نازل فرمائے آپ اس کو لوگوں تک پہنچاتے رہیں۔ جبکہ آیت کا ترجمہ یہ بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حکم نہیں دیا ہے بلکہ آپ سے درخواست کی ہے کہ آپ ایسا کریں۔ اس طرح کے صیغوں سے قرآن پاک کے مترجم نسخے بھرے ہوئے ہیں۔

واضح رہے کہ قرآن پاک کا ترجمہ لفظاً تو قرآن نہیں ہے لیکن معناً اور حکماً قرآن ہی ہے۔ لہٰذا کسی بھی زبان میں اس کا ترجمہ کرنے والے کو یہ بات اپنے ذہن میں تازہ رکھنی چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو جیسا کچھ وہ ہے ترجمہ کی زبان میں منتقل کر رہا ہے۔ اس ترجمہ میں اپنی طرف سے کوئی حذف یا اضافہ کرنا یا انداز تخاطب کو تبدیل کرنا کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے۔ اگر مترجم اپنی طرف سے تفسیر و توضیح کے طور پر کچھ کہنا چاہتا ہے تو اس کا اظہار وہ تفسیری نوٹ میں کرے۔ چونکہ تفسیر و توضیح اس کے اپنے کلام اور اپنی تعبیر سے عبارت ہوتی ہے اس لیے وہ اس میں شرع کے دائرے میں رہتے ہوئے جو اسلوب چاہے اختیار کر سکتا ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کا عموماً اور اپنے آخری رسول اور نبی محمد ﷺ کا ذکر خصوصاً القاب کے بغیر کیا ہے، لیکن جدید اردو ترجموں میں انبیاء کے ناموں سے پہلے بریکٹ میں ''حضرت'' اور ناموں کے بعد بریکٹ میں ''علیہم السلام، اور ''صلی اللہ علیہ وسلم'' لکھنے کا التزام کیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض شخصیتوں کے ناموں سے پہلے بھی بریکٹ میں ''حضرت'' کا اضافہ کیا

گیا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ حضرت مریم کے نام سے پہلے ''پاکباز بی بی'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر یہ اضافے ترجمہ میں بریکٹ کے اندر نہ لکھے جاتے تو ترجمہ میں خیانت شمار ہوتے، لیکن بریکٹ کے اندر لکھنے سے یہ ''استدراک'' میں شمار ہوتے ہیں۔ استدراک کے معنی ہیں گرفت کرنا اور تصحیح کرنا۔ گویا مترجم نے اللہ تعالیٰ کے کلام میں تصحیح کی ہے۔ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں کا احترام وادب ملحوظ نہ رکھا اس لیے مترجم نے تصحیح کر کے یہ کمی پوری کر دی اور اس کا تدارک کر دیا!!

ابھی میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ قرآن پاک کے ایسے ترجموں کے بارے میں تھا جن کا تصوف کے اسکول سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اس سے ان ہمہ جہت اور ہمہ گیر اثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو ''فکر صوفی'' نے مسلمانوں کے مختلف طبقوں پر ڈالے ہیں۔ یہاں تک کہ بظاہر تصوف کا مخالف مترجم قرآن بھی اللہ تعالیٰ کے کلام کا ترجمہ کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی عظمت کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے اور ہوا کا رخ دیکھ کر ترجمہ کرتا یا تفسیر لکھتا ہے۔

یہ چند نہایت اہم اور ناگزیر باتیں تھیں جو قدرے تفصیل سے عرض کی گئی ہیں، جن کا مطالعہ نہ صرف اس کتاب کے اصل مباحث کے مطالعہ سے قبل ان شاء اللہ تعالیٰ مفید ثابت ہوگا بلکہ یہ باتیں سیرت، فضائل اعمال، فضائل ومناقب اور تصوف کی کتابوں کے مطالعہ سے پہلے بھی مفید ہوں گی اور ان کی روشنی میں موجودہ دور میں کیے جانے والے قرآنی ترجموں اور تفسیری حواشی میں عقائدی غلطیوں کو معلوم بھی کیا جا سکے گا۔

چونکہ تصوف سے کسی نہ کسی شکل میں وابستہ مسلمانوں کی اکثریت وہ فکر وعقیدہ نہیں رکھتی جو ہر دور میں ''حقیقی'' صوفیا کا رہا ہے۔ بلکہ وہ صرف ظاہری اعمال میں یا بعض بدعتوں کے حوالہ سے تصوف سے نسبت رکھتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ یہ مقدمہ اور پھر یہ کتاب ان کے لیے صحیح اسلامی عقیدہ معلوم کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

کتاب کی یہ دوسری جلد چار ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول: غیبیات — باب دوم: قصص الانبیاء

باب سوم: حج اور زیارت مدینہ — باب چہارم: معاشرت

ہر باب کے تحت جتنے ذیلی مسائل زیر بحث آئے ہیں اور ان کے بارے میں موضوع اور منکر روایتوں سے تعرض کیا گیا ہے، پہلے ان کے بارے میں پوری تفصیل سے اسلامی نقطہ نظر واضح کر دیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ کتاب وسنت سے باہر دلائل نہ دیے جائیں۔ اس لیے زیر بحث مسائل اور امور

کے بارے میں ائمہ اور علماء کے اقوال سے بہت کم استدلال ملے گا۔ انتہائی ناگزیر حالت میں کسی اسلامی عقیدے کی تائید یا توضیح کے موقع پر کسی اہل علم کا قول نقل کیا گیا ہے۔ اور ہر مسئلے کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ اس پر کسی بھی مسلک کی چھاپ نظر نہیں آئے گی۔ کسی بھی عقیدے اور فکر کی تنقید کرتے ہوئے کسی بھی شخصیت کی تجریح اور تشہیر سے گریز کیا گیا ہے۔ اور ہر عالم کا ذکر ادب واحترام سے کیا گیا ہے۔

روایات کی صحت وسقم معلوم کرنے کا ذریعہ صرف ''علم الرجال'' کی کتابیں ہیں۔ اس لیے کوشش کی گئی ہے کہ کسی بھی روایت کی صحت وسقم کو ثابت کرنے کے لیے یا کسی راوی کو ثقہ یا مجروح دکھانے کے لیے صرف ان ائمہ فن کے اقوال نقل کیے جائیں جو اس میدان میں مستند مانے جاتے ہیں اور جن کا علم و فضل اور نزاہت و دیانتداری متفق علیہ ہے۔

اس جلد میں سارے حوالے حاشیہ میں منتقل کر دیے گئے ہیں تاکہ مطالعہ کے دوران تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ صحیح احادیث کی سند نقل کرنے کی بجائے صرف حدیث کا متن، حدیث کے راوی صحابی اور حدیث کے ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ رہیں موضوع اور منکر روایات تو اولاً ان کی سندوں کو مختصر کر دیا گیا ہے۔ ثانیاً صرف ان کا ترجمہ دیا گیا ہے تاکہ اردو قارئین اکتاہٹ محسوس نہ کریں۔ رہے اہل علم تو وہ حاشیہ میں مذکور حوالوں سے ان کتابوں تک پہنچ سکتے ہیں جن سے یہ روایتیں لی گئی ہیں۔

نہایت افسوس ناک بات ہے کہ اس امت میں عقائدی بگاڑ تصوف کی راہ سے آیا ہے۔ قرآن پاک کی من مانی اور باطنی تفسیر کے بانی بھی اہل تصوف ہیں۔ ذکر واذکار اور طہارت و ریاضت کے من گھڑت اور خود ساختہ طریقوں کو بھی امت کے افراد میں انہوں نے متعارف کرایا ہے۔ اس کے بعد دعویٰ یہ ہے کہ حقیقی اسلام تصوف ہی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کتاب کے مباحث سے اس دعویٰ کی قلعی کھل جائے گی۔

اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمے میں مکتبہ بیت السلام کے مالک محترم جناب حافظ عابد الٰہی ظہیر صاحب حفظہ اللہ کا ذکر خیر آ چکا ہے اور جیسا کہ میں اس میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ کتاب کی کمپوزنگ تک ذاتی طور پر میں ان سے واقف نہیں تھا۔ کتاب کی کمپوزنگ کے بعد ان سے چند منٹ کی ملاقات رہی۔ اسی طرح میری فطری کم آمیزی اور تصنیف و تالیف کے میدان میں غیر معروف ہونے کی وجہ سے محترم جناب حافظ عابد الٰہی صاحب بھی میرے بارے میں خاطر خواہ واقفیت نہیں رکھتے رہے ہوں گے۔ اس کے باوجود انہوں نے نہ صرف یہ کہ یہ ایڈونچر (Adventure) لیا اور انجام سے بے پروا ہو کر کتاب شائع کرنے پر تیار ہو گئے بلکہ میری خواہش کے مطابق انہوں نے اسے نہایت اعلیٰ پیمانے پر اور فن طباعت کے عصری تقاضوں کے

مطابق شائع کیا اور کاغذ بھی نہایت عمدہ استعمال کیا جس کی وجہ سے کتاب بہت دیدہ زیب اور جاذب نظر ہوگئی۔ اس سے محترم جناب حافظ عابد الٰہی صاحب کی نیک نیتی، اخلاص اور خیر کی اشاعت میں تعاون کا بھر پور جذبہ عیاں ہوتا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ موصوف کے اس جذبہ خیر کو قبول فرمائے اور دنیاوآخرت دونوں کی بھلائیوں سے انہیں ہم کنار رکھے اور ہمارے اس تعلق کو پائدار بنائے۔ آمین

حافظ صاحب کتاب کی یہ دوسری جلد بھی اپنے مکتبہ سے شائع کر رہے ہیں جس پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔ جدہ، سعودی عرب میں مقیم محترم جناب مولانا مختار احمد عثمانی صاحب مشہور داعی الی اللہ ہیں۔ وہ موجودہ پرفتن دور میں دعوت دین کی نزاکتوں سے واقف ہیں اور اسلام کے منہجِ اعتدال پر چلتے ہوئے لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے ہیں اور مسلکی تعصب سے دور رہ کر اسلام سے نسبت رکھنے والے ہر طبقہ فکر کے لوگوں میں حق کی آواز بلند کر رہے ہیں۔ آپ نے اس کتاب کی پہلی جلد کی اشاعت کے بعد اسے لوگوں میں پھیلانے اور عام کرنے کے لیے اپنے وقت اور پیسوں کی جو قربانی دی ہے اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور ان کو اور ان کے جملہ اہل خانہ کو اپنی عنایتوں اور برکتوں سے ہمیشہ نوازتا رہے۔ اپنے علم وفضل اور حب خیر میں راقم سے برتر ہونے کے باوجود اس سے ان کو جو تعلقِ خاطر ہے اس کو سدا بہار رکھے آمین۔

کتاب کی اس دوسری جلد کے لیے میرے بڑے بھائی، محسن اور مربّی ڈاکٹر محمد شعیب نگرامی حفظہ اللہ نے از راہ عنایت جو ''پیش لفظ'' تحریر فرمایا ہے اس پر میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ مجھے اور میری اس کاوش کو ان کی تعریفوں کا حقیقی مظہر بنائے۔

اللہ تعالیٰ سے اس بات کے لیے بھی دعا گو اور ملتجی ہوں کہ وہ اس کتاب کی پہلی جلد کی طرح اس دوسری جلد کو بھی قبولیت عام سے نوازے اور یہ اسلام سے نسبت کا دعویٰ کرنے والوں کے عقائد کی اصلاح میں مؤثر ثابت ہو۔ یہ کتاب اگر حسن بیان سے خالی ہے تو ان شاء اللہ تعالیٰ حسن اخلاص سے مملو ملے گی۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اس کو میرے صالح اعمال میں شامل کر لے۔

اِنّہ تعالیٰ سمیعٌ مُجیبٌ وَصَلّی اللّٰہ علٰی رسولنا وحبیبنا محمد وعلی آلہ وصحابتہ وبارك وسلم

سید سعید احسن عابدی

۹/ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ

جدّہ۔ مملکتِ عربیہ سعودیہ

باب اول

غیبیات

آغاز آفرینش:

بدء الخلق یعنی آغاز آفرینش، عرش الٰہی، آسمان و زمین، لوح و قلم، شمس و قمر، اور جنت و جہنم کی تخلیق، جنوں اور انسانوں کی پیدائش، فرشتوں کی حقیقت اور نبی آخر الزمان محمد بن عبد اللہ ﷺ سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء، رسولوں اور ان کی قوموں کے واقعات اور اس طرح کے بے شمار امور کا تعلق غیبیات سے ہے۔ غیب کے لغوی معنی ہیں: مخفی اور پوشیدہ۔ یعنی جو چیز ہماری نگاہوں سے اوجھل اور ہمارے دائرہ معلومات سے باہر ہے وہ غیب ہے۔ یہ غیب کے لغوی معنی ہیں۔ دینی اصطلاح میں غیب سے مراد ہر وہ مخفی اور پوشیدہ چیز ہے جس تک ذرائع معلومات کی رسائی نہ ہو۔ رہیں وہ مخفی اور پوشیدہ چیزیں جن کی حقیقت انسان علمی ذرائع اور وسائل کے ذریعہ حاصل کرتا ہے وہ غیب نہیں ہیں۔

اوپر جن غیبی امور کا ذکر آیا ہے ان کا تعلق ماضی سے ہے اسی طرح اس دنیا کے بعد آخرت میں حشر ونشر، حساب و کتاب اور جزاء و سزا کا تعلق بھی غیبی امور سے ہے جن کا علم صرف اللہ کو ہے۔ اور ان میں سے بعض امور کا جو علم نبی ﷺ اور دوسرے انبیاء کو حاصل تھا وہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے حاصل تھا۔

اس تناظر میں غیبی امور کے بارے میں صرف وہی معلومات صحیح اور قابل اعتماد ہیں جن کی صراحت قرآن پاک میں یا ان حدیثوں میں کر دی گئی ہے جن کی نسبت نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے۔ رہے دوسرے ذرائع معلومات، جیسے: آثار صحابہ اور تابعین کے اقوال؟ تو وہ صرف ان امور کے بارے میں قابل اعتبار ہیں جن کی قرآن پاک اور صحیح مرفوع احادیث میں کوئی اصل ہو۔ یہ آثار صحابہ اور تابعین کے اقوال صرف تفصیلِ مزید کا درجہ رکھتے ہوں۔

رہیں اسرائیلی روایات تو ائمہ حدیث نے تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں ان سے استدلال کے لیے چند اصول وضوابط وضع کرا دیے ہیں جن کی پابندی ضروری ہے۔

اہل کتاب کے صحیفوں سے استدلال کے اصول وضوابط:

(۱) اہل کتاب کے صحیفوں میں درج جو باتیں اسلامی عقیدے کے خلاف نہیں ہیں، عصمت انبیاء کے منافی نہیں ہیں اور کتاب وسنت کی صریح تعلیمات کے خلاف نہیں ہیں، بلکہ عام واقعات کے قبیل سے یا ایسے واقعات کی تفصیلات سے عبارت ہیں جو کتاب وسنت میں کسی نہ کسی شکل میں مذکور ہیں ان کو بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

(۲) اہل کتاب کے صحیفوں میں مذکور جن باتوں کی کتاب وسنت کے بیان سے تصدیق ہوتی ہو ان کے ذکر میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

(۳) اہل کتاب کی جو مرویات عقیدۂ توحید کے منافی ہیں اور جن سے عصمت انبیاء پر زد پڑتی ہے ان کو بیان کرنا حرام ہے الا یہ کہ واضح کر دیا جائے: یہ اسرائیلی روایات ہیں۔

(۴) جو باتیں عام ہیں اور جن کا اسلامی شریعت میں کوئی ذکر نہیں آیا ہے تو ایسی باتوں کی نہ تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب۔

(۵) کوئی ایسی بات جو نبی اکرم ﷺ نے نہیں فرمائی ہے اور جس کی نسبت آپ سے بذریعہ صحیح سند ثابت نہیں ہے اس کو نبی ﷺ کی نسبت سے بیان کرنا حرام اور اس کی سزا جہنم ہے۔

تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں اسرائیلی روایات کے ذکر سے متعلق اوپر جو اصول وضوابط بیان کیے گئے ہیں۔ وہ نبی اکرم ﷺ کے درج ذیل ارشادات سے ماخوذ ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

((بَلِّغُوْا عَنِّي وَلَوْ آيَةً وَحَدِّثُوْا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيْلَ وَلَا حَرَجَ۔ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ))

''اگر تم کو ایک آیت کے بقدر بھی میری کوئی حدیث معلوم تو اس کو پہنچا دو اور بنو اسرائیل کے حوالہ سے واقعات بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جو کوئی جان بوجھ کر میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔''[1]

ایک دوسری حدیث میں رسول اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] صحیح بخاری حدیث نمبر، ۳٤٦١

((لاَ تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ وَ﴿ قُوْلُوْا: آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا ﴾))

''اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب۔ اور (قرآن کے موجب) کہو: ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے۔''[1]

واضح رہے کہ جب تک اسلامی تعلیمات ذہن و دماغ میں پوری طرح راسخ نہیں ہوئی تھیں تو رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو اہل کتاب کے صحیفے پڑھنے سے منع فرما رکھا تھا، تاکہ ان کے دماغوں میں قرآن پاک اور تورات کے معانی خلط ملط نہ ہوں۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ہم یہودیوں سے بعض ایسی باتیں سنتے ہیں جو ہمیں پسند آتی ہیں۔ تو آپ کا کیا خیال ہے، کیا ہم ان میں سے بعض باتیں لکھ لیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أَمُتَهَوِّكُوْنَ اَنْتُمْ كَمَا تَهَوَّكَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى، لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً وَلَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهُ إِلَّا إِتِّبَاعِي))

''کیا تمہیں بھی اسی طرح حیرانی اور تذبذب ہے جس طرح یہود و نصاریٰ کو حیرانی اور تذبذب تھا۔ میں تو اسلامی شریعت تمہارے پاس نہایت روشن اور ہر نقص و عیب سے پاک لایا ہوں۔ اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔''[2]

اور سنن دارمی میں ہے:

((وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ بَدَالَكُمْ مُوْسٰى فَاتَّبَعْتُمُوْهُ وَتَرَكْتُمُوْنِيْ لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيْلِ وَلَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا وَأَدْرَكَ نُبُوَّتِي لَاتَّبَعَنِي))

''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے اگر موسیٰ تمہارے سامنے ظاہر ہو جائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی اتباع کرنے لگو تو تم صحیح راہ سے بھٹک جاؤ گے۔ اور اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور ان کو میری نبوت کا زمانہ ملتا تو وہ ضرور میری اتباع کرتے۔''[3]

---

[1] صحیح بخاری حدیث نمبر ۴۴۸۵، ۷۳۶۲، ۷۵۴۲

[2] مسند احمد حدیث نمبر ۱۵۲۲۳ اور شعب الایمان بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح حدیث نمبر: ۱۷۷

[3] سنن الدارمی حدیث نمبر ۴۳۹

تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں بدء الخلق یعنی آغاز آفرینش سے متعلق اور سابق انبیاء اور رسولوں کے بارے میں اسرائیلی روایات جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے منسوب ہیں ان میں حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابی بن کعب اور حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہم کے نام سرفہرست ہیں۔ اس طرح کی روایات حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم سے بھی منسوب ہیں۔ لیکن اول الذکر کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ جو روایات اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں، ان سے ان کی نسبت صحیح نہیں اگرچہ تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں عام ہیں۔ البتہ کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ جن کا نام اور نسب کعب بن مانع بن عمرو بن قیس ہے تو وہ صحابی نہیں بلکہ تابعی تھے[1] اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اسلام لائے تھے۔ چونکہ ان کا تعلق یمن کے یہودی علماء سے تھا اور اپنے علم وفضل کی وجہ سے کعب الحبر یا کعب الاحبار کے لقب سے مشہور تھے۔ اس لیے اسرائیلی روایات ان سے زیادہ منسوب ہیں۔ اگرچہ وہ ثقہ تھے، پھر بھی ان سے منسوب روایتوں کو روایت ودرایت کی کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول نہیں کرنا چاہیے۔

جہاں تک حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا تعلق ہے تو چونکہ فہم قرآن میں ان کو ممتاز اور بلند درجہ و مقام حاصل تھا، اس لیے تفسیری روایات ان سے بہت زیادہ منسوب ہیں۔ حتیٰ کہ بہت سی قرآنی آیات کی متضاد تفسیریں بھی ان کے حوالہ سے نقل کردی گئی ہیں جن کی نسبت ایسے جلیل القدر صحابی سے صحیح نہیں ہوسکتی۔ جس کا لقب بجا طور پر ''ترجمان القرآن'' تھا اور جن کے فہم قرآن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی دعا فرمائی تھی۔ چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول قرین حقیقت ہے کہ:

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منسوب صرف سو روایتیں صحیح ہیں''[2]

تابعین میں جن لوگوں کو اسرائیلی روایات بیان کرنے میں شہرت حاصل تھی ان میں سرفہرست ابوعبد اللہ وہب بن منبہ متوفی ۱۱۰ھ اور عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج متوفی ۱۵۰ھ ہیں۔

تفسیر کی کتابوں میں صحیح احادیث کے علاوہ حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے جو تفسیری روایات منقول ہیں ان میں سے بیشتر روایات صحیح نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر:

(۱) جو روایات اسماعیل بن عبدالرحمٰن السدّی نے ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہیں وہ اسباط بن نصر کے طریق سے مروی ہیں اور اسباط بن نصر کی ثقاہت پر ائمہ حدیث کا اتفاق نہیں تھا۔

---

[1] فتح الباری/ ص: ۳۲۸۷ ج:۳ [2] دیکھئے: الاتقان/ ص ۴۷۲ ج:۲

اگرچہ یہ روایتیں سفیان ثوری اور شعبہ بن حجاج جیسے ائمہ حدیث کے ذریعہ منقول ہیں۔

(۲) مقاتل بن سلیمان کے طریق سے جو تفسیری روایات منقول ہیں وہ بھی مردود ہیں کیونکہ ائمہ حدیث نے اس کو کذاب بتایا ہے۔

(۳) عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے جو تفسیری روایات محمد بن سائب کلبی کے طریق سے مروی ہیں وہ بھی باطل ہیں۔ کیونکہ اس پر کذب بیانی اور رافضیت کا الزام تھا۔ الثعلبی اور الواحدی کی تفسیروں میں اس کی روایات بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ تفسیر کی کتابوں میں منقول کسی بھی روایت کو اس وقت تک قبول نہیں کرنا چاہیے اور نہ اس سے استدلال کرنا چاہیے جب تک کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یا صحابہ کرام سے صحیح سند کے ذریعہ اس کی نسبت ثابت نہ ہو۔ سوائے ان حدیثوں کے جو صحیحین میں مروی ہیں یا حدیث کی دوسری مستند کتابوں میں منقول ہیں اور ان کو کسی ماہر فن حدیث نے صحیح قرار دیا ہو۔ تفسیر کی مشہور کتابوں میں کسی روایت کا منقول ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ روایت صحیح ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا:

متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا۔ چنانچہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((اِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى الْقَلَمُ، ثُمَّ قَالَ: اُكْتُبْ، فَجَرَى فِي تِلْكَ السَّاعَةِ بِمَا هُوَ كَائِنٌ اِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ))

"اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو پہلی چیز پیدا کی وہ قلم ہے۔ پھر فرمایا: لکھ۔ تو وہ اسی گھڑی قیامت تک پیدا ہونے والی تمام چیزوں کو لکھنے کے لیے چل پڑی۔"[1]

سنن ترمذی میں یہ حدیث ان الفاظ میں مروی ہے:

((اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمُ، فَقَالَ: اُكْتُبْ، قَالَ: مَا أَكْتُبُ قَالَ: اُكْتُبِ الْقَدَرَ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ اِلَى الْأَبَدِ))

---

[1] مسند امام احمد حدیث نمبر ۲۳۰۸۱

''درحقیقت پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی وہ قلم ہے۔ فرمایا: لکھ۔ اس نے عرض کیا: کیا لکھوں؟ فرمایا تقدیر لکھ: جو ہو چکا اور ابد تک جو ہونے والا ہے۔''[1]

اسی طرح کی ایک حدیث حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں مروی ہے، کہتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَوَّلَ شَيْءٍ خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالَى الْقَلَمُ ، فَأَمَرَهُ ، فَكَتَبَ كُلَّ شَيْءٍ يَكُوْنُ))

''پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی قلم ہے۔ اور اس کو حکم دیا کہ وہ آئندہ ہونے والی ہر چیز کو لکھے۔''[2]

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالَى الْقَلَمُ: فَأَخَذَهُ بِيَمِيْنِهِ ، وَكِلْتَا يَدَيْهِ يَمِيْنٌ ، قَالَ: فَكَتَبَ الدُّنْيَا وَمَا يَكُوْنُ فِيْهَا مِنْ عَمَلٍ مَعْمُوْلٍ بِرٍّ اَوْ فُجُوْرٍ ، رَطْبٍ أَوْ يَابِسٍ ، فَأَحْصَاهُ عِنْدَهُ فِي الذِّكْرِ ، فَقَالَ: اِقْرَأُوا مَا شِئْتُمْ: ﴿ هٰذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ط اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ o ﴾ فَهَلْ تَكُوْنُ النُّسْخَةُ إِلَّا مِنْ شَيْءٍ قَدْ فَرَغَ مِنْهُ))

''پہلی چیز جو تعالیٰ نے پیدا کی قلم ہے۔ اس نے اس کو اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑا اور اس کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس نے دنیا اور اس میں ہونے والے نیک اور برے اعمال لکھے، تر اور خشک چیزیں لکھیں اور اس نے اپنے پاس موجود تمام چیزوں کو شمار کر ڈالا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ چاہو تو (قرآن میں) پڑھ لو: یہ ہے ہمارا تیار کرایا ہوا نامہ اعمال جو تمہارے اوپر ٹھیک ٹھیک شہادت دے رہا ہے، جو کچھ بھی تم کرتے تھے اسے ہم لکھواتے جا رہے تھے[3] اور کیا نسخہ اور کاپی صرف اسی چیز کی نہیں ہوتی جو

[1] جامع حدیث نمبر ۲۱۵۵

[2] الاسماء والصفات الحدیث ۸۰۳۔ السنن الکبری ص ۹ ج۳۔ مسند ابویعلی ص ۱۲۶، ج۱، کتاب السنۃ ص ۵۰، ج۱، حدیث نمبر: ۱۰۸

[3] سورۃ الجاثیہ آیت: ۲۹

پوری کر لی گئی۔"[1]

اوپر نقل کردہ صحیح حدیثوں سے بصراحت یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کی تخلیق فرمائی۔ البتہ صحیح بخاری میں مروی ایک حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت آسمان و زمین کی تخلیق فرمائی تو اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔ چنانچہ حضرت عمران ابن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْئٌ قَبْلَهُ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ، ثُمَّ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ وَكَتَبَ فِي الذِّكْرِ كُلَّ شَيْئٍ))

"اللہ تعالیٰ تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ذکر (لوح محفوظ) میں ہر چیز لکھی۔"[2]

اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے جو حدیث مروی ہے اس کے الفاظ ہیں:

((كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ، قَالَ: وَعَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ))

"اللہ نے مخلوقات کی تقدیریں آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے لکھیں آپ نے فرمایا: اور اس کا عرش پانی پر تھا۔"[3]

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی مذکورہ حدیثوں سے یہ بات تو بصراحت معلوم ہو رہی ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق عرش اور پانی کی تخلیق کے بہت بعد میں ہوئی، مگر یہ حدیثیں اس امر میں صریح نہیں ہیں کہ عرش اور پانی کی تخلیق قلم کی تخلیق سے پہلے ہو چکی تھی۔ لہٰذا جب دوسری صحیح حدیثوں میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کی تخلیق فرمائی ہے تو یہ بات طے اور متعین ہو گئی اور امام بیہقی رحمہ اللہ کا یہ فرمانا: اللہ تعالیٰ نے پانی ہوا اور عرش کی تخلیق کے بعد جو پہلی چیز پیدا کی وہ قلم ہے[4] کسی نقلی دلیل سے عاری ہے۔

---

[1] كتاب السنة ص ٤٩-٥٠ ح: ١٠٦

[2] صحيح بخاری حديث نمبر ٣١٩١، ٤٧١٨

[3] صحيح مسلم، حديث نمبر ٦٧٤٨ (٢٦٥٣)

[4] الاسماء والصفات ص ٢٣٨، ج٢

مزید یہ کہ عرش اور پانی کے ضمن میں ''ہوا'' کا ذکر کسی صحیح حدیث میں نہیں آیا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ پانی اور عرش میں سے اللہ تعالیٰ نے پہلے کس کو وجود بخشا تو اس کا ذکر بھی کسی صحیح حدیث میں نہیں آیا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں رسول اکرم ﷺ کے ارشاد ''وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ'' کی شرح کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے: اللہ تعالیٰ نے پہلے پانی پیدا فرمایا پھر پانی پر عرش کو وجود بخشا اور اس کی دلیل میں حضرت ابورزین عقیلی رضی اللہ عنہ سے مروی جس حدیث کا مسند امام احمد اور سنن ترمذی میں حوالہ دیا ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

"إِنَّ الْمَاءَ خُلِقَ قَبْلَ الْعَرْش" پانی کی تخلیق عرش سے پہلے ہوئی[1] تو یہ حدیث مسند امام احمد اور سنن ترمذی کے مطبوعہ نسخوں میں مجھے نہیں ملی۔ لہٰذا عرش سے پہلے پانی کی تخلیق کی کوئی نقل دلیل نہیں ہے۔ البتہ عرش کے پانی پر ہونے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پانی کی تخلیق پہلے ہو چکی تھی۔

اوپر آغاز آفرینش سے متعلق جو متعدد صحیح احادیث نقل کی گئیں ہیں ان سے پوری وضاحت سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں جو چیزیں سب سے پہلے پیدا فرمائیں وہ درج ذیل ہیں:

قلم۔ لوح محفوظ۔ عرش۔ آسمان۔ زمین

احادیث بدء الخلق میں ''نور محمدی'' کی تخلیق کا کوئی ذکر نہیں۔

بدء الخلق یا آغاز آفرینش کی حدیثوں میں صراحۃً یا اشارۃً ''نور محمدی'' یا رسول اکرم ﷺ کی تخلیق کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ حتیٰ کہ کتب حدیث میں بدء الخلق کے بارے میں جو ضعیف اور منکر روایات آئی ہیں ان میں بھی ''نور محمدی'' کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ جبکہ امت کے ایک بہت بڑے طبقہ میں ''نور محمدی'' نے عقیدہ کی شکل اختیار کر رکھی ہے اور اس ''نور'' کو پوری کائنات کی اصل قرار دے دیا گیا ہے۔

اس کتاب کی پہلی جلد (ص ۲۸۴ ۔ ۲۸۷) میں اس موضوع اور باطل روایت پر مفصل گفتگو کی گئی ہے جس میں ''نور محمدی'' کا ذکر آیا ہے۔ یہاں ''تفصیل مزید'' کے طور پر اس روایت کا مکمل متن پیش کر دینا چاہتا ہوں، جس کے بعد ان کتابوں کا ذکر کروں گا جن میں یہ بے بنیاد روایت مذکور ہے پھر یہ واضح کروں گا کہ اس روایت کو جن لوگوں نے گھڑا ہے وہ رسول اکرم ﷺ کو صرف رسول نہیں مانتے بلکہ آپ کو کائنات کی اصل مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نعوذ باللہ کائنات میں

---

[1] ص ۱۵۰۲ ج ۲

صاحب تصرف ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اہمیت و ربوبیت میں آپ کا بھی حصہ ہے بلکہ یہ دنیا اور آخرت دونوں آپ کی جود و سخا کے مظہر ہیں اور ''لوح محفوظ'' کا علم آپ کے علم کا صرف ایک حصہ ہے (''موضوع اور منکر روایات'' کی جلد اوّل کے تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے) لیجیے! اب اگلی روایات کا مطالعہ کیجیے۔

''نور محمدی'' کی روایت کا متن:

اس عجیب و غریب روایت کی کوئی سند کسی کتاب میں بیان نہیں ہوئی بلکہ ہر کتاب میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ روی عبد الرزاق بسنده عن جابر ...... عبدالرزاق نے اپنی سند کے ذریعہ جابر سے روایت کیا...... وہ کہتے ہیں:

۱۷۰ ...... ((يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي أَخْبِرْنِي عَنْ أَوَّلِ شَيْئٍ خَلَقَهُ اللّٰهُ قَبْلَ الْأَشْيَاءِ قَالَ: يَا جَابِرُ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى خَلَقَ قَبْلَ الْأَشْيَاءِ نُوْرَ نَبِيِّكَ مِنْ نُوْرِهِ فَجَعَلَ ذٰلِكَ النُّوْرَ يَدُوْرُ بِالْقُدْرَةِ حَيْثُ شَاءَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ فِي ذٰلِكَ الْوَقْتِ لَوْحٌ وَلَا قَلَمٌ وَلَا جَنَّةٌ وَلَا نَارٌ وَلَا مَلَكٌ وَلَا سَمَاءٌ وَلَا أَرْضٌ وَلَا شَمْسٌ وَلَا قَمَرٌ وَلَا جِنِّيٌّ وَلَا إِنسِيٌّ۔ فَلَمَّا أَرَادَ اللّٰهُ أَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ قَسَّمَ ذٰلِكَ النُّوْرَ أَرْبَعَةَ أَجْزَاءٍ، فَخَلَقَ مِنَ الْجُزْءِ الْأَوَّلِ الْقَلَمَ وَمِنَ الثَّانِي اللَّوحَ وَمِنَ الثَّالِثِ الْعَرْشَ۔ ثُمَّ قَسَّمَ الْجُزْءَ الرَّابِعَ أَرْبَعَةَ أَجْزَاءٍ، فَخَلَقَ مِنَ الْجُزْءِ الْأَوَّلِ حَمَلَةَ الْعَرْشِ وَمِنَ الثَّانِي الْكُرْسِيَّ وَمِنَ الثَّالِثِ بَاقِي الْمَلَائِكَةِ۔ ثُمَّ قَسَّمَ الْجُزْءَ الرَّابِعَ أَرْبَعَةَ أَجْزَاءٍ فَخَلَقَ مِنَ الْجُزْءِ الْأَوَّلِ السَّمٰوَاتِ وَمِنَ الثَّانِي الْأَرْضِيْنَ وَمِنَ الثَّالِثِ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ۔ ثُمَّ قَسَّمَ الرَّابِعَ أَرْبَعَةَ أَجْزَاءٍ، فَخَلَقَ مِنَ الْجُزْءِ الْأَوَّلِ نُوْرَ أَبْصَارِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمِنَ الثَّانِي نُوْرَ قُلُوْبِهِمْ وَهِيَ الْمَعْرِفَةُ بِاللّٰهِ وَمِنَ الثَّالِثِ نُوْرَ أُنسِهِمْ وَهُوَ التَّوْحِيْدُ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ...... الحديث))

''یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان مجھے اس پہلی چیز کے بارے میں بتائیے جس کی اللہ نے تمام اشیاء سے پہلے تخلیق فرمائی؟ فرمایا: اے جابر! دراصل اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا کیا اور اس نور کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ

جہاں اللہ چاہے، اپنی قدرت و استطاعت سے گھومتا پھرے۔ اس وقت نہ لوح محفوظ تھی، نہ قلم، نہ جنت تھی، نہ جہنم، نہ فرشتہ تھا، نہ آسمان اور نہ زمین، نہ سورج تھا، نہ چاند، نہ جن تھے، اور نہ انسان۔ اور جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو اس نور کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے پہلے حصے سے قلم کی تخلیق فرمائی، دوسرے سے لوح محفوظ اور تیسرے سے عرش۔ پھر اس کے چوتھے حصے کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلے حصے سے حاملین عرش کی تخلیق فرمائی، دوسرے سے کرسی اور تیسرے سے بقیہ فرشتوں کو پیدا کیا۔ پھر اس کے چوتھے حصے کو چار اجزاء میں تقسیم کر دیا۔ پہلے جزء سے آسمانوں کو بنایا، دوسرے سے زمینوں کو اور تیسرے سے جنت اور جہنم کو۔ پھر اس کے چوتھے جزء کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلے حصے سے مؤمنین کی بصارت کا نور بنایا۔ دوسرے سے ان کے دلوں کا نور بنایا جو اللہ کی معرفت سے عبارت ہے۔ اور تیسرے سے ان کے اُنس کا نور پیدا کیا جو توحید، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے......"

اس روایت کو جن علماء نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے ان کے اور ان کی کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

نور محمدی کے واقعہ کے مآخذ:

(۱) علامہ شیخ شہاب الدین احمد بن محمد قسطلانی متوفی ۹۲۳ھ۔ شیخ قسطلانی کا شمار ممتاز علمائے حدیث میں ہوتا ہے۔ ان کی صحیح بخاری کی شرح ارشاد الساری لشرح البخاری، علم حدیث میں ان کی گہری اور وسیع نظر کی ترجمان ہے۔ شیخ قسطلانی نے سیرت رسول ﷺ کے موضوع پر اپنی مشہور کتاب "المواهب اللدنية" میں "نور محمدی" کی روایت کا ذکر، رواه عبد الرزاق بسنده عن جابر" سے کیا ہے اور روایت کی صحت و سقم سے تعرض کیے بغیر قلم کی تخلیق کی حدیثوں اور اس روایت کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔

(۲) شیخ حسین الدیار البکری متوفی ۹۹۰ھ نے اپنی کتاب "الخمیس فی انفس نفیس" میں اس روایت کا ذکر کیا ہے اور اس کو نبی اکرم ﷺ کے مناقب میں شمار کیا ہے۔ لیکن روایت کی صحت و سقم سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔

(۳) شیخ اسماعیل بن محمد عجلونی متوفی ۱۱۶۳ھ نے اپنی کتاب "کشف الخفاء و مزیل

لے ص ۴۲، ۴۳، ۴۴

الإلباس عما اشتهر من الاحاديث على السنة الناس" میں نور محمدی کی روایت کا ذکر کیا ہے اور اس پر کوئی تبصرہ کرنے کی بجائے "المواهب اللدنية" سے قسطلانی کی پوری عبارت نقل کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔

(۴) چوتھے بزرگ شیخ ابو الحسنات عبدالحی لکھنوی متوفی ۱۳۰۴ھ ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "الآثار المرفوعه فى الاخبار الموضوعه" میں یہ روایت نقل کی ہے لیکن اس کی سند لکھنے کی بجائے "المواہب" کی عبارت نقل کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔ البتہ اس باطل روایت سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں ان کی تردید کی ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مذکورہ بالا روایت ثابت نہیں کیونکہ اس کی کوئی سند ہی نہیں ہے۔

اوپر جن علماء کا ذکر آیا ہے ان سب نے مذکورہ روایت "روى عبد الرزاق بسنده عن جابر" عبدالرزاق نے اپنی سند کے ذریعہ حضرت جابر سے روایت کیا ہے...... کے الفاظ سے نقل کی ہے اور یہ نہیں لکھا کہ عبدالرزاق کون ہے؟ جب کہ عبدالرزاق دراصل تین ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) ابوبکر عبدالرزاق بن عمر الدمشقی: ان کا تعلق تبع تابعین کے درمیانی طبقہ سے تھا۔ یہ امام زہری سے اپنی روایت میں "متروک" اور دوسروں سے اپنی روایت میں بے حد ضعیف تھے۔[1]

(۲) عبدالرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری: ان کا شمار چھوٹے تبع تابعین کے طبقہ میں ہوتا ہے۔ یہ ثقہ اور حافظ حدیث تھے۔ آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے ان کی عدالت متاثر ہوگئی تھی۔ ان پر تشیع کا بھی الزام تھا۔[2]

(۳) عبدالرزاق بن عمر البزیعی: ان کا تعلق تبع تابعین کے بعد کے طبقہ سے ہے جس کی کسی تابعی سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ وہ سچے[3] صدوق تھے۔ واضح رہے کہ علم حدیث میں صدوق ثقہ کا مترادف نہیں ہے۔ یعنی کسی راوی کی روایت صرف اس کے سچے ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کی جاتی بلکہ حفظ و ضبط میں اس کا ماہر ہونا بھی شرط ہے۔

لیکن شیخ ابوعبداللہ محمد بن عبدالباقی الزرقانی نے "المواهب اللدنيه"[4] کی اپنی شرح میں مذکورہ روایت کے راوی کا نام عبدالرزاق بن ہمام الحمیری لکھا ہے۔ یاد رہے کہ علامہ زرقانی کا شمار علمائے حدیث میں ہوتا ہے اور ان کی مذکورہ شرح بہت مشہور ہے۔ مگر انہوں نے بھی اس کی مکمل سند نہیں لکھی۔

---

[1] التقريب ص ۲۹٦۔ ترجمہ: ٤٠٦٤

[2] القتقريب ص ۲۹٦ ترجمہ: ٤٠٦٤

[3] التقريب ص ۲۹٦، ترجمہ: ٤٠٦٣

[4] دیکھئے: المواهب اللدنيه ص ۸۹، ج ۱

کیونکہ کسی کتاب میں اس کی کوئی سند بیان ہی نہیں کی گئی۔ اور ہر مصنف نے اپنی کتاب میں "روی عبد الرزاق بسنده عن جابر" والے صیغہ کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے۔ چنانچہ حافظ جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر سیوطی متوفی ۹۱۱ھ سے جب یہ پوچھا گیا: کیا حدیث میں یہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے محمد ﷺ کا نور پیدا کیا اور اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا......؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ "اس حدیث کی کوئی ایسی سند نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جا سکے"[1] حافظ سیوطی فضائل و مناقب کے باب میں کسی روایت کو بڑی مشکل سے موضوع اور باطل قرار دیتے تھے بلکہ صوفی المشرب ہونے کی وجہ سے موضوع سے موضوع روایات کو صرف ضعیف کہنے پر اکتفا کرتے تھے۔ خاص طور پر ان روایتوں کو جن کا تعلق رسول اکرم ﷺ کے فضائل و مناقب سے ہے۔ لیکن یہ روایت ان کے نزدیک بھی ناقابل اعتبار تھی۔ اس لیے انہوں نے اس کی کوئی تاویل کرنے کے بجائے اس کو بے سند کہنے میں کوئی تردد نہ کیا۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ عبد الرزاق بن ہمام الحمیری کی طرف اس کی نسبت بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی کسی کتاب میں بھی اس باطل اور جھوٹی روایت کا ذکر نہیں ہے، حتیٰ کہ المصنف میں بھی نہیں۔

مندرجہ بالا وضاحتوں سے "نور محمدی" والی روایت کا بے اصل اور باطل ہونا ثابت ہو گیا۔ لگتا ہے کہ کسی صوفی المشرب شخص نے مذکورہ روایت گھڑ کر اس کے شروع میں "رواہ عبد الرزاق بسندہ عن جابر" کی عبارت لگا کر لوگوں میں پھیلا دی۔ چونکہ اس میں رسول اکرم ﷺ کی ایک ایسی صفت بیان ہوئی ہے جس سے آپ کا "فوق البشر" ہونا ظاہر ہو رہا ہے اس لیے اس طبقہ میں اس کو رواج مل گیا جو آپ کی بشریت کا قائل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس بے اصل روایت سے صرف صوفی المشرب علماء نے استدلال کیا ہے اور قدیم علمائے حدیث اور ارباب سیر کی کتابوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

دراصل اس روایت کا اسلوب بیان صحیح احادیث کے اسلوب بیان سے بہت مختلف اور صوفیانہ اسلوب بیان سے بہت مشابہ ہے: مثلاً "نور ابصار المومنین" "المعرفة بالله" اور "انس القلوب" جیسی تعبیرات صرف تصوف کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

اس جھوٹی روایت میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے نور سے اپنے نبی ﷺ کا نور پیدا کیا تھا، دوسرے لفظوں میں پوری کائنات "نور محمدی" سے پیدا کی گئی ہے۔ تو یہ دعویٰ بلا دلیل اور اسلامی عقیدے کے منافی ہے۔

---

[1] الحاوی للفتاوی ص ۳۸۶، ج:۱

رسول اللہ ﷺ بشر تھے اور بشر کا مادۂ تخلیق مٹی ہے:

قرآن پاک کی دسیوں آیات مبارکہ میں پوری وضاحت سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی اکرم محمد ﷺ بشر تھے اور بشر کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا واقعہ بیان کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح اور دوٹوک انداز میں یہ بیان فرمادیا ہے کہ انسان مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴾ [الحجر:۲٦]

''ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا ہے''

اور ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ﴾ [الحجر:۲۸، ۲۹]

''اے نبی! یاد کرو اس وقت کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر...... انسان...... پیدا کرنے والا ہوں۔ پس جب میں اسے مکمل بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا''

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کو اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴾ [الروم:۲۰]

''اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اب تم (کئی حالتوں سے گزر کر) بشر ہو کہ پھیلتے جارہے ہو''

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی زبانی ان کی بشریت کا اعلان کروایا ہے تاکہ ان کے پیروؤں پر حجت رہے:

﴿ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِیَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ

الْمُؤْمِنُوْنَ○ ﴾ [ابراهيم:١١]

''ان کے رسولوں نے ان سے کہا: ہم تو تمہاری طرح کے صرف انسان ہیں۔لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فضل فرماتا ہے۔ اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ ہم تمہارے پاس کوئی معجزہ ظاہر کردیں الا یہ کہ اللہ اس کی اجازت دے اور اللہ ہی پر مومنوں کو بھروسہ کرنا چاہیے''

مطلب یہ ہے کہ رسول اپنی خلقت کے اعتبار سے انسان ہی ہوتے تھے، البتہ عام لوگوں پر ان کو یہ فضیلت حاصل تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو رسالت سے نوازا تھا اور وہ لوگوں کو جس حق کی دعوت دیتے تھے اس کے حق ہونے پر ان کو ''علم الیقین'' حاصل تھا۔ لوگوں کے مطالبے اور خواہش پر وہ معجزات دکھانے کا اختیار نہیں رکھتے تھے بلکہ ایسا اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اجازت پر موقوف تھا کہ وہ کب ان کو معجزات دکھانے کی اجازت اور حکم دیتا ہے۔

چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ بھی اللہ کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کے سلسلے کی ایک آخری کڑی تھے، اس لیے آپ بھی لازماً بشر اور انسان تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے خود آپ کی زبان سے آپ کی بشریت کا اعلان کروایا۔

ارشاد الٰہی ہے:

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ [الكهف:١١٠]

''اے محمد! کہہ دو کہ میں تو محض تمہی جیسا ایک انسان ہوں۔ مجھ کو وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود تو صرف ایک ہی معبود ہے''

نبی مکرم ﷺ کی بشریت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ کو اُلوہیت کی صفت سے متصف نہ کیا جائے، کیونکہ الٰہ اور معبود تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

سابق انبیاء اور رسولوں کی طرح محمد رسول اللہ ﷺ بھی معجزات دکھانے پر قدرت نہیں رکھتے تھے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا○ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا○ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا○ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ

تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ط وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ط قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ ﴾ [الاسراء:۹۰-۹۳]

''کافروں نے کہا: ہم تیری تصدیق اس وقت تک نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کردے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور تو اس میں نہریں رواں کردے۔ یا تو، جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہمارے اوپر گرادے۔ یا اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو رو در رو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے۔ یا تو آسمان پر چڑھ جائے۔ اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی کتاب کو نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ اے محمد! کہہ دو پاک ہے میرا رب! کیا میں ایک انسان رسول کے سوا کچھ اور بھی ہوں؟''

کس قدر واضح اور دو ٹوک طریقے سے یہ بیان کردیا گیا ہے کہ کسی کے نبی اور رسول ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس کو خدائی اختیارات حاصل ہوگئے ہیں اور وہ اپنی صداقت ثابت کرنے کے لیے جب چاہے معجزے دکھا سکتا ہے۔ قادر مطلق تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے اس دنیا میں اپنے رسول اور نبی صرف لوگوں کو توحید کی تعلیم دینے کے لیے بھیجے۔ محمد ﷺ بھی اللہ کے نبیوں اور رسولوں کی جماعت کے ایک فرد تھے۔ لہٰذا آپ کو نبی اور رسول ماننے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ کو ایسا انسان مانا جائے جو نور سے نہیں بلکہ گوشت پوست سے بنا ہے۔ خدائی اختیارات کا مالک نہیں ہے اور اس کے ہاتھ میں کائنات کی باگ ڈور نہیں ہے اور نہ اس کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ ہر ایک کے مطالبے پورے کردے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں نہایت واضح اور دو ٹوک طریقے سے یہ بیان کردیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بشر اور انسان تھے اس طرح خود رسول اکرم ﷺ نے بذات خود مختلف موقعوں پر نہایت واضح طریقے سے اپنی بشریت کا اعلان فرمادیا تھا۔

ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَإِنَّهُ يَأْتِينِي الْخَصْمُ، فَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُوْنَ أَبْلَغَ مِنْ بَعْضٍ، فَأَحْسِبُ أَنَّهُ صَادِقٌ فَأَقْضِي لَهُ بِذٰلِكَ فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِحَقِّ مُسْلِمٍ، فَإِنَّمَا هِيَ قِطْعَةٌ مِنَ النَّارِ، فَلْيَأْخُذْهَا أَوْ لِيَتْرُكْهَا))[1]

[1] صحیح بخاری ۲۴۵۸، ۷۱۸۱، ۷۱۷۵۔ صحیح مسلم: ٤٤٧٥ (۱۷۱۳)

''میں تو صرف ایک انسان ہوں اور میرے پاس معاملات والے آتے ہیں، اس کا امکان ہے کہ تم میں سے کوئی کسی دوسرے سے زیادہ زبان آور ہو اور میں اس کو سچا سمجھ کر اس کے حق میں اس کا فیصلہ کر دوں۔ تو جس کے لیے میں کسی ایسی چیز کا فیصلہ کر دوں جس کا حقدار دوسرا مسلمان ہے، تو یہ درحقیقت آگ کا ایک ٹکڑا ہے، چاہے اس کو لے لے یا چھوڑ دے''

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں تو صرف انسان ہوں''۔ اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی انسانی حیثیت پر متنبہ کرنا ہے کہ بشر غیب کا علم نہیں رکھتے اور ان کو پوشیدہ امور میں سے صرف اسی کا علم ہوتا ہے جس سے اللہ ان کو مطلع کر دیتا ہے۔ چنانچہ معاملات میں فیصلے سے متعلق نبی مکرم ﷺ سے بھی ایسے فیصلے کا امکان تھا جس کا امکان عام بشر سے ہوتا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان ظاہری قرائن کی بنیاد پر فیصلے فرماتے تھے اور اس کا امکان رہتا تھا کہ امر واقعہ اس کے خلاف ہو۔[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی (حدیث کے راوی: ابراہیم کہتے ہیں: مجھے نہیں معلوم کہ جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد اور میرے استاذ حضرت علقمہ رحمہ اللہ نے کون سا صیغہ بیان کیا؟ یعنی آپ نے زیادہ رکعتیں پڑھا دیں یا کم؟) اور جب آپ نے سلام پھیرا تو آپ سے عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! کیا نماز میں کوئی تبدیلی ہوگئی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ کیا؟ صحابہ نے عرض کیا: آپ نے اس اس طرح نماز پڑھی ہے۔ راوی کہتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں پاؤں موڑے، قبلہ رخ ہوئے، دو سجدے کیے، پھر سلام پھیرا اور ہماری طرف چہرۂ مبارک کر کے فرمایا:

((إِنَّهُ لَوْ حَدَثَ فِي الصَّلٰوةِ شَيْءٌ لَنَبَّأْتُكُمْ بِهِ، وَلٰكِنْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ، أَنْسٰى كَمَا تَنْسَوْنَ، فَإِذَا نَسِيْتُ فَذَكِّرُوْنِي، وَإِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلٰوتِهِ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ، فَلْيُتِمَّ عَلَيْهِ، ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيْنِ))[2]

''اگر نماز میں کوئی نئی بات پیدا ہوئی ہوتی تو میں تمہیں اس کی خبر دے دیتا، لیکن میں تو محض تمہاری مانند ایک انسان ہوں اور اسی طرح بھولتا ہوں جس طرح تم بھولتے ہو۔ لہٰذا اگر میں

---

[1] المنہاج ص: ۱۱۰۱

[2] صحیح بخاری/ ۴۰۱، ۴۰۴، ۱۲۲۶، ۶۶۷۱، ۷۲۴۹۔ صحیح مسلم/ ۱۲۷۴ (۵۷۲)

بھول جاؤں تو مجھے یاد دلا دو اور جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں شک ہو جائے تو وہ یقینی بات کو اختیار کرے اور اسی کو بنیاد بنا کر نماز پوری کرے پھر دو سجدے کر لے''

اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ شرعی اعمال میں بھول چوک سے دو چار ہوتے تھے۔ یہی جمہور علماء کا مسلک ہے۔ البتہ تبلیغ دین کے معاملے میں آپ بھول چوک اور غلطی سے محفوظ تھے۔

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو اہل مدینہ کھجور کے درختوں میں ''گابھا'' لگاتے تھے۔ کہتے ہیں: قلم کاری کرتے تھے۔ نبی ﷺ نے دریافت فرمایا: تم لوگ کیا کرتے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا: ہم ایسا کرتے آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: شاید اگر تم ایسا نہ کرو تو بہتر ہو۔ جب لوگوں نے قلم کاری ترک کردی (یعنی نر کھجوروں کا گابھا مادہ کھجوروں میں رکھنے والا عمل بند کردیا) تو درختوں سے یا تو پھل گر گئے یا کم آئے۔ لوگوں نے نبی مکرم ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا:

((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْئٍ مِنْ دِينِكُمْ فَخُذُوْا بِهِ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْئٍ مَنْ رَأيٍ فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ))[1]

''میں تو صرف ایک انسان ہوں، جب میں تمہیں تمہارے دین کی کسی بات کا حکم دوں تو اسے لے لو۔ اور اگر میں تمہیں کسی رائے کا حکم دوں تو میں صرف ایک انسان ہوں''

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دین کے معاملات میں تو رسول اللہ ﷺ کا ہر حکم واجب الاطاعت ہے کیونکہ دین کے معاملات میں آپ کا ہر ارشاد وحی الٰہی پر مبنی ہوتا تھا:

جیسا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰىo ﴾ [النجم:۳، ٤]

''نبی اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا یہ تو ایک وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے''

لیکن دنیاوی معاملات میں آپ کی کوئی بات واجب الاطاعت نہیں ہے۔

اوپر جو تین احادیث نقل کی گئی ہیں ان میں رسول اللہ ﷺ نے نہایت صریح الفاظ میں اپنی بشریت کا اعلان فرمایا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ آپ کوئی فوق البشر ہستی نہیں تھے بلکہ تمام انبیاء اور رسولوں کی طرح بشر تھے اور عام بشر پر جو فضیلت اور برتری آپ کو حاصل تھی وہ یہ تھی کہ آپ اللہ کے

[1] صحیح مسلم/ ٦١٢٧ (٢٣٦٢)

رسول تھے اور آپ کا مادۂ تخلیق مٹی تھا نور نہیں تھا۔ لہٰذا آپ کا جسم مبارک گوشت، خون اور ہڈیوں سے عبارت تھا جس کو غذا اور پانی کی حاجت رہتی تھی۔

بشریت رسول کا عقیدہ ایمان بالرسالت کی صحت کے لیے شرط ہے:

قرآن پاک اور احادیث میں تمام انبیاء اور رسولوں کی بشریت کو عمومی طور پر اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی بشریت کو خصوصی طور پر اتنی شدومد اور اتنی تفصیل سے اس لیے پیش کیا گیا ہے تا کہ اس کو ایسا عقیدہ سمجھ کر قبول کیا جائے جس کے بغیر انبیاء اور رسولوں کی نبوت و رسالت پر ایمان کا دعویٰ قابل قبول نہیں ہوتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماں محمد بن عبداللہ ﷺ تک اپنے جتنے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے ان سب کو نبی اور رسول ماننے کے ساتھ ساتھ یہ ماننا بھی صحت کے لیے شرط ہے کہ وہ سب بشر اور انسان تھے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ٥ وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ٥ ﴾ [الانبیاء:۷، ۸]

''اے نبی! ہم نے تم سے پہلے انسانی مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا، جن کو ہم وحی کرتے تھے، اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر...... اہل کتاب سے پوچھ لو۔ ان کا ہم نے ایسا جسم نہیں بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ ہمیشہ رہنے والے تھے۔''

اس آیت مبارکہ میں پہلے توحید کے ساتھ یہ واضح کر دیا گیا کہ اگر محمد بن عبداللہ ﷺ بشر ہیں تو آپ سے پہلے آنے والے رسول بھی بشر تھے جس کے گواہ اہل کتاب ہیں۔ دوم یہ کہ وہ تمام انسانوں کی طرح کھانے پینے کے محتاج تھے۔ سوم یہ کہ ان میں سے کسی کو دوام حاصل نہیں تھا۔ اس طرح اس آیت نے اس عقیدے کی جڑ کاٹ دی کہ اللہ کے نبی اور رسول غیر معمولی اور مافوق الفطرت صفات سے متصف تھے۔

سابقہ قوموں میں سے جس قوم نے اپنے نبی کو الوہیت کی صفت سے متصف کیا وہ نصاریٰ ہیں۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی باپ کے بغیر معجزاتی پیدائش کو اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت پر محمول کرنے کی بجائے ان کو الوہیت میں شریک بنا لیا۔ قرآن ان کی کج فہمی واضح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر کسی کا اعجازی شکل میں پیدا ہونا اس کے الٰہ ہونے کی دلیل ہو سکتا ہے تو اس کے زیادہ مستحق حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ کیونکہ وہ باپ اور ماں دونوں کے بغیر پیدا کیے گئے تھے:

﴿ اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴾ [آل عمران:٥٩]

''اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اس کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس کو کہا: ہو جا، تو وہ ہو گیا۔''

مگر اس بات کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ کسی کا باپ اور ماں کے بغیر پیدا کیا جانا اپنے اندر اس سے بڑی اعجازی شان رکھتا ہے جو صرف باپ کے بغیر پیدا ہوا ہے، عیسائی حضرت آدم علیہ السلام کے اندر کسی الٰہی صفت کے قائل نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ عیسائیوں میں عقیدۂ تثلیث یا اُلوہیتِ مسیح کے پیچھے کوئی ٹھوس منطق کار فرما نہیں ہے۔ اور جو مخلوق ہے وہ کسی بھی حال میں خالق یا الٰہ نہیں ہو سکتا اور نہ الٰہی صفات میں شریک ہو سکتا ہے۔ اس بدیہی حقیقت کے باوجود عیسائیوں میں عقیدۂ الوہیتِ مسیح کیسے پیدا ہوا؟

قرآن اس سوال کا جواب بڑی تفصیل سے دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام نبیوں کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی توحید ہی کی دعوت دیتے تھے۔ وہ اور ان کی ماں دونوں بشری صفات ہی سے متصف تھے۔ لیکن ان کی عقیدت میں غلو اور انتہا پسندی نے عیسائیوں کو شرک میں مبتلا کر دیا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ مَرۡیَمَ ؕ وَ قَالَ الۡمَسِیۡحُ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اعۡبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیۡ وَ رَبَّکُمۡ ؕ اِنَّہٗ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ الۡجَنَّۃَ وَ مَاۡوٰىہُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿ لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ ۘ وَ مَا مِنۡ اِلٰہٍ اِلَّاۤ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ؕ ﴾ [المائدہ:٧٢، ٧٣]

''یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے کہ جنہوں نے کہا اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے، حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ اے بنو اسرائیل! اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔ حالانکہ ایک معبود کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے''

یہ آیتیں اپنے مدعا میں اتنی واضح ہیں اور مسیح علیہ السلام کی دعوت توحید اور شرک باللہ کی تردید اتنی دوٹوک ہے کہ کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی رسالت اور ان کی اور ان کی والدۂ ماجدہ کی بشریت واضح کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ط كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ط اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ٥ ﴾

[المائدہ:۷۵]

''مسیح ابن مریم صرف ایک رسول تھا، اس سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں، اس کی ماں ایک راست باز عورت تھی اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اے نبی! دیکھو ہم ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں کس طرح واضح کر رہے ہیں، پھر دیکھو یہ کدھر الٹے پھرے جاتے ہیں''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے عقیدہ الوہیتِ مسیح کی تردید کرتے ہوئے ان کے انسان ہونے کی ایک ایسی علامت اور نشانی بیان کی ہے جس کا انکار کوئی نہیں کر سکتا۔ یعنی مسیح علیہ السلام ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ وہ اور ان کی ماں مادی جسم رکھتے تھے کہ جو اپنی بقاء کے لیے کھانا کھاتے تھے۔

آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ عیسائیوں میں مشرک کی بیماری اور مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا عقیدہ، ان کی عقیدت و محبت میں ''غلو'' گمراہ قوموں کی پیروی سے پیدا ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ارشادات اور ان پر نازل ہونے والی کتاب اس عقیدے سے پاک ہے:

﴿ قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ٥ ﴾ [المائدہ:۷۷]

''اے نبی! کہو اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔''

اس آیت مبارکہ میں عیسائیوں کی گمراہی کے دو اسباب بیان کیے گئے ہیں: ایک تو دین میں غلو، یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی عقیدت و تعظیم میں غلو جو بعد میں ان کی الوہیت کے عقیدے پر منتج ہوا۔ دوم ہمسایہ قوموں کے اوہام، باطل فلسفوں، مشرکانہ عقائد اور ان کی خواہشات نفس کے ترجمان خیالات و افکار کی پیروی۔ گمراہ قوموں سے مراد اس دور کی وہ قومیں تھیں جو مشرک تھیں۔ خصوصاً یونانی فلاسفہ جن کا فکری اور عقائدی سرمایہ اللہ تعالیٰ کی کسی شریعت سے ماخوذ نہیں تھا۔

امت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل و احسان ہے کہ اس نے جہاں اپنے آخری ہدایت نامے، قرآن کو قیامت تک کے لیے ہر طرح کی تبدیلی اور تحریف سے محفوظ کر دیا، اسی طرح اس نے اپنے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک اور آپ کی قولی اور فعلی سنت کو بھی محفوظ کر دیا اور اس کی حفاظت کے

لیے ہر دور میں ایسے ماہر فن اور مخلص علماء پیدا کرتا رہا جو رسول اکرم ﷺ کی سیرت پاک، آپ کی قولی و فعلی سنت اور عقیدۂ توحید کو ہر طرح کی آمیزش سے محفوظ کرتے رہے، جس کا سلسلہ ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہے گا۔

کتاب و سنت میں مسلمانوں کو غلو اور انتہاء پسندی سے محفوظ رکھنے کے لیے اور رسول اکرم ﷺ سے بے پناہ اور انتہائی محبت کرنے کا مطالبہ کرنے کے ساتھ ساتھ، بار بار آپ کی بشریت کی تاکید کی گئی ہے تاکہ رسول اکرم ﷺ کی بشریت کا عقیدہ ذہن و دماغ میں رچ بس جائے۔ کیونکہ مشرکانہ خیالات وافکار سے دل و دماغ کو محفوظ رکھنے کے لیے بشریتِ رسول کا عقیدہ سب سے قوی ذریعہ ہے۔ اگر یہ عقیدہ پختہ اور بیدار رہے تو پھر ممکن نہیں ہے کہ اُلوہیتِ غیر اللہ کا عقیدہ دل و دماغ پر حملہ کر سکے۔

رسول اکرم ﷺ کی وفات کا عقیدہ:

رسول اکرم ﷺ کی بشریت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔ چنانچہ اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾ [الزمر:۳۰]

''اے نبی! تم بھی مرنے والے ہو اور یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں''

مطلب یہ ہے کہ موت تو لازمۂ بشریت ہے۔ لہٰذا اے نبی! موت کی وادی سے آپ کو بھی گزرنا ہے اور آپ کی دعوت کو ٹھکرانے والوں کو بھی گزرنا ہے۔ اس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں، نہ عام لوگ اور نہ رسول۔

غزوۂ احد میں جب رسول اکرم ﷺ کی ہدایات کی خلاف ورزی کے نتیجے میں جیتی ہوئی جنگ شکست میں بدل گئی اور دشمنوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ رسول اللہ ﷺ شہید کر دیے گئے تو مسلمانوں میں بددلی پھیل گئی، ان کا عزم کمزور پڑ گیا اور ان کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اس موقع پر سورۂ آل عمران کی درج ذیل آیت مبارکہ نازل ہوئی:

﴿ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴾ [آل عمران:١٤٤]

''محمد تو صرف ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ جو الٹے پاؤں پھر جائے گا وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا۔ اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو ضرور بدلہ دے گا''

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں بہت سے رسول گزر چکے ہیں اسی طرح محمد ﷺ بھی اللہ کے ایک رسول ہیں۔ جس طرح کی آزمائشوں اور مصیبتوں سے دوسرے رسول گزرے ہیں اس طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں محمد ﷺ کو بھی پیش آسکتی ہیں۔ اور جس طرح آپ سے پہلے آنے والے رسولوں کو موت کے مرحلے سے گزرنا پڑا ہے اسی طرح محمد ﷺ کو بھی وفات پانا ہے۔ چاہے وہ قدرتی موت ہو یا قتل کے ذریعہ آپ کی وفات ہو۔ آپ کے رسول ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ کو حیات دائمی حاصل ہوگئی اور آپ ہمیشہ رہیں گے۔ ہمیشہ رہنے والا تو صرف معبود حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔

﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝ ﴾ [الرحمن:٢٦، ٢٧]

''ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے''

رسولوں کی بعثت کا مقصد لوگوں تک ان کے رب کا پیغام پہنچانا اور اس کے احکام کو نافذ کرنا تھا۔ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام و ہدایات بندوں کو دی ہیں ان کی پابندی رسولوں کی بقاء پر موقوف نہیں تھی۔ اسی طرح رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کی پابندی بھی آپ کے لوگوں کے درمیان ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے پر موقوف نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا ہے:

((تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا مَسَكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهِ))[1]

''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اگر تم ان کو پکڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے: ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اس کے نبی کی سُنت''

لہٰذا اگر محمد ﷺ کے اس دنیا سے رحلت فرما جانے کے بعد کوئی قبل از اسلام کی زندگی کی طرف

[1] مؤطا امام مالك، كتاب القدر، حديث نمبر٣

پلٹ جانا چاہتا ہے تو پلٹ جائے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا بلکہ اپنی ہی دنیا اور آخرت برباد کرے گا۔

چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی تو اس صدمے نے صحابہ کرام کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان کو یہ بات معلوم تھی کہ پیارے نبی فداہ ابی وامی ﷺ ان کے درمیان ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ مگر یہ ایک عقائدی اور نظری بات تھی۔ جب کسی انسان کو کسی سے غیر معمولی تعلق ہوتا ہے اور وہ اس کو اپنی جان سے زیادہ چاہنے لگتا ہے تو اس کی نگاہوں سے وہ وقت اوجھل رہتا ہے جب وہ ذات اس سے جدا ہو جائے گی۔ مگر آج وہ وقت آ گیا تھا۔ وہ عظیم سانحہ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ وہ مقدس اور محبوب ہستی ان سے جدا ہوگئی تھی۔ اور وہ زبان مبارک خاموش تھی جس سے وہ وحی الٰہی سنتے تھے۔ اس طرح ان کی نگاہوں میں پوری دنیا تاریکی میں ڈوب گئی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"جس دن رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے اس دن اس کی ہر چیز روشن اور منور ہوگئی تھی۔ اور جس دن آپ کی وفات ہوئی اس دن مدینہ کی ہر چیز تاریک ہوگئی اور ابھی ہم نے نبی ﷺ کے دفن سے اپنے ہاتھ ہی جھاڑے تھے کہ ہم نے اپنے دلوں کو بیگانہ پایا"[1]

کس قدر جانکاہ اور دل ہلا دینے والا تھا یہ صدمہ جس سے صحابہ کرام کے ہوش وحواس اڑ گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر یہ خبر بجلی بن کر گری، ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور ان کی حالت غیر ہوگئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شجاعت و بہادری میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ سے والہانہ محبت و تعلق تھا۔ علم نفس کے مطابق آدمی جتنا بڑا بہادر ہوتا ہے اسی قدر رقیق القلب بھی ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نبی مکرم ﷺ سے جو محبت تھی وہ ایک منفرد شان رکھتی تھی۔ مگر ان کے اندر صدمات کو برداشت کر لینے کی جو قوت تھی وہ دیگر صحابہ کرام میں سے کسی میں نہیں تھی۔ ان کا دل زیادہ مضبوط اور زیادہ قوت برداشت کا مالک تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اپنی خالہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ "جس وقت رسول اکرم ﷺ نے رحلت فرمائی اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سنح کے مقام پر اپنے گھر میں تھے۔ ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات کی خبر سن کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ اللہ کی قسم رسول اللہ ﷺ نے وفات نہیں پائی ہے۔ ام المومنین نے فرمایا کہ حضرت عمر نے بعد میں بتایا کہ میرے دل میں یہی خیال پیدا ہوا۔ یعنی یہ کہ آپ کی وفات نہیں ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ آپ کو ضرور بیدار کرے گا اور آپ لوگوں کے ہاتھ پاؤں

[1] سنن ابن ماجه حديث نمبر ١٦٥٤

کاٹ ڈالیں گے۔ یا ''منافقین کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیں گے''[1] اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پہنچ گئے اور کسی سے بات کیے بغیر سیدھے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رخ انور سے چادر ہٹائی، بوسہ لیا اور فرمایا: میرے ماں باپ آپ پر قربان، کس قدر پاکیزہ ہیں آپ، زندگی اور موت دونوں حالتوں میں! اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اللہ آپ کو دو موتیں نہیں دے گا اور جو موت آپ پر لکھ دی گئی تھی وہ آپ کو مل گئی۔ اس کے بعد وہ حجرے سے باہر نکلے اور دیکھا کہ حضرت عمر لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے ان سے کہا بیٹھ جاؤ۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ دوبارہ کہا: بیٹھ جاؤ، انہوں نے پھر انکار کر دیا۔ اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صرف نظر کرتے ہوئے کلمہ شہادت پڑھا۔ لوگ حضرت عمر کو چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

((أَمَّا بَعْدُ، فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ))

''تم میں سے جو محمد کی عبادت کر رہا تھا تو بے شک محمد وفات پا گئے اور جو اللہ کی عبادت کر رہا تھا تو یقیناً اللہ زندہ ہے جس کو موت نہیں آئے گی''

اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سورۂ زمر کی آیت نمبر ۳۰ اور سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۴۴ پڑھیں جو اوپر نقل کی جا چکی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ آیت (آل عمران:۱۴۴) تلاوت کرتے ہوئے سنا تو مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا اور میرے پاؤں میرا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ میں زمین پر گر پڑا اور مجھے یقین ہو گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں۔ ادھر صحابہ کرام کا یہ حال ہو گیا کہ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔[2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہو جانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے اپنے اس موقف کی وضاحت فرمائی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] سنن ابن ماجه حديث نمبر ١٦٥٠

[2] صحيح بخاري حديث نمبر ١٢٤١، ٣٦٦٧، ٣٦٦٩، ٤٤٥٢، ٤٤٥٥، ٥٧١٠، ٥٧١١، ٧٢١٩

وفات کی خبر سن کر انہوں نے اختیار کیا تھا۔ فرمایا: مجھے یہ امید تھی کہ رسول اللہ ﷺ زندہ رہیں گے اور آپ ہم سب سے آخر میں وفات پائیں گے۔[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس امت میں سب سے افضل اور سب سے بلند مقام حاصل ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی مسلسل رفاقت کی وجہ سے بھی ان کا علم ومعرفت اور ان کی فراست و دانائی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ اس تناظر میں آپ کا یہ فرمانا کہ ''تم میں سے جو محمد کی عبادت کر رہا تھا تو محمد وفات پا گئے اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے تو یقیناً اللہ زندہ ہے جس کو موت نہیں آئے گی...... یہ معنی رکھتا ہے کہ عبادت کا سزاوار تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو سدا سے ہے، جبکہ سدا رہے گی اور محمد ﷺ تو صرف اللہ کے رسول اور بندے تھے۔ اللہ کا رسول اور بندہ معبود نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ فانی ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیجا تعریف سے منع فرمایا ہے:

خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: میں نے نبی مکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((لاَ تُطرونِی کَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَی ابْنَ مَرْیَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُہُ، فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہُ))[2]

''میری بے جا تعریف نہ کرنا جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم کی بے جا تعریف کی۔ کیونکہ میں تو صرف اللہ کا بندہ ہوں۔ اور کہو: اللہ کا بندہ اور اس کا رسول''

أَطْرَی یُطْرِی إِطْرَاءً...... کے معنی ہیں کسی کی ایسی تعریف کرنا جو باطل، بے بنیاد اور حق سے متجاوز ہو۔

اس تشریح کی روشنی میں حدیث کا مطلب ہے کہ میری مدح سرائی اور نعت گوئی کرتے ہوئے میرا کوئی ایسا وصف مت بیان کرو جو میرے اندر نہیں ہے۔ عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی مثال دے کر آپ نے یہ تعین فرما دیا کہ جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم کو اللہ کے بندے اور رسول کے مقام سے اٹھا کر الوہیت کے مقام پر بٹھا دیا ویسا تم لوگ نہ کرنا۔ کیونکہ جس طرح وہ اللہ کے رسول تھے اسی طرح میں بھی

[1] صحیح بخاری حدیث نمبر ۷۲۱۹
[2] صحیح بخاری حدیث نمبر ۳۴۴۵، ۶۸۳۰

اللہ کا رسول ہوں۔ اور جیسا کہ اس آیت مبارکہ سے واضح ہے:

﴿ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط ﴾ [المائدہ:۷۵]

''مسیح ابن مریم صرف ایک رسول تھے۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں''

اسی طرح

﴿ وَ مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط ﴾ [آل عمران:۱۴۴]

''اور محمد بھی صرف ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔''

واضح رہے کہ اللہ کے کسی بندے کو الہ یا معبود بنا لینے یا اس کے اندر کسی الٰہی صفت کا عقیدہ رکھنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط ﴾ [المائدہ:۷۲]

''درحقیقت کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے''

قرآنی آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بالاتری اور بالادستی، حاجت روائی اور مشکل کشائی، پناہ دھندگی، خبر گیری، حفاظت اور دست گیری، عزت و ذلت دنیا اور قبولیت دعاء کا تعلق ان صفات سے ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں اور ان میں سے کسی بھی صفت سے کسی مخلوق کو متصف کرنے سے کوئی انسان مؤمن اور مؤحد نہیں رہ سکتا۔

﴿ فَتَعٰلَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ٥ وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُونَ٥ ﴾

[المؤمنون:۱۱۶، ۱۱۷]

''پس بالا و برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ عرش بزرگ کا رب ہے اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ بے شک کافر کبھی فلاح نہیں پائیں گے''

اسلام سے نسبت کا دعویٰ کرنے والے جس گروہ نے سب سے پہلے رسول اکرم ﷺ کی مبالغہ آمیز اور بیجا تعریف شروع کی اور آپ کو ان صفات سے متصف کیا جو اللہ کے لیے خاص ہیں وہ صوفیا کا گروہ ہے۔ اس وقت اس گروہ کے عقائد کی تفصیلی بحث ہمارا موضوع نہیں ہے۔ لہٰذا ہم ''نور محمدی'' کے باطل عقیدے کے پس منظر میں مذکور بالا رسول اکرم ﷺ کے ارشاد کے حوالے سے اس گروہ کے ایک

مشہور شاعر کے نعتیہ قصیدہ کے چند اشعار پیش کر کے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ گروہ نبی کریم ﷺ کے حق میں اسی غلو اور مبالغہ آمیزی کا مرتکب ہوا ہے جس سے آپ نے منع فرمایا تھا۔

شرف الدین ابوعبداللہ محمد بن سعید بوصیری متوفی ۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۵/م ایک مشہور صوفی شاعر گزرے ہیں۔ انہوں نے ''بردہ'' کے نام سے رسول اکرم ﷺ کی ایک طویل نعت نظم کی ہے۔ اس نعت کو دنیا کے گوشے گوشے میں پائے جانے والے صوفیا میں بڑی شہرت حاصل ہے۔ اس کو دنیا میں برکت اور آخرت میں نجات نیز کشف و کرامات کے حصول کے لیے وظیفہ کے طور پر پڑھا جاتا ہے۔ اس نعت کا وہ بند جس کا تعلق رسول اللہ ﷺ سے ''مناجات'' سے ہے اس کے چند اشعار، ان کا ترجمہ اور پھر ان کی مختصر اور ضروری تشریح پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ صوفیا نے رسالت کا ڈانڈہ الوہیت سے کس طرح ملا دیا ہے۔ ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے انبیاء اور رسول مبعوث ہوئے اور ان کو جو معجزات دیے گئے تھے وہ سب رسول اکرم ﷺ کے معجزات ہی سے ماخوذ تھے اور اس دنیا میں جس کا نام محمد ہوگا اس کی بخشش یقینی ہے۔ یہ دنیا اور آنے والی دنیا نبی ﷺ کے جود و سخا کا مظہر ہے اور لوح محفوظ کا علم محمد ﷺ کے خزانہ علم و معرفت کا معمولی سا حصہ ہے۔ قیامت کے دن جس مقام محمود یا شفاعت کبریٰ سے رسول اللہ ﷺ سرفراز کیے جائیں گے وہ آپ کا حق ہے:

وَكُلُّ آيٍ أَتَى الرُّسُلُ الْكِرَامُ بِهَا   فَإِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُوْرِهِ بِهِمْ

''جو معجزات اور کرامتیں معزز رسولوں کے ہاتھوں ظاہر ہوئی ہیں وہ سب نبی ﷺ کے ''نور'' سے نکل کر ان تک پہنچی ہیں''

قصیدہ بردہ کے شارح احمد بن محمد بن حجر ہیتمی متوفی ۹۷۳ھ اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سابق انبیاء اور رسولوں کے معجزات ان کو رسول اکرم ﷺ کے ''نور سے عن طریق استمداد'' حاصل ہوئے ہیں۔ یعنی انہوں نے اس نور سے مدد طلب کی جس کے نتیجے میں ان کے ہاتھوں یہ معجزات ظاہر ہوئے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ''نور'' آدم علیہ السلام بلکہ آسمانوں اور ان کی مخلوقات، زمین اور اس پر پائی جانے والی تمام مخلوقات سے پہلے پیدا کیا جاچکا تھا''[1]

---

[1] العمدة فی شرح البردة ص ۲۸۹

ھیثمی کی یہ بات سراسر جھوٹ اور بے بنیاد ہے۔ مندرجہ بالا صفحات میں "نور محمدی" والی روایت کا بطلان اور اس کا بے اصل ہونا ثابت کیا جا چکا ہے۔ یہ "نور محمدی" درحقیقت صوفیا کی ذہنی اختراع ہے، کتاب وسنت میں اس کا کوئی وجود نہیں ملتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے وہ سب مستقل بالذات تھے اور ہر ایک کو اللہ نے بذریعہ وحی اپنے احکام دیے اور جن کے ہاتھوں چاہا معجزات ظاہر فرمائے۔ دراصل معجزات کا اظہار کسی بھی نبی یا رسول کا اختیاری فعل نہ تھا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۝ ﴾ [ابراهيم:١١]

"ان سے (قوموں سے) ان کے رسولوں نے کہا: ہم تو تم ہی جیسے انسان ہیں، لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنا فضل فرماتا ہے۔ اور ہمارے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ ہم تمہارے پاس کوئی معجزہ لے آئیں اِلا یہ کہ اللہ اس کی اجازت دے اور اللہ ہی پر مومنوں کو بھروسہ کرنا چاہیے"

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کی زبانی یہ اعلان کرا دیا ہے کہ وہ سب بشر ہیں۔ البتہ عام انسانوں پر ان کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اللہ نے ان کو اپنی رسالت کے لیے منتخب کر لیا اور ہر قوم میں انہیں میں سے رسول مبعوث فرمایا۔ اور جس کے ذریعہ جو معجزہ دکھانا چاہا اپنی قدرت سے دکھایا نہ کہ ان رسولوں کی قدرت واختیار سے۔

نور محمدی، نظریہ حلول کا ترجمان ہے:

دراصل "نور محمدی" صوفیا کے نظریہ حلول کا ترجمان ہے۔ حلول کا مطلب ہے: دو جسم اس طرح ایک ہو جائیں کہ اگر ایک کی طرف اشارہ کیا جائے تو وہ دوسرے کی طرف بھی ہو۔ اور صوفیا کے ایک بہت بڑے طبقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے میں حلول کیے ہوئے ہے۔ اس کا نعرہ سب سے پہلے ابومغیث حسین بن منصور حلاج متوفی ۳۰۹ھ نے لگایا تھا۔ حلاج کا شمار اکابر صوفیا میں ہوتا ہے۔ اس نے حلول کا نظریہ یونان اور ہندوستان کے فلسفیوں سے اخذ کیا تھا جہاں یہ نظریہ عام تھا۔ اسی حلول کے نظریہ سے "وحدۃ الوجود" کا نظریہ پیدا ہوا جس کی رو سے اللہ، انسان اور کائنات سب ایک ہیں۔ صوفیا میں اس

کا نعرہ محی الدین ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ نے لگایا۔

حسین بن منصور حلاج نے اپنی کتابوں میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دو شکلیں ہیں: نورانی ازلی و قدیم...... یہ شکل عالم کے وجود پانے سے پہلے سے ہے۔ اسی نورانی شکل سے علم و معرفت کے چشمے پھوٹے ہیں۔ انبیاء اور اولیاء نے اسی نور سے علم و معرفت حاصل کی ہے۔ دوم نبی مرسل کی شکل...... جو حادث ہے اور ہر جگہ اور ہر زمانے میں موجود رہی ہے۔ نبی مرسل نے اپنی رسالت اپنے ازلی اور قدیم نور سے اخذ کی ہے۔[1]

حلاج وحی الٰہی کا منکر تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات سے رسالت اخذ کی ہے (بالفاظِ دیگر حلاج یہ کہتا تھا کہ: نبی کریم محمد رسول اللہ ﷺ پوری زندگی وحی کے معاملے میں جھوٹ بولتے رہے۔ العیاذ باللہ۔) اور جس طرح عیسائی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ذات الٰہی ازلی ناسوت، انسان عیسیٰ میں حلول کر گئی۔ اسی طرح حلاج اور اس کے پیروؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول محمد ﷺ ایک ایسا مظہر ہیں جس میں اللہ نے حلول کر لیا ہے۔ یا ناسوت...... انسان...... میں لاہوت...... اللہ...... نے حلول کر لیا ہے۔

یوں تو اعتدال پسند صوفیا نے بظاہر حلاج اور اس کے عقیدہ ''حلول'' سے براءت کا اظہار کیا ہے لیکن ''نور محمدی'' کو پوری کائنات کی اصل قرار دینے میں وہ حلاج کے ہمنوا ہیں۔ اس وجہ سے ''نور محمدی'' کا ذکر صوفیا یا تصوف سے متاثر لوگوں کی کتابوں میں ملتا ہے اور ''نور محمدی'' سے متعلق بعض روایتیں سند کے ساتھ ملتی ہیں اور بعض بلا کسی سند کے:

۱۷۱ ...... خَلَقَنِي اللّٰهُ مِنْ نُوْرِهِ، وَخَلَقَ أَبَا بَكْرٍ مِنْ نُوْرِي وَخَلَقَ عُمَرَ مِنْ نُوْرِ أَبِي بَكْرٍ وَخَلَقَ أُمَّتِي مِنْ نُوْرِ عُمَرَ، وَعُمَرُ سِرَاجُ أَهْلِ الْجَنَّةِ۔

''اللہ نے مجھے اپنے نور سے پیدا کیا۔ اور ابوبکر کو میرے نور سے پیدا کیا اور عمر کو ابوبکر کے نور سے پیدا کیا اور میری امت کو عمر کے نور سے پیدا کیا اور عمر اہل جنت کے چراغ ہیں''

یہ روایت باطل اور جھوٹ ہے اس کی تخریج ابونعیم نے اپنی امالی میں کر کے اس کو باطل قرار دیا ہے۔ اس کی سند کے راویوں: ابومعشر، ہیثم بن جمیل اور ابوشعیب کو ''متروک'' لکھا ہے۔ لیکن امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ یہ جھوٹ ہے۔ مذکورہ تینوں راویوں میں سے اس کی روایت کسی نے نہیں

[1] الفلسفة الصوفيه في الاسلام ص ۳۷۹۔ ۳۸۰

کی ہے، بلکہ اس کی مصیبت احمد بن یوسف مسیحی ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ کا مطلب ہے کہ مذکورہ روایت گھڑنے والا احمد بن یوسف مسیحی نصرانی ہے۔[1]

۱۷۲......إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى خَلَقَ نُوْرَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ خَلْقِ آدَمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ بِأَلْفَى عَامٍ وَجَعَلَهُ فِي عَمُوْدٍ أَمَامَ عَرْشِهِ يُسَبِّحُ اللّٰهَ وَيُقَدِّسُهُ ثُمَّ خَلَقَ آدَمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ مِنْ نُوْرِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَخَلَقَ نُوْرَ النَّبِيِّيْنَ عَلَيْهِمُ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ مِنْ نُوْرِ آدَمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ۔

”بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے محمد ﷺ کا نور آدم علیہ الصلاۃ والسلام کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل پیدا کیا اور اس کو اپنے عرش کے سامنے ایک ستون میں ڈال دیا کہ وہ اللہ کی تسبیح وتقدیس کرتا رہے۔ پھر محمد ﷺ کے نور سے آدم علیہ الصلاۃ والسلام کو پیدا کیا اور آدم علیہ الصلاۃ والسلام کے نور سے نبیوں کا نور بنایا“[2]

یہ عبارت جھوٹ ہے حدیث نہیں ہے۔ قرآن پاک میں آدم علیہ السلام کی تخلیق کے واقعہ کے سراسر خلاف ہے۔ مزید یہ کہ یہ عبارت حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے منسوب جھوٹی روایت کے بھی خلاف ہے۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نور سے پہلے عرش کی تخلیق ہو چکی تھی۔ جبکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منسوب روایت میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ عرش کی تخلیق ”نور محمدی“ سے ہوئی ہے۔ دراصل اس روایت کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے۔

۱۷۳......خُلِقْتُ أَنَا وَعَلِيٌّ مِنْ نُوْرٍ، وَكُنَّا عَنْ يَمِيْنِ الْعَرْشِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ اللّٰهُ آدَمَ بِأَلْفَى عَامٍ، ثُمَّ خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ فَانْقَلَبْنَا فِي أَصْلَابِ الرِّجَالِ، ثُمَّ جُعِلْنَا فِي صُلْبِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، ثُمَّ اشْتَقَّ أَسْمَاءَ نَا مِنِ اسْمِهِ: فَاللّٰهُ مَحْمُوْدٌ وَأَنَا مُحَمَّدٌ وَاللّٰهُ الْأَعْلَى وَعَلِيٌّ عَلِيٌّ۔

”میں اور علی نور سے پیدا کیے گئے اور ہم اللہ کے آدم کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال قبل عرش کے داہنے کنارے تھے۔ پھر اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو ہم مردوں کی پیٹھوں میں منتقل ہو گئے۔

[1] تنزیہ الشریعہ ص ۳۳۷، ج ۱
[2] المدخل لابن الحاج ص ۳۰، ج ۲ بحوالہ محبۃ الرسول ص ۱۸۳

پھر اللہ نے ہم کو عبد المطلب کی پیٹھ میں ڈال دیا اور پھر ہمارے ناموں کو اپنے نام سے نکالا، پس اللہ کا نام محمود ہے اور میں محمد ہوں۔ اللہ الاعلیٰ ہے اور علی علی ہیں۔"

یہ روایت جھوٹ ہے، حدیث نہیں ہے۔ اس کا گھڑنے والا جعفر بن احمد ہے۔ امام عبد اللہ بن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہم نے اس سے مروی موضوع حدیثیں لکھی ہیں جن کو اسی نے وضع کیا ہے۔ اس روایت کو امام ابن الجوزی، حافظ سیوطی اور ابن عراق نے بھی موضوع قرار دیا ہے۔[1]

۱۷٤ ......كَانَ نُوْرًا حَوْلَ الْعَرْشِ ، فَقَالَ: يَا جِبْرِيْل! أَنَا كُنْتُ ذٰلِكَ النُّوْرَ۔

"عرش کے گرد نور تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا اے جبریل! وہ نور میں ہی تھا"

یہ عبارت بھی حدیث نہیں ہے۔ اس کا ذکر حدیث کی کسی بھی مستند کتاب میں نہیں آیا ہے۔[2]

یہ ہے "نور محمدی" کی حقیقت۔ اس کی روشنی میں اس جھوٹ کا اندازہ لگائیے جو بوصیری کے مذکورہ شعر میں مضمر ہے۔ اس کے بعد یہ کہنا مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ فضائل و مناقب کے باب میں صوفیا کی باتیں جھوٹ کا پلندا ہیں۔ بلکہ انہوں نے اپنے عقائد اپنے ذوق و خیال سے گھڑ لیے ہیں جن کا کتاب و سنت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ (بوصیری کا دوسرا شعر) ؏

فَإِنَّ لِي ذِمَّةً مِنْهُ بِتَسْمِيَتِي مُحَمَّدًا وَهُوَ أَوْفَى الْخَلْقِ بِالذِّمَمِ

"اپنا نام محمد ہونے کی وجہ سے مجھے رسول اللہ ﷺ کا ذمہ اور عہد حاصل ہے اور آپ تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ ذمہ اور عہد پورا کرنے والے ہیں"

قصیدہ بردہ کے شارح ہیتمی کہتے ہیں: چونکہ شاعر کا نام رسول اللہ ﷺ کے اسم مبارک کے مطابق ہے اس لیے اس کو آپ کی شفاعت کا ذمہ حاصل ہے۔ گناہوں کے ارتکاب سے اس اسم مبارک اور اس سے حاصل ہونے والی برکتوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لہٰذا قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ "محمد" نام رکھنے والوں کی شفاعت فرمائیں گے اور ان کی حمایت کریں گے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

۱۷۵ ......يُوْقَفُ عَبْدَانِ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ تَعَالَى فَيَأْمُرُ بِهِمَا إِلَى الْجَنَّةِ، فَيَقُوْلَانِ: رَبَّنَا بِمَ اسْتَأْهَلْنَا الْجَنَّةَ وَلَمْ نَعْمَلْ عَمَلًا يُجَازِيْنَا الْجَنَّةَ؟ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالَى:

---

[1] الكامل ص ٥٧٨، ج٢۔ الموضوعات: ص ٩٥۔ ٩٦، ج٢، ح ٦٣٤۔ تنزيه الشريعة: ص ٣٥١، ج١، اللآلي: ص ٣٢٠، ج١، الفوائد: ص ٣٤٢

[2] عبد المتعال محمد الجبري: المشتهر من الحديث الموضوع: ح ١٣

اُدْخُلا الْجَنَّةَ فَإِنِّي آلَيْتُ عَلَى نَفْسِي أَنْ لاَ يَدْخُلَ النَّارَ مَنِ اسْمُهُ أَحْمَدُ وَلَا مُحَمَّدٌ۔

''اللہ تعالیٰ کے سامنے دو بندے کھڑے کیے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل کیے جانے کا حکم فرمائے گا۔ وہ دونوں عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم جنت کے حقدار کیسے ہوئے؟ حالانکہ ہم نے ایسا کوئی عمل نہیں کیا ہے جو بدلے میں ہمیں جنت کا مستحق بنائے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم دونوں جنت میں داخل ہو جاؤ۔ کیونکہ میں نے اپنے آپ سے یہ عہد کیا ہے کہ وہ شخص جہنم میں داخل نہیں ہوگا جس کا نام احمد یا محمد ہوگا''[1]

یہ روایت حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی رو سے ایمان و عمل غیر ضروری قرار پاتے ہیں۔ اس کو تمام ائمہ حدیث، امام ابن الجوزی، امام ذہبی، امام ابن حبان، امام شوکانی، امام ابن القیم، ابن عراق اور حافظ سیوطی نے موضوع اور من گھڑت قرار دیا ہے۔ اس کی سند کے ایک راوی حسین بن بکیر کا شیخ احمد بن عبداللہ بن فتح، جس کا لقب ''ذارع'' ہے کذاب اور جھوٹا تھا۔ اور ذارع کا شیخ صدقہ اور اس کا باپ موسیٰ دونوں غیر معروف ہیں۔[2] (بوصیری کا تیسرا شعر) ۶

يَا أَكْرَمَ الْخَلْقِ مَالِي مَنْ أَلُوذُ بِهِ سِوَاكَ عِنْدَ حُلُوْلِ الْحَادِثِ الْعَمِمِ

''اے مخلوقات میں سب سے زیادہ معزز و مکرم! آپ کے سوا میرا کوئی نہیں ہے کہ میں پر ہجوم مصائب اور کثرت آفات میں اس کی پناہ لوں''

قصیدہ بردہ کے شارح ھیتمی کہتے ہیں:

شاعر کی مراد ہے: قیامت کے دن جب منظر ہولناک ہوگا اور مصائب و آلام کی کثرت اور شدت ہوگی تو مخلوقات میں رسول اللہ ﷺ کے سوا میرا کوئی نہیں ہوگا جس کی میں پناہ لوں گا۔[3]

شارح ھیتمی کی تشریح پر چند ملاحظات قابل ذکر ہیں:

(۱) پہلی بات تو یہ کہ اس شعر میں قیامت کے دن کی شدت اور ہولناکی کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ عمومی

---

[1] العمدة في شرح البردہ: ص ۲۳۵، ۲۳۶

[2] الموضوعات: ص ۲۴۱ ج۱، ح ۳۲۶۔ الميزان: ص ۳۱۳ ج۲۔ المجروحين ص ۳۷۲، ج۱۔ الفوائد: ص ۴۷۱۔ المنار المنيف: ح ۹۳۔ تنزيه الشريعه: ص ۱۷۳ ج۱، اور اللآلی المصنوعة: ص ۹۷، ج۱

[3] العمده فی شرح البردة: ص ۶۵۹

مصائب وآفات بیان ہوئے ہیں۔

(۲) دوسری بات یہ کہ شاعر نے یہ بات اس دنیا میں کہی ہے اور یہ اعتراف کرتے ہوئے کہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مخلوق ہیں، خالق نہیں ہیں۔ تو پھر اس نے رسول اللہ ﷺ کو پکارنے کے بجائے اللہ کو کیوں نہ پکارا؟ اور یہ کیوں نہ کہا کہ اے اللہ! جب قیامت کے دن مصائب وآفات کا ہجوم ہوگا اور ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہوگا، اس ہولناک دن میں تو مجھے اپنے محبوب رسول اور بندے کی شفاعت کا مستحق بنائیو۔ کیونکہ کتاب وسنت سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے اذن سے شفاعت فرمائیں گے اور آپ کی شفاعت کبریٰ لوگوں کے حساب کتاب کے لیے ہوگی۔ ان کی بخشش کے لیے نہیں۔ چنانچہ متعدد احادیث میں شفاعت کبریٰ کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان کا خلاصہ ہے کہ تمام خلقت ایک ایک کرکے ہر نبی سے شفاعت کی درخواست کرے گی۔ مگر سب پر اللہ کا خوف اس قدر طاری ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کچھ عرض کرنے سے معذرت کردیں گے۔ آخر میں لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور آپ سے درخواست کریں گے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ ان کا حساب کتاب کرکے ان کو اس مصیبت سے نجات دے۔ رحمتہ للعالمین فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم تیار ہوجائیں گے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے اذن باریابی طلب فرمائیں گے اور جب آپ کو اذن مل جائے گا تو آپ اپنے رب کو دیکھتے ہی سجدے میں گر جائیں گے اور جب تک آپ کا رب چاہے گا سجدے میں پڑے رہیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ آپ سے فرمائے گا: محمد! سر اٹھاؤ اور جو کہنا ہے کہو، تمہاری بات سنی جائے گی، تم شفاعت، سفارش کرو تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی اور تم مانگو تم کو عطا کیا جائے گا۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ میرے دل میں اپنی حمد وثنا کے ایسے کلمات ڈال دے گا جو مجھے اس وقت معلوم نہیں ہیں۔ میں انہی الہامی کلمات کے ذریعہ اپنے رب کی حمد وثنا بیان کروں گا۔[1]

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ سے شفاعت کی درخواست کرنا جب آپ کی حیات پاک میں جائز نہیں تھا تو پھر آپ کی رحلت کے بعد کیونکر جائز ہوسکتا ہے؟ شاعر کو یہ بات معلوم ہے کہ مخلوق سے دعا کرنا شرک اکبر ہے۔ صحابہ کرام نبی معظم ﷺ سے دعا نہیں کرتے تھے بلکہ آپ سے دعاء کی درخواست کرتے تھے۔

قاضی ابوالفضل عیاض فرماتے ہیں: سلف صالحین سے منقول ہے کہ قیامت کے دن نبی اکرم ﷺ

[1] صحیح بخاری: ۷۵۱۰۔ صحیح مسلم: ۴۷۹، ۴۸۰

کی شفاعت کی اللہ تعالیٰ سے درخواست کرنی چاہیے۔یعنی بندہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرے کہ وہ اس دن اس کو اپنے نبی کی شفاعت سے سرفراز فرمائے۔[1]

اور احادیث میں اذان کے بعد جو دعا پڑھنے کا حکم آیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ سے رسول اکرم ﷺ کو ''مقام محمود'' پر سرفراز کرنے کی درخواست مذکور ہے۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جو شخص اذان کے بعد کہے:

((اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ التَّامَّۃِ وَالصَّلَاۃِ الْقَائِمَۃِ آتِ مُحَمَّدًا الْوَسِیلَۃَ وَالْفَضِیلَۃَ وَابْعَثْہُ مَقَامًا مَحْمُودًا الَّذِی وَعَدْتَہُ، حَلَّتْ لَہُ شَفَاعَتِی یَوْمَ الْقِیَامَۃِ))

''اے اللہ! جو اس پوری دعاء اور قائم ہونے والی نماز کا رب ہے! تو محمد ﷺ کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرما اور جس مقام محمود کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اس پر ان کو سرفراز فرما۔ تو اس کے لیے قیامت کے دن میری شفاعت واجب ہو جائے گی''[2]

(۳) تیسری بات یہ کہ نبی اکرم ﷺ سے شفاعت کبریٰ یا مقام محمود سے متعلق جو احادیث مروی ہیں ان میں یہ صراحت ہے کہ لوگ نبی ﷺ سے دعاء نہیں کریں گے یا آپ کی پناہ میں آنے کی آپ سے درخواست نہیں کریں گے بلکہ آپ سے شفاعت کی درخواست کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں آپ سے یہ درخواست کریں گے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ان کو ان کی پریشانیوں سے نجات دے۔ کیونکہ شفاعت بھی دعاء ہی ہے۔ البتہ عام دعاء اور شفاعت میں یہ فرق ہے کہ دعاء اپنے اور غیر دونوں کے لیے کی جاتی ہے جبکہ شفاعت صرف غیر کے لیے کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں: شَفَعَ فُلَانٌ لِفُلَانٍ اِلَی فُلَانٍ...... فلاں نے فلاں کے لیے فلاں سے سفارش کی۔ اور اس دنیا میں رسول اللہ ﷺ سے شفاعت کی درخواست کرنا آپ کو پکارنے اور آپ سے دعاء کرنے کی طرح ہے جو جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا سزاوار صرف خالق ہے اور کسی کو پکارنے اور اس سے دعا کرنے کا مطلب اس کو معبود بنانا ہے۔

﴿ وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ

[1] الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ص ۲۲۵، ۲۲۶، ج:۵

[2] صحیح البخاری: ٦١٤، ٤٧١٩

﴿الْحُكْمُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ [القصص:۸۸]

''اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو۔ نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر وہی۔ ہر چیز ہلاک ہو جانے والی ہے سوائے اس کی ذات کے۔ فرمانروائی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جاؤ گے''

مذکور بالا وضاحت کی روشنی میں مذکورہ شعر:

يَا اَكْرَمَ الْخَلْقِ مَالِى مَنْ اَلُوْذُبه سِوَاكَ عِنْدَ حُلُوْلِ الْحَادِثِ الْعَمِمِ

''اے مخلوقات میں سب سے زیادہ معزز و مکرم! آپ کے سوا میرا کوئی نہیں ہے کہ میں پر ہجوم مصائب اور کثرت آفات میں اس کی پناہ لوں''

صریح مشرکانہ شعر ہے جس کو کسی بھی تاویل کے ساتھ صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (دیکھیے اگلا شعر) ع

فَاِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتَهَا وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

''آپ کے جود وسخا ہی سے دنیا اور آخرت کو وجود ملا ہے اور لوح وقلم کا علم آپ کے علوم کا ایک حصہ ہے''

شارح ھیتمی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دنیا اور آخرت میں جو کچھ ہے اور آئندہ ہوگا وہ سب رسول اللہ ﷺ کے جود وسخا کا نتیجہ ہے اور لوح وقلم میں جو علم محفوظ ہے وہ رسول اکرم ﷺ کے علوم و معارف کا صرف ایک حصہ ہے۔ شاعر کے اس شعر کی توجیہہ کرتے ہوئے ھیتمی آگے لکھتے ہیں: لوح وقلم کا علم اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے علوم و معارف کا صرف ایک حصہ ہے کیونکہ ''اسراء'' کی رات اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوح محفوظ کے تمام علوم سے مطلع فرما دیا تھا اور اپنی ذات وصفات کے اسرار سے متعلق مزید علوم سے بھی آپ کو سرفراز فرمایا تھا۔[1]

مبالغہ کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور اگر مبالغہ کی کوئی بنیاد ہو بھی تو اس صورت میں بھی وہ اللہ اور رسول کے نزدیک ایک ناپسندیدہ چیز ہے۔ جبکہ یہاں اس دعویٰ کی سرے سے کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز اور رسول پاک ﷺ نے اپنے ارشادات میں کب اور کہاں یہ فرمایا ہے کہ ''اسراء اور معراج میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو لوح محفوظ میں درج تمام علوم اور مزید اپنی ذات وصفات کے اسرار سے متعلق دوسرے تمام علوم سے مطلع فرما دیا تھا۔

[1] العمدة فى شرح البردہ: ص ٦٦٦-٦٦٩

جہاں تک قرآن پاک کا تعلق ہے تو سورۃ الاسراء کی پہلی آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ''اسراء'' کی حکمت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُo ﴾ [الاسراء:۱]

''پاک ہے وہ اللہ جو لے گیا اپنے بندے کو ایک رات مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے گرد و پیش ہم نے برکتیں پھیلا رکھی ہیں تا کہ ہم اسے اپنی بعض نشانیوں کا مشاہدہ کرائیں بلاشبہ وہ اللہ رب العالمین سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

اور سورۃ النجم کی اٹھارہویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے:

﴿ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیَاتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰیo ﴾

''درحقیقت اس نے اپنے رب کی بعض بڑی نشانیاں دیکھیں''

رہیں احادیث...... تو اسراء و معراج کے بارے میں بکثرت صحابہ کرام سے مروی ہیں اور ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں اختصارا اور تفصیلاً ان کا ذکر کیا ہے۔ مگر کسی ایک صحیح حدیث میں بھی یہ اشارۃ نہیں فرمایا گیا کہ ''اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو لوح محفوظ کے علوم اور اپنی ذات وصفات کے اسرار سے متعلق دوسرے تمام علوم سے مطلع فرما دیا تھا۔ درحقیقت تصوف کی کتابوں کا تفصیلی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ارباب تصوف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماخذ کتاب وسنت سے کہیں زیادہ ان کا خاص ذوق ہے۔ اور اگر وہ کبھی اللہ کی کتاب کی کسی آیت یا رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث سے استدلال کرتے بھی ہیں تو اس وقت بھی ان کا خاص ''صوفیانہ ذوق'' ان کے ذہن و دماغ پر حاوی رہتا ہے اور وہ اس آیت یا حدیث کی اس طرح تفسیر یا تاویل کرتے ہیں کہ وہ ان کے تصور دین سے ہم آہنگ ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ کتاب وسنت کو اپنے فاسد اور باطل خیالات کا ترجمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر صوفیا کا ایک بہت بڑا طبقہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ پر قرآن پاک کے نزول سے پہلے ہی وہ مجملاً آپ کو عطا کیا جا چکا تھا۔ اور تفصیلی قرآن جبریل علیہ السلام کے ذریعہ آپ پر نازل کیا گیا۔ چنانچہ سورہ طہ کی آیت نمبر ۱۱۴:

﴿ فَتَعَالَی اللّٰهُ الْمَلِکُ الْحَقُّ وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ وَحْیُهٗ وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًاo ﴾ [طٰهٰ:۱۱۴]

''تو بہت بلند و مرتبہ ہے اللہ بادشاہ برحق۔ اے محمد! قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کرو جب تک کہ تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ اور کہو: اے میرے رب! مجھے مزید علم عطا کر''

کی تفسیر کرتے ہوئے ''وحدت الوجود'' کے بانی محی الدین محمد بن علی المعروف بابن عربی کہتے ہیں:

جان لو کہ رسول اللہ ﷺ کو جبریل کے نزول سے پہلے ہی قرآن مجمل شکل میں، آیتوں اور سورتوں کی تفصیلات کے بغیر عطا کا چکا تھا۔ اس آیت میں آپ سے فرمایا گیا ہے کہ جو قرآن تمہارے پاس موجود ہے جبریل سے پہلے اس کو پڑھنے میں جلدی نہ کرو اور اس طرح امت کے سامنے اجمالی قرآن مت پیش کرو کیونکہ اس کے مفصل نہ ہونے کی وجہ سے اس کو کوئی سمجھ نہیں سکے گا۔[1]

کیا اس ہرزہ سرائی سے بڑی کوئی اور ہرزہ سرائی ہوسکتی ہے۔ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں یہ صراحت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر قرآن پاک کا نزول حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ ہوا ہے اور اس سے قبل آپ کو کتاب اور ایمان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [الشوریٰ:٥٢]

''اور اے محمد! اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ تمہیں معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے؟ لیکن اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس کے ذریعہ ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں جسے چاہتے ہیں اور بلاشبہ تو بھی لوگوں کو سیدھی راہ دکھلاتا رہتا ہے۔''

کس قدر واضح ہے یہ آیت مبارکہ اپنے مدعا میں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قرآن پاک کو روح قرار دیا ہے۔ کیونکہ عام روح جسموں میں زندگی سے عبارت ہے اور قرآن پاک ایسی روح ہے جس سے دلوں کو اور عام روحوں کو زندگی ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرما رہا ہے کہ منصب نبوت پر سرفراز کیے جانے اور قرآن کے نزول سے قبل تو آپ کے ذہن میں کتاب الٰہی اور ایمان کا کوئی تصور تک نہ تھا۔ اسی چیز کو سورۃ الضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے ''ضالاً'' سے تعبیر کیا ہے ارشاد ربانی ہے:

---

[1] الكبريت الاحمر فی علوم الشيخ الأكبر للشعرانی: ص ٦ بحواله محبة الرسول ﷺ ص: ٢٠٠

﴿ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰىo ﴾ [الضحیٰ:۷]

”اے نبی! تمہارے رب نے تم کو ناواقف راہ پایا پس ہدایت بخشی“

مطلب یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر سرفراز کیے جانے سے پہلے تک رسول اللہ ﷺ کو اس دینِ حق اور اس کے اصول و احکام کا کوئی علم نہیں تھا اور شرک و بت پرستی کے اس مکی ماحول میں آپ کو یہ معلوم نہ تھا کہ آپ کدھر جائیں اور کون سا طریقہ اختیار کریں؟ اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ فضل و احسان کیا کہ آپ پر کتاب نازل فرمائی جس نے ایمان کی تعلیم دی، صحیح راہ دکھائی اور حسن عمل اور حسن اخلاق کا طریقہ بتایا۔

اور سورۃ النجم میں اللہ تعالیٰ کفار مکہ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

﴿ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰىo وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰىo عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰىo ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوٰىo ﴾ [النجم:۲تا۶]

”تمہارا ساتھی نہ بھٹکا ہے اور نہ بہکا ہے۔ وہ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتا ہے۔ یہ تو صرف ایک وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔ اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے جو بڑا صاحبِ حکمت ہے“

اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ میں کفار مکہ کو یہ باور کرایا ہے کہ محمد ﷺ جو خود تمہارے اپنے آدمی ہیں جن کے اخلاق و کردار سے تم خوب اچھی طرح واقف ہو اور جن باتوں کی طرف وہ تم کو دعوت دے رہے ہیں وہ ان کے اپنے ذہن و دماغ کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ یہ باتیں تو دراصل وحی الٰہی ہیں جو اللہ کے حکم سے آپ پر ایک نہایت عظیم، زبردست قوت والے اور صاحب حکمت نے نازل کی ہیں۔ یعنی اس قرآن کو لے کر نبی اکرم ﷺ پر نازل ہونے والے حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔

آغاز وحی سے متعلق جو احادیث مروی ہیں ان سے بھی بصراحت یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ پر جب پہلی بار وحی الٰہی نازل ہوئی تو آپ وحی، نبوت اور فرشتہ وحی کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتے تھے۔ اگرچہ آپ فطری طور پر شرک و بت پرستی سے بالکل پاک تھے اور جاہلی معاشرے کی تمام برائیوں سے آپ کا دامن پاک تھا مگر اس سب کے باوجود آپ نبوت و رسالت سے خالی الذہن تھے، چہ جائیکہ آپ اس کے امیدوار ہوتے۔

﴿ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ط ﴾ [القصص:۸۶]

''تم اس بات کے امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی مگر یہ تو تمہارے رب کی طرف سے مہربانی ہوتی۔''

چنانچہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی خالہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو طویل حدیث روایت کی ہے، اس میں وہ فرماتی ہیں:

((أَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّادِقَةُ فِي النَّوْمِ، فَكَانَ لا يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَتْهُ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ، فَكَانَ يَأْتِي حِرَاءَ فَيَتَحَنَّثُ فِيهِ. وَهُوَ التَّعَبُّدُ. اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ، وَيَتَزَوَّدُ لِذَلِكَ، ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى خَدِيجَةَ فَتُزَوِّدُهُ لِمِثْلِهَا حَتَّى فَجِئَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِي غَارِ حِرَاءٍ، فَجَاءَهُ الْمَلَكُ فِيهِ فَقَالَ: اقْرَأْ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدُ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ: اقْرَأْ، فَقُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدُ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ: اقْرَأْ، فَقُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدُ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ: **اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ.** حَتَّى بَلَغَ...... **عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ** [العلق:١......٥]))

فَرَجَعَ بِهَا تَرْجُفُ بَوَادِرُهُ حَتَّى دَخَلَ عَلَى خَدِيجَةَ فَقَالَ: "زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي، فَزَمَّلُوهُ حَتَّى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ

فَقَالَ: "يَا خَدِيجَةُ مَا لِي؟" وَأَخْبَرَهَا الْخَبَرَ وَقَالَ: "قَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي"، فَقَالَتْ لَهُ: كَلَّا أَبْشِرْ. فَوَاللَّهِ لا يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَصْدُقُ الْحَدِيثَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ. ثُمَّ انْطَلَقَتْ بِهِ خَدِيجَةُ حَتَّى أَتَتْ بِهِ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ أَسَدِ بْنِ عَبْدِالْعُزَّى بْنِ قُصَيٍّ وَهُوَ ابْنُ عَمِّ خَدِيجَةَ أَخُو أَبِيهَا وَكَانَ امْرَأً تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعَرَبِيَّ، فَيَكْتُبُ بِالْعَرَبِيَّةِ مِنَ الْإِنْجِيلِ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ يَكْتُبَ، وَكَانَ شَيْخًا كَبِيرًا قَدْ عَمِيَ.

فَقَالَتْ لَهُ خَدِيجَةُ: أَيِ ابْنَ عَمِّ! اسْمَعْ مِنِ ابْنِ أَخِيكَ، فَقَالَ وَرَقَةُ: ابْنَ

أَخِي مَاذَا تَرَى! فَأَخْبَرَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا رَأَى فَقَالَ وَرَقَةُ: هَذَا النَّامُوسُ الَّذِي أُنْزِلَ عَلَى مُوسَى ، يَا لَيْتَنِي فِيهَا جَذَعًا أَكُونُ حَيًّا حِينَ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَوَمُخْرِجِيَّ هُمْ؟ فَقَالَ وَرَقَةُ: نَعَمْ ، لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ إِلَّا عُودِيَ ، وَإِنْ يُدْرِكْنِي يَوْمُكَ أَنْصُرْكَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا......))

''پہلے پہل وحی کی ابتدا سچے یا اچھے خوابوں سے ہوئی اور آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ صبح کے اجالے کی مانند ہوتا۔ آپ غار حراء میں جا کر کئی کئی راتیں تحنث......عبادت......کرتے۔ اس کے لیے آپ ضروری توشہ لے جاتے۔ پھر خدیجہ کے پاس واپس آتے تو وہ اسی طرح کا سامانِ ضرورت ساتھ کر دیتیں۔ یہاں تک کہ ایک دن اسی غار حراء میں اچانک حق۔ وحی۔ کا ظہور ہو گیا اور آپ کی خدمت میں فرشتہ حاضر ہو گیا اور کہا: پڑھو، نبی ﷺ نے فرمایا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے مجھے پکڑ کر اس طرح بھینچا کہ میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو میں نے کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے دوبارہ مجھے پکڑ کر بھینچا کہ میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو، میں نے کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے تیسری بار پھر مجھے پکڑ کر بھینچا یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ. پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ یہاں تک کہ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ اس نے انسان کو وہ علم سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ تک پہنچ گیا۔

رسول اللہ ﷺ لرزاں و ترساں واپس ہوئے اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: مجھے کپڑا اڑھا دو۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو کپڑا اڑھا دیا یہاں تک کہ آپ کی گھبراہٹ جاتی رہی۔ آپ نے فرمایا: خدیجہ! مجھے کیا ہوا؟ اور ان کو اپنے ساتھ پیش آمدہ واقعہ کی خبر دی اور فرمایا: مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔

خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ہرگز نہیں! خوش ہو جائیے۔ اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا؟ آپ رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کے مصائب کو برداشت کرنے میں مدد

دیتے ہیں۔ پھر خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کو لے کر بھاگیں اور آپ کو ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزی بن قصی کے پاس لے گئیں۔ وہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچا زاد بھائی یعنی ان کے باپ کے بھائی کے بیٹے تھے۔ وہ ایسے شخص تھے جس نے جاہلیت میں نصرانیت اختیار کر لی تھی، عربی میں لکھتے تھے اور انجیل سے عربی میں جو اللہ چاہتا ترجمہ کرتے تھے۔ بہت بوڑھے اور نابینا ہو چکے تھے۔

خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا: اے ابن عم! اپنے بھتیجے سے سنئے۔ ورقہ نے کہا: بھتیجے تم نے کیا دیکھا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جو دیکھا تھا بیان کیا۔

ورقہ نے کہا: یہ وہی ناموس...... عالم بالا سے وحی لانے والا فرشتہ...... ہے جو موسیٰ پر نازل کیا گیا تھا۔ کاش میں آپ کے زمانۂ نبوت میں قوی ہوتا۔ کاش میں اس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا وہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا: ہاں کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ کوئی وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لائے ہیں اور اس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر مجھے آپ کا زمانہ ملا تو میں آپ کی پر زور مدد کروں گا''[1]

اس حدیث کا لفظ لفظ یہ صراحت کر رہا ہے کہ اس پہلی وحی کے نزول اور حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد سے ایک لمحہ قبل تک آپ کا ذہن اس وحی کے تصور سے خالی تھا۔ امام محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ "حَتّٰی فَجِئَهُ الْحَقُّ" کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی بالکل اچانک آئی جس کی آمد کی آپ کو توقع نہیں تھی۔[2]

قرآن و حدیث کے ان صریح اور واضح بیانات کے باوجود بکثرت صوفیا کا یہ عقیدہ ہے کہ وحی کی آمد سے قبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کا علم رکھتے تھے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی تعلیم دینی چاہی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں۔ اور جب انہوں نے اس کا سبب معلوم کرنا چاہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب وحی تمہارے حوالے کی جائے تو پردہ اٹھا کر دیکھنا۔ چنانچہ حضرت جبریل علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور دیکھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی ان کو وحی کر رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر جبریل علیہ السلام زور سے چیخے: سبحان اللہ! مِنْكَ

---

[1] صحیح بخاری ۳، ۳۳۹۲، ۴۹۵۳، ۴۹۵۵، ۴۹۵۷، ۶۹۸۲۔ صحیح مسلم: ۱۶۰ (۴۰۳)
[2] المنهاج في شرح صحيح مسلم: ص ۱۹۵

وَاِلَيْكَ يَا مُحَمَّدُ! اے محمد! آپ سے آپ کی طرف؟ مطلب یہ ہے کہ آپ ہی وحی کر رہے ہیں اور آپ ہی وحی وصول بھی کر رہے ہیں۔[1]

یہ من گھڑت اور جھوٹا واقعہ کسی صوفی کی زبان سے ''حالت سکر'' میں نکلنے والی ''بڑ'' نہیں ہے بلکہ تصوف کے نظریہ ''حلول'' اور نظریہ ''وحدت الوجود'' کا ترجمان ہے۔ یعنی محمد ہی اللہ ہیں اور اللہ ہی محمد ہے۔

حلول کا مطلب یہ ہے کہ لاہوت (اللہ) ناسوت (انسان) میں حلول کر گیا اور دونوں ایک ہو گئے۔ اس کا نعرہ سب سے پہلے حلاج نے لگایا تھا جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے۔ امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ اشاعرہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''امت میں ایک ایسی جماعت ہے جو تصوف پر عمل پیرا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اللہ کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مادی جسموں میں حلول کر لے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ جب کسی ایسی چیز کو دیکھتے ہیں جو ان کو خوش منظر لگتی ہے تو کہتے ہیں: ہمیں معلوم نہیں، شاید وہ ہمارا رب ہو''

میں...... ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ...... کہتا ہوں کہ یہ عقیدہ رکھنے والا فرقہ دو گروہوں میں بٹا ہوا ہے:

(۱) ایک گروہ اس بات کا مدعی ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہر خوبصورت اور خوش منظر شکل میں حلول کر لیتا ہے۔

(۲) دوسرے گروہ کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کامل انسانوں میں حلول کر لیتا ہے، وہ کامل انسان جن کے دل خواہشات سے آزاد ہو چکے ہوں، اعلیٰ اخلاق سے موصوف ہوں اور برے اخلاق سے پاک ہوں۔ ادھر نصاریٰ کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسیح کے بدن میں حلول کر لیا ہے اور اس کو ڈھال بنا لیا ہے۔ جبکہ اتحادی (وحدت الوجود کے داعی) یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وجود مطلق ہے جس کو ہر اصلی اور حقیقت نے زیب تن کر لیا ہے۔ اس لیے اللہ ہی موجودات کے عینِ وجود سے عبارت ہے۔[2]

وحدت الوجود کے بانی محی الدین محمد بن علی المعروف بابن عربی ہیں۔ اس نظریہ کی رو سے موجود صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ کائنات اور انسان سب عین اللہ تعالیٰ ہیں۔ اس نظریہ کی رو سے جو خالق ہے وہی مخلوق ہے۔ جو معبود ہے وہی عابد ہے۔ وحدت الوجود کے نظریہ کی رو سے بت پرست، صلیب پرست، آتش پرست اور نجوم پرست سب مؤحد قرار پاتے ہیں۔ کیونکہ جب حقیقت میں اللہ کے سوا کچھ بھی نہیں

---

[1] هذه هي الصوفيه ص: ۸۷ بحواله محبة الرسول ﷺ ص ۱۹۹
[2] مدارج السالكين ص: ۳٤٦، ۳٤۷، ج:۳

ہے اور اللہ ہی وجود مطلق ہے جو تمام موجودات میں جاری و ساری ہے تو پھر موحد و مشرک برابر ہیں۔ اور جو توحید ہے وہی شرک ہے اور جو شرک ہے وہی توحید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے جو احکام و ہدایات دی ہیں وہ بے معنی ہو جاتی ہیں۔

کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ ''نور محمدی' حلول اور وحدت الوجود کے قائل تمام صوفیا نہیں ہیں بلکہ صرف غالی صوفیا یہ عقائد یا نظریات رکھتے ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اہل تصوف میں جو لوگ اعتدال پسند اور کتاب و سنت کی تعلیمات کے داعی معروف ہیں ان کے یہاں بھی حلاج اور ابن عربی جیسے الحاد و زندقہ کے داعیوں کے لیے نرم گوشے ہیں اور دبے لفظوں میں وہ ان کو ''معذور'' مانتے رہے ہیں۔

شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ متوفی ۱۰۳۴ھ مطابق ۱۶۲۴ء کی تصوف کی دنیا میں بہت بڑا نام ہے۔ کچھ لوگ ان کو گیارہویں صدی ہجری کا مجدد مانتے ہیں۔ تحریر فرماتے:

صاحب حق اور صاحب باطل میں امتیاز کا معیار شریعت میں استقامت اور عدم استقامت ہے۔ صاحب حق سکر و بے تمیزی کے باوجود شریعت کے کسی اصول سے سرمو انحراف نہیں کرے گا۔ منصور جس نے ''انا الحق'' کہا تھا قید خانے میں پابہ زنجیر ہونے کے باوجود روزانہ پانچ سو رکعت نفل نماز پڑھتا تھا اور وہ کھانا جو اسے ظالموں کے ہاتھ سے پہنچتا تھا اگرچہ حلال تھا، لیکن اسے نہیں کھاتا تھا۔ لیکن جو صوفی صاحب باطل ہوتا ہے اس پر شریعت کے احکام کی پابندی کوہ قاف جیسی مشکل ہوتی ہے۔[1]

یہ عبارت اس امر پر بصراحت دلالت کرتی ہے کہ شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ حلاج کو صاحب حق اور صاحب استقامت سمجھتے تھے۔ حلاج کے افکار و نظریات سے وہ مکمل طور پر واقف تھے جن کو کسی بھی تاویل سے حق نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تو کیا وہ اس کو اس وجہ سے صاحب حق اور صاحب استقامت سمجھتے تھے کہ وہ قید خانے میں روزانہ پانچ سو رکعتیں نفل نماز ادا کرتا تھا اور کیا حالت کفر میں عبادت کا کوئی اعتبار ہے؟ کیا ان کے سامنے قرآن پاک کی یہ آیت نہیں تھی:

﴿ وَلَقَدْ اُوحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ﴾ [الزمر:٦٥]

''اے نبی! تمہاری طرف اور تم سے پہلے مبعوث کیے جانے والے تمام انبیاء کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور یقیناً تم خسارہ

---

[1] مکتوب ۴:۱۔ بحوالہ تصوف اور شریعت ص ۱۳۱، ج ۲

اٹھانے والوں میں شامل ہوگے“

مطلب ہے کہ شرک کے ساتھ کسی عمل کو عمل صالح نہیں قرار دیا جائے گا اور جو شخص بھی مشرک رہتے ہوئے اپنے نزدیک کسی کام کو نیکی سمجھ کر کرے گا تو اس پر وہ کسی اجر کا مستحق نہ ہوگا۔

شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے محی الدین ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود پر سخت تنقید کی ہے اور اوپر کی سطروں میں بھی اس کی نکارت اور اس کے خلاف اسلام ہونے کو واضح کیا جا چکا ہے۔ اس کے باوجود شیخ سرہندی ابن عربی کو مقبول بندوں اور مقبول اولیاء میں شمار کرتے ہیں اور ان کے ملحدانہ افکار و نظریات کو ان کے کشف کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ تحریر فرماتے ہیں:

”عجیب بات ہے کہ شیخ محی الدین ابن عربی مجھے اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں میں نظر آئے حالانکہ ان کے بیشتر خیالات و افکار غلط ہیں اور اہل حق کی آراء کے خلاف ہیں۔ ممکن ہے کہ کشف میں غلطی کی وجہ سے انہیں معذور قرار دیا گیا ہو اور خطا اجتہادی کے مرتکب کی طرح انہیں قابل ملامت نہ گردانا گیا ہو۔ شیخ محی الدین کے بارے میں اس طرح کے خیالات صرف اس فقیر کے ہیں۔ کیونکہ میں ان کو مقبول سمجھتا ہوں۔ لیکن ان کے علوم کو غلط اور مضر جانتا ہوں۔ اس کے برخلاف ایک گروہ ایسا بھی ہے جو شیخ کو ان خیالات کی وجہ سے قابل ملامت سمجھتا ہے اور ان کے خیالات و تصورات کو غلط قرار دیتا ہے۔ دوسری طرف ایک گروہ ایسا ہے جو ان کے خیالات کی اتباع کرتا ہے اور ان کو درست سمجھتا ہے۔ نیز دلائل و شواہد کی بنیاد پر ان کی تصدیق کرتا ہے۔

مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں گروہوں نے افراط و تفریط کی راہ اختیار کی ہے اور میانہ روی سے کوسوں دور ہیں۔ شیخ ابن عربی جو ”مقبول اولیاء“ میں سے ہیں، ان کو کشف کی غلطیوں کے سبب کیسے مطعون کیا جا سکتا ہے؟ دوسری طرف ان کے وہ علوم و معارف جو صحیح نہیں ہیں اور اہل حق کی آراء کے خلاف ہیں ان کی تقلید کیسے کی جا سکتی ہے اور ان کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے؟ حق تو وہ راہ وسط ہے جس کی توفیق اللہ تعالیٰ نے اس فقیر کو عطا فرمائی ہے۔[1]

دیکھ لیا آپ نے شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ جیسا قد آور عالم، مصلح اور داعی شیخ ابن عربی کو اللہ کا مقبول بندہ اور مقبول ولی قرار دے رہا ہے۔ جبکہ اسی عبارت میں وہ ان کے علوم کو غلط اور مضر بھی قرار دے چکے ہیں۔ اپنی دوسری تحریروں میں ان کے افکار و تصورات کو قرآن و سنت کی واضح اور صریح تعلیمات کے خلاف قرار

---

[1] مکتوب نمبر ۴: ۷، بحوالہ تصوف اور شریعت: ص ۲۹۰ ج ۲

دے کر ان پر سخت تنقید بھی کر چکے ہیں۔ شیخ نے منصور حلاج اور محی الدین ابن عربی کی کتابوں کا بغائر نظر مطالعہ کیا تھا اور پورے یقین قلب کے ساتھ ان کے افکار و عقائد کو کتاب و سنت کے خلاف پایا تھا۔ کیونکہ قرآن کی کسی ایک بھی آیت اور رسول اکرم ﷺ کے کسی ایک بھی ارشاد سے حلول اور وحدت الوجود کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ اس کے باوجود وہ ان دونوں کے لیے اپنے دل میں یہ نرم گوشہ کیوں رکھتے تھے؟

اس سوال کا جواب ان کی مذکورہ تحریر میں موجود ہے۔ یعنی وہ ابن عربی کے ملحدانہ افکار و عقائد کو اجتہادی غلطی یا کشف کی غلطی تصور کرتے تھے۔ اس لیے ان کی نظر میں وہ ''معذور'' تھے۔

رہا منصور حلاج تو اس کو وہ صاحب حق اور صاحب استقامت قرار دے چکے ہیں۔

شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ کتاب و سنت کے جید عالم تھے۔ ان کو اتنی بات تو معلوم رہی ہوگی کہ اجتہاد کی کوئی شرعی بنیاد اور اصل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شرعی نص اپنے مدلول میں واضح اور دوٹوک نہ ہو تو دوسرے شرعی دلائل اور شریعت کے مزاج اور منشا کی روشنی میں (غور و فکر) کے ذریعہ اس شرعی نص کا حکم معلوم کیا جاتا ہے۔

لیکن اگر کوئی نص قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ ہو بایں معنی کہ اس نص کی نسبت اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے یقینی ہو اور اپنے مفہوم و مدلول میں بالکل واضح ہو تو اس مسئلے سے متعلق اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے جس مسئلے سے متعلق وہ نص ہے۔

اور تمام ائمہ اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ کتاب و سنت میں عقائد کو ان کی تمام تفصیلات کے ساتھ واضح کر دیا گیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ توحید کا مسئلہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور توحید کی تینوں قسموں: توحید الوہیت، توحید ربوبیت اور توحید الاسماء والصفات میں سے کوئی بھی ایسی قسم نہیں ہے جس کو لوگوں کے اجتہاد کے لیے تشنہ چھوڑ دیا گیا ہو کیونکہ توحید اساسِ دین ہے۔

سوال یہ ہے کہ کتاب و سنت کی کسی دلیل سے بذریعہ اجتہاد حلول اور وحدت الوجود کا ثبوت ملتا ہے؟ اشارۃً ہی سہی؟ بلکہ یہ نظریہ تو اسلامی عقیدے کی روشنی میں سراسر کفر و الحاد ہے۔ جیسا کہ اوپر کی سطروں میں واضح کیا گیا ہے تو پھر حلول اور وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے والا، اسی کو صحیح دین تصور کرنے والا اور لوگوں کو اس کی دعوت دینے والا اجتہادی غلطی کا مرتکب کیونکر قرار نہیں دیا جا سکتا؟ اس منطق کی رو سے تو دنیا کا کوئی مذہب بھی غلط نہیں ہے اور کسی بھی مذہب اور نظریہ کا ماننے والا کافر یا مشرک نہیں

ہے۔ بلکہ سب صاحب حق اور صاحب استقامت اور سب اللہ کے مقبول بندے بلکہ مقبول اولیاء قرار پاتے ہیں۔ العیاذ باللہ۔

شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''شیخ ابن عربی جو مقبول اولیاء میں سے ہیں ان کو کشف کی غلطیوں کے سبب کیسے مطعون کیا جا سکتا ہے؟

شیخ کی مراد یہ ہے کہ ابن عربی کی زبان و قلم سے شریعت کے خلاف جو باتیں نکل گئی ہیں وہ ان کے کشف کا نتیجہ ہیں، اس لیے ان کی بنیاد پر ان کی طعن و تشنیع صحیح نہیں ہے۔

تصوف کی کتابوں میں اولیاء اللہ یا عارفین باللہ کے حوالے سے کشف و کرامت اور الہام کا ذکر بڑی کثرت سے ملتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اسلام کے شرعی ماخذوں کتاب و سنت کے متوازی اولیاء اللہ کا کشف اور ان کا الہام بھی شرعی ماخذ ہے، بلکہ بسا اوقات اس کو کتاب و سنت کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اس تناظر میں کشف و الہام کی شرعی حیثیت کو واضح کر دینا ضروری ہے۔ لیکن کشف و کرامت اور الہام اولیاء اللہ کے لیے چونکہ خاص ہیں اس لیے پہلے اولیاء اللہ کی تعریف کر دینا ضروری ہے تاکہ سلسلۂ کلام میں ایک منطقی ربط قائم رہے۔

ولی کون ہے:

ولی جس کی جمع اولیاء ہے، ''وَلِيَ يَلِيُ'' سے بنا ہے جو فعیل کے وزن پر ''صفت مشبہ'' ہے۔ صفت مشبہ اس اسم کو کہتے ہیں جس میں فعل کا مصدری معنی دائمی ہو، عارضی نہ ہو۔ اور اپنے موصوف سے کبھی جدا نہ ہوتا ہو۔ وَلِيَ يَلِي وَلْيًا وَوِلَايَةً وَ وَلَايَةً کے معنی ہیں: بالکل قریب ہونا، ملا ہونا، دوست ہونا، محبت کرنا اور مدد کرنا وغیرہ۔

اَلْوَلِيُّ...... اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے اور قرآن پاک میں متولی، کارساز، حامی، ناصر، آقا، سرپرست، نگران کار، ساتھی اور دوست وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں کا ولی ہونے کا مطلب ہے کہ وہ ان کا حامی و ناصر، متولی و کارساز اور آقا و سرپرست ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ط ﴾ [البقرة:٢٥٧]

''جو لوگ مومن ہیں ان کا متولی اور کارساز اللہ ہے وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں

لاتا ہے اور جنہوں نے کفر کیا ہے ان کے کار پرداز طاغوت ہیں جو ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں‘‘

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ان کے امور کا متولی اور ان کا حامی و ناصر اور کارساز اللہ تعالیٰ ہے جو ان کی دست گیری فرماتا ہے اور ان کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر معرفت حق کی روشنی میں لے جاتا ہے۔ اور جو لوگ کفر کا راستہ اختیار کرتے ہیں ان کی نکیل طاغوت کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جو اسے معرفت حق کی روشنی اور فلاح و سعادت کی راہ سے بہت دور غلط راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ طاغوت سے مراد ایسا شخص ہے جو حق تعالیٰ کا باغی ہو۔ صحیح راہ سے دور اور دین فطرت سے منحرف ہو۔ طاغوت انسانوں میں بھی ہوتا ہے اور شیطانوں میں بھی۔

﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍo ﴾ [البقرۃ:۱۰۷]

’’کیا تمہیں معلوم نہیں کہ زمین اور آسمانوں کی فرماں روائی اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے سوا تمہاری خبر گیری اور مدد کرنے والا کوئی نہیں۔‘‘

اس آیت میں ولی بمعنی متولی، نگران کار، اور خبر گیری کرنے والے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بندوں کے اللہ کا ولی ہونے کا مطلب ہے کہ وہ اس کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔ اس کے احکام بجا لاتے ہیں۔ جن باتوں سے اس نے منع فرمایا ہے ان کا ارتکاب نہیں کرتے۔

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَo الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَo ﴾ [یونس:۶۲، ۶۳]

’’سن لو اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یعنی جو ایمان لائے اور جو ڈرتے ہیں‘‘

قرآن پاک کی یہ واحد آیت ہے جس میں اولیاء اللہ کی تعریف اور ان کا وصف بیان کیا گیا یعنی اللہ کے ولی مؤمن اور متقی ہوتے ہیں۔ ’’آمَنُوا‘‘ میں ایمانیات وعقائد سے متعلق تمام باتیں داخل ہیں اور یَتَّقُون میں تمام اعمال صالحہ داخل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ولی اور دوست مؤمن اور متقی لوگ ہوتے ہیں۔ یعنی جو شخص بھی ان دو صفات: ایمان اور تقویٰ سے موصوف ہو وہ ولی ہے۔ ایمان اور تقویٰ کے تمام

ارکان کتاب وسنت میں بیان کردیے گئے ہیں۔ لہٰذا ولی بننے کے لیے یونانی فلاسفہ، مسیحی راہبوں، ہندو سادھوؤں اور بدھ بھکشوؤں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے لیے اللہ اور رسول کافی ہیں۔

﴿ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ۝ ﴾ [المائدہ:۵۵]

''تمہارے دوست تو صرف اللہ، اس کے رسول، اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں''

اسی سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۴۱ سے منافقین کا ذکر آ رہا تھا۔ آیت نمبر ۵۱ میں مسلمانوں سے فرمایا گیا ہے کہ تم یہود ونصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست نہیں اور تم میں سے جو ان کو دوست بنائے گا تو اس کا شمار بھی اِنہیں میں ہوگا۔ پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اللہ عزوجل، اس کے رسول اور مؤمنوں کو اپنا دوست بنائیں کیونکہ اہل ایمان کی دوستی اور ولایت کے حق دار تو صرف اللہ تبارک وتعالیٰ، اس کے رسول اور مؤمنین ہیں۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے دوستی اور ولایت یا ان کو دوست بنانے کا مطلب ان سے حد درجہ محبت اور ان کے احکام وہدایات کی بے چون وچرا اطاعت ہے۔ اور اہل ایمان کے ایک دوسرے کا ولی اور دوست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے محبت کریں اور ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں۔

﴿ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ط اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ط اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝ ﴾ [التوبہ:۷۱]

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ رحم فرمائے گا۔ بے شک اللہ غالب اور صاحب حکمت ہے''

ہر مومن اللہ کا ولی ہے:

اوپر جو قرآنی آیات نقل کی گئی ہیں ان میں مسلمانوں کی کسی خاص جماعت، گروہ یا افراد کو اولیاء اللہ قرار نہیں دیا گیا ہے اور نہ کہیں ایسی خاص ظاہری اور باطنی صفات بیان ہوئی ہیں جن سے موصوف ہونے والوں کو عام مسلمانوں میں کوئی امتیازی مقام حاصل ہوتا ہو۔ اسی وجہ سے ''عقیدہ طحاویہ'' میں لکھا ہے۔

((وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلُّهُمْ أَوْلِيَاءُ الرَّحْمٰنِ وَأَكْرَمُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَطْوَعُهُمْ وَأَتْبَعُهُمْ لِلْقُرْآنِ))[1]

''تمام مومنین رحمٰن کے دوست ہیں اور اللہ کے نزدیک ان میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہیں جو قرآن کے سب سے زیادہ اطاعت گزار اور تابع فرمان ہوں''

امام طحاوی رحمہ اللہ کی مذکور عبارت اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے جس کی قرآنی بیانات سے مکمل تائید ہوتی ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث قدسی بھی اس کے خلاف نہیں ہے جس کی تخریج امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں کی ہے اور جس کا پہلا فقرہ ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى قَالَ: مَنْ عَادَى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ......))[2]

''جو میرے کسی ولی سے دشمنی کرے گا تو میں نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔''

اس حدیث میں اللہ کے ولی سے مراد اس کا مومن و مطیع بندہ ہی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''اللہ کے ولی سے مراد اللہ کی معرفت رکھنے والا ہے جو اس کی اطاعت کا پابند اور اس کی عبادت میں مخلص ہو۔''[3] یعنی جس مؤمن بندے کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور وہ اس کی اطاعت و فرماں برداری سے کبھی غافل نہ ہوتا ہو اور اللہ کی عبادت میں غیر اللہ کو شریک نہ کرتا ہو تو ایسا شخص اللہ کا ولی اور دوست ہے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت سے مراد اس کی حسی معرفت نہیں ہے، کیونکہ ہمارے احساسات ذات الٰہی کا ادراک نہیں کر سکتے اور نہ عقلاً ہی ہم اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔ ''لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ'' اور بصارت و بصیرت کے ذریعہ اسی چیز کا تصور اور ادراک ممکن ہوتا ہے جس کی

---

[1] شرح عقیدہ طحاویہ: ص ۲۲ [2] صحیح البخاری: ۶۵۰۲

[3] فتح الباری: ص ۲۸۵۶، ج ۳

کوئی تشبیہ ہو۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شبیہہ ہے نہ مماثل۔ لہٰذا اس کی معرفت سے مراد اس کے ان اسماء و صفات کی معرفت ہے جو کتاب اللہ اور رسول اکرم ﷺ کے ارشادات میں بیان کردی گئی ہیں اور یہ سب توقیفی ہیں۔ بایں معنی کہ کوئی بھی شخص اپنی طرف سے اللہ کو کوئی نام دینے یا اس کو کسی صفت سے متصف کرنے کا مجاز نہیں ہے:

﴿ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ [النحل:٧٤]

''اللہ کے لیے مثالیں نہ بناؤ۔ بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''

اولیاء اللہ کا صوفیانہ تصور غیر اسلامی ہے:

تصوف کی کتابوں میں ولایت یا اولیاء اللہ کے بارے میں جو تصورات ملتے ہیں ان کا کتاب وسنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ وہ صوفیا کے ذہنوں کی پیداوار ہیں۔ مزید یہ کہ اولیاء اللہ کے متعلق اہل تصوف کا یہ عقیدہ کہ وہ تدبیر کائنات اور دنیا کے انتظامات میں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بٹاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں بدترین شرک ہے جو دور جاہلی کے مشرکین کے شرک سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ مشرکین اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں شرک کے قائل نہیں تھے۔ وہ تو صرف الوہیت میں شرک کا ارتکاب کرتے تھے۔

نبی اور ولی میں موازنہ کرنا کفر ہے:

جو لوگ نبوت اور ولایت یا نبی اور ولی میں موازنہ کرتے ہیں وہ درحقیقت منصب نبوت سے ناواقف ہیں۔ اگر کسی کا عقیدہ یہ ہو کہ ولی نبی سے افضل ہوتا ہے تو ایسا شخص کسی بھی حال میں مسلمان نہیں ہوسکتا چہ جائیکہ وہ اللہ کا محبوب اور صالح بندہ ہو۔ اس دنیا میں اللہ کی بندگی اور عبادت کا صحیح طریقہ آغازِ آفرینش سے صرف وہی رہا ہے جس کی دعوت اللہ کے رسولوں اور نبیوں نے دی ہے اور جن کی آخری کڑی خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اللہ کا محبوب اور برگزیدہ بندہ وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی سنت اور طریقے کا سالک ہو۔

طریق نبوت یا اس شریعت پر عمل کرکے ہی ایک مومن اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرسکتا ہے جسے دے کر اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کو اس دنیا میں بھیجا تھا۔

﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ﴾

''اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور شریعت اختیار کرنا چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کی

جائے گی اور آخرت میں وہ نامرادلوگوں میں سے ہوگا'' [آل عمران:۸۵]

جو دین اور شریعت لے کر رسول اکرم ﷺ اس دنیا میں بھیجے گئے تھے وہی سیدھی اور صحیح راہ ہدایت ہے جس پر چل کر انسان اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام طریقہ ہائے بندگی اللہ تعالیٰ اور اس کی رضا سے دور کردینے والے ہیں:

﴿ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ [الانعام:۱۵۳]

''اور فی الواقع یہ ہے میرا راستہ جو سیدھا ہے لہٰذا اسی کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، ورنہ وہ تم کو اس کے راستے سے ہٹا دیں گے۔ یہی وہ حکم ہے جو اللہ نے تمہیں دیا ہے تاکہ تم اس کے غضب سے بچ سکو''

﴿ وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ؕ وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴾ [المائدہ:۱۲]

''درحقیقت اللہ نے بنواسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ہم نے ان میں بارہ نقیب بھیجے تھے اور اللہ نے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نے نماز قائم کی، زکوۃ دیتے رہے اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی پشت پناہی کرتے رہے۔ اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقیناً میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کردوں گا۔ اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ پس اس کے بعد تم میں سے جس نے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا''

معلوم ہوا کہ صحیح اور سیدھی راہ ہمیشہ سے صرف وہی رہی ہے جس پر چلنے کی دعوت اللہ کے رسول اور نبی دیتے رہے ہیں اور ان کے بعد نبی آخر الزماں، خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ نے جس ''صراط مستقیم'' کی ہدایت فرمائی ہے اور جو دین وشریعت دے کر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دنیا میں مبعوث فرمایا صرف وہی دین وشریعت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ومعتبر ہے اور صرف اسی کی پیروی کرکے انسان

اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی سے سرفراز ہوسکتا ہے۔ آخرت کی فلاح اور کامیابی صرف اسی شریعت کی پیروی پر موقوف ہے۔

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝ ﴾ [التوبۃ:۳۳]

''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کردے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔''

یہ دین حق اور یہ ہدایت نامہ عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت اور معیشت سب پر محیط ہے۔ اس میں تزکیہ نفس، تہذیب اخلاق اور احسان کے طریقے بھی ہیں اور محبت، خشیت، زہد، توکل اور اخلاص کی روح پیدا کرنے کے ذرائع بھی۔ اور مختصراً اللہ اور بندے کے درمیان تعلق پیدا کرنے اور اس کو مضبوط بنانے کا کوئی بھی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس کو اس ''دین حق'' میں نظر انداز کردیا گیا ہو:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۝ ﴾ [المائدہ:۳]

''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کردیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کردی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کرلیا ہے''

تکمیل دین والے الٰہی اعلان کے بعد یہ دعویٰ:

''سلوک دو قسم پر منقسم ہے، سلوکِ نبوت اور سلوکِ ولایت اور ہر ایک کے آثار و خواص جدا جدا ہیں...... اولیاء میں سے کسی پر کسی وقت فیضِ نبوت کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی فیض ولایت کا۔''[1]

باطل ہے اور اپنے پیچھے کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ:

(ا)......: طریق ہدایت صرف ایک ہے اور صرف وہی ہے جس کی دعوت تمام انبیاء اور رسولوں نے دی ہے اور جس کی آخری کڑی اسلام ہے۔ جو ایک مکمل دین ہے اس میں عقائد سے لے کر عبادات، معاملات اور سلوک سب کچھ شامل ہے۔

(ب)......: اسلامی عقائد میں نبوت کے متوازی ''ولایت'' نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی اور اگر اللہ اور رسول سے محبت اور دوستی کو ''ولایت'' قرار دے لیں تو پھر یہ نبوت کے تابع ہے بایں معنی کہ جو

[1] شریعت و طریقت ص ۴۵

شخص اللہ اور رسول کی متعین کردہ ''راہ ہدایت'' کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کرے یا اس کے ساتھ اس کو بھی ''راہ نجات'' فلاح و کامیابی کا ذریعہ اور دل میں اللہ کی محبت اور خشیت پیدا کرنے کا وسیلہ تصور کرے تو وہ ''ولی اللہ'' نہیں بلکہ ''ولی الشیطان'' ہے۔

﴿ فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ [الاعراف:۳۰]

''ایک فریق کو اللہ نے ہدایت دی اور دوسرے گروہ پر گمراہی ثبت ہوگئی کیونکہ انہوں نے اللہ کی بجائے شیطانوں کو اپنے دوست بنالیا (اولیاء) اور گمان کر رہے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں''

(ج)......: اسلام نے اللہ سے تعلق جوڑنے کے لیے خلق سے تعلق توڑنے کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ اجتماعیت تو اسلام کی روح ہے اور اس کے سارے فرائض میں اجتماعیت کی روح کارفرما ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی سیرت پاک اہل ایمان کے لیے اسوہ حسنہ ہے۔ آپ نے اللہ سے تعلق مضبوط بنانے کے لیے اللہ کے بندوں سے تعلق منقطع کر لینے کا نہ حکم دیا ہے اور نہ عملاً اس کا نمونہ پیش کیا ہے۔ نکاح جو معاشرتی زندگی کی بنیاد ہے اسلام میں اس کا حکم دیا گیا ہے:

((يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ ، فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ))[1]

''اے نوجوانو! تم میں سے جس کو نکاح کرنے پر قدرت ہو اس کو چاہیے کہ وہ شادی کرلے۔ کیونکہ یہ نگاہ کو نیچی رکھنے اور شرم گاہ کو محفوظ رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور جسے نکاح کرنے کی قدرت حاصل نہ ہو تو اسے چاہیے کہ روزہ رکھے اس لیے کہ روزہ شہوت کو توڑ دیتا ہے''

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي ، فَمَنْ لَمْ يَعْمَلْ بِسُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي ، وَتَزَوَّجُوا ، فَإِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ ، وَمَنْ كَانَ ذَا طَوْلٍ فَلْيَنْكِحْ وَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَعَلَيْهِ بِالصِّيَامِ ، فَإِنَّ الصَّوْمَ لَهُ وِجَاءٌ))[2]

---

[1] صحیح بخاری: ۵۰۶۵۔ صحیح مسلم: ۱۴۰۰

[2] سنن ابن ماجه، حدیث: ۱۵۰۸، (۱۸۷۳)

''نکاح میری سنت سے تعلق رکھتا ہے، پس جس نے میری سنت پر عمل نہ کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور شادیاں کرو، کیونکہ قیامت کے روز میں دوسری قوموں سے تمہاری کثرت پر فخر کروں گا اور جو شخص نکاح کی قدرت رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ نکاح کرے اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو اسے چاہیے کہ وہ روزہ رکھے، اس لیے کہ روزہ شہوت کو کم کرنے والا ہے''

اس کے علاوہ کتاب وسنت میں بیویوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان سے محبت آمیز برتاؤ، والدین کے ساتھ نرمی، الفت اور اللہ تعالیٰ کی معصیت کے سوا دوسرے تمام معاملات میں ان کی اطاعت وفرماں برداری، قرابت داروں سے صلہ رحمی، دوسرے بندگانِ خدا کے ساتھ حسنِ سلوک حتیٰ کہ جو لوگ غیر مسلم ہیں مگر وہ مسلمانوں کو کوئی اذیت نہیں دیتے ان کے ساتھ نیکی اور عدل وانصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ایسی صورت میں کیا ''مزعومہ طریق ولایت'' کتاب وسنت سے ماخوذ قرار دیا جاسکتا ہے؟ لہٰذا جو چیز کتاب وسنت سے ماخوذ نہیں ہے وہ سراسر گمراہی ہے اگرچہ اس میں زہد وتوکل، محاسن اخلاق، احسان واخلاص، صبر وشکر، تزکیہ نفس اور طہارتِ قلب کی بھی باتیں ملتی ہیں۔

کشف والہام حق ہے لیکن.......:

اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور صالح بندوں کو بعض اوقات ''خلاف عادت'' باتوں سے نوازتا ہے۔ اس کی یہ نوازش اور تکریم ''اولیاء اللہ'' کے نام سے کسی خاص جماعت اور گروہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا ہر مومن اور متقی بندہ اس تکریم سے نوازا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض مخفی امور اور باتیں اس پر منکشف فرما دیتا ہے۔

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ٥ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ط ﴾ [الطلاق:۲، ۳]

''جو اللہ سے ڈرتا ہے تو اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دیتا ہے اور ایسی جگہ سے اس کو روزی دیتا ہے جدھر اس کا گمان بھی نہیں جاتا۔''

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ٥ ﴾ [الانفال:۲۹]

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمہارے لیے (حق و باطل، ہدایت وگمراہی کی پہچان کے لیے) دلیل و برہان پیدا کر دے گا اور تم سے تمہاری برائیوں کو

دور کر دے گا اور تمہاری مغفرت فرما دے گا اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے“

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ٥ ﴾ [العنکبوت:٦٩]

”جو لوگ ہماری راہ میں بھر پور جدو جہد کرتے ہیں ہم انہیں اپنی راہیں دکھا دیتے ہیں اور بے شک اللہ نیکو کاروں کے ساتھ ہے“

ان آیتوں سے اللہ کے نیک اور صالح بندوں کے لیے کشف و کرامت اور الہام کا ثبوت ملتا ہے۔ ان تینوں آیتوں میں ایک ہی بات کو مختلف انداز میں ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ اللہ کا تقویٰ اور اللہ کی راہ میں جہاد دونوں ایک ہی ہیں۔ اسی طرح ”مخرج، فرقان“ اللہ کی رضا اور خوشنودی کے راستے بھی ایک ہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں اس کے احکام کی پابندی کرتے ہیں اور جن باتوں سے اس نے روکا ہے ان سے اجتناب کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ان کے حال پر نہیں چھوڑتا بلکہ ان کی دستگیری و رہنمائی فرماتا رہتا ہے۔ مشکلات کے موقع پر ان سے ان کے بچ نکلنے کے راستے پیدا کر دیتا ہے اور رزق کی تنگی کے وقت ان کو دوسروں کا دست نگر نہیں بننے دیتا بلکہ ان کی توقع کے برخلاف ایسی جگہوں سے ان کے لیے رزق کے دروازے کھول دیتا ہے جدھر ان کا گمان بھی نہیں جاتا۔ مگر یہ سب کچھ ان کے لیے ہے ”جو مومن اور متقی ہوں“۔

رہے وہ لوگ جنہوں نے اس دین میں عقائد سے لے کر عبادات، معاملات اور معاشرت تک ہر باب میں اپنے ذوق و خیال سے ایسی باتیں داخل کر دی ہیں جن کا اس دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہوں نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیا ہے تو ایسے لوگ مؤمن اور متقی نہیں ہیں۔ چاہے وہ ہر روز ایک ہزار رکعتیں نوافل کی پڑھتے ہوں، بلا ناغہ روزے رکھتے ہوں اور اللہ کے ذکر سے ان کی زبانیں تر رہتی ہوں۔ اگر ایسے لوگوں سے خلاف عادت کشف و کرامت جیسے امور کا ظہور ہوتا بھی ہے تو ان کا تعلق اس کشف اور الہام سے ہرگز نہیں ہے جس کا ثبوت اوپر نقل کردہ قرآنی آیات سے ملتا ہے۔ بلکہ کشف و الہام کی شکل میں یہ خارق عادت احوال ”فریب نفس“ کے سوا کچھ اور نہیں ہیں۔

پھر کشف کی صفت سے کوئی نیک اور صالح انسان ہر وقت متصف نہیں ہوتا اور نہ یہ اس کی اختیاری صفت ہے۔ بلکہ یہ ایک تکریم ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بعض محبوب بندوں کو کبھی کبھی نوازتا ہے۔

کشف اس اعتبار سے تو معجزات کی مانند ہے کہ معجزات کی طرح یہ بھی خلافِ عادت ہوتا ہے، مگر معجزات کی طرح یہ یقینی اور فریب نفس سے پاک نہیں ہے۔ چونکہ نبی معصوم ہوتا ہے اس لیے اس کے

ہاتھوں ظاہر ہونے والے معجزات یقین کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے انبیاء اور رسولوں کے جو معجزات ثابت ہیں ان پر ایمان ضروری ہے۔ لیکن کوئی نبی عام طور پر اور رسول اکرم ﷺ خاص طور پر ہر وقت معجزہ دکھانے پر قادر نہیں تھے۔

اللہ کے نیک اور صالح بندوں کا کشف نہ ان کے لیے کوئی شرعی دلیل ہے اور نہ غیروں کے لیے۔ اگر کشف مسلّمات دین سے ٹکراتا ہو تو وہ مردود ہے اور اگر اس کا تعلق غیبی امور سے ہو جن کا علم اللہ تعالیٰ کے بتانے سے صرف انبیاء علیہم السلام کو حاصل تھا تو یہ کشف بھی مردود ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو عمومی طور پر اور رسول اکرم ﷺ کو خصوصی طور پر جن غیبی امور کا علم حاصل ہوتا تھا وہ ان کو بذریعہ وحی الٰہی حاصل ہوتا تھا۔ رہی وحی الٰہی تو وہ یقینی ذریعہ علم ہے جبکہ کشف و الہام یقینی ذریعہ علم نہیں ہے حتیٰ کہ مختلف فیہ شرعی دلائل میں سے کسی دلیل کو بذریعہ کشف یا الہام کسی دوسری دلیل پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک ایسے اطمینان قلب کی ہے جو جائز اور مباح امور میں سے کسی امر کو اختیار کرنے سے متعلق کسی مؤمن بندے کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس کشف یا الہام کی بنیاد پر کسی حلال چیز کو حرام قرار دینا یا کسی حرام کو حلال کر دینا صریح گمراہی ہے کیونکہ حلت یا حرمت قطعی دلائل سے ثابت ہوتی ہے۔

اللہ کے صالح اور نیک بندوں کے کشف و الہام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کی طرف کی جانے والی وحی، حضرت خضر علیہ السلام کے الہام اور حضرت مریم علیہا السلام سے فرشتے کی بصورتِ انسان دُو بدو گفتگو پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اولاً تو ان تینوں واقعات کو قرآن میں بیان کرنے کا مقصد کوئی شرعی اصول اور قاعدہ بیان کرنا نہیں ہے۔ ثانیاً یہ تینوں واقعات ناقابل تکرار ہیں۔

کشف و الہام کے بارے میں اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے کتاب و سنت کی روشنی میں وہی حق ہے۔ مگر برا ہو اندھی عقیدت کا جس نے ارباب تصوف کو اس باب میں حق سے بہت دور کر دیا ہے اور انہوں نے اولاً تو کشف و الہام کا دائرہ حد درجہ وسیع کر دیا ہے۔ دوم اس کو اپنے ''مزعوم اولیاء اللہ'' کی دائمی صفت بنا دیا ہے جس سے وہ اپنی من گھڑت اور خود ساختہ ریاضتوں کے نتیجے میں متصف ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر آپ کے دل میں کیا ہے؟ آپ نے کتنے گناہ کیے ہیں؟ اہل قبور کن حالات سے گزر رہے ہیں؟ کون جنتی ہے اور کون جہنمی؟ آپ کے ذکر و اذکار قبول ہو رہے ہیں یا نہیں؟ یہ ساری باتیں اگر اہل کشف و الہام کو معلوم ہو جاتی ہیں تو سوال یہ ہے کہ پھر علام الغیوب اللہ تعالیٰ کے لیے کیا بچا؟

کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے یہ محض دعویٰ ہے۔ نہیں، کیونکہ اس طرح کی

باتوں سے تصوف کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

ایک مشہور صوفی بزرگ لکھتے ہیں، شیخ ابو یزید قرطبی فرماتے ہیں: میں نے یہ سنا کہ جو شخص ستر ہزار مرتبہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھے اس کو دوزخ کی آگ سے نجات ملے۔ میں نے یہ خبر سن کر ایک نصاب یعنی ستر ہزار کی تعداد اپنی بیوی کے لیے بھی پڑھا اور کئی نصاب خود اپنے لیے پڑھ کر ذخیرۂ آخرت بنایا۔ ہمارے پاس ایک نوجوان رہتا تھا جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ یہ صاحب کشف ہے۔ جنت اور دوزخ کا بھی اس کو کشف ہوتا ہے۔ مجھے اس کی صحت میں کچھ تردد تھا۔ ایک مرتبہ وہ نوجوان ہمارے ساتھ کھانے میں شریک تھا کہ دفعتہً اس نے ایک چیخ ماری اور سانس پھولنے لگا۔ کہا کہ میری ماں دوزخ میں جل رہی ہے۔ اس کی حالت مجھے نظر آئی ہے۔ قرطبی کہتے ہیں کہ میں اس کی گھبراہٹ دیکھ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ایک نصاب اس کی ماں کو بخش دوں جس سے اس کی سچائی کا بھی مجھے تجربہ ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے ایک نصاب ستر ہزار کا ان نصابوں میں سے جو اپنے لیے پڑھے تھے، اس کی ماں کو بخش دیا۔ میں نے اپنے دل میں چپکے ہی سے بخشا تھا اور میرے اس پڑھنے کی خبر بھی اللہ کے سوا کسی کو نہ تھی۔ مگر وہ نوجوان کہنے لگا کہ چچا میری ماں دوزخ کے عذاب سے ہٹا دی گئی ہے۔ قرطبی کہتے ہیں کہ مجھے اس قصے سے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو اس برکت کا جو ستر ہزار کی مقدار پر میں نے سنی تھی، اس کا تجربہ ہوا۔ دوسرے اس نوجوان کی سچائی کا یقین ہو گیا۔[1]

غور فرمایئے! ستر ہزار مرتبہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ورد من گھڑت، اس کا یہ مبالغہ آمیز ثواب من گھڑت اور اس کو کسی دوسرے کے نام بخشنا یہ بھی من گھڑت۔ مگر نتیجہ یہ کہ ادھر اس کو بخشا، ادھر دوزخ میں جلنے والی عورت جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دی گئی اور صاحب کشف کی نگاہوں کے سامنے جو غیب کے پردے حائل تھے وہ سب چاک ہو گئے۔ اس نے یہ سب کچھ دیکھ لیا اور حضرت ''ولی'' نے اس کی کشفی خبر کی تصدیق بھی کر دی۔

ایک طرف اس من گھڑت واقعہ کو رکھیے اور دوسری طرف حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث کو رکھیے جس میں آیا ہے کہ نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں میں مدفون دو ایسے انسانوں کی آوازیں سنیں جو عذاب میں مبتلا تھے۔ تو آپ نے فرمایا:

((يُعَذَّبَانِ، وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ، ثُمَّ قَالَ: بَلَى، كَانَ أَحَدُهُمَا لَا يَسْتَتِرُ

[1] فضائل اعمال: ص ۴۰۳-۴۰۴، ج ۱

مِنْ بَوْلِهِ وَكَانَ الْآخَرُ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ، ثُمَّ دَعَا بِجَرِيدَةٍ فَكَسَرَهَا كِسْرَتَيْنِ، فَوَضَعَ عَلَى كُلِّ قَبْرٍ مِنْهُمَا كِسْرَةً، فَقِيلَ لَهُ! يَا رَسُولَ اللَّهِ لِمَ فَعَلْتَ هٰذَا؟ قَالَ: لَعَلَّهُ أَنْ يُخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ تَيْبَسَا أَوْ إِلَى أَنْ يَيْبَسَا))[1]

''ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور کسی بڑی چیز کے نتیجے میں ان کو عذاب نہیں دیا جا رہا۔'' پھر آپ نے فرمایا: کیوں نہیں، ان میں کا ایک اپنے پیشاب سے احتیاط نہیں برتتا تھا اور دوسرا چغل خوری کیا کرتا تھا۔ پھر آپ نے کھجور کی ایک ٹہنی طلب کی۔ اس کو دو حصوں میں توڑا اور ہر قبر پر ایک حصے کو گاڑ دیا۔ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول آپ نے ایسا کیوں کیا؟ فرمایا: شاید ان ٹہنیوں کے خشک ہونے تک ان کے عذاب میں تخفیف رہے''

اور صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے:

((إِنِّي مَرَرْتُ بِقَبْرَيْنِ يُعَذَّبَانِ، فَأَحْبَبْتُ بِشَفَاعَتِي، أَنْ يُرَفَّهَ عَنْهُمَا، مَا دَامَ الْغُصْنَانِ رَطْبَيْنِ))[2]

''میرا گزر دو ایسی قبروں سے ہوا جن میں مدفون دونوں مردوں پر عذاب ہو رہا ہے۔ پس میں نے چاہا کہ میری شفاعت (دعاء) سے اس وقت تک ان کے عذاب میں تخفیف رہے جب تک دونوں ٹہنیاں ہری رہیں''

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے دونوں قبروں کے مردوں پر ہونے والے عذاب سے مطلع فرمایا اور آپ نے ان کے لیے دعاء فرمائی۔ آپ کی دعاء ان کے حق میں ایک مدت کے لیے قبول ہوئی۔ یعنی جب تک ان قبروں پر گاڑی ہوئی ٹہنیاں تر رہیں گی اس وقت تک ان پر ہونے والے عذاب میں تخفیف رہے گی۔

مذکورہ دونوں قبروں میں مدفون مردے نبی اکرم ﷺ کے صحابی تھے اور وہ جس عذاب میں مبتلا تھے اس کا سبب یہ تھا کہ ان میں سے ایک پیشاب کرتے ہوئے احتیاط نہیں برتتے تھے اور پیشاب کے چھینٹے ان کے کپڑوں پر پڑتے تھے اور دوسرے چغل خور تھے۔ جب رسول اکرم ﷺ نے ان کے حق میں دعاء فرمائی تو وہ صرف عارضی مدت کے لیے قبول ہوئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا کہ آپ

[1] صحیح بخاری: ح۲۱۶، ۲۱۸، ۱۳۶۱، ۶۰۵۲، ۶۰۵۵۔ صحیح مسلم: ۲۹۲
[2] صحیح مسلم: ح ۳۰۱۲ (۷۵۱۸)

کھجور کی ایک ہری شاخ کو دو حصوں میں تقسیم کر لیں اور ان میں سے ہر ایک کو مذکورہ قبروں پر گاڑ دیں۔ جب تک یہ شاخیں خشک نہ ہوں گی، تر رہیں گی اس وقت تک ان کے عذاب میں تخفیف رہے گی۔

رسول رحمت ﷺ کی دعاء سے دو مسلمان بندوں پر ہونے والے عذاب میں صرف تخفیف ہوتی ہے اور وہ بھی عارضی طور پر۔ لیکن ایک ''ولی'' کی من گھڑت دعاء سے عذاب میں مبتلا ایک عورت کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ یہ نہیں معلوم کہ اس کے عذاب کا سبب کیا تھا؟ مزید یہ کہ ''عالم برزخ'' میں اہل معصیت اور کفار و مشرکین قبروں ہی میں رہیں گے اور ان کو صبح و شام جہنم کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قیامت تک ان کا یہی حال رہے گا اور قیامت میں حساب کتاب کے بعد ان کو جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ (یٰس: ۵۱،۵۲، غافر: ۴۶)

حافظ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابوبکر سیوطی لکھتے ہیں:

بعض اولیاء کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک فقیہہ کی مجلس میں حاضر ہوئے جس نے ایک حدیث بیان کی۔ تو مذکورہ فقیہہ سے ولی نے کہا: یہ حدیث باطل ہے۔ اس پر فقیہہ نے اس ولی سے دریافت کیا: تم کو کہاں سے یہ معلوم ہوا؟ ولی نے جواب دیا: یہ نبی ﷺ تمہارے سر پر کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں: میں نے یہ حدیث نہیں بیان کی ہے۔ اور اس ولی نے فقیہہ پر کشف کیا تو اس نے بھی رسول اللہ ﷺ کو دیکھا......[1]

یا سبحان اللہ! فقیہہ جو شریعت کا عالم ہے اور دوسروں کو شریعت کی تعلیم دے رہا ہے وہ ایسی حدیث سے استدلال کر رہا ہے جس کے بارے میں اس کو تو یہ معلوم نہیں کہ وہ صحیح ہے یا باطل۔ اور ایک نام نہاد ولی اپنی من گھڑت ریاضتوں کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کو دیکھ لیتا ہے اور آپ اس سے یہ بھی فرماتے ہیں کہ: فقیہہ جو حدیث بیان کر رہا ہے وہ آپ نے نہیں بیان فرمائی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ صحیح حدیثوں کا یہ ذخیرہ جو شریعت کا دوسرا بنیادی ماخذ ہے اور جس کو ہزاروں علمائے حدیث نے روایت و درایت کی کسوٹی پر پرکھ کر جمع کیا ہے، اس میں سے کسی بھی حدیث کو کوئی ولی اپنے کشف کے زور پر باطل قرار دے سکتا ہے۔ اور کسی بھی باطل اور جھوٹی روایت کو جس سے ولی کی خود ساختہ عبادتوں اور ریاضتوں کی تائید ہوتی ہو صحیح قرار دے سکتا ہے۔

پھر کشف کے نام پر اس ''فریب نفس'' کو تسلیم کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے

---

[1] الحاوی للفتاوی: ص ۱۹۷، ج ۲

صرف یہ کہ زندہ ہیں بلکہ آپ مختلف جگہوں پر تشریف لے جاتے ہیں اور غیر مرئی حالت میں ہوتے ہیں۔ اس حالت میں آپ کو صرف اولیاء اللہ ہی کشف کے زور پر دیکھ سکتے ہیں۔ جبکہ قرآنی آیات میں یہ صراحت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ دوسرے سابق انبیاء اور رسولوں کی طرح وفات پا چکے ہیں اور قیامت سے پہلے اپنی قبر مبارک سے باہر نہیں نکلیں گے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا خود ارشاد ہے:

((أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَوَّلُ مَنْ يَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ وَأَوَّلُ شَافِعٍ وَأَوَّلُ مُشَفَّعٍ))[1]

''میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور میں پہلا شخص ہوں گا جس کی قبر کھلے گی۔ اور میں پہلا شفاعت کرنے والا ہوں گا، سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قیامت سے پہلے نبی کریم ﷺ اپنی قبر مبارک سے نہیں نکلیں گے اور اس مسئلے کو ایک عقیدہ کی حیثیت حاصل ہے۔ جس پر ائمہ حدیث وفقہ کا اجماع ہے۔ لہٰذا بیداری میں آپ کو دیکھنے کا دعویٰ اس اجماع کے خلاف ہے۔ مزید یہ کہ کوئی بھی شخص مرجانے کے بعد اس دنیا میں واپس نہیں آسکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے اور اس حکم میں انبیاء، اولیاء اور شہداء سب داخل ہیں۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ احد میں ان کے والد حضرت عبد اللہ بن حرام رضی اللہ عنہ کی شہادت کے موقع پر ان سے فرمایا:

((يَا جَابِرُ! أَلَا أُخْبِرُكَ مَا قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لِأَبِيكَ؟ قُلْتُ: بَلَى، قَالَ: مَا كَلَّمَ اللّٰهُ أَحَدًا قَطُّ إِلَّا مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ، وَكَلَّمَ أَبَاكَ كِفَاحًا، فَقَالَ: يَا عَبْدِي! تَمَنَّ عَلَيَّ أُعْطِيكَ، قَالَ: يَا رَبِّ! تُحْيِينِي فَأُقْتَلُ فِيكَ ثَانِيَةً۔ قَالَ: إِنَّهُ سَبَقَ مِنِّي "أَنَّهُمْ لَا يُرْجَعُونَ" (الانبياء:٩٥) قَالَ: يَا رَبِّ! فَأَبْلِغْ مَنْ وَرَائِي، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ هٰذِهِ الْآيَةَ: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا))[2]

''اے جابر! کیا میں تمہیں اس بات کی خبر نہ دوں جو اللہ عزوجل نے تمہارے باپ سے فرمائی ہے؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں، فرمایا: اللہ نے کسی شخص سے بے پردہ بات نہیں کی

---

[1] صحيح مسلم: ٢٢٧٨

[2] جامع ترمذی: ح ٣٠١٠۔ سنن ابن ماجه ١٨٧، ٢٨٥٠

ہے، مگر تمہارے باپ سے اس نے آمنے سامنے بات کی ہے اور فرمایا: اے میرے بندے! مجھ سے اپنی خواہش بیان کر میں تجھے وہ عطا کروں گا۔ تیرے باپ نے عرض کیا: اے میرے رب! تو مجھے زندہ کر دے تاکہ تیری راہ میں دوبارہ قتل کیا جاؤں۔ اللہ نے فرمایا: یہ تو میرا فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ لوگ (جو مر چکے ہیں) دنیا میں واپس نہیں کیے جائیں گے۔ تیرے باپ نے عرض کیا: اے میرے رب! جو لوگ میرے پیچھے ہیں ان کو (میرے مقام بلند سے) مطلع کر دے، تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں ان کو مردہ مت سمجھو"

اس حدیث اور اُس حدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے جس میں قبروں میں انبیاء علیہم السلام کی زندگی کی خبر دی گئی ہے۔ کیونکہ قبر عالم برزخ سے عبارت ہے۔ عالم برزخ اس دنیا اور آخرت کے درمیانی مرحلے کا نام ہے۔ لہٰذا قبر میں رسول اکرم ﷺ کو جو زندگی حاصل ہے وہ برزخی زندگی ہے۔ آپ کا جسم اطہر تو مدینہ منورہ میں آپ کی قبر مبارک میں ہے اور آپ کی روح مبارک "اعلیٰ علیین" یا رفیق اعلیٰ میں ہے اور آپ پر سلام بھیجنے کے وقت آپ کے جسم اطہر میں آپ کی روح مبارک کو لوٹا دینے سے یہ قطعاً مراد نہیں ہے کہ جسم و روح کا یہ اتصال اس طرح ہو جاتا ہے جس طرح دنیاوی زندگی میں تھا۔ یا جس طرح کا اتصال قیامت کے دن ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو احادیث میں اس کی صراحت ہوتی۔ جبکہ قرآن و حدیث میں اس دنیا سے آپ کی رحلت کو "موت" سے تعبیر کیا گیا ہے اور موت اس دنیاوی زندگی کے خاتمہ کا نام ہے۔ لہٰذا حالت بیداری میں کسی شخص کا آپ کو دیکھنا محال ہے۔ کیونکہ اس کے لیے آپ کا اپنی قبر مبارک سے جسم اور روح کے ساتھ باہر نکلنا ضروری ہے۔ جبکہ اوپر جو حدیث نقل کی گئی ہے وہ یہ صراحت کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ وفات پا جانے کے بعد کوئی بھی شخص اس دنیا میں واپس نہیں آ سکتا۔

اسی طرح کسی شخص کا بحالت بیداری رسول اللہ ﷺ کو غیر مرئی شکل میں دیکھنا بھی محال ہے۔ کیونکہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ آپ اس مادی جسم سے نکل کر روحانی یا غیر مرئی وجود اختیار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں اور یہ چیز آپ کی بشریت کے منافی ہے۔

اور اگر بفرض محال یہ مان لیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی مادی ہیئت کو بدل کر روحانی ہیئت اختیار کرنے پر قادر تھے تو پھر کسی بشر کے لیے اس حالت میں آپ کو دیکھنا ناممکن ہے۔ جس طرح کوئی بشر فرشتوں اور جنوں کو ان کی اصلی ہیئت اور شکل میں نہیں دیکھ سکتا۔ شیطانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے:

﴿ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ ﴾ [الاعراف:٢٧]

''شیطان اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے''

اور سورۃ التوبۃ میں اللہ تعالیٰ نے غزوۂ حنین میں اپنی نصرت و تائید کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ○ ﴾ [التوبة:٢٦]

''پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول اور مومنین پر نازل فرمائی اور ایسے لشکر نازل فرمائے جنہیں تم نے نہیں دیکھا''

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس کے رد میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ان حدیثوں کو نہیں پیش کیا جا سکتا جن میں یہ صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام کو دو بار ان کی اصلی شکل میں دیکھا ہے[1] کیونکہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا جو آپ کے لیے خاص تھا۔ بایں معنی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے اور محبوب بندے کے اندر ایسی قدرت پیدا کر دی تھی کہ آپ روح الامین کو ان کی اس شکل میں دیکھ سکیں جس پر اس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ یہ قدرت تزکیہ نفس اور ریاضت سے نہیں پیدا کی جا سکتی۔ اسی وجہ سے ان دو بار کے علاوہ حضرت جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انسانی شکل میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح سابق انبیاء اور رسولوں کے پاس بھی فرشتے ہمیشہ انسانی شکل میں آیا کرتے تھے۔

خلاصہ کلام یہ کہ نام نہاد اولیاء اللہ کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحالت بیداری دیکھنے کے واقعات ان کے ذہنی تخیلات اور فریب نفس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں۔

قارئین کرام! نام نہاد اولیاء اللہ کی تعبیر پر تعجب نہ کریں۔ میں یہ تعبیر کا لفظ سہواً نہیں قصداً استعمال کر رہا ہوں۔ اور اس سے میرا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اولیاء اللہ کسی مافوق البشر ہستیوں کا نام نہیں ہے جیسا کہ اوپر کے صفحات میں قرآنی آیات اور احادیث سے ثابت کیا جا چکا ہے۔ ان کو مافوق البشر ہستیوں کی

[1] صحیح بخاری: ح ٣٢٣٢، ٤٨٥٥۔ صحیح مسلم ح ٤٣٢، ٤٣٩

حیثیت ارباب تصوف نے ایک خاص عقیدے اور تصور کے تحت دی ہے۔ ورنہ اللہ کے تمام مومن اور متقی بندے اولیاء اللہ ہیں۔

ان خود ساختہ اور من گھڑت اولیاء کے بارے میں تصوف کی امہات الکتب اور فضائل اعمال کی کتابوں میں صوفیاء کے جو عقائد بیان ہوئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ: ''اولیاء اللہ'' کے ہاتھوں میں مخلوق کے امور ہیں اور وہ کائنات کے انتظام و انصرام میں تصرف کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کی مشکلات کو حل کرنے، ان کے مصائب اور آفتوں کے ازالے اور ان کو نفع ونقصان پہنچانے پر قدرت رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ''مرجانے کے بعد بھی اولیاء سے تصرفات وخوارق سرزد ہوتے ہیں[1] بلکہ اولیاء (عاشق) مرتے ہی نہیں۔[2]

''رسالہ قشیریہ'' میں ''فراست'' کے باب میں اولیاء اللہ کے کشف و کرامت کے جو واقعات درج ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ غیب کی کوئی بھی ایسی قسم نہیں ہے جس سے اولیاء اللہ مطلع نہ رہے ہوں۔ اس تناظر میں تو اللہ تعالیٰ کی صفت ''علم غیب'' بے معنی ہو جاتی ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ انبیاء کرام ﷩ کے معجزات عام طور پر اور رسول اکرم ﷺ کے معجزات خاص طور پر ان کے اختیاری فعل نہ تھے۔ بلکہ یہ معجزات وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی توفیق سے دکھاتے تھے اور اس صفت سے وہ ہمیشہ متصف نہ ہوتے تھے۔ جبکہ اولیاء اللہ کے بارے میں صوفیاء کا جو عقیدہ ہے وہ یہ کہ کشف و کرامت ان کی لازمی صفت تھی۔ اور وہ جب چاہتے کشف کے ذریعہ غیب کا پردہ چاک کر کے مخفی حقائق کا ادراک کر لیتے حتیٰ کہ دلوں میں پیدا ہونے والے خیالات و افکار، لوگوں کے مخفی اعمال اور ان سے سرزد ہونے والے گناہوں کی تعداد اور ان کے درجات تک سے واقف ہوتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ''مستعمل پانی'' کے ناپاک ہونے کا جو فتویٰ دیا تھا تو اس وجہ سے کہ ''جب وہ کسی شخص کو وضو کرتے ہوئے دیکھتے تو اس پانی میں جو گناہ ڈھلتا ہوا نظر آتا اس کو معلوم کر لیتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ کبیرہ گناہ ہے یا صغیرہ، مکروہ فعل ہے یا خلاف اولیٰ''[3]!!

دراصل اولیاء اللہ کے کشف و الہام اور ان کے دوسرے فضائل و مناقب کے باب میں صوفیاء کی مبالغہ آرائیوں بلکہ گمراہ کن عقائد کا سبب یہ ہے کہ وہ ''توحید'' کے صحیح مفہوم سے نا آشنا رہے ہیں اور ہیں۔ اکابر صوفیاء کی کتابوں اور ان کے ملفوظات کے سنجیدہ مطالعہ سے جو افسوس ناک حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ کہ انہوں نے ''توحید'' کو کتاب وسنت سے سمجھنے کی بجائے اپنے ذوق، الحادی فلسفہ اور غیر مسلم

---

[1] شریعت وطریقت ص ۳۲۷　[2] فضائل اعمال: ص ج ۱　[3] فضائل اعمال: ص ۶۹۴، ج ۱

راہبوں کے اقوال سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ بسا اوقات اپنے خاص ''ترنگ'' میں آ کر بعض صوفیا نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ: قرآن تو پورے کا پورا شرک ہے اور توحید تو صرف وہ ہے جو ہم کہتے ہیں''[1]

﴿ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ﴾ بڑی سنگین بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے...... (الکہف:۵)

میں نے اولیاء اللہ اور کشف و الہام کے مسئلے میں اتنی تفصیل سے اس لیے گفتگو کی ہے تاکہ یہ واضح کر سکوں کہ تصوف کی کتابوں میں اولیاء اللہ کے فضائل و مناقب اور ان کے کشف و الہام سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اور اس سلسلے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ کتاب وسنت سے ماخوذ دلائل پر مبنی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ واقعات ایک ایسی ذہنیت کے ترجمان ہیں جو اسلامی ذہنیت نہیں ہے۔ اور ان سے ایک ایسے دینی تصور کی ترجمانی ہوتی ہے جو کتاب وسنت سے ماخوذ نہیں ہے۔

مذکورہ بحث سے اس خاص عقیدے کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے جو اہل تصوف کے حلقوں میں ''نور محمدی'' کے پھیلنے اور رواج پانے کے پیچھے کارفرما رہا ہے اور میں نے اس سلسلے میں جو کچھ عرض کیا وہ کتاب وسنت کے دلائل کی زبان میں عرض کیا ہے۔ اور کسی کی تضحیک یا تجریح کی بجائے خالص اصولی بحث کی ہے۔ اس لیے کہ اس تحقیقی بحث سے میرا مقصد اِحقاقِ حق اور اِبطال باطل کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

لوح محفوظ:

۱۷۶...... إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ لَوْحًا مَحْفُوْظًا مِنْ دُرَّةٍ بَيْضَاءَ، صَفْحَاتُهَا مِنْ يَاقُوْتَةٍ حَمْرَاءَ قَلَمُهُ نُوْرٌ وَكِتَابُهُ نُوْرٌ، لِلّٰهِ فِيْهِ فِي كُلِّ يَوْمٍ سِتُّوْنَ وَثَلٰثِمِائَةِ لَحْظَةٍ، يَخْلُقُ وَيَرْزُقُ وَيُمِيْتُ وَيُحْيِي وَيُعِزُّ وَيُذِلُّ وَيَفْعَلُ مَا يَشَاءُ۔

''بے شک اللہ نے لوح محفوظ کو سفید موتی سے بنایا ہے۔ اس کے صفحات سرخ یاقوت کے ہیں۔ اس کا قلم بھی نور ہے اور اس کی کتابت بھی نور ہے۔ اس لوح محفوظ میں اللہ تعالیٰ ہر دن تین سو ساٹھ بار نظر ڈالتا ہے اور وہ تخلیق فرماتا ہے، رزق عطا کرتا ہے، مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے۔ عزت اور ذلت دیتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے''

یہ ایک ضعیف روایت ہے جو غیبی امور کے بارے میں قابل استدلال نہیں ہے۔ اس کی تخریج حافظ طبرانی نے المعجم الکبیر[3] میں کی ہے۔ اس کی سند میں زیاد بن عبد اللہ بکائی اور لیث بن ابو سلیم دو راوی

[1] مدارج السالکین: ص ۴۰۷، ج ۳ [2] ص ۱۶۵، ج ۳
[3] ص ۸۸، ج ۳

شامل ہیں اور دونوں ضعیف ہیں۔ حافظ طبرانی نے یہ روایت مذکورہ کتاب میں ایک دوسری سند سے بھی روایت کی ہے[1] جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے۔ اس موقوف روایت کی سند کے تمام راوی، بکیر بن شہاب کے سوا ثقہ ہیں۔ بکیر کا ذکر امام ابوحاتم نے ''شیخ'' کے لقب سے کیا ہے جو ضعیف کا ہم معنی ہے۔ اگرچہ امام ابن حبان نے بکیر بن شہاب کا ذکر اپنی کتاب ''الثقات''[2] میں کیا ہے لیکن تنہا ابن حبان کی توثیق قابل اعتبار نہیں ہے جیسا کہ ائمہ حدیث نے تصریح کی ہے۔

اس روایت کو حافظ سیوطی نے الجامع الصغیر[3] میں اور علامہ ابن ابی العز نے ''شرح العقیدۃ الطحاویہ''[4] میں نقل کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی ''البدایہ والنہایہ''[5] میں یہ روایت نقل کی ہے مگر اس کی صحت وسقم پر کوئی حکم نہیں لگایا۔ پھر ایک روایت ابن عباس سے موقوفاً بھی نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اسحاق بن بشر کہتے ہیں: مجھے مقاتل اور ابن جریج نے مجاہد سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے خبر دی کہ ابن عباس نے فرمایا: لوح محفوظ کے بیچ میں لکھا ہوا ہے:

((لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ، دِيْنُهُ الْإِسْلَامُ، وَمُحَمَّدٌ عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ))

''نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر تنہا اللہ، اس کا دین اسلام ہے۔ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں''

جو اللہ پر ایمان لایا اور جس نے اس کے وعدے کو سچ مانا اور اللہ کے رسولوں کی اتباع کی تو وہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: لوح سفید موتی کی ایک تختی ہے جس کی لمبائی آسمان اور زمین کے درمیان پائی جانے والی مسافت کے برابر اور اس کی چوڑائی مشرق و مغرب کے درمیان پائی جانے والی مسافت کے برابر ہے۔ لوح کے دونوں کنارے موتیوں اور یاقوت کے ہیں۔ اور اس کی جلد سرخ یاقوت کی ہے۔ اس کا قلم نور ہے اور اس کا کلام عرش کے ساتھ مربوط ہے۔ اس کی اصل ایک فرشتے کی حفاظت میں ہے۔

حافظ ابن کثیر نے مزید لکھا ہے: حضرت انس رضی اللہ عنہ اور دوسرے علمائے سلف کا قول ہے: لوح محفوظ اسرافیل کی پیشانی پر ہے۔[6]

---

[1] ص ۳۲، ج۲ [2] ح ۱۶۰۸ [3] ص ۲۶۳
[4] ص ۱۷، ج۱ [5] البدایہ والنہایہ ص ۱۷، ج۱

لہٰذا مذکورہ روایات اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔ کیونکہ کسی بھی روایت کی نسبت نبی مکرم ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ یعنی کوئی روایت مرفوع نہیں ہے۔

مزید یہ کہ عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مجاہد اور دوسرے تابعین کے واسطوں سے جو روایتیں نقل کی ہیں ان میں انہوں نے صحت روایت کا اہتمام نہیں کیا ہے۔ بلکہ جو کچھ ان کو ملا اس کی روایت کر دی۔ یہی حال مقاتل بن سلیمان کا بھی ہے۔ محدثین کے نزدیک وہ ضعیف بھی ہیں۔[1]

ایک اور روایت امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے:

((إِنَّ اللَّوْحَ الْمَحْفُوْظَ الَّذِي ذَكَرَ اللّٰهُ ﴿ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيْدٌ ○ فِيْ لَوْحٍ مَحْفُوْظٍ ﴾ [البروج: ۲۱، ۲۲] فِي جَبْهَةِ إِسْرَافِيْلَ))[2]

"بے شک وہ لوح محفوظ جس کا ذکر اللہ نے اپنے قول میں کیا ہے: بلکہ یہ بلند پایہ قرآن ہے جو لوح محفوظ میں ثبت ہے" اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی میں ہے"

تو یہ روایت بھی منکر ہے۔ اس کی تخریج امام طبری نے قرۃ بن سلیمان کی سند سے کی ہے۔ ہم سے حرب بن سریج نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالعزیز بن صہیب نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔

امام ابو محمد عبدالرحمٰن رحمہ اللہ بن امام ابو حاتم محمد بن ادریس الرازی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب "علل الحدیث" میں لکھا ہے: میں نے اپنے والد سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا جس کو عمرو بن علی نے قرہ بن سلیمان ازدی سے، انہوں نے حرب بن سریج سے، انہوں نے عبدالعزیز بن صہیب سے اور انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيْدٌ ○ فِيْ لَوْحٍ مَحْفُوْظٍ ﴾ کے بارے میں روایت کیا اور بیان کیا ہے کہ لوح محفوظ حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر مثبت ایک تختی کا نام ہے تو میرے والد نے فرمایا: یہ حدیث منکر ہے۔ قرہ مجہول اور ضعیف الحدیث ہے۔[3]

ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب "الجراح والتعدیل" میں لکھا ہے: قرہ بن سلیمان جہضمی، حماد بن زید کا

---

[1] الاتقان ص ۴۷۱، ج۲

[2] تفسیر طبری ص ۹۰، ج۳

[3] ص ۳۱۴، ج۳

ہم نشین تھا۔ اس نے ہشام بن حسان اور معاویہ بن صالح سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ اس سے ابوالولید طیالسی اور عمرو بن علی نے۔ میرے والد نے اس کو ضعیف الحدیث قرار دیا ہے۔[1]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''تقریب التہذیب'' میں لکھا ہے: قرہ سچا تھا لیکن روایت حدیث میں غلطیاں کرتا تھا''[2] حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں یہ روایت نقل کی ہے لیکن اس کی صحت وسقم کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔[3]

حافظ ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کی سند سے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے:

ہم سے معاویہ بن صالح نے بیان کیا کہ ابوالاعیس (عبدالرحمٰن بن سلمان) نے کہا:

۱۷۷ ......مَا مِنْ شَيْئٍ قَضَى اللّٰهُ، الْقُرْآنَ فَمَا قَبْلَهُ وَمَا بَعْدَهُ إِلَّا وَهُوَ فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ وَاللَّوْحُ الْمَحْفُوْظُ بَيْنَ عَيْنَي إِسْرَافِيْلَ لَا يُؤْذَنُ لَهُ بِالنَّظَرِ فِيْهِ۔

''اللہ نے قرآن سے پہلے اور قرآن کے بعد جس چیز کا بھی فیصلہ کیا ہے وہ لوح محفوظ میں درج ہے اور لوح محفوظ اسرافیل کی دونوں آنکھوں کے درمیان ہے۔ ان کو اس پر نظر ڈالنے کی اجازت نہیں ہے''

یہ روایت اولاً تو مقطوع ہے۔ تابعی کے قول یا فعل کو مقطوع کہتے ہیں۔ ثانیاً ابوالاعیس عبدالرحمٰن بن سلمان سے اس کی روایت کرنے والے معاویہ بن صالح، امام لیث بن سعد کے کاتب تھے اور حافظے کے اعتبار سے ضعیف تھے۔ رہے ابوالاعیس عبدالرحمٰن بن سلمان تو ان کی توثیق امام ابن حبان کے علاوہ کسی اور نے نہیں کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں ان کی جرح وتعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اور ابن حبان کے قول کا حوالہ دینے پر اکتفا کیا ہے[4] اور کسی راوی کے بارے میں تنہا ابن حبان کی توثیق اس کی ثقاہت کے لیے کافی نہیں ہے۔ اگر ان روایتوں کی سندیں صحیح بھی ہوتیں تب بھی غیبی امور کے بارے میں موقوف اور مقطوع روایتوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

حافظ ابوجعفر محمد بن الصباح البزار الدولابی نے کتاب الکنی میں لوح محفوظ کے بارے میں مزید

---

[1] الجرح والتعدیل: ص ۱۳۱، ج۳
[2] ص ۹۵ ترجمہ ۱۱۶٤
[3] ص ٦٢٦ ج۳
[4] ص ۲۸۳، ترجمہ: ۳۸۸۳

موقوف روایات نقل کی ہیں[1] مگر انہوں نے اس سلسلے میں ایک بھی مرفوع حدیث نقل نہیں کی ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ لوح محفوظ کے بارے میں کوئی بھی روایت مرفوع نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ لوح محفوظ کے بارے میں تفسیر یا حدیث کی کتابوں میں جو تفصیلات ملتی ہیں وہ نا قابل اعتماد اور نا قابل استدلال ہیں۔ لہٰذا عرش و کرسی کی طرح اس پر ایمان رکھنا بھی اسی صورت میں واجب ہے جس شکل میں کتاب وسنت میں اس کا ذکر آیا ہے۔

عقیدۂ طحاویہ میں ہے:

((نُؤْمِنُ بِاللَّوْحِ وَالْقَلَمِ وَبِجَمِيْعِ مَا فِيْهِ قَدْ رَقَمَ))

''ہم لوح وقلم اور اللہ نے اس میں جو کچھ رقم فرمایا ہے ان پر ایمان رکھتے ہیں''[2]

روح کی حقیقت:

قران پاک میں متعدد مقامات پر روح کا ذکر آیا ہے اور اس کا اطلاق متعدد اشیاء پر کیا گیا ہے۔ کہیں روح سے مراد قرآن پاک ہے تو کہیں عام وحی۔ اسی طرح کہیں روح بول کر حضرت جبریل علیہ السلام مراد لیے گئے ہیں تو کہیں اس کا اطلاق اس چیز پر کیا گیا ہے جس کو اردو میں ''جان'' کہتے ہیں۔ یعنی جس کے ذریعہ جاندار مخلوق زندہ رہتی ہے اور جسم سے جس کے نکل جانے سے موت طاری ہو جاتی ہے۔ ہر جگہ سیاق وسباق سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ روح سے کیا مراد ہے۔

پھر جسم سے روح کے نکلنے کے بھی مختلف درجات ہیں۔ نیند کی حالت میں بھی روح جسم سے کسی نہ کسی شکل میں نکل جاتی ہے مگر جسم کے ساتھ اس کا ایک طرح کا رشتہ باقی رہتا ہے۔ اسی وجہ سے جسم کے اعضائے رئیسہ کام کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن موت کے وقت روح مکمل طور پر جسم کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور اس کے تمام اعضاء معطل ہو جاتے ہیں لیکن خود روح نہیں مرتی۔

قبر یعنی عالم برزخ میں جسم کے ساتھ روح کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ قبر میں انسان جس ثواب یا عذاب سے دو چار ہوتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے اس میں اتنی حس پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ثواب یا عذاب کو محسوس کر سکے اگر چہ اس دنیا میں بسنے والے نہ تو قبر میں مردوں کے احوال کو محسوس کرتے ہیں اور نہ کسی کو ان کے احوال کی حقیقت کا علم ہی حاصل ہے۔ جس شکل میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اہل قبور کے ثواب یا عذاب

[1] ص ۱۱۸، ج۱ [2] ص ۱۶۔ شرح العقیدة الطحاویة: ص ۲۶۳

کی خبر دے دی ہے اس پر اسی شکل میں ایمان رکھنا ضروری ہے۔

روح سراسر ایک ایسے غیبی وجود سے عبارت ہے جس کی حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ انبیاء، اولیاء اور فرشتوں کو بھی نہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ط قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَ مَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ﴾ [الاسراء:٨٥]

''اے نبی! لوگ تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تم لوگوں کو بہت معمولی علم دیا گیا ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں روح سے مراد...... روح نبوت اور وحی ہے یا روح حیات؟ جس کو جان کہتے ہیں یہ میرا موضوع نہیں ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کی طرح صحیح احادیث میں بھی روح کی کوئی تفصیل نہیں بیان ہوئی۔ مثلاً روح فانی ہے یا غیر فانی؟ اس کی تخلیق کب ہوئی اور اس کی حقیقت اور ماہیت کیا ہے؟

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: ایک موقع پر میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک کھیت یا نخلستان میں تھا اور آپ کھجور کی ایک ٹہنی پر ٹیک لگائے ہوئے تھے کہ اتنے میں کچھ یہودی وہاں سے گزرے۔ انہوں نے آپس میں کہا: ان سے روح کے بارے میں سوال کرو۔ ان میں سے ایک نے کہا: تم لوگوں کو اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ دوسرے نے کہا: وہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں کوئی ایسی چیز نہیں بتائیں گے جو تمہیں ناپسند ہو۔ پھر انہوں نے کہا: ان سے دریافت تو کرو۔ لہٰذا انہوں نے آپ سے روح کے بارے میں پوچھا۔ نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم ان کا سوال سن کر خاموش رہے اور ان کو کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر میں سمجھ گیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ لہٰذا میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور جب وحی نازل ہو چکی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿ وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ط قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَ مَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ﴾[1]

لیکن دین کے دوسرے شعبوں کی طرح وضّاعینِ حدیث نے اس غیبی شعبے کو بھی نہیں بخشا۔ اس باب میں جہاں انہوں نے خود حدیثیں گھڑ کر لوگوں میں پھیلائی ہیں وہیں اسرائیلی روایات سے بھی اس شعبے

[1] صحیح بخاری: ح ١٢٥، ٤٧٢١۔ صحیح مسلم: ٢٧٩٤۔ ترمذی ٣٠٦٦۔ مسند امام احمد ٣٦٨٨

کو گندا کیا ہے۔

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں: ہم کو محمد بن ناصر نے خبر دی، کہا: ہم کو مبارک بن عبد الجبار نے خبر دی، کہا: ہم کو عبد الباقی بن احمد نے خبر دی، کہا: ہم کو محمد بن جعفر بن علان نے خبر دی، کہا: ہم کو ابو الفتح ازدی حافظ نے خبر دی، کہا: ہم سے ہاشم بن نصیر نے بیان کیا، کہا: ہم سے شیبان بن محمد نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبد اللہ بن ایوب بن ابی علاج نے بیان کیا، کہا: مجھ سے میرے باپ نے ابو جعفر محمد بن علی بن حسین سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ان کے دادا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

۱۷۸ ...... إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ خَلَقَ الْأَرْوَاحَ قَبْلَ الْأَجْسَادِ بِأَلْفَى عَامٍ، ثُمَّ جَعَلَهَا تَحْتَ الْعَرْشِ، ثُمَّ أَمَرَهَا بِالطَّاعَةِ لِي، فَأَوَّلُ رُوْحٍ سَلَّمَتْ عَلَيَّ رُوْحُ عَلِيٍّ۔

''بے شک اللہ عزوجل نے روحوں کو جسموں سے دو ہزار سال قبل پیدا کیا، پھر ان کو عرش کے نیچے رکھ دیا، پھر ان کو یہ حکم دیا کہ وہ میری اطاعت کریں۔ پس جس پہلی روح نے مجھے سلام کیا وہ علی کی روح ہے''

یہ روایت جھوٹ ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے:

امام ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: حافظ ابو الفتح ازدی نے عبد اللہ بن ایوب اور اس کے باپ ایوب بن ابی علاج کو جھوٹا قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ ان دونوں سے حدیثوں کی روایت جائز نہیں ہے۔ حافظ سیوطی اور ابن عراق نے اس روایت کے موضوع ہونے میں امام ابن الجوزی کی تائید کی ہے۔[1]

۱۷۹ ...... إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الرُّوْحُ۔

''بے شک اللہ نے جو پہلی چیز پیدا کی وہ روح ہے''

یہ روایت بھی باطل اور جھوٹ ہے جس کا ذکر ائمہ حدیث میں سے کسی نے اپنی کتاب میں نہیں۔ اور متاخرین میں صرف علامہ ابو الحسنات عبد الحی لکھنوی نے اس کو اپنی کتاب الآثار المرفوعہ فی الاخبار

---

[1] الموضوعات: ص ۱۹۰، ج ۲، ح ۷۴۷۔ اللآلی المصنوعة: ص ۳۴۹، ج۱۔ تنزیہ الشریعة: ص ۳۶۸، ج۲، ح ۸۱

الموضوعہ میں درج کیا ہے۔[1]

۱۸۰......اَلْأَرْوَاحُ فِي خَمْسَةِ أَجْنَاسٍ: فِي الْإِنْسِ وَالْجِنِّ وَالشَّيَاطِيْنِ وَالْمَلَائِكَةِ، وَالرُّوْحِ وَسَائِرُ الْخَلْقِ لَهَا أَنْفَاسٌ وَلَيْسَتْ لَهَا أَرْوَاحٌ۔

''مخلوقات کی پانچ قسموں اور صنفوں میں روح پائی جاتی ہے: انسانوں، جنوں، شیطانوں، فرشتوں اور روحوں میں۔ رہیں بقیہ مخلوقات؟ ان میں سانس تو ہوتی ہے روح نہیں ہوتی۔''

یہ روایت بھی جھوٹ ہے۔ اس روایت کی سند کے ایک راوی صالح بن حیان کو امام نسائی نے غیر ثقہ قرار دیا ہے۔[2] اور امام ابو حاتم نے لکھا ہے کہ صالح بن حیان ثقہ راویوں کے نام سے ایسی حدیثیں روایت کیا کرتا تھا جو ثقہ راویوں کی روایت کردہ حدیثوں کی طرح نہیں ہوتی تھیں۔[3]

عجیب بات یہ ہے کہ اس جھوٹی روایت میں جنوں اور شیطانوں کو الگ الگ صنف قرار دیا گیا ہے جبکہ دونوں ایک ہی ہیں۔ اسی طرح اس روایت میں حیوانوں کو ذی روح میں نہیں شمار کیا گیا ہے جبکہ صحیح حدیث میں حیوانوں کو ذی روح قرار دیا گیا ہے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا تَتَّخِذُوْا شَيْئًا فِيْهِ الرُّوْحُ غَرَضًا))[4]

''ایسی کسی چیز کو نشانہ مت بناؤ جس میں روح ہو''

اور حضرت سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ایسے لوگوں کے پاس سے گزر ہوا جنہوں نے ایک مرغی کو نشانہ بنا رکھا تھا اور اس پر تیر اندازی کر رہے تھے۔ جب انہوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ نشانہ بازی کرنے والے کون ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے والوں پر لعنت بھیجی ہے۔[5]

---

[1] حدیث نمبر ۴۳   [2] الضعفاء والمتروکین: ص ۵۷، ح ۲۹۰

[3] کتاب المجروحین: ص ۳٦٥، ج۱۔ الموضوعات ص ۲۳۰، ج ۱، ح ۳۱٤۔ تنزیه الشریعه ص ۱۷۰، ج۱، ح٤۔ اللالی المصنوعه: ص ۸۹ ج۱۔ الاباطیل والمناکیر ح ٤۳۳۔ الفوائد المجموعة: ح ۱۳۲۳

[4] صحیح مسلم ح ۱۹۵۷ (۵۰۵۹)

[5] صحیح مسلم ح ۱۹۵۸ (۵۰٦۱)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ حیوانوں میں روح ہوتی ہے کیونکہ مرغی حیوانوں ہی کی ایک قسم ہے۔

شفق کی حقیقت:

جب سورج غروب ہوتا ہے تو اپنے پیچھے افق پر سرخ رنگ چھوڑ جاتا ہے جو تقریباً ایک گھنٹے میں ختم اور معدوم ہوتا ہے۔ اس سرخی کو عربی میں شفق کہتے ہیں۔ سورۃ الانشقاق میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ ﴾ [الانشقاق:١٦، ١٧]

''نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے''

حدیثیں وضع کرنے والوں نے اس سرخی یعنی شفق کے بارے میں بھی حدیثیں گھڑ کر لوگوں میں پھیلا دی ہیں۔ چنانچہ تفسیر کی کتابوں میں بعض روایتیں ان الفاظ میں ملتی ہیں:

١٨١ ...... اَلْحُمْرَةُ الَّتِي فِي السَّمَاءِ مِنْ عَرَقِ الْأَفْعَى الَّتِي تَحْتَ الْعَرْشِ۔

''آسمان میں جو سرخی ہوتی ہے وہ اس سانپ کے پسینے سے پیدا ہوتی ہے جو عرش کے نیچے ہے''

یہ ایک باطل اور بے اصل روایت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد نہیں ہے۔ اس کا ذکر صرف شیخ شمس الدین محمد بن خلیل طرابلسی نے، جو قاوقجی کے لقب سے معروف تھے، اپنی کتاب ''اللُّؤْلُؤُ الْمَرْصُوْعِ فِيْمَا لَا أَصَلَ لَهُ أَو بِأَصْلِهِ مَوْضُوْعٌ'' میں کیا ہے۔[1]

اس باطل روایت میں پہلا دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ شفق کی سرخی سانپ کے پسینے کا نتیجہ ہے۔ اور دوسرا دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ عرش کے نیچے سانپ ہے۔ ''افعی'' ایک نہایت ہی زہریلے خبیث سانپ کو کہتے ہیں جس کا رنگ ''چتکبرا'' ہوتا ہے۔

ایک دوسری روایت حافظ جلال الدین سیوطی نے الجامع الصغیر میں ان الفاظ میں نقل کی ہے:

١٨٢ ...... اَلْحُمْرَةُ مِنْ زِيْنَةِ الشَّيْطَانِ۔[2]

''آسمان کی سرخی شیطان کی زینت سے پیدا ہوتی ہے''

یہ روایت مرسل بھی ہے اور ضعیف بھی۔

مذکورہ دونوں روایتیں اسرائیلات سے ماخوذ معلوم ہوتی ہیں۔

کہکشاں کی حقیقت:

رات میں اگر آسمان صاف ہو تو وسط آسمان میں بے شمار چھوٹے بڑے تاروں کے مجموعے سے

---

[1] ح ١٧٩ [2] ضعيف الجامع الصغير: ح ٢٧٢٩

ایک شاہراہ سی بنی ہوئی نظر آتی ہے جس کو عربی میں ''المجرّۃ'' اور اردو میں کہکشاں کہتے ہیں۔

اوپر دو ایسی باطل روایتیں نقل کی گئی ہیں جن میں سے ایک شفق کی سرخی کو عرش کے نیچے پائے جانے والے سانپ کے پسینے کا اور دوسری میں شیطان کی زینت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

جبکہ بعض موضوع اور جھوٹی روایتوں میں کہکشاں کو عرش کے نیچے پائے جانے والے سانپ کے پسینے کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے:

۱۸۳ ...... اَلْمَجَرَّةُ الَّتِي فِي السَّمَاءِ عَرَقُ الْحَيَّةِ الَّتِي تَحْتَ الْعَرْشِ۔

''آسمان میں کہکشاں اس سانپ کا پسینہ ہے جو عرش کے نیچے ہے''

یہ روایت باطل ہے۔ اس کی تخریج حافظ سیوطی نے اللآلی المصنوعة میں کی ہے۔[1] انہوں نے ایک اور روایت حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی نقل کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یمن روانہ فرمایا تو مجھ سے فرمایا:

((إِنَّكَ تَأْتِي قَوْمًا أَهْلَ الْكِتَابِ: فَإِنْ سَأَلُوْكَ عَنِ الْمَجَرَّةِ، فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهَا مِنْ عَرَقِ الْأَفْعَى الَّتِي تَحْتَ الْعَرْشِ))

''تم وہاں اہل کتاب کے پاس جاؤ گے۔ لہٰذا اگر وہ تم سے کہکشاں کے بارے میں سوال کریں تو انہیں بتانا کہ وہ اس سانپ کے پسینے سے بنی ہے جو عرش کے نیچے ہے''

یہ روایت نقل کرنے کے بعد حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

حافظ طبرانی نے یہ روایت عبد الاعلیٰ بن حکیم کے ترجمہ کے ضمن میں نقل کی ہے اور لکھا ہے: یہ محفوظ نہیں ہے (یعنی شاذ ہے)۔ عبد الاعلیٰ مجہول ہے۔ سند کا دوسرا راوی: ابوبکر بن ابی سبرہ متروک ہے اور اس کی سند کا تیسرا راوی: سلیمان بن شاذکونی بھی متروک ہے۔

اور حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اس روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی سند تاریک ہے اور متن صحیح نہیں ہے۔

اس زیر بحث روایت کی جو سند حافظ طبرانی نے بیان کی ہے وہ یہ ہے:

ہم سے محمد بن ابوزرعہ نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے ہشام بن عمار نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے عبد اللہ بن یزید نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے شعیب بن ابی حمزہ نے، عبد الاعلیٰ بن ابی حمزہ سے، انہوں نے عبادۃ بن نسی

---

[1] ص ۷۸، ج ۱

سے، انہوں نے عبدالرحمٰن بن غنم سے اور انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((اَلْمَجَرَّةُ الَّتِی فِی السَّمَاءِ عَرَقُ الْحَيَّةِ الَّتِی تَحْتَ الْعَرْشِ))

حافظ طبرانی لکھتے ہیں:

یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف اسی سند سے مروی ہے جس کی روایت میں ہشام بن عمار منفرد ہیں۔[1] ہشام بن عمار اگرچہ امام بخاری کے شیوخ میں شمار ہوتے ہیں لیکن ان کی ثقاہت مختلف فیہ ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہشام بن عمار بن نصیر سلمی دمشقی سچے تھے۔ جب سن رسیدہ ہو گئے تو جیسا ان کو بتایا جاتا اسی طرح روایت کرنے لگتے۔ ان کی روایت کردہ قدیم حدیثیں صحیح ہیں''[2]

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

ہشام بن عمار صحیح بخاری کے راویوں میں سے ہونے اور سچے ہونے کے باوجود حافظہ کے کمزور تھے جس کی وجہ سے ناقابل استدلال تھے۔[3]

لہٰذا غیبی امور کے بارے میں یہ روایت مردود ہے۔ کیونکہ ضعیف الاسناد ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے متن سے اسرائیلیات کی بو بھی آتی ہے۔

۱۸٤ ......يَا مُعَاذُ إِنِّی مُرْسِلُكَ إِلٰی قَوْمٍ أَهْلِ الْكِتَابِ فَإِذَا سُئِلْتَ عَنِ الْمَجَرَّةِ الَّتِی فِی السَّمَاءِ فَقُلْ: هِیَ لُعَابُ حَيَّةٍ تَحْتَ الْعَرْشِ۔

''اے معاذ! میں تم کو اہل کتاب کی قوم میں بھیج رہا ہوں۔ اگر تم سے کہکشاں کے بارے میں پوچھا جائے تو کہنا: یہ اس سانپ کا لعاب ہے جو عرش کے نیچے ہے''

حافظ سیوطی نے لکھا ہے: یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی سند کا ایک راوی: فضل بن مختار ''منکر الحدیث'' تھا۔[4]

---

[1] المجعم الاوسط: ص ۳۸۹۔ ۳۹۰، ج ۷، ح: ٦٧٥٦

[2] تقریب التهذیب: ص ٥٠٤۔ ترجمه: ۷۳۰۳

[3] معجم اسامی الراوة: ص ۳۲۱، ج ٤

[4] اللآلی المصنوعة: ص ۷۹، ج ۱

۱۸۵ ......إِنَّ الْعَرْشَ لَمُطَوَّقٌ بِحَيَّةٍ۔

''عرش ایک سانپ سے گھیرا ہوا ہے یا عرش کے گرد سانپ طوق کی مانند لپٹا ہوا ہے''

یہ اسرائیلی روایت ہے اس کی تخریج سیوطی نے جس سند سے کی ہے وہ درج ذیل ہے:

ہم سے محمد بن اسحاق بن راہویہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے میرے والد نے بیان کیا۔ کہا: ہم کو معاذ بن ہشام نے خبر دی۔ کہا: مجھ سے ابوقتادہ نے کثیر بن ابی کثیر سے، انہوں نے ابوعیاض سے، اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔

ابوالحسن علی بن محمد بن عراق نے ''تنزيهه الشريعه'' میں یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس کے راوی ثقہ ہیں۔[1]

لیکن ''تنزيه الشريعه'' کے محققین، عبدالوہاب عبداللطیف اور عبداللہ محمد صدیق نے اس کی تعقیب کرتے ہوئے لکھا ہے:

اس کا تعلق اسرائیلیات سے ہے۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کثرت سے اسرائیلی روایات بیان کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت باطل ہے۔

یہ روایت موقوف بھی ہے جس سے اس کی نکارت مزید بڑھ جاتی ہے۔

درحقیقت کہکشاں ہو یا سورج اور چاند...... ان کی تخلیق غیبی امور سے تعلق رکھتی ہے جن کے بارے میں کوئی بھی روایت صرف اسی صورت میں قابل قبول ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت صحیح ہو۔ اس باب میں بعض صحابہ کرام کی موقوف روایات یا تابعین کے اقوال (مقطوعات) قابل قبول نہیں ہیں۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں بہت سی روایات صحابہ کرام کی نسبت سے ایسی منقول ہیں جن کا تعلق اسرائیلیات سے ہے۔

فرشتوں کی حقیقت:

فرشتوں کا تعلق بھی غیبی امور سے ہے اور وہ غیر مرئی مخلوق ہیں۔ ان کی تخلیق ''نور'' سے ہوئی ہے:

((خُلِقَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ نُورٍ، وَخُلِقَ الْجَانُّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ وَخُلِقَ آدَمَ مِمَّا وُصِفَ لَكُمْ))[2]

---

[1] ص ۱۹۱ ج ۱، ح ۳۹

[2] صحيح مسلم: ح ۷۴۹۵ (۲۹۹۶)

''فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں اور جن آگ کی لپٹ سے اور آدم اس مادے سے پیدا کیے گئے ہیں جو تم سے بیان کیا جا چکا ہے''

لہٰذا فرشتوں کے بارے میں صرف وہی تفصیلات صحیح اور قابل اعتبار ہیں جو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں بیان کر دی گئی ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں فرشتوں کی جو عمومی صفات بیان ہوئی ہیں وہ یہ کہ: وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرماں بردار بندے ہیں اور ہر حال میں اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں:

﴿ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء:۲۷]

''وہ اللہ کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے اور اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں''

﴿ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ ﴾ [التحریم:٦]

''وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور انہیں جو حکم دیا جاتا ہے اسے بجا لاتے ہیں''

فرشتوں کی ذات غرور و تکبر سے پاک ہے اور وہ دن رات اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی بڑائی بیان کرنے میں لگے رہتے ہیں۔''

﴿ وَ مَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ لَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء:۱۹، ۲۰]

''اللہ کے پاس جو فرشتے ہیں وہ تکبر میں آکر اللہ کی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے اور نہ عبادت سے تھکتے ہیں۔ وہ رات دن بلا توقف اللہ کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں''

اوپر جو صفات بیان ہوئی ہیں ان سے تمام فرشتے موصوف ہیں۔ البتہ قرآن پاک میں اور احادیث میں حضرت جبریل علیہ السلام کی متعدد مزید صفات بیان ہوئی ہیں: مثلاً الروح الأمین، روح القدوس، شدید القوٰی وغیرہ۔

اور صحیح مسلم میں ہے کہ جب حضرت مسروق بن اجدع رحمہ اللہ نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے قرآن پاک کی ان آیتوں ''وَلَقَدْ رَآهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝'' اور نبی نے اس کو روشن افق پر دیکھا۔ (التکویر: ۲۳) اور ''وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى'' (النجم: ۱۳) ''اور اس نے اس کو ایک بار اور اترتے ہوئے دیکھا۔'' کے بارے میں پوچھا کہ ان آیتوں میں کس کا دیکھنا مراد ہے؟ تو ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

((اَنَا اَوَّلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ سَاَلَ عَنْ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،

فَقَالَ: إِنَّمَا هُوَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔ لَمْ أَرَهُ صُوْرَتِهِ الَّتِي خُلِقَ عَلَيْهَا غَيْر هَاتَيْنِ الْمَرَّتَيْنِ، رَأَيْتُهُ مُنْهَبِطًا مِنَ السَّمَاءِ، سَادًّا عِظَمُ خَلْقِهِ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ))[1]

''اس امت میں سب سے پہلے میں نے ہی رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ تو آپ نے فرمایا: وہ تو جبریل علیہ السلام تھے جن کو میں نے اس اصلی صورت میں جس پر اللہ نے ان پید کیا ہے، ان دو موقعوں (ابتداء بعثت اور معراج) کے سوا کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے ان کو آسمان سے اس طرح اترتے دیکھا کہ ان کی عظیم ہستی آسمان سے زمین تک چھائی ہوئی تھی''

لہٰذا فرشتوں کی تخلیق، ان کی قدرت وتوانائی اوران کے اوصاف اوراعمال کا تعلق غیبات سے ہے جن کی حقیقت تک ہمارے علم کی رسائی نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی کتاب اوراس کے رسول ﷺ کے ارشادات میں ان کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں صرف انہی پر اکتفا کرنا لازمی ہے۔ مزید تفصیلات جاننے کا نہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہے اور نہ اس کا کوئی اعتبار ہے۔

مذکورہ وضاحتوں کی روشنی میں تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں فرشتوں سے متعلق جو روایات بیان ہوئی ہیں وہ مردود ہیں۔ مثلاً:

۱۸۶ ......أَتَانِي مَلَكٌ بِرِسَالَةٍ مِنَ اللّٰهِ تَعَالَى، ثُمَّ رَفَعَ رِجْلَهُ فَوَضَعَهَا فَوْقَ السَّمَآءِ وَالْأُخْرَى فِي الْأَرْضِ لَمْ يَرْفَعْهَا۔

''میرے پاس ایک فرشتہ اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آیا۔ پھر اس نے اپنا پیر اٹھا کر آسمان پر رکھا درآنحالیکہ دوسرا پیر زمین ہی پر تھا جس کو اس نے نہیں اٹھایا''

یہ روایت اگرچہ موضوع تو نہیں ہے لیکن بے حد ضعیف ہے۔ اس کی تخریج امام ابن عدی نے الکامل[2] میں الثعلبی نے اپنی تفسیر میں[3] الواحدی نے الوسیط[4] میں، سیوطی نے الجامع الصغیر[5] میں اور محمد بن طاہر بن علی مقدسی ظاہری نے ذخیرہ الحفاظ[6] میں کی ہے جس کی سند درج ذیل ہے:

صدقہ بن عبداللہ سے روایت ہے، وہ موسیٰ بن عقبہ سے روایت کرتے ہیں، وہ اعرج سے اور وہ

---

[1] ح ۴۳۹ (۲۸۶)
[2] ص ۲۰۱، ج ۱
[3] ص ۸٤، ج ۳
[4] ص ۱۹۹، ج ۳
[5] ضعيف الجامع: ح ۸۱
[6] ذخيرة الحافظ ح ٦٨

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا......

محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صدقہ بن عبد اللہ کی وجہ سے یہ حدیث ضعیف ہے[1]۔ حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں اس کو ضعیف لکھا ہے۔[2] امام ذہبی نے الضعفاء میں لکھا ہے کہ امام احمد اور امام بخاری نے اس کو بے حد ضعیف لکھا ہے۔[3]

یہاں یہ واضح رہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اللہ کا پیغام لے کر ہمیشہ حضرت جبریل علیہ السلام آیا کرتے تھے اور اوپر صحیح مسلم کی وہ حدیث پیش کی جا چکی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو بار ان کی اصلی شکل میں دیکھا ہے۔ ورنہ وہ آپ کی خدمت میں انسانی شکل میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

البتہ غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ۝ ﴾ [الانفال:۹]

’’اس وقت کو یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے۔ تو اس نے تمہاری فریاد یہ کہہ کر قبول فرمائی کہ میں تمہاری مدد ایسے ایک ہزار فرشتوں سے کر رہا ہوں جو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ہیں۔‘‘

صحیحین میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے یہ ثابت ہے کہ غزوۂ احد میں دو فرشتوں نے انسانی شکل میں حصہ لیا۔ حضرت سعد فرماتے ہیں:

((رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ أُحُدٍ، وَمَعَهُ رَجُلَانِ يُقَاتِلَانِ عَنْهُ، عَلَيْهِمَا ثِيَابٌ بِيْضٌ، كَأَشَدِّ الْقِتَالِ، مَا رَأَيْتُهُمَا قَبْلُ وَلَا بَعْدُ))[4]

’’میں نے غزوۂ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں دیکھا کہ آپ کے ساتھ دو مرد سفید کپڑے پہنے ہوئے، آپ کے دفاع میں پوری قوت سے لڑ رہے تھے۔ میں نے ان کو نہ

---

[1] الضعیفہ: ح ۱۶۸۸ [2] ترجمہ: ۲۹۱۳

[3] الضعیفہ: ص ۱۸٤، ۱۸۵، ج ٤

[4] صحیح بخاری ح ٤٠٥٤، ٥٨٢٦، صحیح مسلم ح ۲۳۰٦

پہلے دیکھا اور نہ بعد میں دیکھا"

۱۸۷......إِنَّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً وَهُمُ الْكَرُوبِيُّوْنَ، مِنْ شَحْمَةِ أُذُنِ أَحَدِهِمْ إِلَى تَرْقُوَتِهِ مَسِيْرَةُ سَبْعَمِائَةِ عَامٍ لِلطَّائِرِ السَّرِيْعِ فِي انْحِطَاطِهِ۔

"اللہ کے کچھ فرشتے جو کروبی ہیں، ان کے کانوں کی لو سے گلے تک کا فاصلہ اتنا ہے جو ایک تیز پرواز کرنے والا پرندہ زمین پر اترتے وقت کی رفتار سے سات سو سال میں طے کرتا ہے"

یہ روایت حد درجہ ضعیف اور ساقط الاعتبار ہے۔ اس کی روایت حافظ ابن عسا کر نے اپنی تاریخ میں اس سند سے کی ہے:

محمد بن ابی السری سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں: ہم کو عمرو بن ابی سلمہ نے صدقہ بن عبد اللہ القرشی سے، انہوں نے موسیٰ بن عقبہ سے، انہوں نے محمد بن منکدر سے، اور انہوں نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے خبر دی۔[1]

محدث العصر محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ سند بے حد ضعیف ہے، جس کی دو علتیں ہیں:

(۱) محمد بن ابی السری جن کا نام محمد بن متوکل بن عبد الرحمٰن ہاشمی ہے۔ روایتِ حدیث میں بہت غلطیاں کرتے تھے۔[2]

(۲) دوسری علت یہ ہے کہ صدقہ بن عبد اللہ القرشی ضعیف ہیں جن کو امام احمد اور امام یحییٰ بن معین نے ضعیف قرار دیا ہے اور امام بخاری رحمہم اللہ جمیعاً نے ان کو حد درجہ ضعیف قرار دیا ہے۔[3]

حافظ ابن حجر نے ابن ابی السری کو "سچا" ہونے کے ساتھ وہم کا مریض قرار دیا ہے۔[4] اور صدقہ بن عبد اللہ کو ضعیف لکھا ہے جن کی کنیت ابو معاویہ یا ابو محمد اور لقب "السمین" تھا۔[5]

دراصل "کروبیوں" کے نام سے فرشتوں کی کسی جماعت کا ذکر صحیح احادیث میں نہیں آیا ہے اور جن مفسرین نے اپنی تفسیروں میں ان کا ذکر کیا ہے تو انہوں نے اس کا کوئی ماخذ نہیں بتایا۔ چنانچہ حافظ

---

۱ ص ۲۳۱، ج ۱۲
۲ الصحيحه: ص ۸۵، ج ۱، ح ۳۶۔ معجم اسامی الرواة: ص ۲۰، ج ٤
۳ معجم اسامی الرواة: ص ۳٤۰، ۳٤۱ ج ۲
٤ تقريب التهذيب ص ٤۳۸ ترجمہ: ٦۲٦۳
۵ ص ۲۱٦۔ ترجمہ: ۲۹۱۳

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے "البدایہ والنہایہ"[1] میں لکھا ہے کہ "کروبیوں" سے مراد وہ فرشتے ہیں جو عرش الٰہی کے گرد موجود ہیں اور حاملین عرش کے ساتھ ان کا شمار بھی اشرف الملائکۃ میں ہوتا ہے اور وہ مقرب فرشتے ہیں۔

حافظ ابن کثیر نے اپنے اس قول کی کوئی دلیل نہیں دی ہے اور سورۃ النساء کی آیت ۱۷۲ کو پیش کرنے پر اکتفاء کیا ہے جس میں مقرب فرشتوں کا ذکر آیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلّٰهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ ﴾

"مسیح اللہ کا بندہ ہونے میں کوئی عار سمجھے گا اور نہ مقرب فرشتے"

۱۸۸ ......اِنَّ لِلّٰهِ مَلَكًا لَو قِيْلَ لَهُ: اِلْتَقِمِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِيْنَ بِلُقْمَةٍ وَاحِدَةٍ لَفَعَلَ، تَسْبِيْحُهُ: سُبْحَانَكَ حَيْثُ كُنْتَ۔

"یقیناً اللہ کا ایک ایسا فرشتہ ہے کہ اگر اس سے کہا جائے: آسمانوں اور زمینوں کو ایک لقمہ بنا کر نگل جا تو وہ نگل جائے گا۔ اس کی تسبیح ہے! پاک ہے تو جہاں بھی ہو"

حافظ ابن کثیر نے اس روایت کو "البدایہ والنہایہ" میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ بے حد ضعیف (غریب جدا) ہے۔[2] نیز یہ موقوف بھی ہوسکتی ہے۔

حافظ ھیثمی نے بھی المجمع میں یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی روایت میں وہب اللہ بن رزق منفرد ہے۔ اور میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے کتب تراجم میں اس کا ذکر کیا۔ ہو[3] یعنی وہ مجہول ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ امام ذہبی نے "العلو" (ص ٦٦) میں اس کو منکر لکھا ہے۔ لیکن اس کی کوئی علت نہیں بیان کی۔ میرے خیال میں اس کی نکارت کا سبب وہب اللہ ہے جس کے مجہول اور قلیل الحدیث ہونے کی وجہ سے ائمہ حدیث نے اس کو نظر انداز کردیا ہے۔[4]

۱۸۹ ......اِسْرَافِيْلَ لَهُ اَرْبَعَةُ اَجْنِحَةٍ، مِنْهَا جَنَاحَانِ اَحَدُهُمَا بِالْمَشْرِقِ وَالْآخَرُ بِالْمَغْرِبِ، وَاللَّوْحُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ، فَإِذَا أَرَادَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اَنْ يَكْتُبَ الْوَحْيَ يَنْقُرُ بَيْنَ جَبْهَتِهِ۔

"اسرافیل کے چار بازو ہیں۔ جن میں سے دو ایسے ہیں کہ ان میں سے ایک مشرق میں ہے

---

[1] البدایہ والنہایہ: ص ٥٦، ج ۱ [2] ایضًا: ص ٤٩، ج ۱
[3] ص ۸۰، ج ۱ [4] الضعیفہ: ص ۱۸۲، ج ۷، ص ۳۱۹۹

اور دوسرا مغرب میں۔ اور لوح محفوظ ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان ہے۔ پس جب اللہ عزوجل وحی لکھنا چاہتا ہے تو ان کی پیشانی کے درمیان چوٹ لگاتا ہے''

یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے جس کی تخریج حافظ ابوالشیخ عبداللہ بن محمد بن جعفر اصبہانی نے اپنی کتاب "العظمه" میں ابوایوب کے طریق سے کی ہے:

ہم سے خالد واسطی نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے خالد حذاء نے ولید ابوبشر سے، انہوں نے عبداللہ بن رباح سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ کعب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے عرض کیا: کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسرافیل کے بارے میں کچھ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے......[1]

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

یہ سند موضوع ہے۔ ابوایوب کے سوا اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ ابوایوب کا نام اور لقب سلیمان بن داوٗد شاذکونی ہے۔ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ''المغنی'' میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

امام یحییٰ بن معین نے اس پر کذب بیانی کا الزام لگایا ہے اور امام بخاری کا قول ہے کہ: اس کی ثقاہت محل نظر ہے۔[2]

۱۹۰ ......النَّفَّاخَان فِي السَّمَاءِ الثَّانِيَةِ، رَأْسُ اَحَدِهِمَا بِالْمَشْرِقِ وَرِجْلَاهُ بِالْمَغْرِبِ، اَوْ قَالَ رَأْسُ اَحَدِهِمَا بِالْمَغْرِبِ وَرِجْلَاهُ بِالْمَشْرِقِ يَنْتَظِرَانِ مَتَى يُؤْمَرَانِ يَنْفُخَانِ فِي الصُّوْرِ فَيَنْفُخَانِ۔

''دونوں صور پھونکنے والے فرشتے دوسرے آسمان میں ہیں۔ ان میں سے ایک کا سر مشرق میں ہے اور اس کے دونوں پیر مغرب میں ہیں۔ یا ان میں سے ایک کا سر مغرب میں ہے اور اس کے دونوں پاؤں مشرق میں ہیں۔ دونوں اس انتظار میں ہیں کہ کب ان کو صور پھونکنے کا حکم دیا جاتا ہے کہ وہ پھونکیں''[3]

یہ روایت منکر ہے اور اس کی نکارت کی دلیل یہ ہے کہ اس میں صور پھونکنے والے فرشتوں کی تعداد دو بتائی گئی ہے۔ جبکہ صحیح احادیث سے صور پھونکنے والے صرف ایک فرشتے کا ثبوت ملتا ہے:

---

[1] ص ۸۲۰، ج۳، ح۳۸۵ [2] الضعیفه: ۹۱۹، ۹۲۰، ج:۱٤، ح ٦٨٩٥

[3] مسند امام احمد: ح ٦٨٠٤

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كَيْفَ أَنْعَمُ وَقَدِ الْتَقَمَ صَاحِبُ الْقَرْنِ الْقَرْنَ وَحَنَى جَبْهَتَهُ وَأَصْغَى سَمْعَهُ يَنْتَظِرُ أَنْ يُؤْمَرَ أَنْ يَنْفُخَ، فَيَنْفَخُ، قَالَ الْمُسْلِمُوْنَ: فَكَيْفَ نَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: قُوْلُوْا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ، تَوَكَّلْنَا عَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا))[1]

''کس طرح اطمینان وسکون محسوس کروں؟ حال یہ ہے کہ صاحبِ صور، صور کو منہ میں لیے، پیشانی جھکائے اور کان لگائے اس انتظار میں ہے کہ اس کو پھونکنے کا حکم ہو اور وہ پھونکے، مسلمانوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمیں کیا کہنا چاہیے؟ فرمایا: کہو: اللہ ہی ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ ہم نے اپنے رب اللہ پر بھروسہ کیا''

صور کیا ہے؟

صور اور قرن ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ اردو میں اس کا ترجمہ نرسنگھا یا بگل کیا جا سکتا ہے۔ اس کی صحیح جسامت اور اس میں پھونکنے کی صحیح کیفیت کے ادراک سے عقل انسانی قاصر ہے۔ البتہ قرآنی آیات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ''صور پھونکنے'' سے جو آواز پیدا ہوگی وہ اس قدر ہولناک ہوگی کہ پہلے آسمان وزمین کی تمام مخلوق خوف زدہ ہو جائے گی اور پھر ہر جاندار فنا ہو جائے گا۔

قرآن پاک میں مختلف مقامات پر صور پھونکنے کا ذکر آیا ہے۔ تمام آیتوں کو ایک ساتھ جمع کرنے سے تین بار صور پھونکنے کا ثبوت ملتا ہے: (۱) نفخة الفزع...... خوف و ہراس طاری کر دینے والا صور (۲) نفخة الصعق...... ہلاک کر دینے والا صور (۳) نفخة البعث...... وہ صور جسے پھونکتے ہی تمام انسان زندہ ہو کر اپنی قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُوْنَ ﴾ [الزمر:٦٨]

''اور صور پھونکا جائے گا تو وہ سب مر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ سوائے ان کے جن کو اللہ (زندہ رکھنا) چاہے۔ پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو یکا یک سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے''

[1] جامع ترمذی: ح ٣٢٤٤، السنن الكبرى للنسائي: ح ١١٣١٢، الصحيحه:١٠٧٩

اس آیت سے دو مرتبہ صور پھونکنے کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن سورۃ النمل کی آیت ۸۷ سے بصراحت ایک ایسے صور پھونکنے کا ثبوت ملتا ہے جو تمام جانداروں کو خوف زدہ کر کے رکھ دے گا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ﴾ [النمل:۸۷]

''جس دن صور پھونکا جائے گا تو وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، خوف زدہ ہو جائیں گے سوائے ان کے جن کو اللہ (اس ہولناکی سے محفوظ رکھنا) چاہے''

قرآن پاک میں غور و تدبر کا صحیح طریقہ:

قرآن پاک میں ایک ہی مضمون کو مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ کہیں اجمال ہے تو کہیں تفصیل۔ کہیں کسی واقعہ کے صرف ایک حصہ کو بیان کیا گیا ہے تو کہیں پورا واقعہ۔ لہٰذا قرآن کا مطالعہ کرنے اور اس سے کسی مسئلے کا استنباط کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ کسی مضمون سے متعلق تمام آیتوں کا بدقت نظر مطالعہ کر کے کوئی نتیجہ اخذ کیا جائے۔ مذکورہ وضاحت کے تناظر میں ''نفخِ صور'' سے متعلقہ تمام آیتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تین مرتبہ صور پھونکا جائے گا۔

(۱) نفخة الفزع (۲) نفخة الصعق (۳) نفخة البعث

صحیح مسلم کی حدیث کا مفہوم:

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث تین مرتبہ نفخ صور کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس میں صرف دو ''نفخون'' کے درمیان کی مدت بیان کی گئی ہے جسے حدیث کے راوی جلیل القدر صحابی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یاد نہ رکھ سکے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((''مَا بَيْنَ النَّفْخَتَيْنِ اَرْبَعُوْنَ'' قَالُوْا: يَا أَبَاهُرَيْرَةَ! اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا؟ قَالَ: أَبَيْتُ، قَالُوْا: اَرْبَعِيْنَ شَهْرًا؟ قَالَ: أَبَيْتُ، قَالُوْا: اَرْبَعِيْنَ سَنَةً؟ قَالَ: أَبَيْتُ، ''ثُمَّ يُنْزِلُ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيَنْبُتُوْنَ كَمَا يَنْبُتُ الْبَقْلُ'')) [1]

''دو مرتبہ صور پھونکنے کی درمیان کی مدت چالیس ہے''۔ لوگوں نے کہا: اے ابو ہریرہ! کیا

[1] م ح: ۷۴۱۴

چالیس دن؟ فرمایا: مجھے اس کا تعین کرنے سے انکار ہے (کیونکہ یا تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسا نہیں سنا یا میں نے اس کو یاد نہیں رکھا) لوگوں نے کہا: تو کیا چالیس ماہ؟ فرمایا: میں یہ بھی نہیں کہتا۔ لوگوں نے پوچھا: کیا چالیس سال؟ فرمایا: میں اس سے بھی انکاری ہوں۔ پھر اللہ آسمان سے پانی نازل فرمائے گا اور مرے ہوئے لوگ اس طرح جی اٹھیں گے جس طرح سبزی اگتی ہے''

اس حدیث پاک میں نفخة الصعق اور نفخة البعث کے درمیان کی مدت بیان ہوئی ہے اور اس سے ''نفخة الفزع'' کی نفی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس میں صور پھونکنے کی تعداد نہیں بلکہ دو نفخوں کے درمیان کی مدت بیان ہوئی ہے۔

صور پھونکنے والا فرشتہ کون ہے؟

قرآن پاک میں صور پھونکنے کا ذکر مبنی للمجھول کے فعل (نُفِخَ اور یُنْفَخُ) سے کیا گیا ہے۔ فعل مبنی للمجہول میں فاعل محذوف ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن پاک سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ صور پھونکنے والا فرشتہ کون ہے؟

اسی طرح جن صحیح حدیثوں میں صور پھونکنے کا ذکر آیا ہے ان میں سے کسی بھی حدیث میں اس فرشتے کے نام کی صراحت نہیں ہے جو صور پھونکے گا۔ بلکہ نام کی بجائے ''صاحب القرن......قرن والا'' یا ''صاحب الصور......صور والا'' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ رہیں وہ حدیثیں جن میں یہ صراحت ہے کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکیں گے تو ان میں سے کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں:

مشہور ہے کہ صاحب صور حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں اور حلیمی (ابوعبداللہ حسین بن حسن بن محمد) نے اس مسئلے میں ''اجماع'' نقل کیا ہے۔ وہب بن منبہ کی حدیث، بیہقی میں ابوسعید کی حدیث اور ابن مردویہ کے یہاں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اسرافیل کے نام کی صراحت ہے۔ اسی طرح وہ طویل حدیث جس کی تخریج عبد بن حمید، طبری، اور ابویعلی نے الکبیر میں، طبرانی نے الطوالات میں، علی بن معبد نے کتاب الطاعة والمعصیة میں اور بیہقی نے البعث میں کی ہے۔ اور جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے اور جس کا دارومدار اسماعیل بن رافع پر ہے تو ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی سند میں ''اضطراب'' بھی ہے۔ کبھی تو اس نے اس حدیث کی روایت محمد بن کعب قرظی سے براہ راست کی ہے

اور کبھی ایک مبہم اور غیر معلوم شخص کے واسطے سے کی ہے۔ اسی طرح محمد بن کعب قرظی نے یہ حدیث کبھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے براہ راست اور کبھی انصار کے ایک مبہم شخص کے واسطے سے روایت کی ہے۔ اس حدیث کی تخریج ایک اور ضعیف راوی: اسماعیل بن ابی زیاد شامی نے اپنی تفسیر میں ''عن محمد بن عجلان عن محمد بن کعب قرظی'' کی سند سے کی ہے۔ مغلطائی نے اسماعیل بن رافع کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف قرار دینے پر عبدالحق پر اعتراض کیا ہے اور ان پر یہ بات مخفی رہی کہ شامی اس سے زیادہ ضعیف تھا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اس نے اس روایت کو اس سے سرقہ کر کے ابن عجلان کے سر منڈھ دیا ہو۔ امام دار قطنی نے اس کو متروک اور وضع حدیث کا مرتکب قرار دیا ہے اور خلیلی کا قول ہے؛ اسماعیل بن ابی زیاد شامی ضعیف شیخ تھا جس نے اپنی تفسیر میں ایسی روایتیں بھر دی ہیں جن میں اس کا کوئی متابع نہیں ہے۔[1]

میں نے حافظ ابن حجر کی یہ طویل عبارت اس لیے نقل کر دی ہے تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ جن روایتوں میں صور پھونکنے والے فرشتے کے طور پر حضرت اسرافیل علیہ السلام کے نام کی صراحت ہے، ان میں سے کوئی بھی روایت قابل اعتبار نہیں ہے۔

واضح رہے کہ قرآن پاک میں حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت میکائیل علیہما السلام کا تو ذکر آیا ہے لیکن حضرت اسرافیل علیہ السلام کا ذکر نہیں آیا۔ البتہ صحیح حدیث میں حضرت جبریل اور حضرت میکائیل علیہما السلام کے ساتھ حضرت اسرافیل علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز کے آغاز میں یہ دعاء پڑھا کرتے تھے:

((أَللّٰهُمَّ! رَبَّ جِبْرَائِيْلَ وَمِيكَائِيْلَ وَإِسْرَافِيْلَ، فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيمَا كَانُوا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ، اِهْدِنِي لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ، إِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ))[2]

''اے اللہ! جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل کے رب، آسمانوں اور زمین کے بنانے والے، غیب وشہود کے عالم! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان اس معاملے میں فیصلہ فرماتا ہے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ تو مجھے اپنی توفیق سے اس حق کی رہنمائی فرما جس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بے شک تو ہی جسے چاہے سیدھے راستے کی رہنمائی کر سکتا ہے''

[1] فتح الباری: ص ۲۸۶۷، ج ۳ [2] صحیح مسلم: ح ۱۸۱۲ (۷۷۰)

۱۹۱ ......جَاءَنِی جِبْرِیْلُ وَهُوَ یَبْکِیْ ، فَقُلْتُ: مَا یُبْکِیْكَ؟ قَالَ: مَا جَفَّتْ لِیْ عَیْنٌ مُنْذُ خَلَقَ اللّٰهُ جَهَنَّمَ مَخَافَةَ أَنْ أَعْصِیَهُ ، فَیُلْقِیَنِیْ فِیْهَا۔

''جبریل میرے پاس روتے ہوئے آئے، تو میں نے ان سے پوچھا: تمہیں کونسی چیز رلا رہی ہے؟ انہوں نے کہا: جب سے اللہ نے جہنم بنائی ہے، اس وقت سے میری آنکھ اس خوف سے خشک نہیں ہوئی ہے کہ میں اس کی نافرمانی کر بیٹھوں اور وہ مجھے اس میں ڈال دے''

یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔ اس کو حافظ سیوطی نے ''الجامع الکبیر'' میں نقل کیا ہے اور صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ ابوعمران سے مرسلاً روایت ہے اور اس کی صحت وسقم سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

یہ روایت علامہ علاء الدین علی متقی ہندی نے کنز العمال[1] میں اور امام بیہقی نے شعب الایمان[2] میں حسین بن جعفر کی سند سے روایت کی ہے۔ ہم سے عبداللہ بن ابی زیاد نے بیان کیا، کہا: ہم سے سیار بن حاتم نے بیان کیا، کہا: ہم سے جعفر بن سلیمان نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابوعمران نے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہمیں خبر ملی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نبی مکرم ﷺ کی خدمت میں روتے ہوئے حاضر ہوئے ......

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ روایت مرسل ہونے کے ساتھ ضعیف الاسناد بھی ہے۔ کیونکہ اس کی سند کا ایک راوی حسین بن جعفر غیر معروف ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ یہ وہی حسین بن جعفر ہو جس کا ذکر ''ثقات ابن حبان''[3] میں آیا ہے۔ یعنی حسین بن جعفر بن محمد القتّات، جو کوفی تھا اور ابونعیم سے روایت کیا کرتا تھا اور اس سے اہل عراق احادیث روایت کرتے تھے۔

حافظ ابوبکر محمد بن ابومظفر سمعانی نے کتاب الانساب کے مادہ ''القتات'' کے ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

حسین بن جعفر بن محمد قتات نے یزید بن مہران بن ابی خالد خباز اور منجاب بن حارث اور عبدالحمید بن صالح سے حدیثیں روایت کی ہیں۔

سمعانی نے اسی پر اکتفا کیا ہے اور اس کی جرح وتعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ صرف اتنا اضافہ کیا ہے: حسین، محمد بن جعفر بن محمد بن حبیب بن ازہر قتات کوفی کا بھائی تھا، جس کو ''لسان

[1] کنز العمال: ح: ۵۸۹۶ [2] شعب الایمان: ص: ۵۲۱، ج ۱، ح: ۹۱۵ [3] الثقات: ص: ۱۹۲، ج: ۸

المیزان" میں ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

البانی آگے لکھتے ہیں:

میرے خیال میں یہ حسین غیر مشہور ہے اور اس کا تعلق ان راویوں سے ہے جو "قِلّتِ روایت" میں مشہور تھے اور وہ حافظ طبرانی کے شیوخ میں شمار ہوتا ہے۔ جنھوں نے "المعجم الاوسط" میں اس سے دو حدیثیں (۳۵۰۴۔۳۵۰۵) روایت کی ہیں۔

البانی مزید لکھتے ہیں:

اس حدیث کا متن منکر بلکہ موضوع ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے خلاف ہے:

﴿ لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ ﴾ [التحريم:٦]

"فرشتے اس حکم میں اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جو وہ انہیں دیتا ہے۔ اور انہیں جو حکم دیا جاتا ہے اس کو بجالاتے ہیں"

شاید اس روایت کا تعلق اسرائیلیات سے ہو جو کسی راوی پر مشتبہ ہوگئی اور اس نے اس کو نبی کریم ﷺ سے منسوب کردیا۔ جیسا کہ "ہاروت و ماروت" والی روایت کو نبی کریم ﷺ سے منسوب کردیا گیا ہے۔[1]

محدث البانی نے ہاروت و ماروت والی جس روایت کی جانب اشارہ کیا ہے وہ درج ذیل ہے:

ہاروت و ماروت کا قصہ:

۱۹۲ ...... إِنَّ الْمَلَائِكَةَ قَالَتْ: يَا رَبِّ! كَيْفَ صَبْرُكَ عَلَى بَنِيْ آدَمَ فِي الْخَطَايَا وَالذُّنُوْبِ؟ إِنِّيْ اِبْتَلَيْتُهُمْ وَعَافَيْتُكُمْ، قَالُوْا: كُنَّا مَكَانَهُمْ مَا عَصَيْنَاكَ، قَالَ: فَاخْتَارُوْا مَلَكَيْنِ مِنْكُمْ، فَلَمْ يَأْلُوْا أَنْ يَخْتَارُوْا، فَاخْتَارُوْا هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ، فَنَزَلَا، فَأَلْقَى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِمَا الشَّبَقَ، قُلْتُ: وَمَا الشَّبَقُ؟ قَالَ: الشَّهْوَةَ، قَالَ: فَنَزَلَا، فَجَاءَتْ اِمْرَأَةٌ يُقَال لَهَا "الزُّهْرَةُ" فَوَقَعَتْ فِيْ قُلُوْبِهِمَا، فَجَعَلَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا يُخْفِيْ عَنْ صَاحِبِهِ مَا فِيْ نَفْسِهِ، فَرَجَع إِلَيْهَا، ثُمَّ جَاءَ الْآخَرُ، فَقَالَ: هَلْ وَقَعَ فِيْ نَفْسِكَ مَا وَقَعَ فِيْ قَلْبِيْ؟ قَالَ:

[1] الضعيفه: ص ١١٣٤۔١١٣٥، ج١٣، ح: ٦٤٩٧

نَعَمْ، فَطَلَبَاهَا نَفْسَهَا، فَقَالَتْ: لَا أُمَكِّنُكُمَا حَتَّى تُعَلِّمَانِي الإِسْمَ الَّذِي تَعْرُجَانِ بِهِ إِلَى السَّمَاءِ وَتَهْبِطَانِ، فَأَبَيَا، ثُمَّ سَأَلَاهَا أَيْضًا فَأَبَتْ، فَفَعَلَا، فَلَمَّا اسْتُطِيْرَتْ طَمَسَهَا اللّٰهُ كَوْكَبًا وَقَطَعَ أَجْنَحَتِهَا، ثُمَّ سَأَلَا التَّوْبَةَ مِنْ رَبِّهِمَا، فَخَيَّرَهُمَا، فَقَالَ: اِنْ شِئْتُمَا رَدَدْتُكُمْ اِلَى مَا كُنْتُمَا عَلَيْهِ، فَاِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ عَذَّبْتُكُمَا، وَاِنْ شِئْتُمَا عَذَّبْتُكُمَا فِي الدُّنْيَا، فَاِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ رَدَدْتُكُمَا اِلَى مَا كُنْتُمَا عَلَيْهِ، فَقَالَ اَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهِ: اِنَّ عَذَابَ الدُّنْيَا يَنْقَطِعُ وَيَزُوْلُ، فَاخْتَارَا عَذَابَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ، فَأَوحَى اللّٰهُ اِلَيْهِمَا أَنِ ائْتِيَا بَابِلَ، فَانْطَلَقَا اِلَى بَابِلَ فَخَسَفَ بِهِمَا، فَهُمَا مَنْكُوْسَانِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ مُعَذَّبَانِ اِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔

''فرشتوں نے عرض کیا: اے ہمارے رب! آپ اولاد آدم پر ان کے گناہوں، اور خطاؤں کے معاملے میں کس طرح صبر کرتے ہیں؟ فرمایا: میں نے ان کو آزمائش میں ڈالا ہے اور تم کو (آزمائش سے) محفوظ رکھا ہے۔ فرشتوں نے کہا: اگر ہم اولاد آدم کی جگہ ہوتے تو آپ کی نافرمانی نہ کرتے۔ اللہ نے فرمایا: تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو چن لو۔ انہوں نے کسی تاخیر کے بغیر ہاروت اور ماروت کو چن لیا۔ وہ دونوں زمین پر اتر گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر "شبق" ڈال دیا (راوی کا بیان ہے کہ میں نے پوچھا) شبق کیا ہے؟ فرمایا: شبق جنسی خواہش ہے۔ دونوں جب زمین پر اترے تو ان کے پاس ایک عورت آئی جس کا نام زہرہ تھا۔ اس نے ان دونوں کے دلوں میں جگہ بنالی۔ ان میں سے ایک دوسرے سے اپنے دل کی بات چھپاتا رہا اور ان میں سے ہر ایک اس کے پاس جاتا رہا۔ پھر ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے دریافت کیا: کیا تیرے دل میں اس کی وہی محبت ہے جو میرے دل میں ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں: ان دونوں نے اس سے اپنی خواہش نفس کا اظہار کیا تو اس نے جواب دیا: میں تم دونوں کو اس وقت تک خواہش نفس پوری کرنے کا موقع نہ دوں گی جب تک کہ تم مجھے وہ نام نہ سکھا دو جس کے ذریعہ تم آسمان پر چڑھتے اور اس سے اترتے ہو۔ ہاروت اور ماروت نے وہ نام سکھانے سے انکار کردیا اور دوبارہ اس سے اپنی خواہش پوری کرنے کا سوال کیا۔ مگر اس نے انکار کردیا۔ تب انہوں نے اسے وہ نام بتا دیا۔ اس پر

اللہ نے اس کی صورت مٹا کر اسے ایک ستارے میں تبدیل کر دیا اور اس کے بازو کاٹ دیے۔ پھر ہاروت اور ماروت نے اپنے رب سے معافی کی درخواست کی۔ اللہ نے ان کو اختیار دیتے ہوئے فرمایا: اگر تم چاہو تو میں تم دونوں کو اس حالت پر واپس کر دوں جس پر تم پہلے تھے۔ پھر جب قیامت آئے تو تمہیں عذاب دوں۔ یا اگر چاہو تو دنیا میں تم کو عذاب دوں اور جب قیامت آئے تو تم کو اس پہلی حالت میں لوٹا دوں جس پر تم تھے۔ یہ سن کر ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا: دنیا کے عذاب کا سلسلہ تو منقطع ہو کر یہ عذاب ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے آخرت کے عذاب کے مقابلے میں دنیا کا عذاب قبول کر لیا۔ اللہ نے ان کو وحی کے ذریعہ حکم دیا کہ ''بابل'' جاؤ لہٰذا وہ بابل شہر چلے گئے جہاں اللہ نے ان کو دھنسا دیا۔ وہ آسمان اور زمین کے درمیان الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ اور قیامت تک اسی طرح عذاب میں مبتلا رہیں گے''

یہ روایت باطل ہے۔ جس کے لفظ لفظ سے اس کے باطل ہونے کی بو آتی ہے۔ اگرچہ بہت سارے مفسرین نے سورۃ البقرہ کی آیت ۱۰۲ کی تفسیر کے ضمن میں اس کو نقل کیا ہے۔ یہ روایت فرشتوں اور نبیوں کے بارے میں یہودیوں کی گندی ذہنیت کی ترجمان ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: ہاروت اور ماروت کا قصہ متعدد تابعین سے مروی ہے۔ جیسے: مجاہد، سدی، حسن بصری، قتادۃ، ابو العالیہ، ربیع بن انس اور مقاتل بن حبان۔ نیز قدیم اور متاخر مفسرین میں سے بہتوں نے اس قصہ کو بیان کیا ہے جو اخبار بنو اسرائیل سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ اس مسئلے میں کوئی بھی صحیح حدیث متصل سند کے ساتھ الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں ہے اور قرآن پاک میں یہ قصہ تفصیل کے بجائے اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ لہٰذا جو کچھ قرآن میں بیان ہوا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے اور حقیقت حال کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔[1]

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی "الجامع للاحکام القرآن" میں لکھتے ہیں:

یہ پورا قصہ نا قابل اعتبار ہے اور یہ بات بعید از امکان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کی نسبت صحیح ہو۔ کیونکہ قرآن پاک میں فرشتوں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں یہ روایت ان کے سراسر خلاف ہے۔[2]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۹۷، ج ۱ [2] تفسیر قرطبی: ص ۴۱۸۔ ۴۱۹، ج ۱

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

یہ روایت مرفوع حیثیت سے میں باطل ہے۔ اس کی تخریج حافظ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں (ص ۴۲۔۴۳ ج ۸) اور امام ابن جریر نے اپنی تفسیر میں (ص ۳۶۴ ج ۲) حسین کی سند سے کی ہے۔

سنید بن داؤد کہتے ہیں: ہم سے فرج بن فضالہ نے معاویہ بن صالح کے واسطہ سے اور انہوں نے نافع سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

اس روایت کی مصیبت فرج بن فضالہ یا اس سے روایت کرنے والا سنید ہے۔ یہ دونوں ضعیف ہیں جیسا کہ "تقریب التهذیب" میں اس کی صراحت موجود ہے۔ (ص ۳۸۰، ترجمہ: ۵۳۸۳، ص ۱۹۷۔ ترجمہ: ۲۶۴۶)

محدث البانی رحمہ اللہ آگے لکھتے ہیں:

"دومۃ الجندل کی ایک عورت نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس نے بابل میں ہاروت اور ماروت کو پیروں کے ساتھ لٹکتے ہوئے دیکھا ہے اور اس نے ان سے اسی حال میں جادو سیکھا...... یہ بات اس طویل قصہ کے ضمن میں آتی ہے جو اس عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا تھا اور جس کی روایت ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں (۳۶۶۔۳۶۷، ج ۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حسن سند سے کی ہے۔ لیکن وہ عورت چونکہ مجہول ہے لہٰذا اس سے منسوب خبر نا قابل اعتبار ہے۔[1]

۱۹۳ ...... لَعَنَ اللّٰهُ الزُّهْرَةَ، فَإِنَّهَا هِيَ الَّتِي فَتَنَتِ الْمَلَكَيْنِ: هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ۔

"زہرہ پر اللہ کی لعنت ہو کیونکہ اسی نے دونوں فرشتوں: ہاروت اور ماروت کو فتنہ میں ڈالا تھا"

یہ روایت بھی جھوٹ ہے۔ اس کو حافظ ابوبکر احمد بن محمد بن اسحاق معروف بابن سنی نے اپنی مشہور کتاب۔ "عمل اليوم والليلة" میں (ح ۶۴۸) اور حافظ ابن مندہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

اس کا راوی: جابر بن یزید جعفی ہے جس پر روایت حدیث میں کذب بیانی کا الزام تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دنیا میں واپس آئیں گے اور قرآن میں دابۃ الارض سے وہی مراد ہیں۔[2]

۱۹۴ ...... إِنَّ آدَمَ لَمَّا أَهبَطَهُ اللّٰهُ تَعَالَى إِلَى الأَرْضِ، قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ: أَيْ رَبِّ! ﴿ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [البقرہ:۳۰] قَالُوْا: رَبَّنَا نَحْنُ أَطوَعُ

---

[1] الضعیفہ: ص ۳۱۳۔۳۱۵ ج ۲، ح ۹۱۲ [2] الضعیفہ: ص ۳۱۵، ج ۲، ح ۳۱۹

لَکَ مِنْ بَنِی آدَمَ، قَالَ اللّٰہُ تَعَالَی لِلْمَلَائِکَۃِ: ھَلُمُّوْا مَلَکَیْنِ مِنَ الْمَلَائِکَۃِ حَتّٰی یُھْبَطَ بِھِمَا إِلَی الْاَرْضِ فَنَنْظُرَ کَیْفَ یَعْمَلَانِ؟ قَالُوْا: رَبَّنَا! ھَارُوْتُ وَمَارُوْتُ۔ فَأُھْبِطَا إِلَی الْأَرْضِ، وَمُثِّلَتْ لَھُمَا الزُّھْرَۃُ اِمْرَأَۃً مِنْ أَحْسَنِ الْبَشَرِ، فَجَاءَتْھُمَا، فَسَأَلَاھَا نَفْسَھَا، فَقَالَتْ: لَا، وَاللّٰہِ حَتّٰی تُکَلِّمَا بِھٰذِہِ الْکَلِمَۃِ مِنَ الْإِشْرَاکِ، فَقَالَا: وَاللّٰہِ لَا نُشْرِکُ بِاللّٰہِ، فَذَھَبَتْ ثُمَّ رَجَعَتْ بِصَبِیٍّ تَحْمِلُہُ، فَسَأَلَاھَا نَفْسَھَا، قَالَتْ: لَا وَاللّٰہِ حَتّٰی تُقْتُلَا ھٰذَا الصَّبِیَّ فَقَالَا: وَاللّٰہِ لَا نَقْتُلُہُ اَبَدًا، فَذَھَبَتْ ثُمَّ رَجَعَتْ بِقَدَحِ خَمْرٍ، فَسَأَلَاھَا نَفْسَھَا، قَالَتْ: لَا، وَاللّٰہِ حَتّٰی تَشْرَبَا ھٰذَا الْخَمْرَ، فَشَرِبَا، فَسَکِرَا، فَوَقَعَا عَلَیْھَا وَقَتَلَا الصَّبِیَّ، فَلَمَّا أَفَاقَا قَالَتِ الْمَرْأَۃُ: وَاللّٰہِ مَا تَرَکْتُمَا شَیْئًا مِمَّا أَبَیْتُمَا عَلَیَّ إِلَّا فَعَلْتُمَا حِیْنَ سَکِرْتُمَا، فَخُیِّرَا بَیْنَ عَذَابِ الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃِ، فَاخْتَارَا عَذَابَ الدُّنْیَا۔

”جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا تو فرشتوں نے عرض کیا: اے ہمارے رب! کیا آپ اس میں ایسے شخص کو مقرر فرما رہے ہیں جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا جبکہ ہم آپ کی حمد وثناء کے ساتھ آپ کی تسبیح و تقدیس میں لگے ہوئے ہیں؟ اللہ نے فرمایا: ”میں جو جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے“ (البقرۃ:۳۰) انہوں نے عرض کیا: اے ہمارے رب! ہم اولاد آدم سے زیادہ تیرے اطاعت گزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: فرشتوں میں سے دو فرشتے لاؤ جن کو زمین پر اتارا جائے اور ہم دیکھیں کہ وہ کس طرح عمل کرتے ہیں۔ فرشتوں نے عرض کیا: اے ہمارے رب! ہاروت اور ماروت، پس ان کو زمین پر اتارا گیا اور زہرہ نے ان کے لیے انسانوں میں خوبصورت ترین عورت کی شباہت اختیار کی اور ان کے پاس آئی، انہوں نے اس سے اس کا جسم مانگا۔ اس نے جواب دیا: اللہ کی قسم نہیں، یہاں تک کہ تم اس کلمہ کے ذریعہ شرک کا اظہار کردو۔ فرشتوں نے جواب دیا: اللہ کی قسم ہم اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔ یہ سن کر وہ چلی گئی پھر ان کے پاس ایک بچہ لیے ہوئے واپس آئی، انہوں نے اس سے اس کا جسم مانگا۔ اس نے جواب دیا: اللہ کی قسم نہیں اِلاّ یہ کہ تم لوگ اس بچے کو قتل کردو۔ فرشتوں نے جواب دیا: اللہ کی قسم ہم اس کو

ہرگز نہیں قتل کر سکتے یہ سن کر وہ چلی گئی۔ پھر ایک پیالے میں شراب لے کر ان کے پاس واپس آئی۔ انہوں نے اس سے اس کا جسم مانگا۔ اس نے کہا: اللہ کی قسم ہرگز نہیں یہاں تک کہ تم دونوں یہ شراب پی لو۔ چنانچہ انہوں نے شراب پی اور مدہوش ہوگئے۔ پھر اس کے ساتھ بدفعلی کی اور بچے کو ہلاک کر دیا۔ جب ہوش میں آئے تو اس عورت نے کہا: اللہ کی قسم! تم دونوں نے مجھ سے جن افعال بد کے ارتکاب سے انکار کیا تھا جب نشے میں آئے تو ان کا ارتکاب کر ڈالا تو ان دونوں فرشتوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ یا تو دنیا کا عذاب اختیار کریں یا آخرت کا عذاب۔ اور انہوں نے عذابِ دنیا کو اختیار کر لیا''

یہ ایک باطل روایت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے، اس کی تخریج امام ابن حبان نے موارد الظمآن میں[1]۔ امام احمد نے مسند[2] میں۔ عبد بن حمید نے منتخب[3] میں، ابن ابی الدنیا نے العقوبات[4] میں۔ البزار نے الکشف[5] میں اور ابن سنی نے عمل الیوم واللیلہ[6] میں حسب ذیل سند سے کی ہے۔

زہیر بن محمد سے روایت ہے، وہ موسیٰ بن جبیر سے روایت کرتے ہیں، وہ نافع مولیٰ ابن عمر سے اور وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

حافظ البزار نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے اس کو ''نافع عن ابن عمر'' کی سند سے موقوفاً یعنی عبداللہ بن عمر کے قول کی حیثیت سے روایت کیا ہے اور یہ میرے پاس مرفوع شکل میں زہیر کی سند سے پہنچی ہے، کیونکہ زہیر حافظ حدیث نہیں تھا۔

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: اس سند سے یہ حدیث غریب یعنی ضعیف ہے۔ کیونکہ موسیٰ بن جبیر کے سوا اس کی سند کے تمام راوی ثقہ ہیں۔[7]

موسیٰ بن جبیر انصاری کا ذکر امام ابن ابی حاتم نے بھی ''الجرح والتعدیل'' میں کیا ہے، لیکن اس کی جرح وتعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔[8]

چونکہ موسیٰ بن جبیر مجہول الحال ہے اور نافع سے اپنی اس روایت میں منفرد بھی ہے اسی لیے حافظ ابن کثیر نے اس کو غریب کہا ہے۔

---

[1] موارد: ٧١٧ [2] مسند الامام احمد: ٦١٧٨ [3] منتخب ص ٨٦، ج١
[4] العقوبات: ص ٧٥، ج٢ [5] الکشف: ٢٩٣٨
[6] عمل الیوم واللیلة: ٦٥١ [7] تفسیر ابن کثیر: ص ٢٥٤، ج١
[8] الجرح والتعدیل: ص ١٣٩، ج٤

امام ابن حبان نے موسیٰ کو اگرچہ کتاب الثقات میں درج کیا ہے[1]۔ مگر یہ بھی لکھا ہے کہ وہ روایت حدیث میں غلطیاں کرتا تھا اور ثقہ راویوں کے خلاف حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔ امام ابن حبان نے اگر اس کو صریح لفظوں میں ثقہ قرار دیا ہوتا تو بھی تنہا ان کی توثیق پر اعتماد صحیح نہ ہوتا چہ جائیکہ انہوں نے اس کی ایسی صفت بیان کر دی ہے جس سے اس کی ثقاہت مجروح ہو گئی ہے۔ حالانکہ وہ راویوں کی توثیق میں سہل انگاری سے کام لیتے تھے۔

علامہ رشید رضا نے اس قصہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اہل کتاب کی مقدس کتابوں میں اس قصہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اب اگر یہ ان کتابوں کی روایات کے زمانے میں گھڑا گیا ہے تو یہ ان کتابوں سے ماخوذ ہو سکتا ہے جو خرافات کے قبیل سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس قصہ کو اسرائیلی خرافات میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس طرح کی کوئی روایت نبی کریم ﷺ کی مرفوع حدیث کے طور پر ثابت نہیں ہے۔[2]

اس روایت کی ناقابل اعتماد سند کے علاوہ اس کا متن حد درجہ منکر ہے۔ کیونکہ یہ فرشتوں کے بارے میں قرآن پاک کے صریح بیانات کے خلاف ہے جن میں سے بعض کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور جن کا خلاصہ یہ ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے نہایت فرماں بردار بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جو ذمہ داریاں سونپ دی ہیں وہ ان کی من وعن تعمیل میں لگے ہوئے ہیں۔

امام احمد بن حنبل نے بھی اس روایت کو منکر قرار دیا ہے جیسا کہ ابن قدامہ نے "المنتخب" میں لکھا ہے۔[3]

اور امام ابن ابی حاتم نے کتاب ''العلل'' میں لکھا ہے کہ ''میں نے اپنے والد سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا جو معاذ بن خالد عسقلانی نے زہیر بن محمد سے، انہوں نے موسیٰ بن جبیر سے، انہوں نے نافع سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے...... تو میرے والد نے فرمایا: یہ حدیث منکر ہے۔[4]

اوپر کے صفحات میں ہاروت اور ماروت کے بارے میں جو جھوٹی روایت (۱۹۲) پیش کی گئی ہے اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جس عورت نے ہاروت اور ماروت کو بدکاری پر آمادہ کیا تھا اس کو مسخ کر کے

---

[1] الثقات: ص ٤٥١، ج٧
[2] بحوالہ الضعیفہ: ص ٣١٨، ج، ح ١٧٠
[3] المنتخب ص ٢١٤، ج ١١
[4] العلل ص ٣١٨، ج٢، ح ١٦٩٩

''زہرہ'' نامی ستارے میں تبدیل کر دیا گیا جبکہ یہ زیر بحث منکر روایت یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ ''زہرہ'' نے خوبصورت عورت کی شکل اختیار کر کے ہاروت اور ماروت کو بدکاری پر آمادہ کیا۔ دونوں روایتوں کے متن میں یہ اختلاف خود ان کے بطلان کی دلیل ہے۔

ہاروت و ماروت کا قصہ قرآنی بیان کے خلاف ہے:

فرشتے اللہ تعالیٰ کے ''معصوم عن الخطاء'' بندے ہیں۔ وہ نورانی ہونے کی وجہ سے جو مادی شکل چاہیں اختیار کریں مگر اپنے اندر مادی خاصیت پیدا نہیں کر سکتے۔ جس کا مطلب ہے کہ فرشتے اپنی بقاء کے لیے جس طرح کھانے پینے سے بے نیاز ہیں اسی طرح وہ جنسی خواہشات سے بھی پاک ہیں۔ جس کا ثبوت درج ذیل قرآنی واقعہ سے ملتا ہے۔

قرآن پاک میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب الٰہی کے نزول سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں فرشتوں کی انسانی شکل میں آمد کا ذکر آیا ہے اور سورۂ ہود اور سورۃ الذاریات میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سامنے کھانے کے لیے بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا جس کو انہوں نے ہاتھ نہیں لگایا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًاؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍo فَلَمَّارَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةًؕ ﴾

[هود:٦٩، ٧٠]

''درحقیقت ہمارے فرستادہ فرشتے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر پہنچے اور کہا تم پر سلامتی ہو۔ ابراہیم نے جواب دیا تم پر سلام ہو۔ اور کچھ ہی دیر بعد ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آیا۔ مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس تک نہیں پہنچ رہے تو ان سے اجنبیت محسوس کی اور ان سے خوف محسوس کرنے لگا''

اور سورۃ الذاریات میں ہے ابراہیم علیہ السلام نے ان سے پوچھا: ''اَلَا تَاْكُلُوْنَ'' کیا تم لوگ کھاتے نہیں؟ مطلب یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کے سامنے بھنا ہوا بچھڑا رکھا اور پھر دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو حیرت و تعجب سے پوچھا: کیا تم لوگ کھاتے نہیں۔ معلوم ہوا کہ اگر انسانی شکل اختیار کرنے سے فرشتوں کی خاصیت بدل جاتی تو وہ اپنے عظیم میزبان کی دلداری کی خاطر بھنا ہوا بچھڑا کھانا شروع کر دیتے۔

اور سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ہاروت اور ماروت کا قصہ اجمالاً جس سیاق وسباق میں بیان فرمایا ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ان کو بنو اسرائیل کی آزمائش کے لیے بھیجا گیا تھا نہ کہ خود ان کی اپنی آزمائش کے لیے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ط وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ط ﴾ [البقرۃ:۱۰۲]

"(اہل کتاب کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا) اور پیچھے لگے اس جادو کے جو شیاطین سلیمان کے عہد حکومت میں پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا بلکہ کفر کا ارتکاب ان شیطانوں نے کیا تھا جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے اور پیچھے پڑے اس علم کے جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت اور ماروت پر نازل کیا گیا تھا، جبکہ وہ دونوں فرشتے کسی کو جو بھی سکھاتے تو کہہ دیتے کہ: "ہم محض ایک آزمائش ہیں۔ لہٰذا تو کفر کا ارتکاب مت کر۔"

یہ آیت مبارکہ بصراحت یہ اعلان کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں فرشتوں کو بابل میں جادو کا علم دے کر لوگوں کی آزمائش کی غرض سے نازل کیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ شیطانوں کے برعکس لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے وقت یہ بتا دیتے تھے کہ جادو سیکھنا کفر ہے۔

جادو کیا ہے؟

قرآن پاک کے بیان سے اتنی بات تو ثابت ہے کہ "جادو کا وجود ہے" اور اس کا انکار خود قرآن کا انکار ہے۔ اوپر ہاروت اور ماروت کے قصہ پر مشتمل سورۃ البقرہ کی جس آیت کا ایک حصہ نقل کیا گیا ہے وہ پوری آیت درج ذیل ہے:

﴿ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ط وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ط فَيَتَعَلَّمُوْنَ

مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ط وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ط وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ قف وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ط لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ٥ ﴾ [البقرة:١٠٢]

''(اہل کتاب کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا) اور پیچھے لگے اس جادو کے جو شیاطین سلیمان کے عہد حکومت میں پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا بلکہ کفر کا ارتکاب ان شیطانوں نے کیا تھا جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے اور پیچھے پڑے اس علم کے جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت اور ماروت پر نازل کیا گیا تھا، جبکہ وہ دونوں فرشتے کسی کو جو بھی سکھاتے تو کہہ دیتے کہ ''ہم محض ایک آزمائش ہیں لہٰذا تو کفر کا ارتکاب مت کر۔ تاہم وہ ان سے ایسی چیز سیکھتے تھے جس کے ذریعہ شوہر اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ حالانکہ وہ اس کے ذریعہ اللہ کے حکم کے بغیر کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اور وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو ان کو نقصان تو پہنچا سکتی تھی لیکن نفع نہیں پہنچا سکتی تھی۔ درحقیقت انہیں معلوم تھا کہ جس نے اسے خریدا ہے، آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ کتنی بری متاع تھی جس کے بدلے میں انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ کاش انہیں معلوم ہوتا''

اس آیت مبارکہ میں جادو کی عملی ممارست کا ذکر کیا گیا ہے جس میں یہودیوں کا ایک گروہ ملوث تھا۔ اور اس کے ذریعہ وہ شوہر اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال دیا کرتا تھا۔

قرآن کی یہ صراحت یہ ثابت کر رہی ہے کہ ایک طرف اگر جادو اپنی تاثیر رکھتا ہے تو دوسری طرف جو لوگ اس وقت جادوگری اور شعبدہ بازی سیکھ رہے تھے وہ اخلاقی گراوٹ کی آخری پستی میں گر چکے تھے۔ کیونکہ کسی انسان کی پست اخلاقی کا اس سے زیادہ نیچا اور کوئی مرتبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی عورت کو اس کے شوہر سے جدا کرنے کی کوشش کرے۔

مذکورہ آیت مبارکہ میں ایک اور نہایت اہم بات یہ بیان کی گئی ہے کہ: جادو سیکھنے اور اس کو استعمال کرنے میں صرف نقصان ہی نقصان ہے۔ اس میں نفع کا کوئی عنصر نہیں ہے۔ اسی بات کو سورۃ طٰہٰ میں یوں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَ لَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ٥ ﴾ [طه:٦٩]

''اور جادوگر جہاں سے بھی آئے کامیاب نہیں ہو سکتا''

ہاروت اور ماروت کا یہ قصہ قران پاک کی صرف اسی آیت (البقرہ:۱۰۲) میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن قوم فرعون کے جادوگروں کا قصہ قرآن پاک کی متعدد سورتوں میں بیان کیا گیا ہے جن میں سے سورۃ الاعراف میں ان کے جادو کی یہ حقیقت بیان کی گئی ہے:

﴿ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴾ [الاعراف:۱۱٦]

''جب انہوں نے (اپنی لاٹھیاں اور رسیاں) پھینکیں تو نگاہوں کو سحر زدہ اور دلوں کو خوف زدہ کر دیا اور وہ بہت بڑا جادو لائے تھے۔''

اور سورۃ طہٰ میں ہے:

﴿ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴾ [طه:٦٦]

''موسیٰ نے (جادوگروں سے) کہا: بلکہ تم پھینکو۔ یکا یک ان کی رسیاں اور لاٹھیاں موسیٰ کو ان کے جادو کے زور سے ایسی لگیں کہ وہ دوڑ رہی ہیں''

ان دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت یہ صراحت کر رہی ہے کہ جادوگروں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا جس کی وجہ سے ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کو سانپ نظر آنے لگے۔ جبکہ دوسری آیت یہ بتا رہی ہے کہ ان کے جادو کے زور سے موسیٰ علیہ السلام کو ایسا خیال ہونے لگا کہ رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں۔

یعنی پہلی آیت میں ان کی شعبدہ بازی اور جادوگری کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور دوسری میں اس کا نتیجہ۔ دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ ان کے جادو سے رسیوں اور لاٹھیوں کی ماہیت اور حقیقت تبدیل نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ رسیاں اور لاٹھیاں ہی رہیں۔ البتہ ان کے ہاتھوں کی صفائی اور خاص انداز سے زمین پر ان کو ڈالنے سے لوگوں کی نگاہوں اور خیالات پر یہ اثر پڑا کہ انہوں نے ان کو دوڑتے ہوئے سانپ محسوس کیا جس کی وجہ سے وہ خوف زدہ ہو گئے۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے معجزے نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کو حقیقی سانپ میں تبدیل کر دیا جس کو جادوگروں نے فوراً بھانپ لیا۔ کیونکہ وہ اپنے جادو کی حقیقت سے واقف تھے اور وہ فوراً یہ سمجھ گئے کہ چشم زدن میں ایک بے جان لاٹھی کا حقیقی سانپ بن جانا کسی جادو کا نتیجہ نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تو ایک معجزاتی

عمل ہے جو اس ذاتِ مطلق کی قدرت کا ایک مظہر ہے جو پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اسی لیے وہ پکارا ٹھے: ﴿ اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰی ﴾ [طه:٧٠]

''ہم ایمان لائے ہارون اور موسیٰ کے رب پر''

غور کا مقام ہے کہ جادوگروں نے یہ نہیں کہا: ہم ہارون اور موسیٰ پر ایمان لائے۔ کیونکہ ان کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ایک معمولی سی بے جان لاٹھی کو ایک عظیم الجثہ اور ہیبت ناک سانپ میں تبدیل کر دینا کسی مخلوق کا کام نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ وہ ہارون اور موسیٰ علیہما السلام جیسے عظیم المرتبت انسان ہی کیوں نہ ہوں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ظاہر ہونے والے الٰہی معجزے نے ان کے نہاں خانہ دل کی ظلمتوں کو کافور کر دیا اور وہ نورِ توحید سے روشن ہوگئے۔ یہ سب کچھ جس سرعت سے ہوا، اس کو قرآن پاک کے معجزاتی بیان میں محسوس کیا جاسکتا ہے:

﴿ فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰی ﴾ [طه:٧٠]

''پس گرا دیے گئے جادوگر سجدہ کرتے ہوئے۔ اور وہ پکارا ٹھے: ہم ایمان لائے ہارون اور موسیٰ کے رب پر''

کس قدر مؤثر ہے قرآن پاک کی یہ تصویر کشی۔ ادھر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں معجزہ دیکھا، ادھر وہ یکبارگی اور بے ساختہ سجدے میں گر گئے۔ جیسے کسی نے ان کو گرا دیا ہو۔

پھر انہوں نے اپنے ایمان کا مظاہرہ سجدے سے کیا جو عبادت الٰہی کی معراج اور قرب الٰہی کا مظہر ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴾ [العلق:١٩] ''سجدہ کر اور قریب ہو جا''

اوپر کی وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ جادو کے ذریعہ کسی چیز کی ماہیت اور حقیقت کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا اور اس سے انسان کے صرف نظر و خیال پر اثر پڑتا ہے۔ پھر یہ اثر انسان کے نفس اور حواس تک سرایت کر جاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ سحر زدہ انسان کے اعضاء بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔

ایک سحر زدہ انسان کی حالت ایک نفسیاتی مریض کی حالت سے مشابہہ ہوتی ہے۔ نفسیاتی مریض کے تمام اعضاء صحیح وسالم ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ اس کے بیمار احساسات و خیالات اس کے جسم پر بھی اثر انداز ہونے لگتے ہیں، خوف، بے خوابی، نسیان، بھوک و پیاس کا فقدان، عزیزوں اور رشتہ داروں کی طرف میلان

میں کمی جو نفرت و کراہیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح کی کیفیتوں سے ایک سحر زدہ انسان بھی گزرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سحر زدہ انسان کی یہ حالت جادو کے نتیجے میں ہوتی ہے جبکہ نفسیاتی بیماری کے کچھ اور اسباب ہوتے ہیں جن کی تفصیلات کا نہ یہ موقعہ ہے اور نہ ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔

چونکہ جادو ایک سفلی عمل کا نام ہے، اس لیے ہر زمانے اور ہر معاشرے کے نہایت بدطینت اور رذیل ترین افراد ہی اس میں ملوث رہے ہیں۔ آج بھی جادوگری اور شعبدہ بازی وہی لوگ کرتے ہیں جن کی فطرت مسخ ہو چکی ہے اور جن کی فکر و ارادے پر شیطان کا مکمل غلبہ ہو چکا ہے۔

سورۃ البقرہ کی آیت ۱۰۲ میں جادو سیکھنے والوں کی یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیتے ہیں۔

﴿ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖط ﴾ [البقرۃ:۲:۱۰۲]

''وہ دونوں فرشتوں سے ایسی چیز سیکھتے تھے جس کے ذریعہ شوہر اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں۔''

ظاہری بات ہے کہ جادوگر صرف اسی بداخلاقی اور صرف اسی برے عمل کا ارتکاب نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے اس گندے عمل کے ذریعہ معصوم اور بے قصور لوگوں کو اور بھی ضرر پہنچاتے ہیں۔ لیکن شوہر اور بیوی میں جدائی ڈالنا چونکہ نہایت ہی حقیر اور کمینی حرکت ہے جس سے ایک ہرا بھرا گھر اور ایک ہنستا کھیلتا خاندان غم و آلام کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور رحمت و سکینت پر مبنی یہ پاکیزہ رشتہ باہمی نفرت میں تبدیل ہو جاتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے جادو کے صرف اسی ایک نتیجے کا ذکر کر دینے پر اکتفا کیا ہے تاکہ معاشرے کے صالح اور باضمیر افراد اس سفلی اور غیر اخلاقی عمل سے متنفر ہو جائیں۔

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے جادو کو کفر قرار دیا ہے اور اپنے صالح بندے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ذات کو اس سے پاک قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ [البقرۃ:۲:۱۰۲]

''سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ کفر کے مرتکب شیاطین ہوئے''

تو آیت مبارکہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام سے جس کفر کی نفی کی گئی ہے وہ جادو ہی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جادو کفر ہے اور جادو کا پیشہ اختیار کرنے والا کافر ہے۔

اس لیے کہ جادو کا سارا مدار شیاطین، ارواح خبیثہ اور ستاروں پر ہوتا ہے یعنی جادوگر دوسروں پر برا اثر ڈالنے اور ان کو نقصان پہنچانے کے لیے شیطانوں، خبیث روحوں اور ستاروں سے مدد لیتے ہیں۔

کہانت اور تنجیم بھی سحر کے قبیل سے ہیں۔ کاہن اٹکل پچو سے غیب کی باتیں بتاتا ہے اور منجم ستاروں کی چال اور ان کے طلوع وغروب کے ذریعہ غیبی امور کے علم کا دعویٰ کرتا ہے۔ نبی مکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ اَتَى كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُوْلُ ، فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ))[1]

''جو کسی کاہن کے پاس جائے اور اس کی باتوں کی تصدیق کرے تو اس نے محمد ﷺ پر نازل ہونے والی شریعت کا انکار کیا''

نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے جن عالم بالا میں جا کر سن گن لینے کی کوشش کرتے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد عالم بالا میں اتنے سخت حفاظتی انتظامات کر دیے گئے کہ ان کے لیے آسمانوں کا رخ کرنا ناممکن ہو گیا۔ اسی کی طرف سورۃ الجن کی درج ذیل آیت میں ارشاد ہے:

﴿ وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًاo ﴾ [الجن:۹]

''(جن کہتے ہیں) اور ہم آسمان میں سننے کے لیے بعض جگہوں پر بیٹھا کرتے تھے لیکن اب جو سننے کی کوشش کرتا ہے تو اپنے لیے گھات میں چمکدار شعلے کو پاتا ہے''

اور سورۃ الحجر میں اس مسئلے کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَo وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍo اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌo ﴾ [الحجر:١٦ تا ١٨]

''درحقیقت ہم نے آسمان میں بہت سی برجیاں بنا دی ہیں اور اس کو دیکھنے والوں کے لیے خوب سجا دیا ہے۔ اور ہر شیطان مردود سے اس کو محفوظ کر دیا ہے۔ اگر کوئی کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک روشن شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے''

رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل شیاطین اور جنات آسمانوں میں جا کر کچھ سن گن لینے کی کوشش اس لیے کرتے تھے تاکہ وہ زمین میں کاہنوں، نجومیوں اور جادوگروں کو عالم بالا کی بعض خبریں، ان میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر پہنچائیں۔ اور یہ کاہن، نجومی اور جادوگر ان کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کریں۔

---

[1] جامع ترمذی: ح ۱۳۵۔ سنن ابن ماجہ: ٥٢٨، ٦٤٤

چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((إِذَا قَضَى اللّٰهُ الْأَمْرَ فِي السَّمَاءِ، ضَرَبَتِ الْمَلَائِكَةُ بِأَجْنِحَتِهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهِ كَالسِّلْسِلَةِ عَلَى صَفْوَانٍ، فَإِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوا: مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ: قَالُوا لِلَّذِي قَالَ: الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ۔ فَيَسْمَعُهَا مُسْتَرِقُو السَّمْعِ وَمُسْتَرِقُو السَّمْعِ هٰكَذَا، وَاحِدٌ فَوْقَ آخَرَ، فَرُبَّمَا أَدْرَكَ الشِّهَابُ الْمُسْتَمِعَ قَبْلَ أَنْ يَرْمِيَ بِهَا إِلَى صَاحِبِهِ فَيُحْرِقَهُ، وَرُبَّمَا لَمْ يُدْرِكْهُ، حَتَّى يَرْمِيَ بِهَا إِلَى الَّذِي يَلِيهِ، إِلَى الَّذِي هُوَ أَسْفَلَ مِنْهُ، حَتَّى يُلْقُوهَا إِلَى الْأَرْضِ، فَتُلْقَى عَلَى فَمِ السَّاحِرِ، فَيَكْذِبُ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ، فَيُصَدَّقُ، فَيَقُولُونَ: أَلَمْ يُخْبِرْنَا يَوْمَ كَذَا وَكَذَا وَيَكُونُ كَذَا وَكَذَا؟ فَوَجَدْنَاهُ حَقًّا، لِلْكَلِمَةِ الَّتِي سُمِعَتْ مِنَ السَّمَاءِ))[1]

''جب اللہ آسمان میں کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے تو فرشتے اس کے فیصلے کی اطاعت میں اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہیں اور ان سے ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسی کسی چکنی چٹان پر زنجیر رگڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جب فرشتوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو وہ دریافت کرتے ہیں: تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ چنانچہ وہ یہ سوال کرنے والے سے کہتے ہیں: (ہمارے رب نے) حق فرمایا، اور وہ بلند و بالا اور بہت بڑا ہے۔ فرشتوں کی ان باتوں کو چوری چھپے سننے والے (شیاطین و جن) سن لیتے ہیں اور چوری چھپے سننے والے اس طرح ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں۔ بسا اوقات تیز شعلہ فرشتوں کی باتیں سننے والے کو، قبل اس کے کہ وہ اس کو اپنے ساتھی تک پہنچائے دھر لیتا اور اس کو جلا دیتا ہے۔ اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ شعلہ اس کو نہیں پکڑ پاتا یہاں تک کہ سننے والا جن فرشتوں کی باتوں کو اپنے سے قریب یعنی اپنے نیچے والے جن کو پہنچا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ان کو زمین پر پھینکتے ہیں اور وہ باتیں جادوگر کے منہ میں ڈال دی جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ مزید سو جھوٹ ملا دیتا ہے اور ان کو سچ مان لیا جاتا ہے۔ کاہن اور جادوگر کہتے ہیں: کیا فلاں دن ہمیں اس نے (جادوگر نے) یہ خبر نہیں دی تھی کہ ایسا اور ایسا ہوگا اور ہم نے اس کو اس ''کلمہ'' کی وجہ سے سچ

[1] صحیح البخاری: ح ٤٧٠١، ٤٨٠٠

نہیں پایا؟ جو آسمان سے سنا گیا تھا؟"

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو کو ان سات گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ قرار دیا ہے جو انتہائی مہلک اور تباہ کن ہیں اور ان میں سے بعض کے ارتکاب سے ایک مسلمان اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ حدیث پاک کے الفاظ ہیں:

((اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! وَمَا هُنَّ؟ قَالَ: الشِّرْكُ بِاللّٰهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ، وَأَكْلُ الرِّبَا، وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ وَالتَّوَلِّي يَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ))[1]

"سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ کیا ہیں؟ فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادوگری، کسی ایسی جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام کیا ہے، سود کا مال کھانا، یتیم کا مال کھانا، جہاد میں دشمن کے مقابلے سے پیٹھ پھیر کر بھاگنا اور پاکدامن مومن بھولی بھالی عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگانا"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو:

صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن نسائی اور ابن ماجہ میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیے جانے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ ذیل میں صحیح بخاری کی حدیث کا متن اور اس کا ترجمہ درج کر رہا ہوں۔ جس کے بعد یہ واضح کیا جائے گا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر آپ کی نبوت کے منافی نہیں ہے۔

((عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ سَحَرَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ مِنْ بَنِي زُرَيْقٍ، يُقَالُ لَهُ لَبِيدُ بْنُ الْأَعْصَمِ، حَتَّى كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهُ كَانَ يَفْعَلُ الشَّيْءَ، وَمَا فَعَلَهُ، حَتَّى إِذَا كَانَ ذَاتَ يَوْمٍ أَوْ ذَاتَ لَيْلَةٍ وَهُوَ عِنْدِي، لٰكِنَّهُ دَعَا وَدَعَا، ثُمَّ قَالَ: يَا عَائِشَةُ! أَشَعَرْتِ أَنَّ اللّٰهَ أَفْتَانِي فِيمَا اسْتَفْتَيْتُهُ فِيهِ؟ أَتَانِي رَجُلَانِ فَقَعَدَ أَحَدُهُمَا عِنْدَ رَأْسِي وَالْآخَرُ عِنْدَ رِجْلَيَّ، فَقَالَ أَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهِ مَا

[1] صحیح بخاری: ح ۲۷٦٦ ۔ صحیح مسلم: ح ۸۹

وَجَعُ الرَّجُلِ؟ فَقَالَ: مَطْبُوبٌ، قَالَ: مَنْ طَبَّهُ؟ قَالَ: لَبِيدُ بْنُ الْأَعْصَمِ، قَالَ: فِي أَيِّ شَيْءٍ؟ قَالَ: فِي مُشْطٍ وَمُشَاطَةٍ وَجُفِّ طَلْعِ نَخْلَةٍ ذَكَرٍ، قَالَ: وَأَيْنَ هُوَ؟ قَالَ: فِي بِئْرِ ذَرْوَانَ، فَأَتَاهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي نَاسٍ مِنْ أَصْحَابِهِ، فَجَاءَ فَقَالَ: يَا عَائِشَةُ! كَأَنَّ مَاءَهَا نُقَاعَةُ الْحِنَّاءِ وَكَأَنَّ رُؤُسَ نَخْلِهَا رُؤُسُ الشَّيَاطِينِ". قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَفَلَا اسْتَخْرَجْتَهُ قَالَ: قَدْ عَافَانِي اللَّهُ فَكَرِهْتُ أَنْ أُثِيرَ عَلَى النَّاسِ فِيهِ شَرًّا۔" فَأَمَرَ بِهَا فَدُفِنَتْ))[1]

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بنو زریق کے ایک آدمی نے، جس کا نام لبید بن اعصم تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کام کے بارے میں یہ خیال ہوتا کہ آپ نے وہ کام کر لیا ہے حالانکہ وہ نہیں کیا ہوتا تھا۔ آخر ایک دن یا ایک رات آپ میرے ہاں تھے اور آپ نے اللہ سے بار بار دعا مانگی۔ پھر فرمایا: اے عائشہ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ نے مجھے وہ بات بتا دی ہے جو میں نے اس سے پوچھی تھی۔ میرے پاس دو آدمی آئے، ان میں سے ایک میرے سرہانے بیٹھ گیا اور دوسرا پائنتی کے پاس۔ میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے پوچھا: آدمی کو کیا تکلیف ہے؟ تو اس نے جواب دیا: ان پر جادو کیا گیا ہے۔ اس نے پوچھا: کس نے کیا ہے؟ جواب دیا: لبید بن اعصم نے۔ دریافت کیا: کس چیز میں؟ جواب دیا: کنگھی اور بالوں میں، ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف کے اندر۔ اس کے ساتھی نے پوچھا: وہ کہاں ہے؟ کہا: ذروان کے کنویں میں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے اور جب واپس تشریف لائے تو فرمایا: اے عائشہ! اس کنویں کا پانی ایسا تھا گویا اس میں مہندی گھول دی گئی ہو اور اس کے کھجور کے سرے شیطانوں کے سر کی مانند تھے۔'' میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے اس کا اعلان کیوں نہ کیا؟ فرمایا: اللہ نے مجھے شفا دے دی لہٰذا مجھے یہ ناپسند ہے کہ اس کے بارے میں لوگوں میں برائی پھیلاؤں۔ پس آپ نے حکم دیا اور اس کو دفن

[1] صحیح بخاری: ح ۳۲۶۸، ۵۷۶۳، ۵۷۶۶، ۶۰۶۳، ۶۳۹۱۔ صحیح مسلم: ح ۲۱۸۹۔ سنن نسائی ح ۴۰۹۱، ابن ماجہ: ۲۸۷۲، ۳۶۱۱۔

کر دیا گیا''

اوپر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں جن ''دو آدمیوں'' کا ذکر آیا ہے وہ درحقیقت دو فرشتے تھے جو انسانی شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ چنانچہ سنن نسائی میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے جو حدیث مروی ہے اس میں یہ صراحت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تھی کہ آپ پر ایک یہودی نے جادو کیا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

((عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ، قَالَ: سَحَرَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ مِنَ الْيَهُوْدِ، فَاشْتَكَى لِذَلِكَ أَيَّامًا، فَأَتَاهُ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ: إِنَّ رَجُلًا مِنَ الْيَهُوْدِ سَحَرَكَ، عَقَدَ لَكَ عُقَدًا فِيْ بِئْرِ كَذَا وَكَذَا، فَأَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَاسْتَخْرَجُوْهَا، فَجِيءَ بِهَا، فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَأَنَّمَا نُشِطَ مِنْ عِقَالٍ، فَمَا ذَكَرَ ذَلِكَ لِذَلِكَ الْيَهُوْدِيِّ، وَلَا رَآهُ فِيْ وَجْهِهِ قَطُّ))[1]

''حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: ایک یہودی مرد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا جس کی وجہ سے کئی روز تک آپ کی طبیعت ناساز رہی۔ پھر جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ایک یہودی مرد نے آپ پر جادو کر دیا ہے۔ اس نے آپ کے لیے کئی گرہیں لگائی ہیں جو اس اس طرح کے کنویں میں ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو بھیجا جنہوں نے ان گرہوں کو نکالا اور وہ آپ کے پاس لائی گئیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کھڑے ہوئے گویا کسی بندھن یا قید سے آزاد کر دیے گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کا نہ اس یہودی سے ذکر کیا اور نہ اس کو اپنے سامنے کبھی دیکھا''

اس حدیث میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے واقعہ کے بیان میں بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ البتہ اس سے اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو آپ کی خدمت میں بھیجا تھا جنہوں نے آپ کو یہ خبر دی کہ آپ پر جادو کیا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ صحیح بخاری کی حدیث میں مذکور دونوں مردوں میں

---

[1] سنن نسائی: ح ۴۰۹۱

سے ''سوال کرنے والے حضرت میکائیل علیہ السلام تھے اور جواب دینے والے حضرت جبریل علیہ السلام۔

انہوں نے اس واقعہ سے متعلق تمام روایتوں کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

نبی کریم ﷺ اس کنویں کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ نے اس میں جھانکا اور ایک آدمی کنویں میں اترا اور کھجور کے اس خوشے کو نکالا جس میں موم کا ایک پتلا بھی تھا جس میں سوئیاں چبھی ہوئی تھیں اور ایک تانت میں گیارہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ جبریل علیہ السلام ''معوذتین'' لے کر نازل ہوئے اور آپ سے ان کو پڑھنے کے لیے کہا۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو پڑھنا شروع کیا۔ آپ ایک آیت پڑھتے جس کے ساتھ ایک گرہ کھولتے اور پُتلے سے ایک سوئی نکالتے۔ سوئی نکالتے وقت آپ درد محسوس کرتے۔ پھر آپ کو آرام آجاتا۔ اور جب معوذتین کی گیارہ آیتوں کی تلاوت کے ساتھ ساتھ گیارہ گرہیں کھول دی گئیں اور ساری سوئیاں نکال دی گئیں تو نبی مکرم ﷺ ایسے ہوگئے جیسے کسی بندھن سے آزاد کردیے گئے ہوں۔ [1]

رسول اللہ ﷺ پر جادو کا اثر منصب نبوت کے منافی نہیں:

صحیح احادیث میں رسول اللہ ﷺ پر جادو کیے جانے اور آپ کی صحت پر اس کے اثر انداز ہونے کا جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ اس تحفظ اور عصمت کے منافی نہیں ہے جس کا ذکر سورۃ المائدہ میں آیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ط ﴾ [المائدہ:٦٧]

''اے رسول! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ (لوگوں تک) پہنچادو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تم کو (لوگوں کے شر سے) محفوظ رکھے گا''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کے لیے جس حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اس کا تعلق تبلیغ دین سے ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ شیاطین جن وانس اگر ایک ساتھ مل کر آپ کو تبلیغِ دین اور دعوتِ حق کی نشر واشاعت سے باز رکھنے کی کوشش کریں تو کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ یہ دین پھیلے گا اور کفر وشرک کی تاریکی چھٹے گی۔

---

[1] فتح الباری: ص ٢٥٦٠، ج٣، بتصرف

﴿ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝ ﴾ [التوبة:٣٣]

''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے پوری جنسِ دین پر غالب کردے۔ خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو''

اسی طرح نبی کریم ﷺ کی عصمت وحفاظت اور اسلام کے غلبہ کا وعدہ اس امر کا بھی متقاضی تھا کہ دشمنانِ اسلام رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے پر قادر نہیں تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے محفوظ ومعصوم ہونے کے معنی یہ بھی ہیں کہ شیاطین جن وانس میں سے کوئی بھی آپ کے فرائض رسالت میں خلل انداز ہونے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ آپ کے خیالات اور آپ کی زبانِ مبارک کو بھی مکمل عصمت حاصل تھی اور کسی بھی حال میں آپ نے نہ کوئی غلط بات سوچی اور نہ زبان مبارک سے کبھی کوئی غلط بات نکالی تھی۔

﴿ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی۝ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۝ ﴾ [النجم:٢، ٤]

''تمہارا ساتھی نہ بھٹکا ہے اور نہ بہکا ہے۔ اور وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا۔ یہ تو صرف ایک وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے''

قرآن پاک اپنے نزول سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہونے تک شیاطین کی دسترس سے مکمل طور پر محفوظ رہا ہے۔

﴿ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّیٰطِیْنُ۝ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهُمْ وَمَا یَسْتَطِیْعُوْنَ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ۝ ﴾ [الشعراء:٢١٠، ٢١٢]

''اس (قرآن) کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں اور نہ ایسا کرنا ان کے شایانِ شان ہے۔ اور نہ وہ اس کی استطاعت ہی رکھتے ہیں۔ وہ تو اس کی سماعت تک سے دور رکھے گئے ہیں۔''

رسول اکرم ﷺ کو خواب اور بیداری ہر حالت میں شیطانی وسوسوں اور برے خیالات سے تحفظ حاصل تھا۔ فرمایا:

((یَا عَائِشَةُ! إِنَّ عَیْنَیَّ تَنَامَانِ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ))[1]

[1] صحیح بخاری: ١١٤٧، ٢٠١٣۔ صحیح مسلم: ح ٧٣٨

''اے عائشہ! میری آنکھیں تو سوتی ہیں مگر میرا دل نہیں سوتا''

لیکن رسول اللہ ﷺ کو بشر ہونے کے ناطے جب زخمی کیا جاسکتا تھا اور آپ کو زخمی کیا بھی گیا۔ جیسا کہ غزوۂ احد میں آپ کے چہرۂ مبارک کو زخمی کر دیا گیا تھا اور آپ کے سامنے کے چار دانت شہید کر دیے گئے تھے۔ خود کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک کے اندر گھس گئیں اور خون جاری ہو گیا۔ چنانچہ حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((لَمَّا كُسِرَتْ بَيْضَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى رَأْسِهِ وَأُدْمِيَ وَجْهُهُ وَكُسِرَتْ رَبَاعِيَتُهُ وَكَانَ عَلِيٌّ يَخْتَلِفُ بِالْمَاءِ فِي الْمِجَنِّ، وَكَانَتْ فَاطِمَةُ تَغْسِلُهُ، فَلَمَّا رَأَتِ الدَّمَ يَزِيدُ عَلَى الْمَاءِ كَثْرَةً، عَمَدَتْ إِلَى حَصِيرٍ فَأَحْرَقَتْهَا وَأَلْصَقَتْهَا عَلَى جُرْحِهِ فَرَقَأَ الدَّمُ))[1]

''جب نبی کریم ﷺ کا خود آپ کے سر مبارک پر توڑ دیا گیا اور آپ کے چہرہ انور کو زخمی کر دیا گیا اور آپ کے سامنے کے چاروں دانت توڑ دیے گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ڈھال میں پانی لاتے تھے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا زخم کو دھوتی تھیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ پانی کے ساتھ خون زیادہ نکلنے لگا ہے تو انہوں نے ایک چٹائی کی طرف رخ کیا، اس کو جلایا اور اس کی راکھ آپ کے زخم پر چپکا دی تب خون بند ہو گیا۔''

اور بشر ہونے کے ناطے آپ کے جسم مبارک پر زہر کا اثر بھی ہو سکتا تھا اور ہوا بھی۔ جیسا کہ بکری کے گوشت کا ایک زہر آلود ٹکڑا صرف منہ میں رکھ لینے سے ہوا تھا حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اس ٹکڑے کو نگلنے کی بجائے تھوک دیا تھا۔ پھر بھی اس کا اثر آپ پر آپ کی زندگی کی آخری سانس تک باقی رہا۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں:

((لَمَّا فُتِحَتْ خَيْبَرُ أُهْدِيَتْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَاةٌ فِيهَا سُمٌّ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِجْمَعُوا إِلَيَّ مَنْ كَانَ هَا هُنَا مِنْ يَهُودَ، فَجُمِعُوا لَهُ، فَقَالَ: إِنِّي سَائِلُكُمْ عَنْ شَيْءٍ، فَهَلْ أَنْتُمْ صَادِقِيَّ عَنْهُ؟ فَقَالُوا: نَعَمْ۔ قَالَ لَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ أَبُوكُمْ؟ قَالُوا: فُلَانٌ۔ فَقَالَ:

[1] صحيح بخاري: ح ٢٤٣، ٢٩٠٣، ٢٩١١، ٣٠٣٧، ٤٠٧٥، ٥٢٤٨، ٥٧٢٢۔ صحيح مسلم: ١٧٩٠

كَذَبْتُمْ، بَلْ أَبُوكُمْ فُلَانٌ۔ قَالُوا: صَدَقْتَ، قَالَ: فَهَلْ أَنْتُمْ صَادِقِيَّ عَنْ شَيْءٍ إِنْ سَأَلْتُ عَنْهُ؟ فَقَالُوا: نَعَمْ يَا أَبَا الْقَاسِمِ، وَإِنْ كَذَبْنَا عَرَفْتَ كَذِبَنَا كَمَا عَرَفْتَهُ فِي أَبِينَا، فَقَالَ لَهُمْ: مَنْ أَهْلُ النَّارِ؟ قَالُوا: نَكُونُ فِيهَا يَسِيرًا، ثُمَّ تَخْلُفُونَا فِيهَا۔ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اخْسَئُوا فِيهَا، وَاللَّهِ لَا نَخْلُفُكُمْ فِيهَا أَبَدًا، ثُمَّ قَالَ: هَلْ أَنْتُمْ صَادِقِيَّ عَنْ شَيْءٍ إِنْ سَأَلْتُكُمْ عَنْهُ؟ قَالُوا: نَعَمْ يَا أَبَا الْقَاسِمِ، قَالَ: هَلْ جَعَلْتُمْ فِي هَذِهِ الشَّاةِ سُمًّا؟ قَالُوا: نَعَمْ۔ قَالَ: مَا حَمَلَكُمْ عَلَى ذَلِكَ؟ قَالُوا: أَرَدْنَا إِنْ كُنْتَ كَاذِبًا نَسْتَرِيحُ، وَإِنْ كُنْتَ نَبِيًّا لَمْ يَضُرَّكَ))[1]

''جب خیبر فتح ہوگیا تو نبی مکرم ﷺ کی خدمت میں ایک زہر آلود بکری تحفے میں بھیجی گئی۔ اس پر نبی معظم ﷺ نے فرمایا: یہاں جو یہودی ہوں ان کو میرے پاس جمع کرو۔ چنانچہ ان کو جمع کیا گیا۔ آپ نے فرمایا: میں تم لوگوں سے ایک چیز کے بارے میں پوچھنے جا رہا ہوں۔ کیا تم لوگ اس کے بارے میں مجھ سے صدق بیانی سے کام لو گے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا: تمہارا باپ کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا: فلاں۔ آپ نے فرمایا: تم جھوٹے ہو۔ بلکہ تم لوگوں کا باپ فلاں ہے۔ انہوں نے عرض کیا: آپ نے سچ فرمایا۔ آپ نے فرمایا: اگر میں تم سے کسی چیز کے بارے میں دریافت کروں تو کیا تم اس کے بارے میں مجھے صحیح بات بتاؤ گے؟ انہوں نے جواب دیا: اے ابوالقاسم! ہاں۔ کیونکہ اگر ہم نے کذب بیانی سے کام لیا تو آپ کو ہمارا جھوٹ معلوم ہو جائے گا۔ جس طرح آپ نے ہمارے باپ کے بارے میں ہماری غلط بیانی جان لی ہے۔ نبی معظم ﷺ نے ان سے فرمایا: جہنمی کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ہم جہنم میں بہت تھوڑی مدت رہیں گے۔ پھر ہمارے بعد آپ لوگ اس میں آ جائیں گے۔ آپ نے فرمایا: تم لوگ اس میں ذلیل و خوار ہو کر پڑے رہو۔ اللہ کی قسم تمہارے بعد ہم اس میں کبھی نہیں داخل ہوں گے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا تم لوگ اس چیز کے بارے میں مجھ سے صحیح بات بتاؤ گے جس کے بارے میں، تم سے میں سوال کروں؟ انہوں نے کہا: اے ابوالقاسم ہاں۔ آپ نے فرمایا: کیا تم لوگوں نے اس بکری میں زہر ملایا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں۔ نبی

---

[1] صحیح بخاری: ح ۳۱۶۹، ۴۲۴۹، ۵۷۷۷

معظم ﷺ نے فرمایا: تم لوگوں کو ایسا کرنے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟ انہوں نے عرض کیا: ایسا کرنے سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ دعویٔ نبوت میں جھوٹے ہیں تو ہم (آپ سے) چھٹکارا پا لیں گے اور اگر آپ نبی ہیں تو یہ زہر آپ کو نقصان نہ پہنچا سکے گا۔"

مرض الموت میں رسول اکرم ﷺ پر اس زہر کا اثر پوری شدت سے ظاہر ہو گیا تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

((كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ فِي مَرَضِهِ الَّذِي مَاتَ فِيهِ: يَا عَائِشَةُ مَا أَزَالُ أَجِدُ أَلَمَ الطَّعَامِ الَّذِي أَكَلْتُ بِخَيْبَرَ، فَهٰذَا أَوَانُ وَجَدْتُ انْقِطَاعَ أَبْهَرِي مِنْ ذٰلِكَ السُّمِّ))[1]

"نبی مکرم ﷺ اپنی اس بیماری میں جس میں آپ کی وفات ہوئی فرماتے تھے: اے عائشہ! خیبر میں جو کھانا میں نے تناول کر لیا تھا اس کی تکلیف برابر محسوس کر رہا ہوں اور یہ وقت ایسا ہے کہ میں اس زہر کی وجہ سے اپنی رگِ جاں کٹتی ہوئی پا رہا ہوں"

رسول اللہ ﷺ پر کیے جانے والے جادو کا جو اثر ہوا تھا وہ آپ کے بحیثیت انسان اور بشر کے ہوا تھا بحیثیت نبی اور رسول کے نہیں۔ اور اس واقعہ سے متعلقہ تمام روایتوں کو سامنے رکھنے سے جو صورتحال بنتی ہے وہ یہ کہ آپ کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا۔ اپنی ازواج مطہرات کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ان کے پاس تشریف لے گئے ہیں مگر ایسا نہ ہوا ہوتا۔ اور یہ تمام اثرات آپ کی ذات تک محدود رہے۔ دوسروں کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ پر کیا گزر رہی ہے حتیٰ کہ ازواج مطہرات پر بھی آپ کی یہ کیفیت مخفی رہی۔ رہی آپ ﷺ کے نبی ہونے کی حیثیت اور آپ کے کارِ رسالت کا معاملہ تو ان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا تھا۔ کسی بھی روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس زمانے میں آپ قرآن پاک کی کوئی آیت بھول گئے ہوں یا آپ نے کوئی آیت غلط پڑھ دی ہو۔ یا کوئی نماز آپ سے چھوٹ گئی ہو۔ یا کم از کم دنیاوی اعمال کی طرح یہ خیال ہی ہوا ہو کہ فلاں نماز پڑھ لی ہے اور واقعتاً آپ نے وہ نماز نہ پڑھی ہو۔[2] حالانکہ جو جادو آپ پر کیا گیا تھا وہ حد درجہ محکم تھا اور جن چیزوں میں جادو کر کے ان کو جس جگہ چھپایا گیا تھا وہاں تک کسی کا خیال تک نہ جا سکتا تھا۔ پھر بھی اللہ نے اپنے اور اپنے محبوب رسول ﷺ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً کے دشمنوں کے اس ناپاک منصوبے کو ناکام بنا دیا۔

[1] صحیح بخاری ح ٤٤٢٨ [2] دیکھئے: فتح الباری: ص ٢٥٥٩، ج٣ بتصرف

رسول اکرم ﷺ پر کیے جانے والے جادو سے متعلقہ صحیح روایتوں اور سورۃ الفلق کی چوتھی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جادوگر یا جادوگرنیاں جس شخص پر جادو کرنا چاہتے ہوں اس کی کوئی خاص چیز مثلاً ''بال'' وغیرہ حاصل کر کے اس پر بعض دوسری چیزوں کے ساتھ جادو کرتے ہیں اور اس سلسلے میں دھاگے یا تانت میں گرہیں ڈالتے ہوئے ان میں شیطانی کلمات پھونکتے ہیں۔

سورۃ الفلق کی چوتھی آیت میں النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدْ..... آیا ہے۔ جس کے معنی ہیں ''گرہوں میں پھونکنے والیاں کے'' اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ناپاک اور شیطانی عمل کا ارتکاب زیادہ تر عورتیں کرتی ہیں۔

سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کے شان نزول، نبی کریم ﷺ پر سے جادو کو اتارنے کے لیے اس کی تلاوت اور رسول اللہ ﷺ کے متعدد ارشادات میں ان کے فضائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں عظیم سورتوں کی صبح و شام تلاوت سے جہاں ایک مومن آدمی شیاطینِ جن و انسان کی برائیوں اور اذیتوں سے محفوظ رہ سکتا ہے وہیں کسی سحر زدہ انسان پر ان کو پڑھ کر دم کر کے جادو کو بے اثر بنایا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں عظیم سورتیں درحقیقت دعا ہیں جنہیں ایک مؤمن آدمی صبح کے رب، لوگوں کے رب، لوگوں کے بادشاہ اور لوگوں کے حقیقی معبود کی پناہ میں آ کر شیاطین جن و انس کی شر انگیزیوں سے تحفظ کی درخواست کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے: جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ ط أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَ لْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَo ﴾ [البقرة:۱۸۶]

''اے نبی! جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو میں قریب ہی ہوں۔ اور پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ میرے احکام کو قبول کریں اور میرے اوپر ایمان لائیں تا کہ وہ راہ ہدایت پالیں۔''

سورج اور چاند:

قرآن پاک میں سورج کو سراج اور چاند کو نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سراج کے معنی چراغ کے ہیں جبکہ نور روشنی کو کہتے ہیں۔ سورۃ النبا کی تیرہویں آیت میں سورج کو ''سِرَاجًا وَهَّاجًا'' فرمایا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًاo ﴾

''اور ہم نے ایک نہایت روشن اور شعلہ زن چراغ بنایا''

وَهَجَ يَهِجُ کے معنی ہیں نہایت روشن ہونا، شعلہ زن ہونا وغیرہ۔

سورج حد درجہ گرم ہے اور اس کی روشنی اس قدر تیز ہے کہ زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہونے کے باوجود برہنہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنا ناممکن ہے۔ جدید سائنس کے مطابق اس کا درجہ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین سے اتنے فاصلے پر رکھا ہے کہ وہ زمین پر بسنے والے انسانوں اور دوسرے جانداروں کو زندگی کا سامان فراہم کر رہا ہے۔

کتاب و سنت میں سورج اور چاند کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں بیان ہوئی ہے۔ جن روایتوں میں سورج اور چاند کی تخلیق نیز سورج کی حرارت اور رفتار وغیرہ بیان کی گئی ہے ان میں سے کوئی بھی روایت صحیح نہیں ہے۔ مثلاً:

۱۹۵ ...... إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى خَلَقَ شَمْسَيْنِ مِنْ نُوْرِ عَرْشِهِ۔

''درحقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورج اور چاند کو اپنے عرش کے نور سے پیدا کیا ہے''

یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج حافظ سیوطی نے الآلی المصنوعة میں اس سند سے کی ہے:

ابوبکر احمد بن موسیٰ بن مردویہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: ہم سے عبداللہ بن اسماعیل بن ابراہیم ہاشمی نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے محمد بن احمد بن براء نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالمنعم بن ادریس نے اپنے باپ سے، انہوں نے وہب بن منبہ سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

حافظ سیوطی نے یہ سند نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: عبدالمنعم بن ادریس کذاب تھا...... وہ آگے لکھتے ہیں: ابن مردویہ نے ایک دوسری روایت ایک دوسری سند سے بیان کی ہے۔ جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

۱۹۶ ......أَلا أُحَدِّثُكُمْ بِمَا سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِي الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَبَدْءِ خَلْقِهِمَا وَمَصِيْرِ أَمْرِهِمَا، فَقُلْنَا: بَلَى يَرْحَمُكَ اللّٰهُ۔ فَقَالَ: إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: إِنَّ اللّٰهَ لَمَّا أَبْرَمَ خَلْقَهُ إِحْكَامًا، فَلَمْ يَبْقَ مِنْ خَلْقِهِ إِلَّا آدَمَ خَلَقَ شَمْسَيْنِ مِنْ نُوْرِ عَرْشِهِ......

''کیا میں تم لوگوں سے وہ حدیث نہ بیان کروں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سورج، چاند، ان کی پیدائش اور ان کے انجام کے بارے میں فرماتے ہوئے سنی ہے؟ ہم نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ فرمایا: بے شک رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تھا، آپ نے فرمایا: جب اللہ نے تخلیق کا فیصلہ کرلیا اور اس کی تخلیق سے صرف آدم کا پیدا کیا جانا باقی رہ گیا تو اس نے اپنے عرش کے نور سے سورج اور چاند کو پیدا کیا......''

اس روایت کی سند میں نوح بن ابی مریم شامل ہے جو بہت بڑا جھوٹا اور وضاع حدیث تھا۔[1]

۱۹۷ ......وُكِّلَ بِالشَّمْسِ تِسْعَةُ اَمْلَاكٍ، يَرْمُوْنَهَا بِالثَّلْجِ كَلَّ يَوْمٍ، لَوْلَا ذٰلِكَ مَا أَتَتْ عَلَى شَيْئٍ إِلَّا أَحْرَقَتْهُ۔

''سورج کے ساتھ ۹ فرشتوں کو لگا دیا گیا ہے جو اس پر ہر روز برف ڈالتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جس چیز پر اس کی روشنی پڑتی اس کو جلا ڈالتی۔''

یہ ایک موضوع اور جھوٹی روایت ہے۔ نبی مکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔

اس کی تخریج امام ابن عدی نے الکامل[2] میں اور انہی کے حوالہ سے امام ابن الجوزی نے الواھیات[3] میں۔ حافظ طبرانی نے معجم الکبیر[4] میں، ابوحفص کنانی نے الامالی[5] میں، حافظ ابوعمر سمرقندی نے الفوائد المنتقاۃ[6] میں اور خطیب بغدادی نے الموضح[7] میں اس سند سے کی ہے:

عفیر بن معدان سے روایت ہے، وہ سلیمان بن عامر الخبائری سے روایت کرتے ہیں وہ ابوامامہ سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے۔

حافظ ابومحمد السراج قاری، امام ابن عدی اور امام ابن الجوزی کا قول ہے:

یہ ضعیف حدیث ہے۔ جو ہمارے علم کے مطابق صرف عفیر بن معدان نے روایت کی ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں: یہ بے حد ضعیف ہے۔ جب کہ ھیثمی نے مجمع الزوائد[8]

---

۱ تفسیر ابن مردویه: ص ٥٦، ج١
۲ الکامل: ص ٢٣٠، ج٢
۳ الواهيات: ص ٣٤، ج١
۴ المعجم الكبير: ص ١٩٧، ج٨، ح ٧٧٠٥
۵ الامالي: ص ٩، ج١
۶ المنتقاة: ص٧١، ج١
۷ الموضح: ص ٧٩، ١٦٥-١٦٦، ج٢
۸ مجمع الزوائد: ص ١٣١، ج٨

میں لکھا ہے:

اور عبدالرؤف مناوی نے ھیثمی کے عفیر کو ضعیف قرار دینے کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس روایت کی غرابت کو صرف عفیر کے سر تھوپنے کے معنی ہیں کہ اس کی روایت کرنے والوں میں کوئی دوسرا ضعیف اور نا قابل اعتبار نہیں ہے جبکہ صورت واقعہ اس کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس کی سند میں مسلمہ بن علی خشنی بھی ہے جس کے بارے میں امام ذھبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے: وہ حد درجہ ضعیف ہے اور ائمہ حدیث نے اس کو متروک قرار دیا ہے اور اس کی روایت کردہ حدیثوں کو منکر بتایا ہے۔ اور مثال میں یہی روایت پیش کی ہے۔

محدث البانی رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں:

اس روایت کی سند سے زیادہ اس کا متن موضوع ہے۔ کیونکہ یہ کلام نبوت و رسالت کی علامتوں سے عاری ہے اور اس پر اسرائیلیات کی چھاپ ہے۔ اس کے متن اور مضمون کے موضوع ہونے کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ یہ علم فلک سے ثابت حقیقت کے خلاف ہے۔ علم فلک کی رو سے زمین پر پائے جانے والے حیوانات و نباتات کے نہ جلنے کا سبب یہ ہے کہ سورج زمین سے بہت زیادہ دور ہے۔[1]

ایک صحیح حدیث میں قیامت کے دن کی شدید گرمی کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ اس دن سورج کو لوگوں کے قریب کر دیا جائے گا۔ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: تُدْنَى الشَّمْسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْخَلْقِ حَتَّى تَكُوْنَ مِنْهُ كَمِقْدَارِ مِيْلٍ، قَالَ: فَيَكُوْنُ النَّاسُ عَلَى قَدْرِ أَعْمَالِهِمْ فِي الْعَرَقِ، فَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ إِلَى كَعْبَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ إِلَى حَقْوَيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يُلْجِمُهُ الْعَرَقُ إِلْجَامًا))[2]

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن سورج مخلوق سے قریب کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ ان سے ایک میل کے بقدر فاصلے پر ہوگا اور لوگ اپنے گناہوں کے بقدر عرق آلود ہوں گے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کے ٹخنوں تک پسینہ ہوگا، کچھ لوگوں کے گھٹنوں تک اور بعض کی کمر تک اور بعض لوگوں کو پسینہ لگام لگا دے گا“

---

[1] دیکھئے: الضعیفہ: ص ٤٦١-٤٦٢، ج١، ح ٢٩٣

[2] صحیح مسلم حدیث نمبر: ٧٢٠٦-٢٨٦٤

یعنی ان کے منہ تک پہنچ جائے گا۔

اس صحیح حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دنیا میں سورج انسانوں، دوسرے جانداروں اور نباتات کو اس وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچا تا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک خاص دوری پر رکھ دیا ہے۔

۱۹۸ ......قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِجِبْرِیْلَ: هَلْ زَالَتِ الشَّمْسُ؟ فَقَالَ: لَا ، نَعَمْ۔ فَقَالَ: کَیْفَ تَقُوْلُ: لَا ، نَعَمْ؟ فَقَالَ: مِنْ حِیْنَ قُلْتُ لَا إِلَی أَنْ قُلْتُ نَعَمْ سَارَتِ الشَّمْسُ مَسِیْرَةَ خَمْسَمِائَةِ عَامٍ۔

''نبی اکرم ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے دریافت فرمایا: کیا سورج اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: نہیں ہاں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم یہ کس طرح کہہ رہے ہو: نہیں ہاں؟ جبریل نے عرض کیا: جب میں نے ''نہیں'' کہا اس وقت سے میرے ''ہاں'' کہنے تک سورج نے پانچ سو سال کی مسافت طے کرلی''

یہ روایت باطل اور جھوٹ ہے۔ اس کو امام غزالی نے ''احیاء العلوم''[1] میں نقل کیا ہے۔ حافظ زین الدین عراقی نے ''المغنی عن حمل الاسفار میں لکھا ہے کہ اس روایت میں مجھے کوئی اصل نہیں ملی۔[2] یعنی یہ باطل ہے۔ نبی کریم ﷺ سے اس کی نسبت صحیح نہیں ہے۔

زمین کی اساس:

۱۹۹ ......اَلْأَرْضُ عَلَی الْمَاءِ وَالْمَاءُ عَلَی صَخْرَةٍ وَالصَّخْرَةُ عَلَی ظَهْرِ حُوْتٍ، یَلْتَقِی حَرْفَاهُ بِالْعَرْشِ وَالْحُوْتُ عَلَی کَاهِلِ مَلَكٍ قَدَمَاهُ فِی الْهُوَاءِ۔

''زمین پانی پر ہے اور پانی ایک چٹان پر اور چٹان ایک مچھلی کی پشت پر ہے جس کے دونوں کنارے عرش سے ملے ہوئے ہیں اور مچھلی ایک ایسے فرشتے کندھے پر ہے جس کے دونوں پاؤں فضا میں معلق ہیں''

یہ روایت بھی موضوع اور جھوٹ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔

حافظ ھیثمی نے مسند الفردوس[3] میں اس کو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور لکھا ہے کہ بزار نے اس کی روایت اپنے شیخ عبد اللہ بن احمد بن شبیب سے کی ہے جو ضعیف ہے۔

---

[1] احیاء العلوم: ص ۳۲-۳۳، ج ۵ [2] المغنی عن حمل الاسفار: ص ۳۳
[3] مسند الفردوس: ص ۱۳۱، ج ۸

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: عبد اللہ بن احمد بن شبیب کو میں نے نہ میزان الاعتدال میں پایا نہ لسان المیزان میں۔ نہ رجال کی کسی اور کتاب میں۔ لگتا ہے کہ اس نام میں تحریف ہو گئی ہے اور روایت کے متن سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔

پھر میں نے یہ روایت الکامل[1] میں دیکھی جو امام ابن عدی نے محمد بن حرب سے روایت کی ہے۔ انہوں نے سعید بن سنان سے، انہوں نے ابو الزاھریہ سے، انہوں نے ابو شجرہ کثیر بن مرہ سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سند نقل کرنے کے بعد ابن عدی نے لکھا ہے: سعید بن سنان نے ابو الزاھریہ سے جو حدیثیں روایت کی ہیں ان میں بیشتر غیر محفوظ یعنی شاذ ہیں۔

محدث البانی اس پر تعقیب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: سعید بن سنان بے حد ضعیف راوی ہے۔ بلکہ اس کے بارے میں جوزجانی نے یہاں تک لکھ دیا ہے: مجھے اس کی روایت کردہ حدیثوں کے موضوع ہونے کا اندیشہ ہے:

البانی آگے لکھتے ہیں: امام ذھبی نے جوزجانی کی جو موضوع حدیثیں میزان الاعتدال میں نقل کی ہیں ان میں یہ زیر بحث روایت بھی شامل ہے۔[2]

واضح رہے کہ سورۃ القلم کی ابتدا میں حرف ''ن'' کی تفسیر میں متعدد مفسرین نے بہت ساری روایتیں اسرائیلیات سے نقل کر دی ہیں۔

۲۰۰ ......خَلَقَ اللّٰهُ الْاَرْضَ يَوْمَ الأَحَدِ وَالْإِثْنَيْنِ وَخَلَقَ الْجِبَالَ يَوْمَ الثُّلَاثَاءِ وَمَا فِيْهِنَّ مِنْ مَنَافِعَ وَخَلَقَ يَوْمَ الْاَرْبَعَاءِ الشَّجَرَ وَالْمَدَائِنَ وَالْعُمْرَانَ وَالْخَرَابَ، فَهٰذِهِ أَرْبَعَةٌ، ثُمَّ قَالَ: أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗ أَنْدَادًا، ذَلِكَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ، وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَا اَقْوَاتَهَا فِيْ اَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِلسَّائِلِيْنَ لِمَنْ سَأَلَ، وَخَلَقَ يَوْمَ الْخَمِيْسِ السَّمَاءَ وَخَلَقَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ النُّجُوْمَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالْمَلَائِكَةَ إِلَى سَاعَاتٍ بَقِيَتْ مِنْهُ، فَخَلَقَ مِنْ هٰذِهِ الثَّلَاثَةِ الآجَالَ حِيْنَ يَمُوْتُ مَنْ مَاتَ، وَفِي الثَّانِيَةِ أَلْقَى الآفَةَ عَلَى كُلِّ

---

[1] الکامل: ص ۱۷۵، ج۱

[2] الضعیفہ: ص ۴۶۲-۴۶۳، ج۱، ح ۲۹۴

شَیْءٍ مِمَّا يَنْتَفِعُ بِهِ النَّاسُ ، وَفِي الثَّالِثَةِ آدَمَ وَأَسْكَنَهُ الْجَنَّةَ وَأَمَرَ إِبْلِيسَ بِالسُّجُوْدِ لَهُ وَأَخْرَجَهُ مِنْهَا فِي آخِرِ سَاعَةٍ۔ قَالَتِ الْيَهُوْدُ: ثُمَّ مَاذَا يَا مُحَمَّدُ؟ قَالَ: ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ۔ قَالُوْا: قَدْ أَصَبْتَ لَوْ أَتْمَمْتَ، ثُمَّ اسْتَرَاحَ، فَغَضِبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَضَبًا شَدِيْدًا، فَنَزَلَ: وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوْبٍ، فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُوْلُوْنَ۔

''اللہ نے زمین کو اتوار اور سوموار کے دن پیدا کیا اور منگل کے دن پہاڑ اور ان میں پائی جانے والی نفع بخش چیزیں پیدا کیں بدھ والے دن کو درخت، شہر، آبادی اور ویرانہ پیدا کیا، یہ ہیں چار چیزیں۔ پھر فرمایا: کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کر دیا اور اس کا ہمسر ٹھہراتے ہو۔ وہی تو سارے جہان کا رب ہے۔ اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ جمائے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا (حم السجدہ:۹) اس کے لیے جو سوال کرتا ہے۔ اور جمعرات کے دن آسمان پیدا کیا اور جمعہ کو ستارے، سورج، چاند اور فرشتے پیدا کیے۔ یہاں تک کہ جمعہ کے دن میں تین گھنٹے باقی بچ گئے تو ان تین گھنٹوں میں سے پہلے گھنٹے میں موت کو پیدا کیا جس سے مرنے والا مرتے وقت دو چار ہوتا ہے۔ دوسرے گھنٹے میں ہر اس چیز پر ہلاکت نازل کر دی جس سے لوگ نفع اندوز ہوتے ہیں۔ آخری تیسرے گھنٹے میں آدم کو پیدا کیا اور ان کو جنت میں بسایا۔ پھر ابلیس کو یہ حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کرے۔ پھر اس گھنٹے کے آخری لمحے میں آدم کو جنت سے نکالا۔ یہودیوں نے کہا: اے محمد! پھر کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ عرش پر متمکن ہوا۔ اس پر انہوں نے کہا: اگر آپ نے پورا واقعہ بیان کیا ہوتا تو درست بات فرماتے۔ انہوں نے کہا: پھر اللہ نے آرام کیا یہ سن کر رسول اللہ ﷺ بے حد غضبناک ہوئے اور قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی: اور ہم نے زمین اور

آسمان کو اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا اور ہمیں کوئی تکان نہ ہوئی۔ پس اے نبی! جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کر"

یہ روایت منکر ہے۔ اس کی تخریج امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر[1] اور تاریخ[2] میں، امام حاکم نے المستدرک[3] میں اور انہی کے حوالہ سے امام بیہقی نے الاسماء والصفات[4] میں اس سند سے کی ہے۔

ہم سے ہناد بن سری نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابوبکر بن عیاش نے ابوسعید بقال سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔

ہناد کہتے ہیں: میں نے یہ پوری حدیث ابوبکر بن عیاش سے سنی ہے جس میں ہے کہ یہودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا......

امام حاکم یہ نے روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔ لیکن امام ذھبی نے حاکم کے اس قول کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے: ابوسعید بقال کے بارے میں امام یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ اس کی روایت کردہ حدیثیں قلم بند کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر[5] میں سورۃ حم السجدہ کی مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے: اس میں غرابت پائی جاتی ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری[6] میں ابوسعید بقال کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

امام طبری نے یہ روایت ایک دوسری سند سے نقل کی ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں: بلکہ یہ سند ضعیف ہے اور اس میں کئی علتیں پائی جاتی ہیں:

(۱) اس کے راوی سنان اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مابین سند منقطع ہے۔ کیونکہ ابوسنان شیبانی بُرجمی کو حضرت ابوبکر کا زمانہ نہیں ملا۔ اس لیے اس کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے اس نے طاؤس، سعید بن جبیر اور ان کے طبقہ کے شیوخ سے حدیثیں روایت کی ہیں لہٰذا یہ روایت منقطع ہے۔

(۲) ابوسنان اگرچہ صحیح مسلم کے راویوں میں سے ہے۔ مگر امام احمد اور دوسرے محدثین نے اس کی

---

[1] تفسیر طبری: ص ٦١، ج ٢٤
[2] تاریخ طبری: ص ٢٣، ج ١
[3] مستدرك حاکم: ص ٧٨٨، ح ٤٠٥٠
[4] الاسماء والصفات: ح ٧٦٥
[5] تفسیر ابن کثیر: ص ٢٥٨، ج ٣
[6] فتح الباری: ص ٢١٠٨، ج ٢

ثقاہت کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس کے بارے میں لکھا ہے: سچا تھا لیکن وہم کا شکار تھا۔[1]

(۳) رہا مہران تو اس کی کنیت ابن ابی عمر عطار رازی ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس کے بارے میں لکھا ہے: وہ وہم کا مریض اور حافظہ کا برا تھا۔[2]

(۴) ابن حمید جس کا نام اور لقب محمد رازی ہے، امام ذہبی نے اس کے بارے میں لکھا ہے: وہ علم کا سمندر تھا مگر ضعیف تھا۔ حافظ ابن حجر نے بھی اس کو ضعیف قرار دیا ہے، البتہ یحییٰ بن معین اس کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔

شاید اس روایت کی اصل اسرائیلیات سے ماخوذ ہے اور بعض راویوں کو وہم ہوگیا اور انہوں نے اس کو "حدیث مرفوع" بنا دیا۔ چنانچہ امام طبری نے اس کا بیشتر حصہ حضرت عبداللہ بن سلام سے "موقوفاً" روایت کیا ہے۔[3]

عرش اور کرسی:

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے لیے عرش و کرسی کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں اور اس کے عرش پر متمکن ہونے کی تعبیر بھی استعمال ہوئی ہے۔ یہ الفاظ اور تعبیرات خالص عربی الفاظ اور تعبیرات ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال، اس کی رفعت و بلندی اس کے ملک و اقتدار کی بے پناہ وسعت اور پوری کائنات پر اس کے محیط ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔ قرآن پاک کے اولین مخاطبین نے ان الفاظ اور تعبیرات کو سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کی اور صحابہ کرام نے اللہ تعالیٰ کے عرش پر متمکن ہونے کو "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" "اس کی مانند کوئی نہیں ہے" کی روشنی میں سمجھا۔ یعنی وہ اپنی بے مثل ذات و صفات کے مطابق عرش و کرسی پر متمکن و جلوہ افروز ہے جس کی کیفیت کے ادراک سے عقل انسانی عاجز ہے۔

قرآن پاک میں عرش کا ذکر متعدد بار آیا ہے اور متعدد سیاق و سباق میں آیا ہے۔ البتہ اللہ کے لیے کرسی کا ذکر صرف ایک بار "آیۃ الکرسی" میں آیا ہے۔ اسی طرح "استوی" کا ذکر بھی متعدد بار آیا ہے۔ کہیں "حرف جر" کے بغیر، کہیں حرف جر "اِلٰی" اور کہیں حرف جر "علیٰ" کے ساتھ۔

---

[1] تقریب التہذیب، ترجمہ: ۲۳۳۲ [2] ایضاً ترجمہ: ۶۹۳۳

[3] الضعیفہ ص: ۹۴۹، ج۱۲، ج ۱۲، ح ۵۹۷۳

حرف جر سے خالی ''استوی'' کے معنی ہیں مکمل ہوا اور کمال کو پہنچا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ﴾ [القصص:١٤]

''اور جب موسیٰ پوری جوانی کو پہنچ گیا اور اس کا نشو ونما مکمل ہو گیا تو ہم نے اس کو قوت فیصلہ اور علم عطا کیا''

حروف جر "الی" اور "علی" کے بغیر "استوی" کا فعل اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال نہیں ہوا اور نہ اس کے شایان شان ہے۔

"استوی الی" کے معنی ہیں: قصد کیا، ارادہ کیا، رخ کیا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ''استوی الی'' کا فعل دو بار استعمال کیا ہے۔

سورۃ البقرہ میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَ هُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ [البقرة:٢٩]

''وہی اللہ ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں پھر اس نے آسمان (کی تخلیق) کا ارادہ کیا اور اس نے سات آسمان بنائے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے''

اور سورۃ حم السجدہ فصلت میں زمین بنانے، اس کی پشت پر پہاڑوں کو جما دینے، اس میں تمام برکتیں رکھ دینے اور اس میں تمام جانداروں کی خوراک کا سامان مہیا کر دینے کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ وَهِىَ دُخَانٌ ﴾

''پھر وہ آسمان (کی تخلیق) جانب متوجہ ہوا جو دھواں تھا''

اور حرف جر "علیٰ" کے ساتھ استوی کے معنی ہیں: بلند ہوا، متمکن ہوا، جلوہ افروز ہوا وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کے لیے "استوی علیٰ" کا فعل قرآن پاک کی متعدد سورتوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ یہ فعل ''عرش'' سے متعلق ہے۔ مثلاً سورۃ الاعراف میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ [الاعراف:٥٤]

''درحقیقت تمہارا رب وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر

وہ عرش پر جلوہ افروز ہوا۔"

تو قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے لیے "استوی" کا فعل ان افعال کی مانند ہے جو اس کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے اس کا دیکھنا اور سننا وغیرہ اور جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات میں بے مثل اور یکتا ہے اسی طرح اپنے فعل میں بھی بے مثل ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۔

لہٰذا جہاں اللہ تعالیٰ کے ان افعال کو تسلیم کرنا اور ان پر ایمان رکھنا فرض ہے جن کا ذکر اس کی کتاب اور صحیح احادیث میں آیا ہے وہیں ان کی حقیقت اور کیفیت معلوم کرنے یا متعین کرنے کی ہر کوشش، ضلالت اور گمراہی ہے۔ کیونکہ ان کی حقیقت اور کیفیت عقل انسانی کی رسائی اور ادراک سے باہر ہے۔

اوپر کی وضاحت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی "حسی معرفت" ناممکن اور محال ہے کیونکہ وہ محسوسات سے ماوراء ہے:

﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ۝ ﴾ [الانعام:١٠٣]

"نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے۔ وہ بڑا باریک بین اور نہایت باخبر ہے"

جس طرح اللہ تعالیٰ کے افعال کی حقیقت اور کیفیت عقل انسانی کے ادراک سے باہر ہے اسی طرح عرش و کرسی کی حقیقت و کیفیت اور ان کی عظمت و وسعت کو سمجھنا بھی محال ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ اپنے لیے عرش و کرسی کا ذکر فرمایا ہے اس لیے ان کی تاویل و تعیین کے بغیر ان کو ماننا اور ان پر ایمان رکھنا فرض ہے۔

آیۃ الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی کرسی کی عظمت و وسعت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:

﴿ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ ۝ ﴾ [البقرۃ:٢٥٥]

"اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو محیط ہے"

قرآن پاک اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کی کرسی کی نہ تو تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور نہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کب فرمائی۔ البتہ قرآن و حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرش الٰہی کی تخلیق آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پہلے ہو چکی تھی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ ﴾ [هود:٧]

''وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا درآنحالیکہ اس کا عرش پانی پر تھا'' اور سورۃ الحاقہ میں ہے کہ قیامت کے دن عرش الٰہی کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ (آیت:۷) صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَرَأَیْتُمْ مَا اَنْفَقَ مُنْذُ خَلَقَ السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ فَإِنَّهُ لَمْ یَغِضْ مَا فِی یَدِهِ وَکَانَ عَرْشُهُ عَلَی الْمَاءِ))[1]

''کیا تمہیں خبر ہے کہ جو کچھ اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کرنے کے بعد سے خرچ کیا ہے اس نے اس کے ہاتھ میں موجود خزانوں میں کوئی کمی نہیں کی اور اس کا عرش پانی پر تھا''

ذیل میں ایسی ضعیف اور منکر روایات نقل کر رہا ہوں جن میں عرش و کرسی کی ایسی تفصیلات بیان ہوئی ہیں جن کے ذکر سے قرآنی آیات اور صحیح احادیث خالی ہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں: ہم سے عبدالرزاق نے بیان کیا، ہم سے یحییٰ بن علاء نے اپنے چچا شعیب بن خالد سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: مجھ سے سماک بن حرب نے عبداللہ بن عمیر سے، انہوں نے احنف بن قیس سے اور انہوں نے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بطحاء میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بادل کا ایک ٹکڑا گزرا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم لوگ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟ ہم نے عرض کیا: یہ بادل ہے۔ آپ نے فرمایا: اور ''الْمُزْنُ'' پانی سے لبریز بادل۔ ہم نے بھی کہا ''الْمُزْنُ'' پھر آپ نے فرمایا: ''العنان؟'' اس پر ہم خاموش رہے۔ تو آپ نے فرمایا:

(۲۰۱)......هَلْ تَدْرُوْنَ كَمْ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ؟ قَالَ: قُلْنَا: اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ، قَالَ: بَيْنَهُمَا مَسِيْرَةُ خَمْسِمِائَةِ سَنَةٍ وَمِنْ كُلِّ سَمَاءٍ اِلَى سَمَاءٍ مَسِيْرَةُ خَمْسِمِائَةِ سَنَةٍ وَكَثْفُ كُلِّ سَمَاءٍ مَسِيْرَةُ خَمْسِمِائَةِ سَنَةٍ وَفَوْقَ السَّمَاءِ السَّابِعَةِ بَحْرٌ بَيْنَ أَسْفَلِهِ وَأَعْلَاهُ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ، ثُمَّ فَوْقَ ذَلِكَ

[1] صحيح بخاري: ح ٤٦٨٤ - صحيح مسلم: ح ٢٣٠٩

ثَمَانِيَةُ أَوْعَالٍ بَيْنَ رُكَبِهِنَّ وَأَظْلَافِهِنَّ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، ثُمَّ فَوْقَ ذَلِكَ الْعَرْشُ، بَيْنَ أَسْفَلِهِ وَأَعْلَاهُ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، وَاللّٰهُ فَوْقَ ذَلِكَ، وَلَيْسَ يَخْفٰى عَلَيْهِ مِنْ اَعْمَالِ بَنِي آدَمَ شَيْئٌ۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ آسمان اور زمین کے مابین کتنی مسافت ہے؟ ہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا: ان کے درمیان پانچ سو سال کے سفر کی مسافت ہے اور ہر آسمان سے دوسرے آسمان تک کی مسافت بھی پانچ سو سال کے سفر کی ہے اور ہر آسمان کی کثافت...... موٹائی...... پانچ سو سال کے سفر کی مسافت کے برابر ہے۔ اور ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی تہہ اور بالائی سطح کے درمیان کا فاصلہ آسمان اور زمین کے درمیانی فاصلے کے برابر ہے۔ پھر اس کے اوپر آٹھ پہاڑی بکرے ہیں جن کے گھٹنوں اور کھروں کے درمیان کی لمبائی آسمان و زمین کے درمیانی فاصلے کے برابر ہے۔ پھر اس کے اوپر عرش ہے جس کے نچلے حصے اور بالائی حصے کے مابین وہی فاصلہ ہے جو آسمان و زمین کے مابین فاصلہ ہے۔ اور اللہ اس کے اوپر ہے جس پر اولاد آدم کے اعمال میں سے کوئی بھی عمل مخفی نہیں ہے''[1]

یہ روایت ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔ اس کی تخریج امام احمد نے مسند میں، امام ابوداؤد[2] اور امام ترمذی[3] نے سنن میں اور امام ابن خزیمہ نے کتاب التوحید[4] میں کی ہے شیخ احمد شاکر نے مسند امام احمد کی تحقیق میں اس روایت کو بے حد ضعیف قرار دیا ہے۔ اس روایت کی سند کے ایک راوی عبد اللہ بن عمیرہ کے بارے میں امام ذہبی کا قول ہے کہ وہ مجہول ہے۔ اور امام بخاری نے لکھا ہے کہ عبد اللہ بن عمیرہ کی احنف بن قیس سے سماعت ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔

یہ روایت دوسری جتنی سندوں سے مروی ہے ان میں سے کوئی بھی سند صحیح نہیں ہے۔

ابوداؤد سے روایت ہے: ہم سے عبد الاعلیٰ بن حماد، محمد بن مثنی، محمد بن بشار اور احمد بن سعید رباطی نے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہم سے وہب بن جریر نے بیان کیا، کہا: مجھ سے میرے والد نے بیان کیا، کہا: میں نے محمد بن اسحاق کو یعقوب بن عتبہ سے، ان کو جبیر بن محمد بن جبیر بن مطعم سے، ان کو ان کے باپ سے اور ان کو ان کے دادا سے روایت کرتے ہوئے سنا کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت

---

1. مسند الإمام أحمد: ١٧٧٠
2. سنن ابی داؤد: ح ٢٧٢٤
3. جامع الترمذي: ح ٣٣٣٠
4. كتاب التوحيد: ح ٦٨

میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جانوں پر بن آئی ہے، بال بچے بھوکے مر رہے ہیں۔ املاک تباہ ہو رہی ہیں، چوپائے ہلاک ہوگئے ہیں۔ آپ اللہ سے ہمارے لیے سقیا یعنی بارش طلب فرمائیے۔ ہم اللہ پر آپ سے سفارش چاہتے ہیں اور آپ پر اللہ کی سفارش۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم پر افسوس! کیا تم کو پتہ ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ پھر آپ نے اللہ کی تسبیح اور پاکی بیان کی اور فرمایا:

(۲۰۲)......وَيْحَكَ إِنَّهُ لَا يُسْتَشْفَعُ بِاللّٰهِ عَلَى اَحَدٍ مِنْ خَلْقِهِ، شَانُ اللّٰهِ أَعْظَمُ مِنْ ذٰلِكَ، وَيْحَكَ أَتَدْرِيْ مَا اللّٰهُ؟ اِنَّ عَرْشَهُ عَلَى سَمَاوَاتِهِ بِهٰكَذَا وَاِنَّهُ لَئِطُّ بِهِ أَطِيْطَ الرَّحْلِ بِالرَّاكِبِ۔

"برا ہو تمہارا، اللہ سے اس کی مخلوق میں سے کسی پر سفارش نہیں کرائی جاتی۔ اس کی شان اس سے برتر اور اعلیٰ ہے۔ افسوس تم پر، کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ کون ہے؟ اس کا عرش آسمانوں پر اس طرح ہے۔ آپ نے اپنی انگلیوں سے ایک گنبد بنا کر سمجھایا اور عرش سے اس طرح چر چراہٹ کی آواز نکلتی ہے جس طرح سوار کے بیٹھنے پر کجاوے سے چر چراہٹ کی آواز نکلتی ہے"

تو یہ روایت بھی ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔ اس کی تخریج ابوداؤد نے سنن[1] میں، دارمی نے الرد علی الجهمية میں کی ہے۔[2] اس کی روایت میں جبیر بن محمد بن جبیر مجہول ہے اور وہ اس روایت میں منفرد بھی ہے۔

حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ[3] میں لکھا ہے کہ حافظ ابن عساکر نے ایک خصوصی رسالہ لکھا ہے جس میں عرش سے چر چراہٹ کی آواز سے متعلق روایت کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ روایت وہم و خیال کی پیداوار ہے۔ حافظ ابن کثیر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ اللہ کی کرسی آسمانوں اور زمین پر محیط ہے اور اس سے اس طرح چر چراہٹ کی آواز آتی ہے جس طرح نئے کجاوے سے مگر اس کے راوی عبداللہ بن خلیفہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے ظلال الجنہ فی تخریج السنہ[4] اور الضعیفہ[5] میں اس روایت کو بجا طور پر منکر قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی صفت میں کجاوے کی صفت سے مشابہت پائی جاتی ہے جس سے اللہ کی ذات پاک ہے۔ مزید لکھا ہے کہ ایسی کوئی روایت صحیح نہیں ہے

---

[1] سنن ابی داؤد: ح ٤٧٢٦
[2] الرد علی الجهمية ص ٤٤
[3] البداية والنهاية: ص ١٢، ج١
[4] ص ٢٥٢-٢٥٣
[5] سلسلة الاحاديث الضعيفه: ص ٢٥٦-٢٥٧، ح ٨٦٦

جس میں ''اطیط'' چرچراہٹ کا لفظ آیا ہے۔ محدث البانی امام ذہبی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب "العلو"[1] میں مذکورہ روایت کو حد درجہ ضعیف اور اس مضمون میں منفرد قرار دیا ہے۔ ابن اسحاق کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر وہ مغازی میں سند بیان کریں تو حجت ہیں۔ ورنہ ان کی روایتوں میں نکارت پائی جاتی ہے۔ اور اللہ جل شانہ کی مانند کوئی شئی نہیں ہے۔

اوپر علم حدیث کے ماہرین کے جو اقوال نقل کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوا کہ عرش سے متعلق مندرجہ بالا دونوں روایتیں سند کے اعتبار سے اگر چہ صرف ضعیف ہیں مگر ان کا متن منکر ہے۔ کیونکہ وہ صحیح احادیث کے خلاف ہیں۔

(۲۰۳)......إِنَّ كُرْسِيَّهُ وَسِعَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ وَأَنَّهُ يَقْعُدُ عَلَيْهِ مَا يَفْضَلُ مِنْهُ مِقْدَارُ أَرْبَعِ أَصَابِعَ۔ ثُمَّ قَالَ بِأَصَابِعِهِ فَجَمَعَهَا وَإِنَّ لَهُ أَطِيْطًا كَأَطِيْطِ الرَّحْلِ اِذَا رُكِبَ مِنْ ثِقْلِهِ۔

''بے شک اللہ کی کرسی آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے یا ان پر چھائی ہوئی ہے۔ اور جب وہ اس پر بیٹھتا ہے تو اس سے چار انگلیوں کے برابر بھی جگہ باقی نہیں بچتی۔ پھر آپ نے اپنی انگلیوں کو جمع کر کے اشارہ فرمایا اور اس سے اللہ تعالیٰ کے وزن کی وجہ سے چرچراہٹ کی آواز نکلتی ہے جس طرح نئے کجاوے پر سوار ہونے پر چرچراہٹ کی آواز نکلتی ہے''

یہ روایت منکر اور مردود ہے۔ کیونکہ اس سے ذات الٰہی کی مخلوق سے تشبیہ لازم آتی ہے۔

اس منکر روایت کو حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ[2] میں اور ابوالعلاء حسن بن احمد ہمدانی نے صفات باری تعالیٰ سے متعلق اپنے فتوے[3] میں حافظ طبرانی کی سند سے نقل کیا ہے۔

عبید اللہ بن ابی زیاد قطوانی سے روایت ہے، کہا: ہم سے یحییٰ بن ابی بکیر نے بیان کیا، ہم سے اسرائیل نے ابواسحاق سے، انہوں نے عبید اللہ بن خلیفہ سے اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: ایک خاتون نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ سے فرمایئے کہ وہ مجھے جنت میں داخل فرمائے۔ تو آپ نے اپنے رب عزوجل کی عظمت و بڑائی بیان کی، پھر فرمایا......

---

[1] العلوّ للذهبي: ص ۲۳ [2] البدايه والنهايه: ص ۱۴، ج۱

[3] فتوىٰ ابو العلاء الهمداني: ص ۱۰۰، ج۱

اس روایت کو الضیاء مقدسی نے بھی المختارہ[1] میں طبرانی کی مذکورہ سند سے اور دوسری سندوں سے، ابن ابی بکیر سے روایت کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔ اسی طرح اس کا ذکر ابومحمد دشتی نے کتاب اثبات[2] الحد میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے راوی بخاری ومسلم کی شرطوں پر پورے اترتے ہیں۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

یہ دوہری غلطی ہے: اولاً تو یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ دوم اس کے راوی بخاری اور مسلم کی شرطوں پر پورے بھی نہیں اترتے۔ عبید اللہ بن خلیفہ کی توثیق ابن حبان کے سوا کسی اور نے نہیں کی ہے۔ تنہا ان کی توثیق کا محدثین کے یہاں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ حافظ ذہبی نے عبید اللہ بن خلیفہ کو غیر معروف اور حافظ ابن حجر نے اس کو مجہول لکھا ہے[3] لہٰذا یہ روایت صحیح کس طرح ہو سکتی ہے۔

البانی آگے لکھتے ہیں: اسی طرح کی حدیث وہ بھی ہے جو ابن اسحاق سے مسند وغیرہ میں مروی ہے اور جس کے آخر میں ہے:

((إِنَّ عَرْشَهُ لَعَلَى سَمَاوَاتِهِ وَأَرضِهِ مِثْلَ الْقُبَّةِ وَإِنَّهُ يَئِطُّ بِهِ أَطِيطَ الرَّحْلِ بِالرَّاكِبِ))

''اللہ تعالیٰ کا عرش اس کے آسمانوں اور زمین پر اس طرح گنبد کی مانند ہے جس سے اس کے بیٹھنے کی وجہ سے چرچراہٹ کی آواز خارج ہوتی ہے جس طرح کجاوے سے اس پر سوار کے بیٹھنے کی وجہ سے چرچراہٹ کی آواز خارج ہوتی ہے۔''

ابن اسحاق کے بارے میں تمام محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ وہ ''مدلس'' تھے۔ اور اس روایت کی کسی بھی سند میں انہوں نے ''سماع'' کی صراحت نہیں کی ہے''۔

محدث البانی مزید فرماتے ہیں:

رہا اس روایت کا متن تو یہ مردود اور منکر ہے۔ امام ذہبی العلو[4] میں لکھتے ہیں:

''عرش سے اس طرح چرچراہٹ کی آواز کا نکلنا جس طرح کی چرچراہٹ کجاوے سے نکلتی ہے'' تو یہ آواز عرش اور کجاوے کی صفت ہوئی اور اس بات سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ اس آواز کو عرش یا کرسی کی صفت قرار دیں۔ مزید یہ کہ ''اطیط'' کا لفظ کسی بھی صحیح حدیث میں نہیں آیا ہے۔[5]

---

[1] المختارہ: ص ٥٩، ج ١
[2] اثبات الحد: ص ١٣٤-١٣٥
[3] تقریب التہذیب: ص ٣١١- ترجمہ: ٤٢٨٦
[4] العلو للذہبی: ص ٢٣
[5] الضیعفہ: ص ٢٥٧، ج ٢، ح ٨٦٦

دراصل عرش و کرسی کے اوصاف، ان کی وسعت اور ہیئت کے بارے میں تفسیر کی بعض کتابوں میں صحابہ کرام کے آثار، سدی اور وہب بن منبہ وغیرہ کے جو اقوال ملتے ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس لیے کہ عرش و کرسی، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کی وسیع سلطنت...... یہ تمام امور توقیفی ہیں جن کے بارے میں وہی باتیں صحیح ہیں جو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات میں مذکور ہیں۔ اور جن روایتوں کی نسبت نبی معظم ﷺ سے صحیح سندوں کے ساتھ ثابت نہیں یا جن کے متن سے اللہ تعالیٰ کے لیے مخلوق سے تشبیہ اور تجسیم لازم آتی ہو مردود ہیں۔ پھر یہ کہ عرش و کرسی کا مفہوم معلوم ہے مگر مخلوق کی کرسی یا تخت سلطنت کی مانند نہیں ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات بے مثل ہیں۔ لہٰذا ان الفاظ کو لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ..... کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان کی کیفیات اور تفصیلات معلوم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ امور عقل انسانی کی رسائی سے باہر ہیں۔

............*

باب دوم

قصص الانبیاء ﴿۲۸﴾

ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق:

کتاب وسنت کی رو سے حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر اور ابوالانبیاء دونوں ہیں، سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ اِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَةًؕ قَالُوۡۤا اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَ یَسۡفِكُ الدِّمَآءَۚ وَ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَؕ قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ۝ ﴾ [البقرۃ:۳۰]

''اے نبی! یاد کرو اس وقت کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے عرض کیا: کیا آپ اس میں کسی ایسے کو پیدا کریں گے جو اس میں فساد پھیلائے اور خون بہائے۔ حالانکہ ہم آپ کی حمد کی ساتھ تسبیح بیان کر رہے ہیں اور آپ کی تقدیس کر رہے ہیں۔ فرمایا: درحقیقت میں جو کچھ جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے نام کی صراحت نہیں کی ہے۔ لیکن بعد کی آیت میں ان کے نام کی تصریح کر کے یہ واضح فرما دیا کہ اس میں لفظ: خلیفہ سے وہی مراد ہیں۔ اسی طرح ان کے نام کی بجائے ان کی صفت خلیفہ کا ذکر کر کے زمین میں ان کی خلافت کی اہمیت بھی واضح کر دی۔

خلیفہ کی حقیقت:

خلیفہ: خَلَفَ یَخۡلُفُ خَلۡفًا وَخِلَافَةً سے بنا ہے اور مبالغہ کا صیغہ ہے۔ خَلَفَ یَخۡلُفُ کے معنی ہیں: پیچھے آنا، جانشین ہونا، قائم مقام ہونا اور نمائندگی کرنا۔

اَلۡخَلۡفُ اس قوم، گروہ اور نسل کو بھی کہتے ہیں جو یکے بعد دیگرے آئے۔[1]

مذکورہ لغوی وضاحت کی روشنی میں لفظ خلیفہ کا اطلاق جانشین، قائم مقام اور نمائندہ پر ہوتا ہے اور اس کو قرناً بعد قرنٍ اور نسلاً بعد نسلٍ آنے والی امت اور قوم کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

[1] القاموس القویم: ص ۲۰۳، ج۱

امام راغب اصفہانی خَلَفَ یَخْلُفُ کے استعمال کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

((خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا، قَامَ بِالأَمْرِ عَنْهُ إِمَّا مَعَهُ وَإِمَّا بَعْدَهُ...... وَالْخِلَافَةُ: النِّيَابَةُ عَنِ الْغَيْرِ، إِمَّا لِغَيْبَةِ الْمَنُوْبِ عَنْهُ وَإِمَّا لِمَوْتِهِ وَإِمَّا لِعِجْزِهِ وَإِمَّا لِتَشْرِيْفِ الْمُسْتَخْلَفِ))[1]

''فلاں شخص فلاں شخص کی جگہ، اس کے ساتھ یا اس کے بعد معاملہ کا ذمہ دار بنا...... اور خلافت کے معنی ہیں: کسی کا کسی دوسرے کی نیابت کرنا، چاہے یہ نیابت دوسرے شخص کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہو یا اس کے وفات پا جانے کے سبب سے یا اس کے عجز کی بنا پر یا اس نائب بنائے جانے والے شخص کی عزت افزائی کی خاطر ہو''

یہ تو فعل خَلَفَ یَخْلُفُ کی لغوی تحقیق اور اس کے استعمال کے بارے میں اہل لغت کی رائے تھی۔

رہا سورۃ البقرہ کی مندرجہ بالا آیت میں لفظ ''خلیفہ'' کا مفہوم؟ تو اس کے بارے میں چند مشہور مفسرین کے اقوال درج ذیل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْأَرْضِ خَلِیْفَةً'' کی تفسیر کرتے ہوئے حافظ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

''میں زمین میں ایک ایسی قوم پیدا کرنے والا ہوں جس میں سے بعض بعض کے پیچھے قرناً بعد قرنٍ نسل در نسل آئیں گے''[2]

یعنی حافظ ابن کثیر خلیفہ سے مراد ایک ایسی قوم لے رہے ہیں جو ایک دوسرے کے بعد آئے گی اور دوسری پہلی کی جانشین ہوگی۔

امام محیی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود بغوی نے مذکورہ آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے جنوں کے وجود، ان کے افساد فی الارض اور قتل و خونریزی سے متعلق تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں منقول روایات کا ذکر کرنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کے خلیفہ ہونے کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ایک ضعیف قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ ''آدم علیہ السلام کو خلیفہ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ ان کے بعد آنے والا ان کا جانشین ہوگا۔'' پھر نہایت دوٹوک انداز میں لکھا ہے۔

((وَالصَّحِیْحُ أَنَّهُ خَلِیْفَةُ اللّٰهِ فِیْ أَرْضِهِ لِإِقَامَةِ أَحْكَامِهِ وَتَنْفِیْذِ وَصَایَاهُ))

---

[1] مفردات القرآن: ص ۱۶۲   [2] تفسیر ابن کثیر ص ۴۹، ج ۱

''صحیح یہ ہے کہ وہ آدم علیہ السلام اللہ کی زمین میں اس کے خلیفہ تھے تاکہ اس کے احکام اور ہدایات کو لاگو اور نافذ کریں''[1]

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی تحریر فرماتے ہیں:

آیت میں خلیفہ سے مراد حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور تمام اہل تاویل کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ وہ اللہ کے فیصلوں اور اس کے اوامر کو نافذ و جاری کرنے کے لیے اس کے خلیفہ تھے۔ کیونکہ وہ زمین میں بھیجے جانے والے پہلے رسول تھے۔[2]

امام قرطبی کے اس قول سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی خلافت کا زیادہ حقدار اس کا رسول ہوتا ہے۔ علامہ شیخ ابوعبداللہ عبدالرحمٰن بن ناصر بن عبداللہ بن ناصر آل سعدی سورۃ البقرہ کی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

یہ ابوالبشر آدم علیہ السلام کی تخلیق کی ابتدا اور ان کی فضیلت کے بیان کا آغاز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ان کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو ملائکہ کو اس سے باخبر کیا اور ان کو یہ بھی بتایا کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنانے والا ہے۔[3]

موجودہ دور میں مولانا حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ تفسیر، حدیث، تاریخ اور دوسرے دینی علوم میں بجا طور پر ایک بلند مقام پر فائز ہیں۔ ان کا عظیم کارنامہ احسن البیان کے تفسیری حواشی سے عبارت ہے۔ آپ نے سورۃ البقرہ کی مذکورہ آیت میں لفظ خلیفہ سے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ ایک ایڈیشن سے دوسرے ایڈیشن میں مختلف ہے مثلاً:

احسن البیان کے پہلے ایڈیشن شائع کردہ مکتبہ دارالسلام ریاض ۱۹۹۵ء میں تحریر فرماتے ہیں:

خلیفہ سے مراد یہاں حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اس کے معنی جانشین کے ہیں۔ اہل علم کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ انسان اللہ کا خلیفہ جانشین ہے یا اپنے سے پہلے کسی مخلوق کا۔ ''خلیفہ اللہ فی الارض'' کے معنی ہوں گے کہ اللہ کے دیے ہوئے اختیارات کو اس کی مرضی و منشا کے مطابق استعمال کرے تاکہ دنیا میں امن و سکون کا گہوارہ بن جائے۔

---

[1] معالم التنزیل: ص ۱۲۵
[2] الجامع لاحکام القرآن: ص ۲۲۳، ج ۱
[3] تیسیر الرحمن فی تفسیر کلام المنان: ص ٤٦

کتاب کے چوتھے ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں بھی یہی خیال نقل کیا گیا ہے مگر پہلے سے زیادہ واضح مزید یہ صراحت ہے کہ آدم علیہ السلام کے ''خلیفہ اللہ فی الارض'' ہونے کا نظریہ ان کا نہیں بلکہ دوسروں کا ہے۔

حافظ صاحب نے دونوں ایڈیشنوں میں سے کسی میں یہ تحریر نہیں فرمایا ہے کہ لفظ خلیفہ کی تفسیر میں ان کے نزدیک کون سا قول دلائل کی روشنی میں راجح ہے۔

لیکن احسن البیان کا جو ایڈیشن "مجمع الملك فهد لطباعة القرآن" نے ''ترجمہ معانی القرآن'' کے نام سے شائع کیا ہے اس میں انہوں نے ''خلیفہ'' کے بارے میں دوٹوک اور حتمی رائے کا اظہار فرمایا ہے:

خلیفہ سے مراد ایسی قوم ہے جو دوسرے کے بعد آئے گی اور یہ کہنا کہ انسان اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے غلط ہے۔[1]

قول فیصل:

اوپر ''خلیفہ'' کے بارے میں متعدد مفسرین کے جو اقوال نقل کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) حضرت آدم علیہ السلام کے خلیفہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اور ان کی اولاد اپنے سے سابقہ کسی مخلوق کی جانشین ہے خصوصیت کے ساتھ جنوں کی۔

(۲) خلیفہ سے مراد ایسی قوم ہے جو ایک دوسرے کے بعد آئے گی۔

(۳) آدم علیہ السلام اور ان کے بعد ان کی ذریت زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے بایں معنی کہ انسان اس دنیا میں اس امر کا مکلّف بنایا گیا ہے کہ وہ اس میں اپنے اعمال سے اپنے خالق اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور مرضیات کا مظہر بنے اور اللہ کے احکام اور فیصلوں کو نافذ کرے۔

ان تینوں اقوال میں سے جہاں تک پہلے قول کا تعلق ہے تو اس کی کوئی بنیاد اور اصل نہیں ہے اور حضرت آدم علیہ السلام سے قبل فرشتوں کے سوا کسی اور مخلوق کا قرآن و حدیث سے کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ دراصل لوگوں نے فرشتوں کے اس سوال اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ..... کی بنیاد پر اس طرح کی کسی مخلوق کا وجود خود فرض کر لیا ہے جو ان کے خیال میں آدم علیہ السلام سے پہلے افساد فی الارض اور خونریزی کی مرتکب ہو چکی تھی۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے جنوں کی تخلیق کا ثبوت تو خود

[1] احسن البیان: ص ۱۷

قرآن سے ملتا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے جنوں کی تخلیق کا کوئی ثبوت قرآن سے نہیں ملتا بلکہ صرف ''الجان'' کی تخلیق کا ثبوت ملتا ہے اور ''الجان'' سے مراد ابوالجن ابلیس ہے۔ جس طرح ''الانسان'' سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں جو ابوالبشر تھے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝ ﴾ [الحجر:۲۶، ۲۷]

''درحقیقت ہم نے انسان...... آدم...... کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے تخلیق بخشی اور ہم جن کو اس سے پہلے آگ کی لپٹ سے پیدا کر چکے تھے''

دوم ...... قرآن پاک میں یہ صراحت ہے کہ تمام مخلوقات میں صرف جنوں اور انسانوں کو اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ ﴾ [الذاریات:۵۶]

''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں''

اور کوئی فرد، جماعت اور قوم اللہ تعالیٰ کی عبادت کا طریقہ اپنے دماغ اور عقل سے نہیں معلوم کر سکتی بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول اور معتبر عبادت کا طریقہ معلوم کرنے کے لیے رسولوں کی محتاج رہی ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ ہدایت کے لیے جن ہمیشہ سے انسانوں میں مبعوث ہونے والے رسولوں کے محتاج رہے ہیں۔ کیونکہ ان میں کوئی رسول اور نبی مبعوث نہیں ہوا ہے۔ اس تناظر میں حضرت آدم علیہ السلام جس طرح انسانوں کے لیے پہلے رسول تھے ٹھیک اسی طرح جنوں کے بھی رسول تھے۔ لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے ان کے پیدا کیے جانے کا دعویٰ یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کو عبادت کا مکلف تو بنا دیا گیا مگر ان کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا اور یہ دعویٰ باطل ہے۔ کیونکہ یہ حکمت الٰہی اور عدل ذات باری کے خلاف ہے۔

اور یہ بات کہ جن انسانوں میں مبعوث ہونے والے رسولوں ہی سے عقائد و عبادات کی تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں؟ یہ سورۃ الاحقاف کی آیات ۲۹۔۳۱ اور سورۃ الجن سے بصراحت ثابت ہے۔

اسی طرح احادیث سے بھی ثابت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنوں کی دعوت پر ان کو دعوت حق دینے کے لیے ان کے پاس تشریف لے جایا کرتے تھے۔[1]

---

[1] صحیح مسلم: ح ۴۵۰۔ ابوداؤد ح ۸۵، جامع ترمذی: ح ۱۸، ۳۲۵۸

معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کا جنوں یا کسی اور مخلوق کا جانشین ہونے کا دعویٰ بلا دلیل ہے اور حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے صرف ابلیس پیدا کیا گیا تھا تمام جن نہیں۔ سورۃ الکہف میں ابلیس کے بارے میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ:

كَانَ مِنَ الْجِنِّ..... وہ جنوں میں سے تھا۔ (آیت:۵۰)

تو اس کا مطلب ہے کہ وہ جنوں کی صنف اور جنس سے تھا، فرشتوں میں سے نہیں تھا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ابلیس سے پہلے جن پیدا کیے جا چکے تھے۔ کیونکہ جس آیت کا یہ فقرہ: ''كَانَ مِنَ الْجِنِّ'' ہے اسی آیت کا آنے والا فقرہ یہ بتا رہا ہے کہ ابلیس ''ابوالجن'' ہے۔ یعنی سارے جنات اسی کی اولاد ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗۤ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ ﴾ [الکهف:۵۰]

''کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت کو اپنا سرپرست بناتے ہو''

رہی دوسری رائے کہ ''خلیفہ سے مراد ایسی قوم ہے جو ایک دوسرے کے بعد آئے گی'' تو یہ اگرچہ حافظ ابن کثیر اور بعض دوسرے مفسرین کی رائے ہے لیکن مرجوح ہے۔ کیونکہ کسی قوم کا یکے بعد دیگرے آنا اپنے اندر کوئی بھی فضیلت نہیں رکھتا۔ چہ جائیکہ ایسی فضیلت کہ جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ کہ اپنے فرشتوں سے فرمائے جو ہمہ وقت اس کی عبادت اور حمد وثناء میں لگے رہتے ہیں۔ کسی قوم کے محض یکے بعد دیگرے آنے سے اس کے مفسد اور قاتل ہونے کا مفہوم بھی نہیں نکلتا۔

دراصل کسی مخلوق سے افساد فی الارض اور خونریزی کا اندیشہ اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جبکہ وہ خواہشاتِ نفس رکھتی ہو، اس کو نیکی اور بدی دونوں کا اختیار دیا گیا ہو، اس کے سامنے خیر وشر کے دونوں راستے ہوں، اور دونوں میں سے کوئی بھی راستہ اختیار کرنے کی اس کو آزادی دی گئی ہو۔ اس طرح کی مخلوق صرف انسان اور جن ہیں۔

فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کے ذریعہ اتنی بات کا علم رہا ہوگا کہ وہ نئی مخلوق جس کو وہ پیدا کرنے جا رہا ہے وہ ارادہ واختیار کی آزادی سے بہرہ ور ہوگی، اس لیے فساد بھی مچائے گی اور خون بھی بہائے گی۔ مگر ان کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ اس نئی مخلوق میں انبیاء بھی ہوں گے۔ صدیقین، شہداء اور صالحین بھی ہوں گے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے ان سے اولاد آدم کے نام بتانے کو کہا تا کہ یہ معلوم ہو کہ ان کا وہ اندیشہ برمحل ہے یا نہیں تو انہوں نے عرض کیا:

﴿ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴾ [البقرة:٣٢]

''پاک ہے تیری ذات ہر نقص سے۔ہمیں تو صرف اتنا ہی علم حاصل ہے جتنا تو نے ہمیں دے دیا ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو یہ حکم دیا کہ وہ قیامت تک پیدا ہونے والی اپنی اولاد کے وہ نام پیش کریں جو اس نے ان کو سکھا دیے ہیں۔ اور جب انہوں نے اپنی اولاد کے ناموں کی فہرست پیش کی تو ان میں صرف مفسد اور سفاک الدم ہی نہ تھے بلکہ ان میں بڑی تعداد میں انبیاء ورسول، صدیقین، شہداء اور صالحین بھی تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾ [البقرة:٣٣]

''کیا میں تم لوگوں سے کہہ نہ چکا ہوں کہ میں آسمانوں اور زمین کی تمام غیبیات کو جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اس کا علم بھی رکھتا ہوں اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے۔''

یعنی اس نئی مخلوق یا خلیفہ کے پیدا کرنے کی جو حکمت ہے وہ تمہیں نہیں صرف مجھے معلوم ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس خلیفہ کے پیدا کرنے سے جو خیر و بھلائی حاصل ہوگی وہ اس شر اور برائی سے بہت زیادہ ہوگی جس کا اندیشہ تم نے ظاہر کیا ہے۔ یہ نئی مخلوق اللہ کی زمین میں تسبیح و تقدیس کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرے گی، زمین میں عدل و انصاف بھی قائم کرے گی اور حق و راستی کا بول بالا بھی کرے گی۔

انسان زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے:

اوپر لفظ ''خلیفہ'' سے متعلق تفصیلی بحث سے ثابت ہوگیا کہ انسان نہ تو زمین میں اپنے سے پہلے کسی مخلوق کا جانشین ہے اور نہ کسی ایسی قوم سے عبارت ہے جو ایک دوسرے کے بعد آئے گی۔ بلکہ انسان زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے اور اس کی پہلی کڑی حضرت آدم علیہ السلام تھے۔

لیکن انسان کے اللہ کا خلیفہ ہونے کا مطلب بھی نہیں ہے کہ وہ اس کا جانشین ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات، اس کے احکام اور اس کی جملہ مرضیات کے مطابق خود زندگی گزارنے اور دوسروں کو اسی طرح کی زندگی گزارنے کی دعوت دینے اور ان کے درمیان اس کے احکام

کو جاری و ساری کرنے کا مکلف اور ذمہ دار ہے۔ اللہ کی خلافت اور اس کی نیابت کا کامل مظہر رسولوں کی ذات تھی اور ان کے بعد ان کی سنت پر چلنے والے صلحاء کی۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں تک اپنی ہدایات اور احکام پہنچانے کے لیے ہمیشہ سے اس منتخب اور برگزیدہ گروہ کو مکلف بنایا ہے جس کو ہم رسولوں کے گروہ کے نام سے جانتے ہیں۔ یعنی دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو رسولوں کے ذریعہ ہی صحیح عقائد اور اپنے نزدیک مقبول و معتبر اعمال کی تعلیم دیتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لانے کے ساتھ رسولوں کی رسالت پر ایمان لانا بھی لازمی رہا ہے۔

دین میں رسالت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ نوع انسانی کے پہلے فرد حضرت آدم علیہ السلام کو رسول کی حیثیت سے پیدا کیا گیا تا کہ وہ اپنی ذات، اپنی فکر و اجتہاد اور اپنے اعمال سے اللہ کی مرضی کی نمائندگی کریں۔

اس طرح اللہ کا خلیفہ ہونے کا مطلب اللہ کی مرضی کا نمائندہ ہونا بھی ہے۔ جو لوگ اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ انسان زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے وہ بھی ایسی باتیں لکھ گئے ہیں جن سے ہمارے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ سورۃ النساء کی آیت:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ ﴾

''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحب امر ہوں'' [النساء:٥٩]

کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ اصل اطاعت تو اللہ ہی کی ہے کیونکہ (اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ...... خبردار مخلوق بھی اسی کی ہے حکم بھی اسی کا ہے (الاعراف:٥٤) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ...... حکم صرف اللہ ہی کا ہے۔ (یوسف:٤٠) لیکن رسول خالص منشاء الٰہی ہی کا مظہر اور اس کی مرضیات کا چونکہ نمائندہ ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ رسول کے حکم کو بھی مستقل طور پر واجب الاطاعت قرار دیا''[1]

بات بالکل واضح ہو گئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ انسان زمین میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ یعنی اس کی ہدایات و مرضیات کا نمائندہ۔ زمین میں خلافتِ الٰہی کی کامل و مکمل صورت اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی

---

[1] احسن البیان: ص ٢٤٥

ذات تھی اور ان کے بعد ان کے متبعین کی۔

دراصل انسان کے کسی سابقہ مخلوق کے جانشین ہونے یا اس کے ایسی قوم ہونے پر جو ایک دوسرے کے بعد آئے، سب سے بڑی زد سورۂ ص کی اس آیت سے پڑتی ہے:

﴿ یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ط ﴾ [ص:٢٦]

''اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر (ایسا نہ ہو) یہ خواہش نفس تمہیں اللہ کی راہ سے بہکا دے۔''

اس آیت مبارکہ میں لفظ خلیفہ سے ''اللہ کا خلیفہ'' ہونے کے علاوہ کوئی اور مفہوم مراد ہو ہی نہیں سکتا۔

سجدۂ آدم:

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے ہی فرشتوں کو یہ حکم دے دیا تھا کہ جب ان کی تخلیق مکمل ہو جائے اور ان کے پتلے میں روح پھونک دی جائے تو وہ سب ان کے آگے سجدے میں گر جائیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ ﴾ [الحجر:٢٨، ٢٩]

''اے نبی یاد کرو اس وقت کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں پس جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا''

پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق پوری کر لی اور ان کے خاکی پتلے میں اپنی روح پھونک دی تو فرشتوں کو دوبارہ یہ حکم دیا کہ وہ سب ان کو سجدہ کریں۔ [1]

یہ سجدہ اپنی ہیئت اور شکل کے اعتبار سے سجدہ ہی تھا۔ یعنی زمین پر پیشانی رکھ دینا اور مسجود حضرت آدم علیہ السلام ہی تھے۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی عبادت نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت تھی۔ کیونکہ اس کا حکم

[1] (البقرہ: ٣٤، الاعراف: ١١، الاسراء: ٦١، الکھف: ٥٠، طٰہٰ: ١١٦)

دینے والا اللہ تعالیٰ ہی تھا اور عبادت درحقیقت نام ہے ''طَاعَةُ مَخْلُوْقٍ لِخَالِقِهٖ فِیْ اَوَامِرِهٖ وَنَوَاهِیْهِ'' مخلوق کی اپنے خالق کے اوامر ونواہی میں، اس کی فرماں برداری کا۔

اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ'' کی تعمیل کر کے فرشتے اس کے عبادت گزار اور مقرب بندے قرار پائے۔ جبکہ اس حکم کی نافرمانی کر کے ابلیس قیامت تک کے لیے ملعون و مردود قرار پایا۔

بات صرف اتنی ہی ہے۔ پھر نہ جانے مفسرین نے کہاں سے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی سابقہ شریعتوں میں غیر اللہ کو تعظیمی سجدہ کرنا جائز تھا۔ سجدۂ عبادت جائز نہیں تھا اور اسلام میں سجدۂ تعظیمی اور سجدہ عبادت دونوں ناجائز ہیں۔ حالانکہ قرآن وحدیث میں کہیں بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ سابقہ شریعتوں میں غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز تھا۔ قطع نظر اس کے کہ وہ سجدہ بطور تعظیم کے ہو یا بغرض عبادت۔ کیونکہ سجدہ عبادات کی روح اور ان کی سب سے بلند چوٹی سے عبارت ہے۔ اور یہ شرک ہے چاہے کسی بھی نام سے کیا جائے۔ لہٰذا اللہ کی کسی بھی شریعت میں جائز نہیں ہوسکتا تھا۔ ورنہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کی سابقہ شریعتیں توحیدی امور میں بھی ایک دوسری سے مختلف رہی ہیں۔

اگر فرشتوں کے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے واقعہ کو اس تناظر میں لیا جاتا کہ انہوں نے ایسا اللہ تعالیٰ کے صریح حکم سے کیا تھا تو کوئی اشکال پیش نہ آتا کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بھی قول یا فعل میں جواب دہ نہیں ہے:

﴿ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ ﴾ [الانبیاء:۲۳]

''وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں جواب دہ نہیں ہے جبکہ لوگ جواب دہ ہیں۔''

مثال کے طور پر کسی معصوم اور بے قصور انسان کا قتل اللہ کی کسی شریعت میں جائز نہیں تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے، اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کریں اور انہوں نے امتثال امر کرتے ہوئے حکم الٰہی کی تنفید شروع کر دی۔ مگر اللہ نے ان کو ایسا کرنے نہ دیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنی رحمت سے بچالیا۔ (الصافات: ۱۰۲، ۱۰۷)

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے ایک معصوم بچے کو قتل کر دیا۔ (الکہف:۷۴)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ نے حضرت موسیٰ کو دریا میں ڈال دیا۔ (القصص:۷)

تو ان مذکورہ واقعات میں سے کوئی بھی واقعہ تشریعی نہیں تھا اور نہ قابل تکرار تھا۔ بلکہ وہ حکم الٰہی تھا اور اس کی تعمیل ضروری تھی۔

رہا وہ سجدہ جو حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی بیوی اور ان کے بیٹوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کیا تھا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا۔ کیونکہ وہ نبی کا خواب تھا اور انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی الٰہی سے عبارت ہوتے ہیں۔ کہ جو حکم کا درجہ رکھتے ہیں اور بعض مفسرین کا یہ قول کہ وہ سجدہ تعظیمی تھا اور سجدۂ تعظیمی حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں جائز تھا۔ تو یہ محض دعویٰ بلا دلیل ہے جو کتاب وسنت کی کسی دلیل پر مبنی نہیں ہے۔

(۲۰۴)......إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى لَمَّا خَلَقَ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَخَرَجَتْ مِنْهُ كُلُّ نَسْمَةٍ هُوَ خَالِقُهَا اِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَانْتَزَعَ ضِلْعًا مِنْ أَضْلَاعِهِ فَخَلَقَ مِنْهَا حَوَّاءَ عَلَى نَبِيِّنَا وَعَلَيْهِمَا الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ۔

"بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اس سے وہ تمام روحیں نکل پڑیں جن کو اللہ قیامت تک پیدا کرنے والا ہے اور آدم کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس سے حواء کو پیدا کیا۔ ہمارے نبی اور ان دونوں پر صلاۃ وسلام ہو۔

یہ ایک منکر روایت ہے جس کی تخریج امام ابوحاتم نے اپنی تفسیر[۱] میں اور ابوالشیخ عبداللہ بن محمد اصفہانی نے العظمہ[۲] میں، محمد بن شعیب کی سند سے کی ہے۔

مجھ سے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے اپنے باپ سے، انہوں نے عطاء بن یسار سے، انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

اس روایت کو حافظ ابوعبداللہ محمد بن ابی یعقوب بن مندہ نے کتاب التوحید[۳] میں، سند کے بغیر معلق اور حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق[۴] میں سند کے ساتھ نقل کیا ہے اور لکھا ہے:

یہ سند بے حد ضعیف ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے ضعیف ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے۔ بلکہ بعض ائمہ حدیث نے تو اس پر حدیث گھڑنے کا الزام لگایا ہے۔

دراصل عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وہی ہے جس نے وہ موضوع روایت بیان کی ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جب ممنوعہ درخت کا پھل کھالیا اور ان پر اللہ تعالیٰ کا عتاب نازل ہوا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ اور واسطہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کی۔ اس

---

[۱] ص ۲۰۶، ج ۳
[۲] العظمة ص ۱۵۵۳، ج ۵
[۳] كتاب التوحيد: ص ۲۱۱، ج ۱
[۴] تاريخ دمشق ص ٦٢٤، ج ۲

روایت پر مفصل بحث اس کتاب کی پہلی جلد میں گزر چکی ہے [۱]۔ دوسرے جتنے الفاظ میں یہ جھوٹی روایت کتابوں میں منقول ہے وہ آئندہ صفحات میں نقل کی جائے گی۔

یہ زیر بحث روایت ہشام بن سعد نے زید بن اسلم سے، انہوں نے ابوصالح سے اور انہوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کی ہے اور یہ سند پہلی سند سے زیادہ کامل ہے۔ اس دوسری روایت کی تخریج امام ترمذی نے سنن [۲] میں اور محدث محمد ناصر الدین البانی نے ظلال الجنہ [۳] میں کی ہے۔ سنن ترمذی کی حدیث کا ترجمہ ہے:

''جب اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا جس سے ہر وہ روح نکل پڑی جوان کی ذریت میں اللہ قیامت تک پیدا کرنے والا ہے اور ان میں سے ہر انسان کی دونوں آنکھوں کے درمیان کی ایک کرن پیدا کی۔ پھر ان کو آدم کے سامنے پیش کیا تو آدم نے عرض کیا: اے میرے رب! یہ کون لوگ ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تیری ذریت ہے۔ آدم نے ان میں سے ایک مرد کو دیکھا جس کی دونوں آنکھوں کے درمیان چمک ان کو بڑی اچھی لگی۔ آدم نے عرض کیا: اے میرے رب یہ کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تیری ذریت میں پیدا ہونے والی آخری امت کا ایک مرد ہے جس کو داؤد کہا جائے گا۔ آدم نے عرض کیا: اے میرے رب! تو نے اس کی کتنی عمر متعین کی ہے؟ اللہ نے فرمایا: ساٹھ سال۔ آدم نے کہا: اے میرے رب! میری عمر سے ۴۰ سال لے کر اس کی عمر میں بڑھا دے۔ پس جب آدم کی عمر پوری ہوئی اور ان کے پاس موت کا فرشتہ آیا تو آدم نے اس سے کہا: کیا میری عمر میں ابھی چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ تو موت کے فرشتے نے جواب دیا: کیا آپ نے یہ چالیس سال اپنے بیٹے داؤد کو نہیں دے دیے ہیں؟ تو آدم نے اس کا انکار کیا۔ اس طرح ان کی ذریت بھی انکار کی روش اختیار کرے گی اور جس طرح آدم سے بھول ہوئی اسی طرح ان کی ذریت بھی بھول سے دو چار ہوگی اور جس طرح آدم نے غلطی کی اسی طرح ان کی ذریت بھی غلطی کی مرتکب ہوگی''

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔ محدث البانی رحمہ اللہ نے بھی اس کو صحیح بتایا ہے [۴] ہے اور امام حاکم نے بھی مستدرک [۵] میں اس کی تصحیح کی ہے اور امام ذہبی نے ان کی تائید کی ہے۔

---

[۱] ''موضوع اور منکر روایات جلد اول'' ص ۱۰۸
[۲] جامع ترمذی: ح ۳۰۷۶
[۳] ظلال الجنة: ح ۲۰۶
[۴] صحیح سنن ترمذی ص ۲۳۹، ج ۳، ح ۳۰۷٦
[۵] مستدرك حاكم: ح ٤١٨٨

اس حدیث میں نہ تو حضرت حواء علیہا السلام کا کوئی ذکر ہے اور نہ اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی ایک پسلی نکالی اور اس سے ان کو پیدا کیا۔

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

مذکورہ آیت حضرت حواء کے اضافہ کے ساتھ متعدد صحابہ سے "موقوف" شکل میں اسباط بن نصر کی سند سے مروی ہے جس کو انہوں نے اسماعیل سدی سے، انہوں نے ابو مالک سے، انہوں نے ابوصالح سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے، اسی طرح مرہ بن شراحیل سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے صحابیوں سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا:

اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو ملعون قرار دے کر جنت سے نکال دیا اور آدم علیہ السلام کو یہ کہتے ہوئے جنت میں آباد کیا: اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ..... تم اور تمہاری بیوی جنت میں آباد ہو جاؤ" تو آدم علیہ السلام جنت میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے وحشت محسوس کرنے لگے کیونکہ ان کی کوئی بیوی نہیں تھی جس سے وہ سکون حاصل کریں۔ ایک دن جب وہ سوئے اور پھر بیدار ہوئے تو ان کے سرہانے ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی جس کو اللہ نے ان کی پسلی سے پیدا کیا تھا۔ آدم نے اس عورت سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ تو اس نے جواب دیا: ایک عورت، انہوں نے اس سے کہا: تم کو کس لیے پیدا کیا گیا ہے؟ کہا: تاکہ تم مجھ سے سکون حاصل کرو......"

البانی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اس کی تخریج حافظ ابن مندہ نے کتاب التوحید[1] میں کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی روایت مسلم نے مرہ سے، انہوں نے سدی سے، انہوں نے عمر بن حماد اور اسباط بن نصر سے کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ سند ثابت ہے"۔

البانی ابن مندہ کے اس قول پر تعجب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اسباط بن نصر کی ثقاہت مختلف فیہ ہے۔ حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سچے تھے مگر بہت غلطیاں کرتے تھے۔ عجیب وغریب روایتیں بیان کیا کرتے تھے۔[2]

لہٰذا یہ سند موقوف ہونے کے ساتھ ضعیف بھی ہے اور لگتا ہے کہ اس کا تعلق اسرائیلیات سے ہے۔

---

[1] کتاب التوحید: ص ۲۱۳، ۲۱۴، ج۱ [2] تقریب التہذیب: ص ۳۸۔ ترجمہ: ۳۲۱

عورت کے پسلی سے پیدا کیے جانے کا مفہوم:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ، فَإِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ وَإِنَّ اَعْوَجَ شَيْئٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ، فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهُ كَسَرْتَهُ، وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ اَعْوَج، فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ))[1]

''تم لوگ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک سے کام لو کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی کا سب سے ٹیڑھا حصہ اس کا بالائی حصہ ہے۔ اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو اسے توڑ دو گے اور اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دو گے تو اس کی کجی برقرار رہے گی''

اور صحیح مسلم کی روایت میں ہے:

((إِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ، لَنْ تَسْتَقِيْمَ لَكَ عَلَى طَرِيْقَةٍ، فَإِنَ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اِسْتَمْتَعْتَ بِهَا، وَبِهَا عِوَجٌ وَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهَا كَسَرْتَهَا وَكَسْرُهَا طَلَاقُهَا))[2]

''عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ وہ کسی ایک طریقے پر برقرار نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا تم اس کی کجی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو لیکن اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو اسے توڑ دو گے اور اس کو طلاق دینا اس کو توڑنا ہے''

محدث البانی نے إِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ...... عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے کی تفسیر میں ملا علی قاری کا یہ قول نقل کیا ہے:

عورتوں کی تخلیق کچھ ایسی ہے کہ اس میں کجی ہے۔ گویا ان کو پسلیوں سے بنایا گیا ہے۔ کیونکہ پسلی کی ہڈی ٹیڑھی ہوتی ہے اور کجی کے لیے یہ تعبیر ''مستعار'' ہے اور اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ انسان جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے۔ تو یہاں ''عجل'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کو اس سے پیدا کیا گیا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جلد بازی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔

البانی فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح بخاري: ٣٣٣١، ٥١٨٦۔ صحيح مسلم ٣٦٤٤

[2] صحيح مسلم: ٢٦٤٣

میرے نزدیک راجح یہی ہے کہ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ...... دو وجوں سے استعارہ ہے، حقیقت نہیں ہے:

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ ایسی کوئی صحیح حدیث نہیں جس میں یہ تصریح ہو کہ حضرت حواء کو حضرت آدم علیہما السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔

(۲) دوسری وجہ وہ صحیح حدیث ہے جس میں عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے: اِنَّ الْمَرْأَةَ كَالضِّلَعِ...... بے شک عورت پسلی کی مانند ہے۔[1، 2]

(۲۰۵)......اِنَّ آدَمَ أَتَى الْبَيْتَ أَلْفَ آتِيَةٍ لَمْ يَرْكَبْ قَطُّ ، فِيهِنَّ مِنَ الْهِنْدِ عَلَى رِجْلَيْهِ۔

''بے شک آدم ہندوستان سے اپنے دونوں پیروں پر چل کر ایک ہزار بار بیت اللہ آئے کسی بار سواری پر سوار ہو کر نہیں آئے۔''

یہ روایت بے حد ضعیف اور نا قابل اعتبار ہے جس کی تخریج امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں[3] میں قاسم بن عبد الرحمٰن کی سند سے کی ہے۔

ہم سے محمد بن احمد بن یزید عبدانی نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن عبد اللہ انصاری نے بیان کیا، کہا: مجھ سے قاسم بن عبد الرحمٰن نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابو حازم نے۔ جو ابن عباس کا آزاد کردہ غلام نبتك ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا......

محدث محمد ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں:

قاسم بن عبد الرحمٰن کو جس کا لقب انصاری ہے۔ امام یحییٰ بن معین نے بے حد ضعیف قرار دیا ہے جیسا کہ میزان الاعتدال[4] میں مذکور ہے۔

حافظ منذری نے بھی یہ روایت ترغیب وترہیب[5] میں نقل کی ہے اور قاسم کو حد درجہ ضعیف قرار دیا ہے۔

رہا حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا آزاد کردہ غلام ابو حازم نبتک تو وہ ثقہ ہے۔ جیسا کہ امام ابن

---

۱ صحیح بخاری: ٥١٨٤۔ صحیح: مسلم ١٤٧٠ ، ٣٦٥٠

۲ الضعیفه ص ١١٣٧ ، ١١٤٠ ، ج ١٢ ، ح ٦٤٩٩

۳ صحیح ابن خزیمه: ص ١٣١٩ ، ج٢ ، ح ٢٧٩٢

۴ میزان الاعتدال: ص ٣٧٤ ، ج٣

۵ الترغیب والترهیب: ص ٣٤٥ ، ج٢ ، ح ٦٩٢

ابی حاتم نے امام حمد کے حوالہ سے لکھا ہے۔[1]

(۲۰۶)......اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ طِيْنَةِ الْجَابِيَةِ وَعَجَّنَهُ مِنْ مَاءٍ مِنَ الْجَنَّةِ۔

''درحقیقت اللہ نے آدم کو جابیہ کی مٹی سے پیدا کیا اور اس مٹی کو جنت کے پانی سے گوندھا''

یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج امام عبد اللہ بن عدی نے الکامل[2] میں اور انہی کے طریق سے امام ابن الجوزی نے الموضوعات[3] میں اس سند سے کی ہے:

ولید بن مسلم سے روایت ہے، وہ اسماعیل بن رافع سے روایت کرتے ہیں، وہ مقبری سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

امام ابن الجوزی نے اس روایت کو درج ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے:

((خَلَقَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ آدَمَ مِنْ تُرَابِ الْجَابِيَةِ وَعَجَّنَهُ بِمَاءِ الْجَنَّةِ))

اس سند کا راوی اسماعیل بن رافع مکی ہے جو ضعیف ہے۔ جسے امام احمد اور امام یحییٰ بن معین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ان سے اس کی روایت کرنے والا ولید بن مسلم ''مدلس'' ہے جو نا قابل بھروسہ تھا۔

اس روایت کا متن اس کی سند سے زیادہ منکر ہے۔ کیونکہ یہ اس صحیح حدیث کے خلاف ہے جس کی تخریج امام ترمذی، ابوداؤد اور ابن خزیمہ نے کی ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((اِنَّ اللّٰهِ تَعَالَى خَلَقَ آدَمَ مِنْ قَبْضَةٍ قَبَضَهَا مِنْ جَمِيْعِ الْاَرْضِ، فَجَاءَ بَنُوْ آدَمَ عَلَى قَدَرِ الْاَرْضِ، فَجَاءَ مِنْهُمُ الْاَحْمَرُ وَالْاَبْيَضُ وَالْاَسْوَدُ وَبَيْنَ ذَلِكَ، وَالسَّهْلُ وَالْحَزْنُ وَالْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَبَيْنَ ذَلِكَ))

''درحقیقت اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس مٹھی بھر مٹی سے پیدا کیا جو اس نے تمام زمین سے لی۔ اسی وجہ سے بنو آدم زمین کے مطابق ظاہر ہوئے۔ ان میں سے کوئی سرخ ہے تو کوئی گورا، کوئی سیاہ فام تو کوئی درمیانی رنگت کا، کوئی نرم خو ہے تو کوئی سخت مزاج ہے اور کوئی برا ہے تو کوئی اچھا۔ اور کوئی درمیانی خصلتوں کا ہے''[4]

---

[1] الضعیفہ ص ۱۵۹، ج۱۱، ح ۵۰۹۲، صحیح ابن خزیمہ کے محقق ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے ابو حازم کا نام نجتک لکھا ہے۔ لیکن البانی نے کتاب کے حاشیہ پر نبیل نام لکھا ہے اور دلیل میں دولابی کی الکنی، ابن ابی حاتم کی جرح وتعدیل اور ابن حبان کی ''ثقات'' کا حوالہ دیا ہے۔

[2] الکامل: ص ۲۷۸، ج۱ [3] الموضوعات: ص ۳۰۲، ج۱، ح ۳۹۴

[4] ابو داؤد: ح ۴۶۹۳۔ ترمذی: ۲۹۵۵۔ کتاب التوحید: ص ۴۴

یہ صحیح حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو کسی ایک جگہ کی مٹی سے نہیں پیدا کیا جیسا کہ ''جابیہ''[1] والی جھوٹی روایت میں دعویٰ کیا گیا ہے بلکہ مختلف جگہوں کی مٹیوں کو ملا کر اس سے ان کا پتلا بنایا۔

انسان کے اجزائے ترکیبی:

اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کے پہلے فرد حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے فرمائی۔ لیکن ان کی اولاد کو نطفے سے وجود بخشا اور قیامت تک جتنے انسان پیدا ہوں گے ان سب کا مادۂ تخلیق نطفہ ہی ہوگا۔

﴿ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ○ الَّذِيْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ○ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ○ ﴾ [السجدہ:٦ تا ٨]

''وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا، زبردست اور مہربان۔ اس نے ہر چیز کو عمدہ طریقے سے پیدا کیا اور انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی کے گارے سے کی۔ پھر اس کی نسل حقیر پانی کے جوہر سے چلائی۔''

لیکن حضرت آدم علیہ السلام کے خاکی پتلے میں جو عناصر ترکیبی رکھے گئے تھے یا زمین کے جن مواد سے وہ بنایا گیا تھا وہ مواد اور عناصر ترکیبی ان کے نطفے سے، ان کی ذریت کے نطفوں میں منتقل ہوتے رہے۔ اس طرح صالح مٹی اور انسانی جسم کے مواد اور عناصر ترکیبی ایک ہی ہیں۔ مثال کے طور پر:

کاربن **Carbon**، ہائڈروجن **Hydrogen**، نائٹروجن **Nitrogen**، کلورین **Chlorine**، سلفر **Sulphur**، کیلشیم **Calcium**، فاسفورس **Phosphorus**، پوٹاشیم **Potassium**، سوڈیم **Sodium**، لوہا **Iron**، آئیوڈین **Iodine**، آکسیجن **Oxygen** اور منگنیز **Manganese** وغیرہ زرخیز مٹی اور انسانوں کے مشترکہ عناصر ترکیبی ہیں۔

(۲۰۷)......لَمَّا أَهْبَطَ اللّٰهُ تَعَالَى آدَمَ إِلَى الْأَرْضِ: كَانَ أَوَّلَ مَا أَكَلَ مِنْ ثِمَارِهَا النَّبْقَ۔

''جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین پر اتارا تو انہوں نے زمین کے پھلوں میں سے جو پھل سب سے پہلے کھایا وہ بیری کا پھل تھا''

---

[1] شام کے ایک گاؤں کا نام جابیہ ہے۔

یہ روایت منکر ہے۔ اس کی تخریج حافظ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد[1] میں اور انہی کے طریق سے امام ابن الجوزی نے العلل المتناهيه[2] میں بکر بن بکار کی سند سے کی ہے۔

ہم سے ورقاء نے ابن ابی نجیح سے، انہوں نے مجاہد سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے......

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ابن الجوزی کا قول ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ امام یحییٰ بن معین نے بکر بن بکار کے بارے میں کہا کہ: وہ کچھ بھی نہیں یعنی نا قابل اعتبار ہے۔

البانی فرماتے ہیں: بکر بن بکار کی بعض محدثین نے توثیق کی ہے لیکن اس کی روایت کردہ حدیثوں پر مشتمل ایک ایسا نسخہ ہے جس میں منکر روایتیں ہیں۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ انہی منکر روایتوں کی وجہ سے اس کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

البانی آگے چل کر لکھتے ہیں: بکر بن بکار کے ضعیف ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہی روایت ایک دوسری بار ”عن حماد بن سلمہ، عن علی بن زید، عن یوسف بن مہران، عن ابن عباس کی سند سے اس نے موقوف روایت کی ہے اور اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب نہیں کیا ہے۔[3]

حضرت آدم علیہ السلام کا ہند میں نزول:

(۲۰۸)......نَزَلَ آدَمُ بِالْهِنْدِ وَاسْتَوْحَشَ، فَنَزَلَ جِبْرِيْلُ، فَنَادَى بِالْأَذَانِ: اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ (مَرَّتَيْنِ)، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ (مَرَّتَيْنِ) قَالَ آدَمُ: مَنْ مُحَمَّدٌ؟ قَالَ: آخِرُ وَلَدِكَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

”آدم علیہ السلام ہندوستان میں نازل ہوئے اور وحشت و گھبراہٹ محسوس کرنے لگے تو جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور اذان دی: اللہ اکبر، اللہ اکبر، اشهد ان لا اله الا الله (دو مرتبہ) اشهد ان محمد رسول الله (دو مرتبہ)۔ آدم نے پوچھا: محمد کون ہیں؟ جبریل نے جواب دیا: انبیاء میں سے تمہاری آخری اولاد صلی اللہ علیہ وسلم۔

[1] تاریخ بغداد: ص ٦٢، ج ١٣ [2] العلل المتناهيه: ص ١٦٦، ١٦٧، ج ٢

[3] الضعيفه: ص ٤٢١، ج ١٣، ح ٦١٩٣

یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کی تخریج حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق [1] میں محمد بن عبد اللہ بن سلمان کی سند سے کی ہے:

ہم کو علی بن بہرام کوفی نے خبر دی، کہا: ہم کو عبد الملک بن ابی کریمہ نے عمرو بن قیس سے انہوں نے عطاء سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے......

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یہ سند ضعیف ہے۔ علی بن بہرام کو میں نہیں جانتا۔ حافظ ابن حجر نے اس کا ذکر ابو کریمہ سے روایت کرنے والوں کے ضمن میں کیا ہے۔ اور اس کا پورا نام: علی بن یزید بن بہرام لکھا ہے۔ پھر مجھے اس کا ذکر تاریخ بغداد [2] میں مل گیا جس میں ''یزید'' کو اس کا دادا قرار دیا گیا ہے اور لکھا ہے۔

''علی بن بہرام بن یزید ابو جحیہ مزنی عطار...... اس کا تعلق افریقہ سے تھا جہاں سے وہ عراق منتقل ہو گیا اور اپنی وفات تک وہیں سکونت پذیر رہا۔ بغداد میں عبد الملک بن ابو کریمہ انصاری سے حدیثوں کی روایت کی، اس سے احمد بن یحییٰ اودی، موسیٰ بن اسحاق انصاری، علیک رازی اور حسن بن طیب شجاعی نے حدیثیں روایت کیں''

اس کے بعد حافظ خطیب بغدادی نے اس کی روایت کردہ دو حدیثیں مثال میں نقل کی ہیں۔ مگر اس کی جرح و تعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔

رہا سند کا بنیادی راوی: محمد بن عبد اللہ بن سلیمان تو اس نام کے دو راوی ہیں:

(۱) ایک کوفی ہے جس کو ابن مندہ نے مجہول لکھا ہے۔

(۲) دوسرے کا لقب خراسانی ہے۔ جس پر امام ذہبی نے موضوع حدیث روایت کرنے کا الزام لگایا ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ وہ پہلا ہے۔ یعنی محمد بن عبد اللہ بن سلیمان کوفی۔

البانی آگے لکھتے ہیں:

یہ زیر بحث حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس کی سند اس حدیث سے قوی ہے جس میں آدم علیہ السلام کے حکم الٰہی کی خلاف ورزی کرنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کے واسطہ سے توبہ کرنے کا ذکر آیا ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

---

[1] تاریخ دمشق: ص ۳۲۳، ج ۲ [2] تاریخ بغداد: ص ۳۵۳، ج ۱۱

((لَمَّا اقْتَرَفَ آدَمُ الخَطِيْئَةَ قَالَ: يَا رَبِّ! اَسْأَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ لَمَّا غَفَرْتَ لِيْ......))

''جب آدم سے گناہ سرزد ہو گیا تو کہا: اے میرے رب! میں محمد کے حق کا واسطہ دے کر تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے معاف کر دے......''[1]

تو اس میں یہ صراحت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نبی مکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت میں رہتے ہوئے اور زمین پر اترنے سے قبل جانتے تھے۔ جبکہ یہ زیر بحث روایت یہ صراحت کر رہی ہے کہ آدم علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زمین پر نازل ہونے تک ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا: محمد کون ہیں؟ تو یہ روایت اس روایت کے باطل ہونے کی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے۔[2]

اوپر اس روایت کی جو سند بیان ہوئی ہے اس سے اس کا ضعیف ہونا بالکل واضح ہے۔ مگر جیسا کہ محدث البانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ روایت اپنی سند کے اعتبار سے اس روایت سے قوی ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں ''شجر ممنوعہ'' کا پھل کھا کر اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ بنا کر اپنی اس لغزش کی معافی کی درخواست کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا تھا۔

تو وہ روایت صرف ضعیف ہی نہیں ہے بلکہ موضوع اور باطل ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کی پہلی جلد میں پوری تفصیل سے واضح کیا جا چکا ہے۔ لیکن نبی مکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء اللہ کو وسیلہ اور واسطہ بنا کر دعا کرنا چونکہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے اندر عقیدہ کی شکل اختیار کر چکا ہے اس لیے اس کو صحیح دینی رنگ دینے اور مطلوب بنانے کی خاطر مذکورہ روایت گھڑی گئی ہے۔ اسی طرح بعض صحیح حدیثوں سے ایسی عبارتیں جوڑ دی گئی ہیں جن سے اس غلط عقیدے کی تائید ہوتی ہے۔ اسی طرح کی روایتوں میں سے ایک درج ذیل روایت بھی ہے جس کو پہلی روایت کی شاہد کہا جاتا ہے۔

(۲۰۹)......لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْأَرْضَ وَاسْتَوَى اِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ، وَخَلَقَ الْعَرْشَ، كَتَبَ عَلَى سَاقِ الْعَرْشِ: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ خَاتَمُ الْاَنْبِيَاءِ، وَخَلَقَ الْجَنَّةَ الَّتِىْ اُسْكَنَهَا آدَمَ وَحَوَّاءَ، فَكَتَبَ

[1] اس کتاب کی پہلی جلد کے صفحہ ۱۰۸۔۱۱۰ پر اس روایت کا باطل ہونا واضح کیا جا چکا ہے۔ اور آگے روایت نمبر ۲۱۳ کے تحت اسی مضمون کی حامل ایک دوسری روایت مختلف الفاظ میں آ رہی ہے۔

[2] الضعيفه: ص ۵۷۹۔ ۵۸۰، ج ۱، ح ۴۰۳

اِسْمِي عَلَى جَمِيعِ الْاَبْوَابِ وَالْاَوراقِ وَالْقِبَابِ وَالْخِيَامِ، وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوحِ وَالْجَسَدِ، فَلَمَّا اَحْيَاهُ اللّٰهُ تَعَالٰى نَظَرَ إِلَى الْعَرْشِ فَرأَى إِسْمِي، فَأَخْبَرَهُ اللّٰهُ أَنَّهُ سَيِّدُ وَلَدِكَ، فَلَمَّا غَرَّهُمَا الشَّيْطَانُ تَابَا وَاسْتَشْفَعَا بِإِسْمِي إِلَيْهِ))

''جب اللہ نے زمین بنائی تو آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور سات آسمان استوار کیے اور عرش کو وجود بخشا۔ عرش کے ستون پر ''محمد رسول الله خاتم الانبیاء'' تحریر فرمایا اور وہ جنت بنائی جس میں آدم وحوا کو آباد کیا اور میرا نام جنت کے دروازوں، درختوں کے پتوں، گنبدوں اور خیموں پر لکھا۔ حالانکہ آدم بھی روح اور بدن کی درمیانی حالت میں تھے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو زندگی بخشی تو انہوں نے عرش کی جانب نظر ڈالی۔ وہاں میرا نام دیکھا۔ اللہ نے ان کو بتایا کہ یہ تمہاری اولاد کے سردار ہیں۔ پس جب شیطان نے آدم اور حواء کو بہکایا تو انہوں نے توبہ کی اور اللہ میرے نام سے سفارش کرائی''

یہ روایت منکر ہے۔ جس کی روایت ابوالحسین بن بشران نے کی ہے اور اسی کے طریق سے امام ابن الجوزی نے ''الوفاء بفضائل المصفطی'' میں اس سند سے روایت کی ہے:

ہم سے ابوجعفر محمد بن عمرو نے بیان کیا، کہا: ہم سے احمد بن اسحاق بن صالح نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن صالح نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن سنان عوفی نے بیان، کہا: ہم سے ابراہیم بن طہمان نے بدیل بن میسرہ سے، انہوں نے عبد اللہ بن شقیق سے، اور انہوں نے میسرہ...... الفجر...... سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا:

میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مَتَى كُنْتَ نَبِيًّا، كُتِبْتَ نَبِيًّا، جُعِلْتَ نَبِيًّا......

آپ کب نبی[1] تھے، آپ کب نبی لکھے[2] گئے، آپ کب نبی[3] مقرر گئے؟ تو آپ نے فرمایا......

یہ روایت امام ابن تیمیہ کے مجموعہ فتاویٰ[4] میں موجود ہے جو دراصل ان کے اس رسالہ سے نقل کی گئی ہے جو آپ نے ''اتحادی'' مذہب کی حقیقت اور اس کے باطل ہونے کے موضوع پر لکھا ہے۔ اور ابن عروہ حنبلی کی کتاب الکواکب الدراری[5] میں محفوظ ہے۔

---

[1] طبقات ابن سعد: ص ۱۴۸، ج۱، ۵۹، ج۷ [2] السنة ح ۴۱۰

[3] مسند احمد ح ۱۶۷۴۰، ۲۳۵۹۸۹ [4] مجموعة فتاوٰی ابن تیمیة: ص ۱۵۰، ج۲

[5] الکواکب الدراري: ص ۳۹، ۱۰۳، ج۱

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

اس سند کے تمام راوی معروف اور ثقہ ہیں سوائے محمد بن صالح کے جس کو میں نہیں جانتا۔ اس کے اوپر کے راوی ''التہذیب'' کے راویوں میں سے ہیں۔ سند کا ایک راوی احمد بن اسحاق بن صالح ہے جس کی کنیت ابوبکر وزّان اور لقب بغدادی ہے۔ امام ابن ابی حاتم نے الجرح والتعدیل[1] میں لکھا ہے کہ میں نے اپنے والد کے ساتھ اس کے بارے میں لکھا ہے: وہ سچا تھا۔ اور امام دار قطنی کا قول ہے: لَا بَأْسَ بِهِ اس میں کوئی حرج نہیں۔[2]

رہا ابوجعفر محمد بن عمرو؟ تو وہ ابن بختری رزاز ہے۔ جس کو حافظ خطیب بغدادی نے ثقہ قرار دیا ہے۔[3]

اس تحقیق کے بعد البانی تحریر فرماتے ہیں:

لگتا ہے اس کی مصیبت محمد بن صالح ہے جس کو میں نہیں جانتا اور جس کو بغدادی نے ابوبکر احمد بن اسحاق بن صالح وزان کے شیوخ میں شمار کیا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ محمد بن صالح ثقہ تھا تو اس صورت میں یہ روایت ''شاذ'' ہوگی۔ کیونکہ اس نے اس روایت میں اپنے سے زیادہ ثقہ راویوں کی مخالفت کی ہے۔ اس لیے کہ صحیح روایتوں میں صرف اتنا ہی آیا ہے: كُنْتُ ، كُتِبْتُ ، جُعِلْتُ نَبِيًّا وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ'' میں نبی تھا، یا نبی لکھا جاچکا تھا یا نبی مقرر کردیا گیا تھا جبکہ آدم روح اور بدن کی درمیانی حالت میں تھے اور کسی بھی ثقہ راوی نے یہ طویل اور منکر عبارت روایت نہیں کی ہے۔[4]

محدث البانی رحمہ اللہ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ کافی اور شافی ہے۔ مگر اس میں اتنا اضافہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ:

اگر رسول اللہ ﷺ کی منقبت اور فضیلت میں یہ بات شامل ہوتی کہ عرش کو بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام اس کے ستون پر اور جنت بنانے کے بعد اس کے دروازوں، اس کے درختوں کے پتوں، اس کے گنبدوں اور خیموں پر لکھا تھا تو یہ چیز سیرت کی کتابوں میں معروف ہوتی، متعدد صحابہ کرام نے اس کو نقل کیا ہوتا۔ جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ یہ صفات ایسی روایت میں بیان ہوئی ہیں جس کا راوی یا

[1] الجرح والتعدیل: ص ٤١ ، ج ١ [2] تاریخ بغداد ص ٢٨ ، ج ٤

[3] ص ١٣٢ ، ج ٣ [4] الضعیفہ: ص ٤٦٨ ، ٤٧٠ ـ ج ١٢ ، ح ٥٧٠٩

تو تمام ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف اور ناقابل اعتبار تھا یا مجہول اور نا معلوم۔

آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے غلطی سرزد ہو جانے کے موقع پر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ اور وسیلہ سے دعا کرنے سے متعلق تمام روایات اپنی سندوں اور فتنوں کے ساتھ موضوع اور منکر ہیں۔ اگرچہ یہ روایتیں بے حد مشہور اور لوگوں میں زبان زد عام ہیں اور ان کی شہرت کا سبب ان کی صحت نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ یہ ایک خاص ذہنیت اور عقیدہ کی ترجمان ہیں۔

اور جن صحیح حدیثوں میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے قبل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کا ذکر آیا ہے تو ان کا مطلب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق سے قبل ہی آپ کے نبی ہونے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ بلکہ بعض حدیثوں میں اس کی صراحت موجود ہے۔[1]

(۲۱۰)......لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، خُبِّرَ بِبَنِيْهِ، فَجَعَلَ يَرَى فَضَائِلَ بَعْضِهِمْ عَلَى بَعْضٍ، فَرَأَى نُوْرًا سَاطِعًا فِيْ أَسْفَلِهِمْ، فَقَالَ: يَا رَبِّ! مَنْ هٰذَا؟ قَالَ: هٰذَا إِبْنُكَ أَحْمَدُ، هُوَ أَوَّلٌ وَهُوَ آخِرٌ، وَهُوَ أَوَّلُ شَافِعٍ۔

"جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کو ان کے بیٹوں کی خبر دی گئی اور انہوں نے ان میں سے بعض کے بعض پر فضائل دیکھے اور ان کے نیچے تیز پھیلی ہوئی روشنی دیکھی تو عرض کیا: اے میرے رب! یہ کون ہے؟ اللہ نے فرمایا: یہ تیرے بیٹے احمد ہیں۔ وہی پہلے ہیں، وہی آخری اور وہی پہلے شفاعت کرنے والے ہیں"

یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ اس کی تخریج حافظ محمد بن اسحاق بن ابراہیم سراج نے اپنی حدیث[2] میں اس سند سے کی ہے۔

ہم سے ابو عبید اللہ یحییٰ بن محمد بن سکن نے بیان کیا، کہا: ہم سے حبان بن ہلال نے بیان کیا، کہا: ہم سے مبارک بن فضالہ نے بیان کیا، کہا: مجھ سے عبید اللہ بن عمر نے خبیب بن عبد الرحمٰن سے، انہوں نے حفص بن عاصم سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، ابو ہریرہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اسی سند سے اس کی تخریج ابو محمد مخلدی نے الفوائد[3] میں، مخلص نے الفوائد[4] المنتقاۃ میں، امام

---

[1] ملاحظہ ہو اس کتاب کی پہلی جلد ص ۲۹۰، ۲۹۱
[2] ص ۲۰۰، ج ۱
[3] الفوائد: ص ۲٦٤، ج ۲
[4] الفوائد المنتقاۃ: ص ۱٤، ج ۱۰

بیہقی نے دلائل النبوۃ[1] میں اور علاؤ الدین علی متقی نے کنز العمال[2] میں کی ہے۔

محدث محمد ناصر الدین رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

یہ سند حسن ہے۔ اس کے تمام راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں سوائے مبارک بن فضالہ کے۔ امام بخاری نے ان کی روایت کردہ صرف معلق حدیث روایت کی ہے اور ان کی ثقاہت مختلف فیہ ہے۔ لیکن اہل تحقیق کا ان کے بارے میں یہ قول ہے کہ اگر وہ اپنی روایت میں حدثنا یا حدثنی کی صراحت کر دیں تو سچے ہیں۔

البانی آگے لکھتے ہیں:

''پھر مجھے یاد آیا کہ مبارک بن فضالہ ''مدلس'' تھے اور ان کی تدلیس[3] اس قسم کی نہیں تھی جس کی برائی مدلس راوی کی اس صراحت سے دور ہو جائے کہ اس کے شیخ نے اس سے حدیث بیان کی ہے۔ بلکہ ان کی تدلیس وہ تھی جو محدثین کے یہاں "تدلیس التسویہ" کے نام سے معروف ہے۔ ایسی تدلیس کرنے والا سند کے اوپر سے اپنے شیخ کے سوا دوسرے ضعیف راویوں کو حذف کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ولید بن مسلم کیا کرتا تھا...... لہٰذا تدلیس التسویہ کرنے والے راوی کی حدیث صرف اس شرط پر قابل قبول ہے کہ وہ اپنے شیخ کے اوپر کے تمام راویوں کے بارے میں یہ صراحت کرے کہ ان میں سے ہر راوی نے یہ کہا ہے کہ اس کے شیخ نے اس سے حدیث بیان کی ہے۔ یعنی حدثنا یا حدثنی کہے۔[4]

حافظ ابن حجر نے بھی مبارک بن فضالہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سچا تھا لیکن تدلیس التسویہ کرتا تھا۔[5]

تعجب ہے کہ محدث البانی نے زیر بحث روایت کے متن سے بالکل تعرض نہیں کیا ہے حالانکہ اس کا متن اس کی سند سے زیادہ برا ہے۔ کیونکہ اس میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اول و آخر ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے جو درحقیقت ان لوگوں کے عقیدے کا ترجمان ہے جن کا دعویٰ ہے کہ نبی معظم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا تو سب سے پہلے کیے گئے لیکن آپ کی بعثت تمام انبیاء کے آخر میں ہوئی۔ اپنے اس دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے

---

[1] دلائل النبوۃ: ص ۴۸۳، ج ۵ [2] کنز العمال: ح ۳۲۰۵٦

[3] دلّس یُدَلِّسُ کے معنی ہیں عیب چھپانا اور دھوکہ دینا۔ محدثین کی اصطلاح میں سند کے عیب چھپانے کو تدلیس کہتے ہیں۔ جس کی بدترین قسم ''تدلیس التسویہ'' ہے جس میں ''مدلس'' سند کے ضعیف راویوں کو حذف کر کے صرف ثقہ راویوں کو باقی رکھتا ہے تاکہ سند قابل اعتماد ہو جائے۔

[4] الضعیفہ ص ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ج ۱۳، ح ٦۴۸۲

[5] تقریب التھذیب: ص ۴۵۲۔ ترجمہ: ٦۴٦۴

کے لیے انہوں نے درج ذیل نا قابل اعتبار روایت کا سہارا لیا ہے:

((كُنْتُ اَوَّلَ النَّبِيِّيْنَ فِي الْخَلْقِ وَآخِرَهُمْ فِي الْبَعْثِ))

میں پیدائش کے اعتبار سے پہلا نبی ہوں اور مبعوث ہونے کے اعتبار سے آخری۔'' اس نا قابل اعتبار روایت کے بارے میں تفصیلی بحث اس کتاب کی پہلی جلد میں گزر چکی ہے۔[1]

(۲۱۱)......اِنَّ آدَمَ قَامَ خَطِيْبًا فِيْ اَرْبَعِيْنَ اَلْفًا مِنْ وَلَدِ وَوَلَدِه وَلَدِهِ وَقَالَ اِنَّ رَبِّيْ عَهِدَ اِلَيَّ ، فَقَالَ: يَا آدَمُ! أَقْلِلْ كَلَامَكَ تَرْجِعُ اِلَى جِوَارِيْ۔

''آدم نے ایک دن اپنے چالیس ہزار بیٹوں اور پوتوں کے درمیان خطبہ دیتے ہوئے کہا: میرے رب نے مجھے حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے: اے آدم! اپنی گفتگو کم کرو تو دوبارہ میری حفاظت میں آ جاؤ گے''

یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اس کی تخریج ابوموسیٰ مدنی نے ''منتهى رغبات السامعين''[2] میں اور حافظ دیلمی نے مسند الفردوس[3] میں ابراہیم بن جعفر بن خُلید کے طریق سے کی ہے۔

ہم سے حسن بن شبیب اغر نے بیان کیا، کہا: ہم سے خلف بن خلیفہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابوہاشم رمانی نے ثابت سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے......

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ سند موضوع ہے جس کا گھڑنے والا حسن بن شبیب ہے۔ امام ابن عدی نے اس کے بارے میں لکھا ہے: اس نے ثقہ راویوں سے باطل روایتیں بیان کی ہیں۔

یہ روایت امام ذہبی نے اس سلسلۂ روایات کے ضمن میں درج کی ہے جن کو انہوں نے منکر قرار دیا ہے۔ مگر انہوں نے یہ روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک دوسری سند سے بھی نقل کی ہے اور اس کو ان پر موقوف قرار دیا ہے۔

البانی اپنی بات ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لگتا ہے کہ یہ روایت اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔

---

[1] موضوع اور منکر روایات: ج ۱ ص ۲۹۲ [2] منتهىٰ رغبات السالكين: ص ۲۵۵ ، ج ۱
[3] مسند الفردوس ص ۲٦۵ ، ج ۲

رہا ابراہیم بن جعفر بن حلید تو مجھے اس کا کوئی ترجمہ نہیں ملا۔[1]

(۲۱۲)......لَمَّا أَهْبَطَ اللّٰهُ آدَمَ إِلَى الْأَرْضِ، قَامَ وِجَاهَ الْكَعْبَةِ فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، فَأَلْهَمَهُ اللّٰهُ هٰذَا الدُّعَاءَ: اَللّٰهُمَّ! إِنَّكَ تَعْلَمُ سَرِيْرَتِي وَعَلَانِيَتِي، فَاقْبَلْ مَعْذِرَتِي، وَتَعْلَمُ حَاجَتِي، فَأَعْطِنِي سُؤلِي، وَتَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي، فَاغْفِرْلِي ذَنْبِي۔

اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ إِيْمَانًا يُبَاشِرُ قَلْبِي وَيَقِيْنًا صَادِقًا حَتَّى أَعْلَمَ أَنَّهُ لَا يُصِيْبُنِي إِلَّا مَا كَتَبْتَ لِي وَرِضًا بِمَا قَسَمْتَ لِي، فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيْهِ:

يَا آدَمُ! إِنِّي قَدْ قَبِلْتُ تَوْبَتَكَ وَغَفَرْتُ لَكَ ذَنْبَكَ وَلَنْ يَدْعُنِي أَحَدٌ بِهٰذَا الدُّعَاءِ إِلَّا غَفَرْتُ لَهُ ذَنْبَهُ وَكَفَيْتُهُ الْمِهَمَّ مِنْ أَمْرِهِ، وَزَجَرْتُ عَنْهُ الشَّيْطَانَ وَاتَّجَرْتُ لَهُ مِنْ وَرَاءِ كُلِّ تَاجِرٍ وَأَقْبَلَتْ إِلَيْهِ الدُّنْيَا رَاغِمَةً وَإِنْ لَمْ يُرِدْهَا۔

''جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین پر اتارا تو انہوں نے کعبہ کی سمت کھڑے ہو کر دو رکعتیں نماز ادا کیں اور اللہ نے ان کے دل میں یہ دعا الہام فرمائی:

اے اللہ! تو میری پوشیدہ اور ظاہری حالت جانتا ہے۔ تو میرا عذر قبول فرما۔ تو میری حاجت مندی سے واقف ہے، تو میری مانگ مجھے عطا فرما۔ اور جو کچھ میرے جی میں ہے تو اس کا علم رکھتا ہے تو میرا گناہ معاف فرما دے۔ اے اللہ! میں تجھ سے ایسے ایمان کا سوال کرتا ہوں جو میرے دل کو چھو لے اور سچے یقین کا طالب ہوں تا کہ مجھے یہ گہرا علم حاصل ہو جائے کہ مجھے صرف وہی کچھ پہنچ سکتا ہے جو تو نے میرے لیے لکھ دیا ہے اور میں تجھ سے اپنے لیے اس نعمت پر قناعت کا طالب ہوں جو تو نے میرے لیے تقسیم کر دی ہے۔ تو اللہ نے ان کو یہ وحی فرمائی۔

اے آدم! میں نے تیری توبہ قبول فرمالی، تیرا گناہ بخش دیا اور جو کوئی بھی مجھ سے یہ دعا کرے گا میں اس کا گناہ معاف کر دوں گا۔ اس کو اس کے غم انگیز معاملے سے محفوظ رکھوں گا، شیطان کو اس سے دور رکھوں گا اور ہر تاجر کے پیچھے اس کے لیے نفع کا سامان کر دوں گا

[1] الضعيفة: ص ۵۳۵۔۵۳۶، ج۶ ح ۲۹۶۱

اور دنیا، اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً اس کی طرف مائل ہوگی“

یہ روایت منکر ہے۔ اس کی تخریج حافظ طبرانی نے المعجم الاوسط[1] میں اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق[2] میں نصر بن طاہر کی سند سے کی ہے:

ہم سے معاذ بن محمد انصاری خراسانی نے ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے باپ عروہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور انہوں نے نبی ﷺ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

حافظ طبرانی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس کی روایت ہشام بن عروہ سے صرف معاذ بن محمد نے کی ہے اور اس کی روایت میں نصر بن طاہر منفرد ہے۔

محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

نصر بن طاہر حد درجہ ضعیف ہے۔ وہ حدیثوں کا سرقہ کرتا تھا اور ایسے لوگوں سے حدیث روایت کیا کرتا تھا جن کو اس نے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ اس کی عمر اس قابل نہیں تھی کہ وہ ان کو دیکھتا۔ جیسا کہ امام ابن عدی نے الکامل میں لکھا ہے اور ایسی چند احادیث نقل کی ہیں جن کا سرقہ کر کے اس نے یہ بیان کرنا شروع کر دیا کہ اس سے یہ حدیثیں فلاں اور فلاں راویوں نے بیان کی ہیں۔ جبکہ یہ حدیثیں اس نے ان سے نہیں سنی تھیں۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ ان لوگوں سے ان کو منسوب کرنے میں کذب بیانی سے کام لیتا تھا جن کے بارے میں وہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ انہوں نے اس سے وہ حدیثیں بیان کی ہیں۔ جبکہ ان راویوں سے اس کی ملاقات ثابت نہیں ہے۔ اس کی اس کذب بیانی کی تفصیل امام ابوبکر عمرو بن ابی عاصم نے ”کتاب السنہ“ میں بیان کی ہے۔

”بصرہ میں ہمارے پاس ایک شیخ تھا جو کافی سن رسیدہ تھا۔ وہ صاحب خیر تھا اور غزوات میں بھی حصہ لے چکا تھا۔ اس کا نام نصر بن طاہر ابو الحجاج تھا۔ ہم نے اس کی روایت کردہ بہت ساری حدیثیں لکھی بھی تھیں جو اس نے ابوعوانہ، سلیمان اور دوسرے لوگوں سے روایت کی تھیں۔ پھر اس نے دلہم بن اسود کی طویل حدیث روایت کی، تو میں نے اس سے پوچھا: کیا دلہم سے تمہاری ملاقات ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ وہ عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم کے ہمراہ ہمارے پاس آیا تھا اور ایک جگہ اس نے قیام کیا۔ اس نے اس جگہ کا نام بھی بتایا۔ چنانچہ میں

[1] المعجم الأوسط: ص ٤٥٢، ج ٦، ح ٥٩٧١

نے دریافت کیا مگر مجھے کوئی ایسا نہیں ملا جس کو یہ یاد ہو کہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم بصرہ آیا تھا۔ حالانکہ عبدالرحمٰن کو جو شہرت حاصل تھی اگر وہ بصرہ آیا ہوتا تو لوگ اس کے بارے میں لکھتے۔ پھر اس کے بعد مجھے اس شیخ کی کذب بیانی معلوم ہوئی اور میں نے اس کو اس وقت بھی دیکھا جب اس کی بینائی چلی گئی تھی۔ وہ ولید بن مسلم اور دوسروں سے ایسی حدیثیں روایت کرتا رہا جو انہوں نے روایت نہیں کی تھیں۔ وہ روایت حدیث میں مسلسل کذب بیانی کرتا رہا''[۱]

البانی آگے لکھتے ہیں:

''ابن حبان پر نضر بن طاہر کی کذب بیانی مخفی رہی۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس کو کتاب الثقات[۲] میں شامل کیا اور لکھا ہے:

''بسا اوقات اس سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں اور وہم کا شکار بھی رہا ہے''

جب حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں نضر بن طاہر کے بارے میں امام ابن ابی عاصم کا مذکور بالا قول نقل کیا تو اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے:

''گویا ابن حبان کو ابن ابی عاصم کا یہ قول معلوم نہ ہو سکا۔''

محدث البانی مزید تحریر فرماتے ہیں:

''یہ حدیث بریدہ بن حصیب سے بھی مروی ہے جس کی روایت حافظ ابن عساکر نے ایک دوسرے طریق سے کی ہے: نضر بن طاہر سے روایت ہے، کہا: ہم کو حفص بن سلیمان نے علقمہ بن مرثد سے، انہوں نے سلیمان بن بریدہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کرتے ہوئے خبر دی......

''حفص بن سلیمان جس کا لقب قاری تھا بے حد ضعیف تھا۔ اگر نضر بن طاہر نے اس سے بھی یہ حدیث نہیں سنی تھی بلکہ اس کا سرقہ کیا تھا تو اس کے معنی ہیں کہ وہ ان لوگوں کو بھی نہیں جانتا تھا جن کی نسبت سے وہ حدیثوں کا سرقہ کرتا تھا''

''لیکن یہ حدیث اس مذکورہ سند کے سوا بھی ایک دوسری سند سے مروی ہے جس کی روایت کرنے والا محمد بن کثیر عبدی ہے۔ کہتا ہے:

ہم سے عبداللہ بن منہال نے سلیمان بن قسیم سے، انہوں نے سلیمان بن بریدہ سے، انہوں نے بریدہ بن حصیب سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا:

---

[۱] کتاب السنہ: ص ۲۸۹ [۲] الثقات: ص ۲۱٤، ج۹

اس دوسری سند کی تخریج امام بیہقی نے الدعوات[1] میں اور انہی کی سند سے حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق[2] میں اور حافظ ابن حجر نے المسلسلات[3] میں ایک دوسری سند سے محمد بن کثیر سے اس کی تخریج کی ہے۔

محدث البانی تحریر فرماتے ہیں:

''اس سند کا راوی عبد اللہ بن منہال، یا عبید اللہ بن منہال یا عبید بن منہال جو بھی نام ہو، اس کا مجھے کوئی ترجمہ نہیں ملا۔

رہا اس کا شیخ، سلیمان بن قسیم جس کو ابن یسیر کہا جاتا ہے، تو وہ تمام محدثین کے نزدیک ضعیف تھا۔ اس کے بارے میں امام ابن حبان کا قول ہے:

''وہ ثقہ راویوں سے معضل[4] روایتیں بیان کیا کرتا تھا۔[5]

(۲۱۳)......لَمَّا أَذْنَبَ آدَمُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الذَّنْبَ الَّذِيْ أَذْنَبَهُ، رَفَعَ رَأْسَهُ إِلَى الْعَرْشِ، فَقَالَ: أَسْأَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ إِلَّا غَفَرْتَ لِيْ، فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيْهِ: وَمَا مُحَمَّدٌ وَمَنْ مُحَمَّدٌ؟ فَقَالَ: تَبَارَكَ اسْمُكَ، لَمَّا خَلَقْتَنِيْ رَفَعْتُ رَأْسِيْ إِلَى عَرْشِكَ فَإِذَا فِيْهِ مَكْتُوْبٌ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، فَقُلْتُ: إِنَّهُ لَيْسَ أَحَدٌ أَعْظَمَ عِنْدَكَ قَدْرًا مِمَّنْ جَعَلْتَ اسْمَهُ مَعَ اسْمِكَ، فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيْهِ: يَا آدَمُ، إِنَّهُ آخِرُ النَّبِيِّيْنَ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ، وَإِنَّ أُمَّتَهُ آخِرُ الْأُمَمِ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ، وَلَوْلَاهُ مَا خَلَقْتُكَ۔

''جب آدم علیہ السلام نے وہ گناہ کر ڈالا جو گناہ انہوں نے کیا تو اپنا سر عرش کی جانب اٹھایا اور کہا: میں تجھ سے محمد کے حق کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے معاف کر دے۔ اللہ نے ان کو وحی فرمائی: محمد کیا ہے اور محمد کون ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا: با عظمت ہے تیرا نام! جب تو نے میری تخلیق فرمائی تو میں نے تیرے عرش کی جانب اپنا سر اٹھایا۔ اس پر لا الہ الا

---

[1] الدعوات: ص ۲۳۱ [2] تاریخ دمشق: ص ۶۴۰-۶۴۱، ج۲

[3] قلمی نسخه المسلسلات: ص ۱۱۳، ج۱

[4] جس حدیث کی سند سے مسلسل دو یا دو سے زیادہ راوی ساقط ہوں وہ معضل ہوتی ہے۔

[5] الضعیفه: ص ۹۲۵-۹۲۷، ج۱۳، ح ۶۴۱۱

اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ لکھا ہوا پایا۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ: تیرے نزدیک ان سے زیادہ کوئی اور عظیم المرتبت نہیں جن کے نام کو تو نے اپنے نام کے ساتھ شامل کیا ہے۔ تو اللہ نے ان کو وحی کی: اے آدم! وہ تیری ذریت میں پیدا کیے جانے والے نبیوں میں آخری نبی اور ان کی امت تیری اولاد میں آخری امت ہوگی۔ اگر وہ نہ ہوتے تو میں تجھے پیدا ہی نہ کرتا۔“

یہ روایت بھی باطل اور نبی معظم ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے۔ پہلی روایت جس کی تخریج امام حاکم نے مستدرک[1] میں اور انہی کے طریق سے امام بیہقی نے دلائل النبوہ[2] میں لَمَّا اقْتَرَفَ آدَمُ الْخَطِيْئَةَ...... کے الفاظ میں کی ہے اور اس روایت کی سند، جس کی تخریج طبرانی نے المعجم الصغیر[3] اور المعجم الاوسط[4] میں کی ہے، درج ذیل ہے:

ہم سے محمد بن داؤد بن داؤد بن اسلم صدفی مصری نے بیان کیا، کہا: ہم سے احمد بن سعید مدنی فہری نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبداللہ بن اسماعیل مدنی نے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے ان کے دادا سے اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

یہ روایت نقل کرنے کے بعد حافظ طبرانی نے لکھا ہے:

اس حدیث کو زید بن اسلم سے صرف ان کے بیٹے عبدالرحمٰن نے روایت کیا ہے اور زید کے بیٹے عبدالرحمٰن سے صرف عبداللہ بن اسماعیل مدنی نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صرف اسی سند سے مروی ہے اور اس کی روایت میں احمد بن سعید منفرد ہے۔

یہ سند انتہائی تاریک ہے: عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے نیچے کے تمام راوی غیر معروف ہیں جیسا کہ حافظ ھیثمی نے مجمع الزوائد[5] میں لکھا ہے کہ اس کی سند میں ایسے راوی شامل ہیں جن کو میں نہیں جانتا۔

اس طرح اس روایت کا سارا ”مدار“ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم پر ہے جس کے بارے میں امام بیہقی نے لکھا ہے کہ وہ اس کی روایت میں منفرد ہے اور اس پر حدیثیں گھڑنے اور بنانے کا الزام ہے۔ اس پر یہ الزام خود امام حاکم لگا چکے ہیں۔ اسی وجہ سے ائمہ حدیث نے مستدرک میں اس کے نقل اور پھر اس کو صحیح قرار دینے کی نکیر کی ہے اور امام حاکم کی جانب غلط بیانی اور تضاد کو منسوب کیا ہے۔

---

[1] مستدرك حاكم: ح ٤٢٨٦ — [2] دلائل النبوه: ص ٤٨٩، ج٥
[3] المعجم الصغير: ص ٨٢-٨٣ — [4] المعجم الأوسط: ص ٢٥٩، ج ٧، ح ٦٤٩٨
[5] مجمع الزوائد: ص ٢٥٣، ج٨

چنانچہ امام حاکم نے اپنی کتاب "المدخل الی معرفة الصحیح من السقیم" میں لکھا ہے: عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم نے اپنے باپ سے موضوع اور جھوٹی حدیثیں روایت کی ہیں اور فن حدیث کے ماہرین میں جو لوگ غور و فکر سے کام لیں گے ان پر بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ موضوع حدیثوں کی روایت کا سب سے بڑا ذمہ دار عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم ہے۔[1]

امام ابن الجوزی نے عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم کے ضعیف اور نا قابل اعتبار ہونے پر ائمہ حدیث کا اتفاق نقل کیا ہے۔[2]

اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب[3] میں اور امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے: امام احمد، ابن معین، ابن مدینی، ابوداؤد، نسائی، ابو حاتم اور تمام اہل مدینہ، عبد الرحمٰن مدنی اور ابن خزیمہ نے عبد الرحمٰن بن زید کو ضعیف اور نا قابل اعتبار قرار دیا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی ذات مقدس کو وسیلہ بنا کر دعا کے قائلین میں ایسے دیانتدار باحثین بھی ہیں جنہوں نے مذکورہ روایت کو باطل قرار دیا ہے۔ انہیں میں شیخ تقی الدین سبکی کی کتاب "السیف المسلول علی من سب الرسول" کے محقق ایاد احمد غوج بھی ہیں جنہوں نے مذکورہ کتاب کے حاشیہ پر اس زیر بحث روایت اور اس کی ہم مثل دوسری روایتوں کو باطل قرار دیا ہے۔[4]

میں نے اتنی تفصیل سے یہ بحث اس لیے کی ہے کہ تاکہ یہ واضح کرسکوں کہ صحیح اسلامی عقائد سے متصادم جتنی روایتیں اہل تصوف کی کتابوں اور ان کے حلقوں میں متداول اور زبان زد عام ہیں وہ سب جھوٹ کا پلندا ہیں۔

(۲۱۴)...... لَمَّا حَمَلَتْ حَرَّاءُ طَافَ بِهَا إِبْلِيْسُ۔ وَكَانَ لَا يَعِيْشُ لَهَا وَلَدٌ۔ فَقَالَ: سَمِّيْهِ عَبْدَ الْحَارِثِ، فَسَمَّتْهُ عَبْدَ الْحَارِثِ، فَعَاشَ، وَكَانَ ذٰلِكَ مِنْ وَحْيِ الشَّيْطَانِ وَأَمْرِهِ۔

"جب حوا امید سے ہوئیں تو ابلیس ان کے پاس آیا۔ درآنحالیکہ ان کا کوئی لڑکا زندہ نہیں رہتا تھا اور ان سے کہا: پیدا ہونے والے بچے کا نام عبد الحارث...... حارث کا بندہ...... رکھنا تو انہوں نے اس کا نام عبد الحارث رکھا اور وہ زندہ رہا۔ ایسا انہوں نے شیطان کے ایماء اور حکم سے کیا۔

---

[1] القاعدة الجليلة: ص ۸۹، الصارم المنكی: ص ۲۹ [2] الموضوعات ص ۶۲، ج ۲

[3] تهذيب التهذيب: ص ۱۶۱، ۱۶۲، ج۶، ص ۵۶۴، ج ۲، ترجمه ۴۸۶۸

[4] السيف المسلول...... ص ۴۷۷-۴۸۱

یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف اور متن کے اعتبار سے منکر اور خلاف واقعہ ہے۔ کیونکہ اس میں حضرت حوا آیت پر شیطان کی فرماں برداری کا الزام ہے۔ دراصل یہ اس ناپاک مہم کا ایک حصہ ہے جس کا مقصد ہر برائی کی جڑ حضرت حوا کو قرار دینا ہے۔ جس کا ثبوت یہودی لٹریچر اور اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کی کتابوں سے ملتا ہے۔ جن میں عورت کو معصیت کا آلہ کار اور گناہوں کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔

اس کی روایت امام ترمذی نے سنن [1] میں، امام حاکم نے مستدرک [2] میں، ابن بشران نے امالی [3] میں اور امام احمد نے مسند [4] میں عمر بن ابراہیم کے طریق سے کی ہے۔

قتادہ سے روایت ہے، وہ حسن سے روایت کرتے ہیں اور وہ سمرہ بن جندب سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

امام ترمذی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

یہ حدیث حسن غریب ہے جس کو ہم صرف عمر بن ابراہیم عن قتادہ کی حدیث کے طور پر جانتے ہیں۔

امام حاکم نے لکھا ہے:

اس کی سند صحیح ہے اور امام ذہبی نے ان کی تائید کی ہے۔

لیکن محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے حسن بصری کا سماع مختلف فیہ ہے۔ مزید یہ کہ حسن بصری ''مدلس'' تھے اور انہوں نے حضرت سمرہ بن جندب سے یہ حدیث سننے کی صراحت نہیں کی ہے۔ امام ذہبی نے ان کے ترجمہ میں لکھا ہے:

''حسن بصری روایت حدیث میں بہت زیادہ تدلیس سے کام لیتے تھے۔ اگر وہ یہ کہتے: ''فلاں سے روایت ہے'' تو ان کی روایت سے استدلال ضعیف تھا۔''

اور امام ابن عدی نے الکامل [5] میں اس کی دوسری علت یہ بتائی ہے کہ اس کی روایت میں عمر بن ابراہیم منفرد ہے اور لکھا ہے: قتادہ سے اس کی روایت کردہ حدیثوں میں ''اضطراب'' ہے۔ تاہم ضعیف ہونے کے باوجود اس کی روایت کردہ حدیث لکھی جاتی تھی''

---

[1] جامع ترمذی: ح ٣٠٧٧　[2] مستدرك حاكم: ح　[3] الامالی: ص ١٥٨، ج ٢

[4] مسند الإمام أحمد: ح ٢٠٣٧٨　[5] الكامل: ص ١٧٠١، ج ٣

محدث البانی آگے لکھتے ہیں:

اس حدیث کا ضعیف ہونا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ''فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا'' کی تفسیر میں پیش کیا جاتا ہے۔ جبکہ حضرت حسن بصری نے اس آیت کی جو تفسیر کی ہے وہ اس زیر بحث ضعیف حدیث میں مذکور تفسیر سے مختلف ہے۔ مذکورہ آیت کی تفسیر کے بارے میں ان کا قول ہے:

''یہ آدم کی ملت میں نہیں بلکہ دوسری ملتوں میں تھا''[1]

حافظ ابن کثیر مذکورہ آیت کی تفسیر کے ضمن میں اس زیر بحث روایت کا ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

حضرت حسن بصری کہا کرتے تھے کہ: وہ یہود و نصاریٰ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ ان کو اولاد عطا فرماتا تھا تو وہ ان کو یہودی اور نصرانی بنا دیتے تھے۔ حسن رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر صحیح سندوں کے ساتھ مروی ہے اور یہی بہترین تفسیر ہے۔ آیت کو اسی مفہوم پر محمول کرنا ہی اچھا ہے۔ اگر مذکورہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ''محفوظ'' ہوتی تو حسن بصری اس سے صرف نظر نہ کرتے۔

ابن کثیر مزید لکھتے ہیں:

مذکورہ روایت اور اس کے مماثل دوسرے آثار اہل کتاب کے آثار سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں اور اس مسئلے میں ہم حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر ہیں کہ مذکورہ آیت کے سیاق و سباق کی روشنی میں، مراد آدم و حوا علیہما السلام نہیں بلکہ ان کی ذریت کے مشرکین مراد ہیں۔[2]

حافظ ابن کثیر اور محدث البانی رحمہما اللہ نے اس زیر بحث روایت کی عدم صحت کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ اگرچہ گراں قدر ہے مگر ان کو اس سے زیادہ واضح اور دوٹوک طریقے سے اس روایت کی نکیر کرنی چاہیے تھی۔ اس لیے کہ اس میں حضرت حوا علیہا السلام کی طرف ابلیس لعین کی فرماں برداری اور صریح شرک کو منسوب کیا گیا ہے۔ کیونکہ عبد الحارث، عبد الرسول، عبد العزی اور عبد الکعبہ وغیرہ جیسے نام رکھنا شرک ہے۔ اس لیے کہ اس میں ''عبد'' کی اضافت غیر اللہ کی جانب کی گئی ہے جو صریح شرک ہے۔

مزید کہ مذکورہ آیت میں تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر مذکورہ روایت کو اس کی تفسیر قرار دیا جائے تو یہ لازم آئے گا کہ نعوذ باللہ آدم و حواء دونوں نے شرک کا ارتکاب کیا!!

---

[1] الضعیفہ: ص ۵۱٦، ۵۱۷، ج ۱، ح ۳۴۳

[2] تفسیر ابن کثیر ص ۷۴، ج ۲، معمولی تصرف کے ساتھ

مذکورہ آیت مبارکہ اپنے سابق و لاحق آیتوں کے ساتھ قرآن حکیم میں یوں آئی ہے:

﴿ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَاۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖۚ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىٕنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ○ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِیْمَاۤ اٰتٰىهُمَاۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ○ اَیُشْرِكُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ○ وَ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّ لَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ○ ﴾ [الاعراف:۱۸۹تا۱۹۲]

”وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک ہلکا سا حمل رہ گیا جسے لیے لیے وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ، اپنے رب سے دعا کی کہ اگر تو نے ہمیں اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزاروں میں سے ہوں گے۔ پس جب اللہ نے ان کو ایک صحیح و سالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی اس بخشش میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ بلند و برتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ کیا یہ لوگ ان کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ وہ نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد پر قادر ہیں“

ان آیات مبارکہ کے آغاز میں نسل انسانی کے پہلے جوڑے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ یعنی حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو دوسرے لفظوں میں پہلے نوع انسانی کی پیدائش ایک جان سے ہونے کا ذکر کیا گیا ہے جس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ پھر اسی جان یا اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنانے کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ آدم علیہ السلام اس سے سکون اور اس کے پاس راحت محسوس کریں۔ اس طرح پہلا فقرہ...... لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا...... پر مکمل ہوگیا۔

اس کے بعد نوع انسانی کے عام مردوں اور عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ: توالد و تناسل کا سلسلہ مرد و عورت کے ملاپ سے چلتا ہے۔ اور جس طرح اللہ تعالیٰ نوع انسانی کے پہلے فرد کا خالق تھا اسی طرح مرد و عورت کے ملاپ سے پیدا ہونے والوں کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ جس کا اقرار ہر انسان کسی مشکل میں پڑنے پر یا کسی احتیاج کے وقت کرتا ہے۔ لیکن جونہی وہ اس مشکل سے نجات پا جاتا ہے یا جب اس کی احتیاج پوری ہو جاتی ہے تو وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔

ان آیات میں قرآن کے اولین مخاطب مشرکین مکہ پیش نظر ہیں جو اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا خالق و مالک

مانتے تھے اور آفات و مصائب میں گھر جانے کے وقت اسی کو پکارتے تھے۔ لیکن جب ان پر انعام واکرام کی بارش ہوتی اور وہ مال واولاد سے نوازے جاتے تو اللہ کے ساتھ ان کو شریک ٹھہرانے لگتے جن کا نہ خلق میں کوئی حصہ ہے اور نہ وہ دوسروں کی کوئی مدد ہی کر سکتے ہیں بلکہ وہ خود اپنی مدد کرنے سے بھی عاجز ہیں۔

اصل دین توحید ہے:

توحید دین فطرت ہے اور اسلام اسی دین فطرت کا نام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًاؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ ﴾ [الروم:۳۰]

''اے نبی! ہر طرف سے منہ موڑ کر اپنا رخ ''الدین'' کی طرف کرلو۔ اللہ کے اس دین فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو مت بدلو۔ یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''

اس آیت مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ آپ کے متبعین کو تمام ادیان سے منہ موڑ کر جس دین کی طرف رخ کرنے اور یکسو ہونے کا حکم دیا گیا ہے وہ دین فطرت یعنی دین توحید ہے۔ جس کا دوسرا نام ہے اسلام ہے:

﴿ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُؕ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۝ ﴾ [آل عمران:۱۹]

''درحقیقت اللہ کے نزدیک مقبول دین صرف اسلام ہے۔ اور اہل کتاب نے تو اس میں علم حق آجانے کے بعد محض عناد اور سرکشی کی وجہ سے اختلاف کیا اور جو کوئی اللہ کی آیات کا انکار کرے گا تو اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو رسول بھی دنیا کے کسی گوشے اور کسی زمانے میں آیا ہے اس کا دین اسلام ہی تھا اور اس نے اپنی قوم کو اسی دین اسلام کی دعوت دی تھی۔ اس اصل دین کو مسخ کر کے اور اس میں کمی بیشی کر کے بہت سے ادیان اور مذاہب جو دنیا میں رائج کیے گئے تھے تو ان کے وجود کے اسباب سوائے راہ حق سے تجاوز اور انحراف کے کچھ نہ تھے۔

پھر اسی سورۂ آل عمران کی پچاسیویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے نہایت واشگاف الفاظ میں یہ اعلان

فرمادیا کہ اس کے ہاں اسلام کے سوا کوئی اور دین قابل قبول نہیں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِينَ ﴾ [آل عمران:۸۵]

''اور جو کوئی اسلام کے سوا علاوہ کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ آخرت میں وہ ناکام و نامرادوں میں سے ہوگا۔''

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تمام انبیاء کا دین اسلام تھا اور وہی اللہ کا پسندیدہ دین ہے۔ اس کے سوا کوئی دین قابل تسلیم اور قابل قبول نہیں۔

ہر بچہ دین اسلام پر پیدا ہوتا ہے:

قرآن میں اسلام کو دین فطرت کہا گیا ہے جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا۔ اور صحیح احادیث میں یہ صراحت ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور فطرت سے مراد توحید ہے۔ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی، خالق اور رب نہیں ہے۔ چونکہ دین توحید صرف اسلام ہے اس لیے معلوم ہوا کہ ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ وَيُنَصِّرَانِهِ كَمَا تُنْتِجُونَ الْبَهِيمَةَ، هَلْ تَجِدُونَ فِيهَا مِنْ جَدْعَاءَ حَتَّى تَكُونُوا أَنْتُمْ تَجْدَعُونَهَا))[1]

''ہر بچہ صرف فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے والدین اس کو یہودی اور نصرانی بنا دیتے ہیں۔ جیسا کہ تم جانور کی تولید کا کام کرتے ہو۔ تو کیا تم ان میں کوئی کان کٹا یا ناک کٹا پاتے ہو؟ بلکہ تم اس کو ناک کٹا یا کن کٹا بنا دیتے ہو''

اور سورۃ الروم کی تیسویں آیت کے فقرہ...... لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ...... کے تحت صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں جو حدیث آئی ہے، اس کے الفاظ ہیں:

((مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ وَيُنَصِّرَانِهِ، أَوْ يُمَجِّسَانِهِ، كَمَا تُنْتَجُ الْبَهِيمَةُ بَهِيمَةً جَمْعَاءَ، هَلْ تُحِسُّونَ فِيهَا مِنْ جَدْعَاءَ، ثُمَّ يَقُولُ: فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ

[1] صحيح بخاری ح ۶۵۹۹، صحيح مسلم ح ۶۷۶۰ (۲۶۵۸)

ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ))[1]

''ہر بچہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔ جس طرح جانور صحیح سالم جانور پیدا کیا جاتا ہے۔ کیا تم ان میں کوئی کان کٹا یا ناک کٹا محسوس کرتے ہو؟ پھر رسول اللہ ﷺ فرماتے: اتباع کرو اللہ کے اس دین فطرت کی جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی۔ یعنی اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو مت بدلو۔ یہی سیدھا دین ہے۔''

امام بخاری نے ''لِخَلْقِ اللّٰهِ'' کی تفسیر لِدِيْنِ اللّٰه اور الْفِطْرَةَ کی تفسیر الاسلام کی ہے اور یہی صحیح تفسیر ہے۔ اسی وجہ سے صحیح حدیث میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ''بچہ کے ماں باپ اس کو مسلمان بنا لیتے ہیں'' اس لیے کہ اس کے فطرت پر پیدا ہونے کا مطلب اس کا مسلمان پیدا ہونا ہے۔ لہٰذا اس کو مسلمان بنانا تحصیل حاصل ہے۔

حدیث میں فطرت پر پیدا ہونے والے کو صحیح سالم اور بے عیب پیدا ہونے والے جانور سے تشبیہ دی گئی ہے اور خود ساختہ مذاہب کے پیروؤں کو عیب دار جانور سے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ توحید فکر و عقیدہ کی صحت سے عبارت ہے۔ جبکہ شرک ایک بیماری ہے جو فکر و عقیدہ کو لاحق ہوتی ہے اور جس طرح انسان کا جسم بیمار ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح انسان کا ذہن اور اس کی فکر بھی بیمار ہوتی ہے۔

قرآنی آیات اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ توحید انسان کے اندرون اور اس کے دل کی آواز ہے جس کو آفاق و انفس میں پھیلی ہوئی ان بے شمار نشانیوں سے تقویت حاصل ہوتی ہے جو ایک قادر مطلق کے وجود پر دلالت کرتی ہیں۔ جبکہ شرک خارجی شے ہے جو باہر سے اثر انداز ہوتی ہے اور اس کو پیدا کرنے میں خارجی عوامل، ماحول اور معاشرے کے توہمات اور باپ دادا کے غلط افکار و عقائد کارفرما ہوتے ہیں۔ توحید کا عقیدہ ایک نہایت مضبوط اور ٹھوس بنیاد پر قائم ہے جبکہ شرک بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ٥ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ط وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ٥ وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ

[1] صحیح بخاری: ح ٤٧٧٥۔ صحیح مسلم ٦٧٥٥ (٢٦٥٨)

فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍo ﴾ [ابراهيم:٢٤ تا ٢٦]

''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے کس طرح مثال بیان کی ہے کلمہ طیبہ کی کہ وہ ایک بہترین درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری جمی ہوئی ہیں اور اس کی شاخیں آسمان میں بلند ہیں۔ وہ ہر آن اپنے رب کے حکم سے اپنا پھل دے رہا ہے۔ اللہ یہ مثالیں لوگوں کے لیے اس لیے بیان کرتا ہے تا کہ لوگ یاد دہانی حاصل کریں۔ اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بدذات درخت جیسی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے، اس کو کوئی استحکام حاصل نہیں ہے''

اسی وجہ سے جب انسان آفات و مصائب میں گھر جاتا ہے اور اس کو نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ اپنے تمام باطل معبودوں کو بھول جاتا ہے اور اللہ وحدہ لاشریک کی جانب دست دعا دراز کر دیتا ہے۔

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَo ﴾ [يونس:٢٢]

''وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر بادموافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور یکا یک طوفانی ہوا کا جھونکا آتا ہے اور موجوں کے تھپیڑے لگنے لگتے ہیں۔ تو مسافر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ طوفان میں گھر گئے ہیں تو اس وقت وہ اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگنے لگتے ہیں کہ: (اے اللہ!) اگر تو نے ہمیں اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے''

مشرکین کے نابالغ بچوں کا انجام:

مشرکین کے وفات پا جانے والے نابالغ بچوں سے متعلق احادیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس مسئلے میں کوئی حتمی اور یقینی علم نہیں دیا تھا۔ اس لیے صحابہ کرام کے سوالوں کے جواب میں آپ اس کو اللہ تعالیٰ کے علم پر موقوف قرار دے دیتے تھے۔ پھر رسول اکرم ﷺ نے کچھ ایسے ارشادات فرمائے جن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ مشرکین کے وفات پا جانے والے نابالغ بچے جنت میں جائیں گے۔ آخر میں نبی مکرم ﷺ نے ایسی تصریح فرما دی جس سے ان

کے جنت میں جانے کا پہلو راجح معلوم ہوتا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ صحیح بخاری میں اس سے متعلق حدیثیں اس ترتیب سے لائے ہیں کہ ان سے اس مسئلے میں توقف، پھر ان کے جنت میں جانے کا غالب گمان اور آخر میں کسی حد تک یقین حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ "باب ما قیل فی اولاد المشرکین" کے تحت حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی جو دو حدیثیں نقل کی ہیں ان کے الفاظ بالترتیب یہ ہیں:

((سُئِلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ، فَقَالَ: اللّٰهُ إِذْ خَلَقَهُمْ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوا عَامِلِينَ))[1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کے بچوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: اللہ نے جب ان کو پیدا کیا تو اس کو یہ علم تھا کہ وہ کونسا علم کریں گے"

((سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذَرَارِيِّ الْمُشْرِكِينَ، فَقَالَ: اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوا عَامِلِينَ))[2]

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کی ذریت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: اللہ کو ان کے اعمال کا علم ہے"

اس باب کے تحت تیسری حدیث وہی ہے جس میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے اور اس کے ماں باپ اس کو یہودی، یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں جس طرح جانور، جانور ہی پیدا ہوتا ہے، کیا تم ان میں کوئی بچہ ناک کٹا یا کان کٹا پاتے ہو؟[3]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد: ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جب ہر بچہ فطرت یعنی توحید پر پیدا ہوتا ہے تو بلوغت کی عمر کو پہنچنے سے قبل مر جانے کی صورت میں اس کو جنت میں جانا چاہیے۔

اور آخر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک طویل خواب میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جنت میں ایسی حالت میں دیکھنے کا ذکر فرمایا ہے کہ ان کے گرد ایسے تمام بچے تھے جو فطرت کی حالت میں مرے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں "باب تعبیر الرؤیا بعد صلاة الصبح" کے تحت جو طویل حدیث آئی ہے اس کے آخر میں ہے:

---

[1] صحیح بخاری: ح ۱۳۸۳۔ صحیح مسلم: ح ٦٧٦٦ (٢٦٦٠)

[2] صحیح بخاری: ح ۱۳۸٤۔ صحیح مسلم: ٦٧٦٢ (٢٦٥٩)

[3] صحیح بخاری: ح ۱۳۸۵۔ صحیح مسلم: ٦٧٥٥ (٢٦٥٨)

((وَأَمَّا الرَّجُلُ الطَّوِيلُ الَّذِي فِي الرَّوْضَةِ فَإِنَّهُ إِبْرَاهِيمُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَمَّا الْوِلْدَانُ الَّذِينَ حَوْلَهُ فَكُلُّ مَوْلُودٍ مَاتَ عَلَى الْفِطْرَةِ، قَالَ: فَقَالَ بَعْضُ الْمُسْلِمِينَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، وَأَوْلَادُ الْمُشْرِكِينَ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَأَوْلَادُ الْمُشْرِكِينَ))[1]

"رہے وہ طویل شخص جو باغ میں تھے تو وہ ابراہیم علیہ السلام تھے۔ اور ان کے گرد جو بچے تھے تو وہ سب نومولود تھے جن کی وفات فطرت پر ہوئی ہے۔ راوی حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: مسلمانوں میں سے ایک صاحب نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اور مشرکین کے بچے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مشرکین کے بچے بھی۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں ابوالانبیاء اور ابوالمسلمین حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جنت میں ایک درخت کے نیچے بے شمار نومولود بچوں کے ساتھ دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں حضرت جبریل و میکائیل علیہما السلام نے بتایا کہ "یہ وہ بچے ہیں جو فطرت پر مرے ہیں" یہاں ایک صحابی نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: کیا ان بچوں میں مشرکین کے بچے بھی تھے؟ آپ نے فرمایا: اور مشرکین کے بچے۔ یعنی ان میں مشرکین کے بچے بھی تھے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

مشرکین کے نابالغ بچوں کے انجام کے مسئلے میں تین فریق ہیں:

اکثریت کی رائے ہے کہ وہ اپنے باپوں کے ساتھ جہنم میں جائیں گے۔ دوسرے فریق نے اس مسئلے میں توقف کا مسلہ اختیار کیا ہے اور تیسرا مسلک جس کو اہل تحقیق نے اختیار کیا ہے اور وہی صحیح ہے کہ مشرکین کے بچے جنت میں جائیں گے۔ جس کی دلیلوں میں سے ایک دلیل وہ حدیث ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جنت میں ابراہیم خلیل صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کا ذکر ہے جن کے گرد لوگوں کے نابالغ بچے تھے۔ اور دوسری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا ۝ ﴾ [الاسراء:۱۵]

[1] صحیح بخاری: ح ۷۰۴۷

''اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں تا آنکہ ایک رسول نہ بھیج دیں''

اور نومولود پر عمل کی پابندی نہیں ہے بلکہ اس پر رسول اللہ ﷺ کا یہ قول منطبق ہے: بچہ غیر مکلف ہے یہاں تک کہ بالغ ہو جائے۔[1]

(۲۱۵)......أَوْحَى اللّٰهُ تَعَالَى إِلَى آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: أَنْ يَا آدَمُ! حُجَّ هٰذَا الْبَيْتَ قَبْلَ أَنْ يَحْدُثَ بِكَ حَدَثُ الْمَوْتِ۔ قَالَ: وَمَا يُحْدَثُ عَلَيَّ يَا رَبِّيْ؟ قَالَ: مَا لَا تَدْرِيْ، وَهُوَ الْمَوْتُ، قَالَ: وَمَا الْمَوْتُ؟ قَالَ: سَوْفَ تَذُوْقُهُ۔ قَالَ: مَنْ أَسْتَخْلِفُ فِيْ أَهْلِيْ؟ قَالَ: أَعْرِضْ ذٰلِكَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ، فَعَرَضَ عَلَى السَّمٰوَاتِ فَأَبَتْ، وَعَرَضَ عَلَى الْأَرْضِ فَأَبَتْ وَعَرَضَ عَلَى الْجِبَالِ فَأَبَتْ، وَقَبِلَهُ ابْنُهُ قَاتِلُ اَخِيْهِ، فَخَرَجَ آدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ أَرْضِ الْهِنْدِ حَاجًّا، فَمَا نَزَلَ مَنْزِلًا أَكَلَ فِيْهِ وَشَرِبَ إِلَّا صَارَ عُمْرَانًا بَعْدَهُ وَقُرًى، حَتّٰى قَدِمَ مَكَّةَ، فَاسْتَقْبَلَتْهُ الْمَلَائِكَةُ بِالْبَطْحَاءِ، فَقَالُوْا: السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا آدَمُ! بُرَّحَجُّكَ، أَمَا إِنَّا قَدْ حَجَجْنَا هٰذَا الْبَيْتَ قَبْلَكَ بِأَلْفَي عَامٍ۔

قَالَ أَنَسٌ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَالْبَيْتُ يَوْمَئِذٍ يَا قُوْتَةٌ حَمْرَاءُ جَوْفَاءُ، لَهَا بَابَانِ، مَنْ يَطُوْفُ يَرَى مَنْ فِيْ جَوْفِ الْبَيْتِ وَمَنْ فِيْ جَوْفِ الْبَيْتِ يَرَى مَنْ يَطُوْفُ، فَقَضَى آدَمُ نُسُكَهُ، فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيْهِ: يَا آدَمُ! قَضَيْتَ نُسُكَكَ؟ قَالَ: نَعَمْ يَارَبِّ، قَالَ: فَسَلْ حَاجَتَكَ تُعْطَ۔ قَالَ: حَاجَتِيْ أَنْ تَغْفِرَلِيْ ذَنْبِيْ وَذَنْبَ وَلَدِيْ۔ قَالَ: أَمَّا ذَنْبُكَ يَا آدَمُ! فَقَدْ غَفَرْنَاهُ حِيْنَ وَقَعْتَ بِذَنْبِكَ، وَأَمَّا ذَنْبُ وَلَدِكَ، فَمَنْ عَرَفَنِيْ، وَآمَنَ بِيْ، وَصَدَّقَ رُسُلِيْ وَكِتَابِيْ، غَفَرْنَا لَهُ ذَنْبَهُ۔

''اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو وحی فرمائی: اے آدم! تم اس گھر کا حج کرو قبل اس کے کہ تمہارے ساتھ موت کا واقعہ پیش آئے۔ انہوں نے عرض کیا: اے میرے رب! میرے ساتھ

[1] المنہاج: ص ۱۵۷٤

کیا واقعہ پیش آئے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جسے تم نہیں جانتے ہو، وہ موت ہے۔ آدم نے عرض کیا موت کیا ہے؟ فرمایا: عنقریب تم اس کا مزہ چکھو گے۔ عرض کیا: میں اپنے اہل میں کس کو اپنا خلیفہ بناؤں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کرو۔ تو انہوں نے آسمانوں پر خلافت کا مسئلہ پیش کیا۔ انہوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے زمین پر پیش کیا۔ اس نے بھی انکار کر دیا اور انہوں نے پہاڑوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ انہوں نے بھی یہ ذمہ داری قبول نہیں کی اور ان کے بیٹے، اپنے بھائی کے قاتل نے خلافت کا منصب قبول کر لیا۔ اس کے بعد آدم علیہ السلام حج کے ارادے سے، ہندوستان کی سرزمین سے نکلے، وہ جہاں بھی قیام کرتے اور وہاں کھاتے پیتے وہاں ان کے بعد آبادی اور گاؤں بن جاتا۔ یہاں تک کہ وہ مکہ پہنچے اور فرشتوں سے بطحاء میں ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان سے کہا: اے آدم آپ پر سلامتی نازل ہو اور آپ کا حج قبول ہو۔ ہم نے آپ سے دو ہزار سال پہلے اس گھر کا حج کیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس وقت بیت اللہ سرخ کھوکھلے یاقوت سے بنا ہوا تھا۔ اس کے دو دروازے تھے۔ جو طواف کرتا وہ بیت اللہ کے اندر کے لوگوں کو دیکھتا اور جو اس کے اندر ہوتا وہ طواف کرنے والے کو دیکھتا۔ جب آدم نے حج کے اعمال پورے کر لیے تو اللہ نے ان کو وحی فرمائی: اے آدم! کیا تم نے اپنے مناسک ادا کر لیے؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں اے میرے رب! اللہ نے فرمایا: اپنی حاجت مانگو وہ تمہیں عطا کی جائے گی۔ آدم نے عرض کیا: میری حاجت یہ ہے کہ آپ میرے گناہوں اور میری اولاد کے گناہوں کو بخش دیں۔ اللہ نے فرمایا: تمہارے گناہ تو ہم اسی وقت معاف کر چکے ہیں جب وہ تم سے سرزد ہوا تھا۔ رہے تمہاری اولاد کے گناہ، تو جو مجھے پہچانے گا، میرے اوپر ایمان لائے گا اور میرے رسولوں اور میری کتابوں کی تصدیق کرے گا ہم اس کے گناہوں کو بخش دیں گے۔"

یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج اصبہانی نے ترغیب و ترہیب[1] میں عمران بن عبدالرحیم کے طریق سے کی ہے:

---

[1] ترغیب و ترہیب: ص ۴۳۴۔۴۳۵، ج ۱

ہم کو عبد السلام بن مطہر نے خبر دی، کہا: ہم کو ابو ہرمز نے انس بن مالک سے روایت کرتے ہوئے خبر دی۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ابو ہرمز جس کا نام نافع ہے اس کو امام یحییٰ بن معین نے کذاب اور حافظ ھیثمی نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔ امام نسائی کا قول ہے کہ وہ ثقہ نہیں تھا۔ اور امام ابن حبان الضعفاء والمتروکین[1] میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

وہ حضرت انس سے ایسی حدیثیں روایت کیا کرتا تھا جو ان کی نہیں بلکہ کسی دوسرے انس کی ہیں۔

اسی طرح عمران بن عبد الرحیم کی ثقاہت بھی محل نظر ہے جس نے امام مالک سے امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کی حدیث وضع کی ہے۔[2]

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے شہر مکہ نہیں تھا:

اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پہلو نٹے بیٹے حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ علیہما السلام کو جب بیت اللہ کے پاس لاکر چھوڑا تھا اس وقت وہاں نہ تو کوئی آبادی تھی اور نہ پانی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو وہاں چھوڑ کر واپس پلٹے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی:

﴿ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا آمِنًا ﴾ [البقرۃ:۱۲۶] ”اے میرے رب تو اس جگہ کو ایک پر امن شہر بنا دے“

یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دو چیزوں کی درخواست کی۔ ایک تو یہ کہ اس بے آب و گیاہ وادی کو شہر بنا دے دوم یہ کہ وہ پر امن ہو۔

اور جب وہ وادی غیر ذی زرع ایک چھوٹی سی بستی میں تبدیل ہوگئی تو حضرت ابراہیم نے دوبارہ یہی دعا کی۔ مگر ”بلدًا“ کے بجائے ”البلد“ کہا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا ﴾ [ابراهیم:۳۵]

”اے میرے رب تو اس شہر کو پر امن شہر بنا دے“

---

[1] الضعیفہ: ص ۵۸، ج ۲ [2] الضعیفہ: ص ۶۲۸۔۶۳۹، ج ۱، ص ۲۶۹، ۲۷۰، ج ۱۱

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس اعلیٰ اور پاکیزہ مقصد کے لیے اپنی بیوی اور بچے کو اللہ تعالیٰ کے محترم گھر کے پاس لاکر آباد کیا تھا اس کا تقاضا تھا کہ وہ وہاں برابر آتے رہیں اور ان کی خبرگیری کرتے رہیں۔ اس طرح یہ دوسری دعا انہوں نے اس وقت مانگی جب وہاں زمزم کا چشمہ پھوٹ پڑا اور قبیلہ جرہم کے لوگ وہاں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ساتھ آباد ہو گئے تھے اور وہ سنسان وادی ایک بستی بن چکی تھی۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو طویل حدیث مروی ہے، اس میں بھی یہ صراحت ہے کہ اس وقت وہاں مکہ میں نہ کوئی فرد بشر تھا اور نہ پانی۔ اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور بچے کو وہاں چھوڑ کر واپس ہوئے تو حضرت ہاجرہ ان کے پیچھے چلیں اور کہا:

((يَا إِبْرَاهِيمُ! أَيْنَ تَذْهَبُ وَتَتْرُكُنَا بِهَذَا الْوَادِي الَّذِي لَيْسَ فِيهِ إِنْسٌ وَلَا شَيْءٌ، فَقَالَتْ لَهُ ذَلِكَ مِرَارًا وَجَعَلَ لَا يَلْتَفِتُ إِلَيْهَا، فَقَالَتْ لَهُ: آللَّهُ الَّذِي أَمَرَكَ بِهَذَا؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَتْ إِذَنْ لَا يُضَيِّعُنَا، ثُمَّ رَجَعَتْ))[1]

''ابراہیم! ہمیں اس وادی میں چھوڑ کر جہاں نہ کوئی انسان ہے اور نہ کوئی اور ہی چیز، کہاں جارہے ہیں۔ انہوں نے ان سے یہ بات کئی بار کہی اور وہ ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ پھر حضرت ہاجرہ نے ان سے کہا: کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: ہاں۔ اس پر وہ بولیں: تب تو وہ ہمیں ضائع نہ فرمائے گا اور واپس چلی گئیں۔''

ابوالولید ازرقی نے تاریخ مکہ میں جو یہ لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مکہ میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو آباد کرنے سے پہلے وہاں عمالقہ آباد تھے تو وہ اپنی سند اور متن دونوں اعتبار سے غلط ہونے کے ساتھ قرآنی آیات اور صحیح احادیث کے خلاف ہے۔[2]

اور جس صحیح حدیث[3] میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہر مکہ کو اسی دن حرام قرار دے دیا تھا جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی تھی تو اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت زمین بنائی تھی اس وقت حدود حرم کا تعین بھی فرما دیا تھا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے اسی فیصلے کا اعلان فرمایا تھا نہ یہ کہ اس وقت مکہ آباد بھی تھا۔

---

[1] صحیح بخاری: ۳۳٦٤ [2] دیکھیے: تاریخ مکہ: ص ۵۱۳، ج۲

[3] صحیح بخاری: ح ۱۸۳۲، ٤۲۹۵۔ صحیح مسلم ۳۳۰۲، ۱۳۵۳

بیت اللہ کے بانی اول حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں:

بیت اللہ کی سب سے پہلی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اگر چہ اس کی جگہ اور اس کے حدود اربعہ کی تعیین اللہ تعالیٰ نے اسی دن فرمادی تھی جس دن آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی تھی اور ساتھ ہی شہر مکہ کو حرام بھی قرار دے دیا تھا۔ البتہ مکہ کو مادی وجود اس وقت ملا جب حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ علیہما السلام کو وہاں بسایا گیا، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْـًٔا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ وَ الْقَآىِٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ [الحج:۲۶]

''اے نبی یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے ابراہیم کے لیے ''البیت'' کی جگہ کی رہنمائی کی تھی۔ اس حکم کے ساتھ کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام، رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھنا۔''

اور اللہ تعالیٰ کے اس گھر کی تعمیر ٹھیک اسی جگہ کی جس جگہ کا تعین اللہ تعالیٰ نے فرمادیا تھا۔

قرآن پاک میں یہ صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے جس گھر کو سب سے پہلے تعمیر کیا گیا وہ یہی بیت اللہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ [آل عمران:۹۶]

''درحقیقت وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بغرض عبادت تعمیر کیا گیا وہ ہے جو مکہ [1] میں ہے یہ گھر مبارک ہے اور لوگوں کے لیے مرکز ہدایت ہے''

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی بہترین تفسیر رسول اکرم ﷺ کا وہ ارشاد مبارک ہے جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((قُلْتُ یَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَيُّ مَسْجِدٍ وُضِعَ فِي الْأَرْضِ أَوَّلَ؟ قَالَ: الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ، قَالَ: قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: الْمَسْجِدُ الْأَقْصَى قُلْتُ: كَمْ كَانَ بَيْنَهُمَا؟ قَالَ: أَرْبَعُونَ سَنَةً))

[1] مکہ وہ خاص جگہ ہے جس میں بیت اللہ واقع ہے۔ یہ لفظ بَكَّ يَبُكُّ سے بنا ہے۔ جس کے معنی گردن توڑ دینے کے ہیں۔ یعنی جو شخص اس گھر کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا اس کی گردن توڑ دی جائے گی۔

''میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! زمین میں پہلی کون سی مسجد تعمیر کی گئی تھی؟ فرمایا: مسجد حرام۔ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: پھر کون سی؟ فرمایا: مسجد اقصیٰ۔ میں نے دریافت کیا: ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ فرمایا: چالیس سال''[1]

قرآنی آیات کی روشنی میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ ''بیت اللہ'' کے بانی اول حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ لہٰذا صحیحین کی اس حدیث میں زمین میں جس پہلی مسجد کی تعمیر کا ذکر آیا ہے وہ یہی بیت اللہ ہے۔ چونکہ بیت اللہ کی سب سے پہلی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی تو حدیث پاک میں مذکور پہلی مسجد کے بانی بھی وہی ہوئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے سلسلہ کلام کی روشنی میں یہ بات بھی متعین ہو جاتی ہے کہ مسجد اقصیٰ کی تعمیر بھی انہوں نے ہی فرمائی۔

رہی حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر کی۔ تو ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں یہ صراحت نہیں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کے بانی اول ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

((أَنَّ سُلَيْمَانَ بْنَ دَاوُدَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، لَمَّا بَنَى بَيْتَ الْمَقْدِسِ سَأَلَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ خِلَالًا ثَلَاثَةً......))[2]

''سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے جب بیت المقدس کی تعمیر کی تو اللہ عز وجل سے تین چیزوں کی درخواست کی''

تو اس حدیث سے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کے وقت اللہ تعالیٰ سے کچھ چیزوں کی درخواست کی تھی۔ مگر اس کے انداز بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سب سے پہلے مسجد اقصیٰ کی تعمیر انہی کے ہاتھوں سے ہوئی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیت اللہ کے بانی اول ہونے کی ایک اور دلیل فریضہ حج ہے جو بیت اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ حج کی منادی اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ کے بعد ہی کی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب ابراہیم علیہ السلام کو اپنے گھر کی جگہ رہنمائی فرمائی اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ اس کی تعمیر کے بعد اس کو طواف کرنے والوں، قیام، رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے شرک کی ہر آلائش

---

[1] صحیح بخاری: ۳۳۶۶۔ صحیح مسلم: ۱۶۱۱۔ ۵۲۰۔ نسائی ۶۸۹۔ ابن ماجہ: ۷۵۳

[2] سنن نسائی: ۶۹۲۔ ابن ماجہ: ۱۴۰۸

اور گندگی سے پاک رکھیں تو اس کے معاً بعد ان کو یہ حکم بھی دیا تھا:

﴿ وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۝﴾ [الحج:۲۷]

''اور لوگوں میں حج کا اعلان عام کر دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور دبلی پتلی اونٹنیوں پر سوار ہو کر آئیں''

اور قربانی جو حج کا ایک اہم رکن ہے اس ''ذبح عظیم'' کی یادگار ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے پہلوٹے اور بردبار بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کے لیے دیا تھا۔

مزید یہ کہ کوئی بھی صحیح مرفوع حدیث ایسی نہیں ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کسی اور نبی کے ہاتھوں بیت اللہ کی تعمیر کا ذکر آیا ہو حافظ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی کسی صحیح حدیث میں یہ نہیں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے بیت اللہ تعمیر شدہ تھا اور جس نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''مَكَانَ الْبَیْتِ'' سے استدلال کیا ہے تو یہ استدلال نہ صحیح ہے اور نہ اس سے یہ مفہوم ظاہر ہی ہوتا ہے۔ بلکہ اللہ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس کی جگہ اللہ کے علم میں مقدر ہے۔ نہ یہ کہ بیت اللہ تعمیر شدہ تھا اور اس کے گھر کی جگہ آدم علیہ السلام سے لے کر ابراہیم علیہ السلام کے زمانے تک قابل تعظیم رہی ہے۔ ہم نے اس کتاب میں یہ ذکر کیا ہے کہ آدم نے بیت اللہ پر قبہ نصب کیا اور فرشتوں نے ان سے کہا کہ ہم تم سے پہلے اس گھر کا طواف کر چکے ہیں اور سفینہ نوح نے چالیس دن یا اس سے لگ بھگ اس کا طواف کیا۔ لیکن یہ تمام خبریں بنو اسرائیل سے منقول ہیں۔ ہمارا اصول یہ رہا ہے کہ ان اسرائیلی خبروں کی نہ تصدیق کی جائے نہ تکذیب۔ لہٰذا یہ قابل استدلال نہیں ہیں۔ بلکہ خود قرآنی صراحت کی روشنی میں مردود ہیں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ [آل عمران:۹۶]

''یعنی درحقیقت جو پہلا گھر تمام لوگوں کے لیے برکت اور ہدایت کی غرض سے تعمیر کیا گیا وہی گھر ہے جو بکہ میں ہے۔ یہ گھر مبارک ہے اور لوگوں کے لیے مرکز ہدایت ہے''

اور ایک قول یہ ہے کہ کعبہ کی جگہ مکہ ہے۔ جس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کعبہ خلیل اللہ، اپنے بعد آنے والے نبیوں کے باپ، اپنی اولاد میں ''دین حنیف'' پر چلنے والوں، اپنی اقتدا کرنے

والوں اور اپنے طریقے پر چلنے والوں کے امام کا تعمیر کردہ ہے۔[1]

حجر اسود:

حجر اسود کو بوسہ دینا یا ہاتھ سے اس کو چھونا یا چھڑی سے اس کو چھو کر چھڑی کو چومنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ لیکن یہ عمل صرف طواف کے موقع پر ''مشروع'' ہے۔ حج یا عمرے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ طواف کرنے والے کے لیے یہ عمل صرف اس صورت میں ''سنت'' ہے جبکہ وہ حجر اسود تک پہنچنے کے لیے کسی کو اذیت نہ دے، کسی کو دھکا نہ دے اور کسی سے مزاحم نہ ہو۔ ورنہ یہ عمل سنت کی بجائے معصیت بن جائے گا۔ کیونکہ اسلام میں کسی کو اذیت دینا حرام ہے۔

ذیل میں پہلے ایسی چند صحیح احادیث نقل کی جارہی ہیں جن سے بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے حجر اسود کو بوسہ دینے کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس کے فضائل کے بارے میں چند صحیح احادیث نقل کروں گا۔

حجر اسود کو بوسہ دینا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((اَنَّهُ جَاءَ اِلَى الْحَجَرِ الْاَسْوَدِ، فَقَبَّلَهُ، فَقَالَ: اِنِّيْ اَعْلَمُ اَنَّكَ حَجَرٌ، لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ، وَلَوْلَا اَنِّيْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَبِّلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ))[2]

''وہ حجر اسود کے پاس آئے اور اس کو بوسہ دیا۔ پھر فرمایا: مجھے معلوم ہے کہ تم ایک پتھر ہو۔ نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہو اور نہ فائدہ۔ اگر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو تجھے بوسہ نہ دیتا''

اس حدیث سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دینا سنت ہے وہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس سے نفع و نقصان کا عقیدہ رکھنا صحیح نہیں ہے۔

حضرت ابوطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

---

[1] البدایہ والنہایہ: ص ۱۸۹۔۱۹۰، ج ۱

[2] صحیح بخاری: ح ۱۵۹۷۔ صحیح مسلم: ج ۱۲۷۰

((رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَطُوْفُ بِالْبَیْتِ وَیَسْتَلِمُ الرُّکْنَ بِمِحْجَنٍ مَعَهُ، وَیُقَبِّلُ الْمِحْجَنَ))[۱]

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ بیت اللہ کا طواف کررہے ہیں اور اپنی چھڑی سے رکن حجر اسود کو چھوتے ہیں اور چھڑی کو چومتے ہیں''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((نَزَلَ الْحَجَرُ الْاَسْوَدُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَهُوَ اَشَدُّ بَیَاضًا مِنَ اللَّبَنِ، فَسَوَّدَتْهُ خَطَایَا بَنِیْ آدَمَ))[۲]

''حجر اسود اس حال میں جنت سے نازل ہوا تھا کہ وہ دودھ سے زیادہ سفید تھا، مگر بنی آدم کے گناہوں نے اس کو سیاہ بنا دیا''

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((اِنَّ الرُّکْنَ وَالْمَقَامَ یَاقُوْتَتَانِ مِنْ یَاقُوْتِ الْجَنَّةِ، طَمَسَ اللّٰهُ نُوْرَهُمَا، وَلَوْلَمْ یَطْمِسْ نُوْرَهُمَا، لَأَضَاءَ تَا مَا بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ))[۳]

''رکن اور مقام...... حجر اسود اور مقام ابراہیم...... جنت کے موتیوں میں سے دو موتی ہیں جن کی روشنی اللہ نے زائل کر دی ہے۔ اگر اس نے ان کی روشنی زائل نہ کی ہوتی تو وہ مشرق و مغرب کے درمیان روشنی پھیلا دیتے''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ نے حجر اسود کے بارے میں فرمایا ہے:

((وَاللّٰهِ لَیَبْعَثَنَّهُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ، لَهُ عَیْنَانِ یُبْصِرُ بِهِمَا وَلِسَانٌ یَنْطِقُ بِهٖ یَشْهَدُ عَلٰی مَنِ اسْتَلَمَهُ بِحَقٍّ))[۴]

''اللہ کی قسم، قیامت کے دن اللہ اس کو اس حال میں ضرور اٹھائے گا کہ اس کی دو آنکھیں ہوں

---

[۱] صحیح مسلم: ح ۱۲۷۵
[۲] جامع ترمذی: ح ۸۷۷
[۳] جامع ترمذی: ح ۸۷۸
[۴] جامع ترمذی: ح ۹۶۱۔ صحیح ابن خزیمہ: ح ۲۷۳۵

سے کی ہے:

مجھ سے مہدی بن ابی مہدی، محمد بن ابی معدی نے بیان کیا، کہا: مجھ سے حکم بن ابان نے بیان کیا، کہا: مجھ سے میرے والد نے عکرمہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔

اس سند کا راوی حکم بن ابان حافظہ کے اعتبار سے ضعیف اور وہم کا بھی شکار تھا[1]۔ اس طرح سند کے اعتبار سے تو یہ روایت صرف ضعیف ہے، لیکن اپنے متن کے اعتبار سے باطل ہے، کیونکہ اس میں حجر اسود کو چھونے اور اس پر ہاتھ پھیرنے والے کو رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرنے والے کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرنے والے کو شرف صحابیت حاصل ہوتا تھا۔

اوپر جو موضوع اور منکر روایات نقل کی گئی ہیں اس طرح کی نہ جانے کتنی روایات تاریخ اور فضائل کی کتابوں میں منقول ہوئی ہیں جن کی صحت و سقم پر کوئی حکم نہیں لگایا گیا۔ اس کی وجہ سے عام قاری ان کو صحیح احادیث سمجھ کر حجر اسود کے بارے میں وہی عقائد رکھتے ہیں جو ان میں بیان ہوئے ہیں۔

(۲۲۱)......لَقَدْ مَرَّ بِهٰذَا نُوْحٌ وَّهُوْدٌ وَّاِبْرَاهِيْمُ عَلٰى بُكْرَانَ لَهُمْ حُمْرٍ خُطُمُهُمُ اللِّيْفُ أَزُرُهُمُ الْعَبَاءُ وَاَرْدِيَتُهُمُ النِّمَارُ، يَحُجُّونَ الْبَيْتَ الْعَتِيْقَ۔

''اس جگہ سے نوح، ہود اور ابراہیم علیہم السلام اپنے جوان سرخ اونٹوں پر گزرے تھے جن کی لگامیں کھجور کے درختوں کی چھالوں کی تھیں۔ ان کا لباس چوغہ اور ان کی چادریں سیاہ و سفید دھاریوں والی تھیں۔ اور وہ بیت عتیق کا حج کر رہے تھے''

حافظ ابن کثیر نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: فِيْهِ غَرَابَةٌ...... اس میں غرابت ہے۔[2] یعنی اس میں ضعف ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حج کیا اور جب وادی عسفان میں پہنچے تو فرمایا: ابوبکر! یہ کون سی وادی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: یہ عسفان کی وادی ہے۔ اس پر آپ

---

[1] تقریب التہذیب: ص ۱۱۳، ترجمہ: ۱۴۳۸

[2] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۸، ج ۱...... غریب اس حدیث کو کہتے ہیں جو صرف کسی ایک فرد سے مروی ہو۔ چاہے سند کے تمام طبقوں میں اس کا راوی ایک رہا ہو۔ یا کسی ایک طبقے میں۔ اگر اس کا اس کا راوی ضعیف ہو تو یہ روایت مردود ہوتی ہے۔

نے فرمایا:

اس روایت کی تخریج امام احمد نے اپنی مسند میں کی ہے اور اس میں نوح اور ابراہیم کے بجائے ہود اور صالح ہے۔[۱] اسی طرح حافظ ھیثمی نے اس کو المجمع[۲] میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے: اس کی روایت امام احمد نے کی ہے اور اس کی سند میں زمعہ بن صالح شامل ہے جس کی ثقاہت کے بارے میں کلام ہے۔

شیخ احمد شاکر نے مسند کی تحقیق میں اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے تقریب التھذیب میں زمعہ بن صالح کو ضعیف لکھا ہے۔[۳]

محدث محمد ناصر الدین البانی نے متعدد ائمہ حدیث کے اقوال کے حوالہ سے زمعہ کو ضعیف قرار دیا ہے۔[۴]

البیت المعمور:

جس طرح اس زمین پر بیت اللہ یا کعبہ ہے ٹھیک اسی طرح ساتویں آسمان پر بھی ایک گھر ہے جس میں فرشتے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ اس گھر کا نام "البیت المعمور" ہے۔ المعمور، عَمَرَ یَعْمُرُ سے اسم مفعول ہے۔ جس کے معنی ہیں "آباد" یعنی ایسا گھر جس کو اللہ کی عبادت کرنے والے ہمیشہ آباد رکھتے ہوں۔

حدیث معراج میں "البیت المعمور" کا ذکر آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((فَأَتَیْنَا السَّمَاءَ السَّابِعَةَ، قِیْلَ: مَنْ هٰذَا؟ قِیْلَ: جِبْرِیْلُ۔ قِیْلَ: مَنْ مَعَكَ؟ قِیْلَ: مُحَمَّدٌ۔ قِیْلَ: وَقَدْ أُرْسِلَ اِلَیْهِ، مَرْحَبًا بِهِ وَلَنِعْمَ الْمَجِیْءُ جَاءَ، فَأَتَیْتُ عَلَى اِبْرَاهِیْمَ، فَسَلَّمْتُ عَلَیْهِ۔ فَقَالَ: مَرْحَبًا بِكَ مِنِ ابْنٍ وَّنَبِیٍّ، فَرُفِعَ لِیَ الْبَیْتُ الْمَعْمُوْرُ۔ فَسَأَلْتُ جِبْرِیْلَ، فَقَالَ: هٰذَا الْبَیْتُ الْمَعْمُوْرُ، یُصَلِّیْ فِیْهِ كُلَّ یَوْمٍ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ اِذَا خَرَجُوْا لَمْ یَعُوْدُوْا اِلَیْهِ آخِرَ مَا عَلَیْهِمْ))[۵]

"ہم...... میں اور جبریل...... ساتویں آسمان پر آئے۔ دریافت کیا گیا: یہ کون ہے؟ جواب دیا گیا: جبریل۔ پوچھا گیا: آپ کے ساتھ کون ہے؟ بتایا گیا: محمد ﷺ۔ سوال کیا گیا: کیا

---

[۱] مسند الإمام أحمد: ح ۲۰۶۷ [۲] المجمع: ص ۲۲۰، ج۳
[۳] تقریب التھذیب: ص ۱۵۷، ترجمہ ۲۰۳۵ [۴] معجم اسامی الرواۃ: ص ۵۴۔۵۵، ج۲
[۵] صحیح بخاری: ح ۳۲۰۷۔ صحیح مسلم: ح ۴۱۶۔۱۶۴

ان کو بلایا گیا ہے؟ ان کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ کیا خوب ہے آنے والے کا آنا۔ میں ابراہیم ﷺ کے پاس آیا اور ان کو سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا: بیٹے اور نبی کے لیے خوش آمدید۔ پھر البیت المعمور کو میرے سامنے کردیا گیا تو میں نے جبریل سے پوچھا: انہوں نے کہا: یہ آباد گھر ہے جس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے نماز ادا کرتے ہیں۔ جب اس سے نکلتے ہیں تو پھر اپنے آخری عہد تک اس میں دوبارہ داخل نہیں ہوتے"

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جب میں ساتویں آسمان پر پہنچا اور دروازہ کھولا گیا تو میں ابراہیم ﷺ کے پاس تھا۔ جبریل علیہ السلام نے کہا:

((هٰذَا أَبُوْكَ ، فَسَلِّمْ عَلَيْهِ ، قَالَ: فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ ، فَرَدَّ السَّلَامَ ، قَالَ: مَرْحَبًا بِالْاِبْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ))[1]

"یہ آپ کے جد امجد ہیں ان کو سلام کیجیے۔ آپ فرماتے ہیں: میں نے ان کو سلام کیا تو انہوں نے جواب دیا: خوش آمدید صالح بیٹے اور صالح نبی۔"

صحیح مسلم میں ہے:

((فَإِذَا أَنَا بِإِبْرَاهِيْمَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْنِدًا ظَهْرَهُ إِلَى الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ))[2]

"میں نے اپنے آپ کو ابراہیم ﷺ کے پاس پایا جو البیت المعمور سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے"

ان احادیث میں جس "آباد گھر" کا ذکر آیا ہے وہ وہی البیت المعمور ہے جس کی سورۃ الطّور کی چوتھی آیت میں قسم کھائی گئی ہے۔ بعض علماء نے قرآنی البیت المعمور سے کعبہ مشرف کو مراد لیا ہے۔ ان کی یہ تفسیر تکلف سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات اگرچہ صحیح ہے کہ خانہ کعبہ یا بیت اللہ حج وعمرہ اور طواف و زیارت کرنے والوں سے ہمیشہ آباد رہتا ہے جو درحقیقت اس کی صفت ہے مگر سورۃ الطّور اور احادیث میں جس گھر کا ذکر آیا ہے اس کا نام البیت المعمور آباد گھر ہے۔ اور احادیث میں یہ صراحت ہے کہ وہ ساتویں آسمان پر ہے زمین پر نہیں۔

صحیح احادیث میں ساتویں آسمان پر البیت المعمور کے ذکر کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر سے اس امر کی جانب واضح اشارہ ملتا ہے کہ زمین کے کعبہ کے بانی وہی ہیں اور خانہ کعبہ کی جگہ اگرچہ

[1] صحیح بخاری: ح ۳۸۸۷ [2] صحیح مسلم: ح ۴۱۱، ۱۶۲

آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے وقت متعین کر دی گئی تھی لیکن بیت اللہ کی عمارت کے معمار اول حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ میں اس کی حکمت کو سورۃ الاسراء میں ارشاد الٰہی: فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولٰهُمَا'' کی تفسیر اور ''بخت نصر کے افسانہ'' کے ذکر کے موقع پر بیان کروں گا۔

کہا جاتا ہے کہ ''البیت المعمور'' بیت اللہ کے اوپر بالکل سیدھ میں اور بالمقابل ساتویں آسمان پر ہے، حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے: قتادہ اور سدی کا قول ہے کہ ہم سے ذکر کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن اپنے صحابہ سے فرمایا:

کیا تمہیں معلوم ہے کہ البیت المعمور کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا: وہ آسمان میں کعبہ کے بالمقابل ایک مسجد ہے جو اگر گرے تو کعبہ پر گرے گی، اس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں وہ جب اس سے نکلتے ہیں تو اپنے اس داخلے کے بعد پھر اس میں کبھی داخل نہیں ہوتے۔[1]

حافظ ابن کثیر نے اس روایت پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔

اور یہی روایت حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں طبری کے حوالہ سے، سعید بن ابی عروبہ عن قتادہ کی سند سے نقل کی ہے اور اس کی صحت وسقم کا کوئی حکم نہیں لگایا ہے۔

لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ اسحاق نے اپنی مسند میں اور طبری نے اپنی تفسیر میں نیز دوسروں نے خالد بن عرعرعن علی کی سند سے روایت کی ہے کہ: علی رضی اللہ عنہ سے "السقف المرفوع" کے بارے میں پوچھا گیا تو: آسمان اور ''البیت المعمور'' کے بارے میں کہا: آسمان میں ایک گھر ہے جو بیت اللہ کے بالمقابل ہے اور وہ آسمان میں اسی طرح محترم ہے جس طرح یہ زمین میں۔ اس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جو دوبارہ اس میں داخل نہیں ہوتے۔'' اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس طرح مروی ہے البتہ اس میں اتنا اضافہ ہے کہ ''وہ البیت الحرام کی مانند ہے اگر گرے تو اسی پر گرے گا۔'' اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی عمدہ سند کے ساتھ اس طرح مروی ہے۔[2]

نہر حیوان:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ص ۳۸۹، ج ۳   [2] فتح الباری: ص ۱۵۱۲، ج ۲

ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے:

(۲۲۲)......فِی السَّمَاءِ نَهْرٌ يُقَالُ لَهُ نَهْرُ الْحَيَوَانِ يَدْخُلُهُ جِبْرِيْلُ كُلَّ يَوْمٍ فَيَنْغَمِسُ ثُمَّ يَخْرُجُ فَيَنْتَفِضُ فَيَخِرُّ عَنْهُ سَبْعُوْنَ اَلْفَ قَطْرَةٍ يَخْلُقُ اللّٰهُ مِنْ كُلِّ قَطْرَةٍ مَلَكًا، فَهُمُ الَّذِيْنَ يُصَلُّوْنَ فِيْهِ ثُمَّ لَا يَعُوْدُوْنَ اِلَيْهِ۔

''آسمان میں ایک نہر ہے جس کو نہر حیوان...... نہر حیات...... کہتے ہیں۔ جبریل ہر دن اس میں اترتے ہیں اور غوطہ لگاتے ہیں۔ پھر وہ اس سے نکلتے ہیں اور اپنا جسم جھٹکتے ہیں تو اس سے ستر ہزار قطرے گرتے ہیں، جن میں سے اللہ ہر قطرے سے ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے۔ وہ وہی ستر ہزار فرشتے ہیں جو البیت المعمور میں نماز پڑھتے ہیں پھر اس میں دوبارہ واپس نہیں آتے''

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: اس کی سند ضعیف ہے۔[۱]

مذکورہ روایت سند کے اعتبار سے اگرچہ ضعیف ہو لیکن متن کے اعتبار سے منکر اور مردود ہے۔ کیونکہ صحیح احادیث میں یہ صراحت ہے کہ فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں۔ یعنی ان کا مادۂ تخلیق نور ہے۔[۲]

(۲۲۳)......اِنَّ آدَمَ غَسَّلَتْهُ الْمَلَائِكَةُ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ وَكَفَّنُوْهُ وَالْحَدُوْا لَهُ وَدَفَنُوْهُ وَقَالُوْا: هٰذِهٖ سُنَّتُكُمْ يَا بَنِيْ آدَمَ! فِيْ مَوْتَاكُمْ۔

''فرشتوں نے آدم کو بیری کے پتوں سے ملے ہوئے پانی سے غسل دیا، ان کو کفن پہنایا۔ ان کے لحد تیار کی اور اس میں ان کو دفن کیا اور کہا: اے بنو آدم! تمہارے مردوں کے بارے میں یہ ہے تمہاری سنت''

یہ روایت موضوع تو نہیں ہے، لیکن بے حد ضعیف ہے۔ اس کی تخریج حافظ طبرانی نے المعجم الاوسط[۳] میں اس سند سے کی ہے۔

ہم سے ولید نے بیان کیا، کہا: ہم سے حسین ابی سری نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن عبید نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن اسحاق نے، محمد بن ذکوان سے، انہوں نے حسن سے، انہوں نے یحیٰ سے اور انہوں نے حضرت ابن بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا......

حافظ طبرانی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

۱۔ فتح الباری: ص ۱۵۱۲، ج ۲ ۲۔ صحیح مسلم: ح ۷۴۹۵-۲۹۹۶

۳۔ المعجم الاوسط: ص ۱۲۰، ج ۱۰ ح ۹۲۵۵

اس کی روایت محمد بن ذکوان سے صرف محمد بن اسحاق نے کی ہے۔

محمد بن اسحاق سچے تو تھے لیکن تدلیس[1] کرتے تھے اور محمد بن ذکوان ضعیف تھے۔[2]

(۲۲۴)......اِنَّ آدَمَ قَبْلَ اَنْ یُصِیْبَ الذَّنْبَ کَانَ اَجَلُهُ بَیْنَ عَیْنَیْهِ وَأَمَلُهُ خَلْفَهُ، فَلَمَّا اَصَابَ الذَّنْبَ جَعَلَ اللّٰهُ اَمَلَهُ بَیْنَ عَیْنَیْهِ وَاَجَلُهُ خَلْفَهُ فَلَا یَزَالُ یَأْمُلُ حَتّٰی یَمُوْتَ۔

''درحقیقت آدم (علیہ السلام) کے گناہ کا ارتکاب کرنے سے پہلے ان کی موت ان کی آنکھوں کے سامنے رہتی تھی اور ان کی امید ان کے پیچھے۔ جب ان سے گناہ سرزد ہوگیا تو اللہ نے ان کی امید ان کی آنکھوں کے سامنے کردی اور ان کی موت ان کے پیچھے۔ تو وہ اپنی موت آنے تک امیدیں کرتے رہے''

یہ روایت منکر ہے۔ اس کی تخریج حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق[3] میں ایک جماعت سے کی ہے:

''انہوں نے کہا: ہم کو ابوبکر محمد بن علی بن حامد شاشی فقیہہ نے خبر دی، کہا ہم کو ابوفضل منصور بن نصر بن عبدالرحیم بن مت کاغدی نے خبر دی، کہا ہم کو ابوسعید ھیثم بن کلیب بن سریج شاشی نے خبر دی، کہا: ہم کو عیسی بن احمد نے خبر دی، کہا: ہم سے نضر بن شمیل نے بیان کیا، کہا: ہم کو عوف نے حسن سے روایت کرتے ہوئے خبر دی اور انہوں نے کہا: مجھے خبر ملی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اس سند کے تمام راوی جو ابوسعید شاشی سے اوپر ہیں، ثقہ ہیں۔ رہا مت کاغدی اور ابوبکر شاشی تو وہ مجہول الحال ہیں۔ مت کاغدی کے بارے میں ابن العماد نے ''شذرات'' میں لکھا ہے: ماوراء النہر کے راویٔ حدیث۔

رہے ابوبکر شاشی تو وہ مشہور شافعی فقیہہ ہیں جن کا ترجمہ ''شذرات''[4] میں موجود ہے۔

محدث محمد ناصر البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اس روایت کو مرفوع قرار دینا میرے نزدیک منکر ہے۔ امام احمد نے الزہد[5] میں اور ابن عساکر

---

[1] سند کا عیب چھپا دینے کو تدلیس کہتے تھے۔ لیکن اگر مدلس سچا ہو اور اپنے شیخ سے حدیث سننے کی صراحت کرے تو اس کی روایت قابل قبول ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ حدثنا یا حدثنی کی بجائے ''عن فلان'' یعنی فلاں سے روایت ہے کہے تو مردود ہوتی ہے۔

[2] تقریب التهذیب، ترجمه ۵۷۲۵، ۵۸۷۱، معجم اسامی الرواة ص ۵۴۷، ۵۵۱، ص ۶۰۵-۶۰۶، ج۳

[3] تاریخ دمشق: ص ۳۲۴، ج۲

[4] شذرات الذهب: ص ۳۷۵، ج۳

[5] کتاب الزهد: ص ۴۸

نے تاریخ دمشق[1] میں اس کو متعدد طرق کے ساتھ حسن سے روایت کیا ہے اور اس کو ان پر موقوف قرار دیا ہے۔ گمان ہے کہ یہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔

البانی آگے لکھتے ہیں:

حافظ سیوطی نے اس کا ذکر الجامع الصغیر[2] میں کیا ہے اور اس کو حافظ ابن عساکر سے منسوب کیا ہے۔ اور عبدالرؤف مناوی نے اس کی صحت وسقم کے بارے میں سکوت سے کام لیا ہے۔[3]

جس کا مطلب ہے کہ وہ اس کی صحت یا سقم معلوم نہ کر سکے۔ لہٰذا ایسی روایت قابل استدلال نہیں ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام:

حضرت نوح علیہ السلام زمین میں مبعوث کیے جانے والے پہلے رسول تھے۔ چنانچہ حدیث شفاعت میں آیا ہے:

((یَجْتَمِعُ الْمُؤْمِنُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ یُحْبَسُ الْمُؤْمِنُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ حَتّٰی یُهِمُّوْا بِذٰلِكَ، فَیَقُوْلُوْنَ: لَوِ اسْتَشْفَعْنَا اِلٰی رَبِّنَا فَیُرِیْحَنَا مِنْ مَكَانِنَا، فَیَأْتُوْنَ آدَمَ، فَیَقُوْلُوْنَ: اَنْتَ اَبُو النَّاسِ، خَلَقَكَ اللّٰهُ بِیَدِهٖ، وَأَسْجَدَ لَكَ مَلَائِكَتَهُ وَعَلَّمَكَ اَسْمَاءَ كُلِّ شَیْءٍ، فَاشْفَعْ لَنَا عِنْدَ رَبِّكَ حَتّٰی یُرِیْحَنَا مِنْ مَكَانِنَا هٰذَا فَیَقُوْلُ: لَسْتُ هُنَاكُمْ وَیَذْكُرُ ذَنْبَهُ فَیَسْتَحِیْ، اِئْتُوا نُوْحًا، فَإِنَّهُ اَوَّلُ رَسُوْلٍ نَبِیٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ اِلٰی اَهْلِ الْاَرْضِ))[4]

''قیامت کے دن مومنین جمع ہوں گے...... قیامت کے دن اہل ایمان ایک جگہ روک لیے جائیں گے...... وہ کہیں گے: کاش ہم اپنے رب کے پاس کسی سے سفارش کرائیں کہ وہ ہمیں اس جگہ سے راحت بخشے۔ لہٰذا وہ آدم (علیہ السلام) کے پاس حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے: آپ تمام لوگوں کے باپ ہیں۔ اللہ نے اپنے ہاتھ سے آپ کی تخلیق فرمائی ہے اور اپنے فرشتوں سے آپ کا سجدہ کرایا ہے اور آپ کو ہر چیز کے نام کا علم بخشا ہے۔ آپ اپنے رب کے پاس ہمارے لیے سفارش کر دیجیے کہ وہ ہمیں ہماری اس جائے قیام سے راحت بخشے۔

---

[1] تاریخ دمشق: ص ۳۲۴، ج۲ [2] الجامع الصغیر: ح ۱۳۵۲

[3] الضعیفہ: ص ۲۱، ج۵، ح ۲۰۰۸

[4] صحیح بخاری: ح ۴۴۷۶، ۶۵۶۵، ۷۴۱۰، ۷۴۴۰، صحیح مسلم: ح ۴۷۵، ۱۹۳

آدم علیہ السلام جواب دیں گے...... میں اس مقام پر نہیں ہوں اور اپنے گناہ کو یاد کر کے شرمندگی محسوس کریں گے۔ نوح کے پاس جاؤ کیونکہ وہ پہلے رسول ...... نبی ...... ہیں جن کو اللہ نے اہل زمین میں مبعوث فرمایا۔“

نبی اور رسول میں فرق:

اوپر جو حدیث پیش کی گئی ہے اس میں نبی اور رسول کو ہم معنی اور ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں بھی یہ دونوں الفاظ بیشتر مقامات پر ہم معنی اور مترادف ہی استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر رسول اور نبی کے الفاظ اس طرح بھی استعمال ہوئے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مرتبے یا کام کے لحاظ سے کوئی فرق ضرور ہے، مثلاً سورۃ الحج میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ط ﴾ [الحج:۵۲]

”اور اے رسول! تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی ایسا رسول اور نہ ایسا نبی بھیجا ہے مگر جب اس نے کوئی تمنا کی، تو شیطان نے اس کی تمنا میں خلل اندازی کی“

اس آیت مبارکہ سے رسول اور نبی کے درمیان فرق کا ثبوت ملتا ہے مگر وہ فرق کیا ہے اس کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔

قرآنی آیات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کا لفظ نبی کی بہ نسبت خاص ہے۔ یعنی ہر رسول نبی بھی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ اور رسول کا منصب نبی سے بڑا ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی تعداد رسولوں سے بہت زیادہ ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر:

قرآن پاک اور صحیح احادیث میں حضرت نوح علیہ السلام کی حقیقی عمر کا ذکر نہیں آیا ہے۔ قرآن پاک میں صرف ایک جگہ اس مدت کا ذکر آیا ہے جس میں وہ اپنی قوم کو دعوت دیتے رہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ط فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ ﴾ [العنکبوت:۱۴]

”ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، پس وہ پچاس کم ایک ہزار برس انکے درمیان رہا

اور طوفان نے لوگوں کو اس حال میں اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ وہ ظالم تھے“

اس آیت مبارکہ سے یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ ان کی حقیقی عمر ساڑھے نو سو برس سے زیادہ تھی مگر وہ کتنی تھی نہ اس کا تعین کیا گیا ہے اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ امام محی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود بغوی، جار اللہ محمود بن عمر زمخشری، ابو اسحاق احمد بن ابراہیم ثعلبی، ابوالفداء حافظ ابن کثیر اور امام محمد بن علی شوکانی وغیرہم نے اپنی تفسیروں میں حضرت نوح علیہ السلام کی صحیح عمر کے بارے میں جو روایتیں نقل کی ہیں ان میں سے کوئی بھی روایت صحیح نہیں ہے۔ بلکہ سب اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں۔ حتیٰ کہ اس قبیل کی جتنی روایتیں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منسوب ہیں، ان سے ان کی نسبت بھی صحیح نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے تفسیر کی کتابوں میں جو روایات منسوب ہیں ان میں سے بہت کم روایات صحیح ہیں۔[1]

البتہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان دس صدیوں کا فاصلہ تھا۔ چنانچہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((اِنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَنَبِيٌّ كَانَ آدَمُ؟ قَالَ: "نَعَمْ مُكَلَّمٌ" قَالَ: فَكَمْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ نُوْحٍ؟ قَالَ: عَشَرَةُ قُرُوْنٍ"))

”ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آدم علیہ السلام نبی تھے؟ فرمایا: ہاں ان سے کلام کیا گیا۔ یعنی اللہ نے ان سے بذریعہ وحی بات کی۔ عرض کی: ان کے اور نوح علیہ السلام کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ تھا؟ فرمایا: دس صدیاں“[2]

اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

(كَانَ بَيْنَ نُوْحٍ وَآدَمَ عَشَرَةُ قُرُوْنٍ كُلُّهُمْ عَلَى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْحَقِّ فَاخْتَلَفُوْا فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ))[3]

”نوح اور آدم علیہما السلام کے درمیان دس صدیوں کا فاصلہ تھا جس میں تمام لوگ شریعت

---

[1] امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے: تفسیر کے باب میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے لگ بھگ سو حدیثیں ثابت ہیں۔ الاتقان ص ۴۷۲، ج ۲

[2] صحیح ابن حبان: ح ۶۱۹۰

[3] مستدرک حاکم: ح ۴۰۶۳۔ امام ذہبی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ حافظ ابن کثیر سے سہو ہو گیا جو اس کو صحیح بخاری سے منسوب کر دیا۔ البدایہ والنہایہ: ص ۱۱۷، ج ۱

حقہ پر کاربند تھے۔ پھر ان میں اختلاف ہوگیا، تو اللہ نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے نبی بھیجے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ تحذیر الساجد من اتخاذ القبور مساجد میں لکھتے ہیں:

علی بن حسین بن عروۃ حنبلی ''الکواکب الدراری فی ترتیب مسند امام احمد'' میں لکھتے ہیں:

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے اُن مؤرخین کے قول کی تردید ہوتی ہے جن کا دعویٰ ہے کہ قابیل اور اس کی اولاد نے آگ کی پرستش کی تھی۔

میں...... البانی...... کہتا ہوں کہ اس میں ان فلسفیوں اور ملحدین کا بھی رد ہے جن کا دعویٰ ہے کہ انسان میں اصل چیز شرک ہے اور توحید عارضی ہے۔[1]

اوپر نقل کردہ صحیح حدیثوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد دس صدیوں یا نسلوں میں توحید زندہ رہی اور ان کی اولاد راہ راست پر قائم رہی۔ پھر ان کے اندر اختلافات پیدا ہوئے۔ لوگوں نے نئے نئے راستے نکال لیے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے۔ بتوں کی پرستش شروع ہوگئی اور لوگوں میں اولیاء پرستی پھیل گئی تو اس امت اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ایسے لوگوں کی جانب اپنا رسول بنا کر بھیجا۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''اس امر میں اختلاف ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو ان کی عمر کتنی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بعثت کے وقت ان کی عمر ۵۰ برس کی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ساڑھے تین سو برس کی عمر میں رسول بنائے گئے اور تیسرا قول یہ ہے کہ ان کی بعثت چار سو اسی برس کی عمر میں ہوئی۔ یہ تمام اقوال امام ابن جریر طبری نے نقل کیے ہیں اور تیسرے قول کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منسوب کیا ہے۔[2]

حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کے وقت ان کی عمر کے بارے میں حافظ ابن کثیر کے نقل کردہ ان اقوال میں سے کوئی بھی قول قابل اعتماد سند پر مبنی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے یہ اقوال نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور ان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

حضرت نوح علیہ السلام کی وصیت:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر

[1] تحذیر الساجد من......ص ۱۳۶ [2] تفسیر طبری: ص ۱۱۷، ج ۱

تھے کہ ایک دیہاتی ریشم کے بنے ہوئے بٹنوں والا ایک سبز ریشمی چوغہ پہن کر حاضر ہوا اور کہنے لگا: تمہارے ان صاحب نے ہر شہسوار ابن شہسوار کو پست کر دیا اور ہر چرواہے کے چرواہ بیٹے کو بلند کر دیا ہے۔"

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے اس کے پورے چوغے کو پکڑ کر اس سے فرمایا:

"کیا میں تیرے جسم پر بے عقلوں کا لباس نہیں دیکھ رہا ہوں؟!"

پھر فرمایا:

((اِنَّ نَبِیَّ اللّٰہِ نُوْحًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمَّا حَضَرَتْہُ الْوَفَاۃُ، قَالَ لِابْنِہٖ: اِنِّیْ قَاصٌّ عَلَیْکَ الْوَصِیَّۃَ: آمُرُکَ بِاثْنَتَیْنِ وَاَنْھَاکَ عَنِ اثْنَتَیْنِ: آمُرُکَ بِلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، فَاِنَّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعَ وَالْاَرْضِیْنِ السَّبْعَ لَوْ وُضِعَتْ فِیْ کَفَّۃٍ وَوُضِعَتْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فِیْ کَفَّۃٍ، رَجَحَتْ بِھِنَّ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَوْ اَنَّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعَ وَالْاَرْضِیْنَ السَّبْعَ کُنَّ حَلَقَۃً مُبْھَمَۃً اِلَّا قَصَمَتْھُنَّ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، وَسُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ، فَاِنَّھَا صَلَاۃُ کُلِّ شَیْءٍ وَبِھَا یُرْزَقُ الْخَلْقُ۔ وَاَنْھَاکَ عَنِ الشِّرْکِ وَالْکِبْرُ قَالَ: قُلْتُ اَوْ قِیْلَ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! ھٰذَا الشِّرْکُ قَدْ عَرَفْنَاہُ فَمَا الْکِبْرُ؟ قَالَ: اَنْ یَکُوْنَ لِاَحَدِنَا نَعْلَانِ حَسَنَتَانِ لَھُمَا شِرَاکَانِ حَسَنَانِ؟ قَالَ: لَا، قَالَ: ھُوَ اَنْ یَکُوْنَ لِاَحَدِنَا اَصْحَابٌ یَجْلِسُوْنَ اِلَیْہِ؟ قَالَ: لَا، قِیْلَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! فَمَا الْکِبْرُ؟ قَالَ: سَفَہُ الْحَقِّ وَغَمْصُ النَّاسِ...... غَمْطُ النَّاسِ))[1]

"اللہ کے نبی نوح ﷺ کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے سے فرمایا: میں تمہیں وصیت کرنا چاہتا ہوں: میں تمہیں دو باتوں کا حکم دیتا ہوں اور دو باتوں سے روکتا ہوں۔ میں تمہیں لا الہ الا اللہ یعنی نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر اللہ، کا حکم دیتا ہوں۔ کیونکہ اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں رکھ دی جائیں اور لا الہ الا اللہ دوسرے پلڑے میں، تو لا الہ الا اللہ ان پر بھاری ہوگا۔ اور اگر ساتوں

---

[1] مسند امام احمد ح ۶۵۸۳۔ الادب المفرد ح ۵۵۸۔ الاسماء والصفات ح ۱۸۶، البدایہ والنہایہ ص ۱۳۹، ج ۱، الصحیحہ: ص ۲۵۹، تا ۴۶۱ ج ۱، ح ۱۳۴

آسمان اور ساتوں زمینیں ایک غیر واضح حلقہ ہوتیں۔ یعنی غیر واضح اور مبہم بات اور معاملہ ......تو لا الہ الا اللہ ان کو واضح کر دیتا۔

اور میں تمہیں سبحان اللہ و بحمدہ کا حکم دیتا ہوں۔ کیونکہ ہر چیز کی نماز ہے۔ اسی کے ذریعہ مخلوق کو روزی ملتی ہے۔

اور میں تمہیں شرک اور تکبر سے منع کرتا ہوں۔ حضرت عبداللہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا یا عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! یہ شرک تو ہم جانتے ہیں مگر تکبر اور بڑائی کیا ہے؟ کیا تکبر یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کے جوتے اور ان کے تسمے خوبصورت ہوں؟ فرمایا: نہیں۔ عرض کیا: کیا تکبر یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کے دوست اور ساتھی ہوں جو اس کے گرد بیٹھتے ہوں؟ فرمایا: نہیں عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! تو پھر تکبر اور بڑائی کیا ہے؟ فرمایا: حق کا مذاق اڑانا اور اس کی سبکی کرنا اور لوگوں کی تحقیر اور عیب جوئی کرنا۔"

حضرت نوح علیہ السلام کی قبر:

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

ابن جریر اور ازرقی نے عبدالرحمٰن بن سابط اور ان کے علاوہ دوسرے تابعین سے مرسلاً یہ روایت کیا ہے کہ "نوح علیہ السلام کی قبر مسجد حرام میں ہے" اور یہ روایت اس روایت سے زیادہ قوی اور ثابت ہے جس کا ذکر بہت سے متاخر علماء کرتے ہیں کہ وہ البقاع کے ایک قصبہ میں مدفون ہیں۔ جو موجودہ وقت میں "کرک نوح" کے نام سے معروف ہے۔[1]

تعجب ہے کہ حافظ ابن کثیر جیسے جلیل القدر حافظ حدیث اور مفسر قرآن نے لبنان کے البقاع نامی علاقے میں حضرت نوح علیہ السلام کی قبر کو خلاف واقعہ اور غیر ثابت قرار دے دیا۔ مسجد حرام میں ان کی قبر کو صحیح اور مطابق واقعہ بتایا۔ حالانکہ دونوں جگہوں میں ان کی قبر سے متعلق جو روایات تاریخ کی کتابوں میں منقول اور لوگوں میں زبان زد ہیں ان میں سے کوئی بھی روایت قابل اعتماد نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ساری روایتیں تابعین کے اقوال سے عبارت ہیں اور ان میں سے کوئی بھی روایت صحیح سند کے ساتھ الصادق والمصدوق ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ یعنی کسی بھی روایت کا سلسلہ نبی کریم ﷺ تک نہیں پہنچتا۔ مزید یہ کہ مسجد حرام میں کسی نبی یا غیر نبی کا مدفون ہونا اپنے اندر جو نکارت رکھتا ہے وہ نکارت کسی دوسری جگہ کسی نبی کے مدفون ہونے میں قطعاً نہیں ہے۔ کیونکہ مسجد حرام "مرکز توحید" ہے۔ اللہ کی زمین میں اللہ کی

---

[1] البدایہ والنہایہ: ص ۱۴۰، ج ۱

عبادت کے لیے بنایا جانے والا پہلا گھر ہے اور دنیا کے طول وعرض میں پائے جانے والے تمام مسلمانوں کا رہتی دنیا تک قبلہ رہے گا۔

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴾ [آل عمران:٩٦]

”بے شک لوگوں کی عبادت کے لیے جو سب سے پہلا گھر تعمیر ہوا وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ یہ گھر بابرکت اور دنیا کے تمام لوگوں کے لیے مرکز ہدایت ہے“

﴿ وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ حَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ ﴾ [البقرة:١٥٠]

”اے نبی! جہاں سے بھی تمہارا گزر ہو اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دو۔ اور اے مسلمانوں جہاں بھی تم لوگ ہو اسی کی طرف اپنا منہ کرلیا کرو۔ تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف بولنے کے لیے کوئی دلیل نہ ملے“

مذکورہ آیت میں نماز میں مسجد حرام کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا، لَعَنَ اللّٰهُ قَوْمًا اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ)) [1]

”اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بننے دیجیو۔ اللہ کی لعنت ہو ان لوگوں پر جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنالیا۔“

﴿ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل:٣٦]

”اور ہم نے ہر امت میں (اس حکم کے ساتھ) ایک رسول بھیجا کہ لوگو! اللہ کی عبادت کرو اور معبودان باطل کی عبادت سے دور رہو۔“

اور تمام انبیاء کی طرح حضرت نوح علیہ السلام نے بھی صرف اللہ کی عبادت کی دعوت دی:

---

[1] مسند امام احمد: ح ٧٣٥٢۔ طبقات ابن سعد: ص ٢٤١۔٢٤٢، ج٢۔ فضائل المدینہ: ص ٦٦، ج١۔ مسند ابویعلی: ص ٣١٢، ج١۔ مسند الحمیدی: ح ١٠٢٥، حلیۃ الاولیاء: ص ٢٨٣، ج٦ ح ٣١٧

﴿ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّي لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ ﴾ [نوح:۲، ۳]

"(نوح نے) کہا: اے میری قوم کے لوگو میں تمہارے لیے کھلا ہوا خبردار کرنے والا ہوں (اور تم کو یہ دعوت دیتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو، اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔"

اور جب نو سو پچاس برس تک قوم کو توحید اور اللہ کی عبادت کی دعوت دینے کے باوجود معدودے چند افراد کے سوا کوئی ان پر ایمان نہ لایا تو نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ فریاد کی:

﴿ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ۝ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۝ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝ ﴾ [نوح:۲۱ تا ۲۳]

"نوح نے عرض کیا: اے میرے رب! انہوں نے میری نافرمانی کی روش اختیار کی اور اس کی پیروی کی جس کے مال اور اولاد نے اس کے نقصان ہی میں اضافہ کیا ہے اور انہوں نے بہت بڑی مکاری کی اور آپس میں کہا: ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو اور نہ چھوڑو ود، سواع، نہ یغوث، یعوق اور نسر کو"

اوپر آیت نمبر ۲۳ میں جن بتوں کے نام آئے ہیں یعنی وَد، سُواع، یغوث، یعوق اور نسر...... تو یہ دراصل قوم نوح سے پہلے کے صالح اور نیک لوگ تھے جن کے مرنے کے بعد لوگ ان کی عبادت کرنے لگے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔[1]

تو کیا یہ بات قرین عقل ہوسکتی ہے کہ ایک جلیل القدر رسول جو ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو توحید کی دعوت دیتا رہا ہو وہ مسجد حرام میں دفن ہونے کی وصیت کرے گا جو مرکز توحید ہے۔ مسجد میں قبر بنانا شرک کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝ ﴾ [الجن:۱۸]

"اور بے شک مسجدیں تو صرف اللہ کے لیے ہیں لہٰذا اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو"

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رحلت فرماتے ہوئے جس چیز کی تاکید فرمائی وہ شرک اور اسباب شرک سے دور رہنے کی تاکید کی تھی۔

---

[1] صحیح بخاری: ح ۴۹۲۰

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بیماری میں جس سے آپ جاں بر نہ ہو سکے فرمایا:

((لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارَى اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ، قَالَتْ: فَلَوْلَا ذٰلِكَ لَاُبْرِزَ قَبْرُه، غَيْرَ اَنَّهُ خُشِيَ اَنْ يُّتَّخَذَ مَسْجِدًا))[1]

''یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں (عبادت گاہیں) بنالیا۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو آپ کی قبر نمایاں کر دی جاتی۔ مگر یہ خوف محسوس کیا گیا کہ کہیں اس کو سجدہ گاہ نہ بنالیا جائے''

حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے نبی ﷺ کو وفات سے پانچ دن پہلے فرماتے ہوئے سنا:

((اِنِّیْ اَبْرَأُ اِلَى اللّٰهِ اَنْ يَّكُوْنَ لِیْ مِنْكُمْ خَلِيْلٌ۔ فَاِنَّ اللّٰهَ قَدِ اتَّخَذَنِیْ خَلِيْلًا، كَمَا اتَّخَذَ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا، مِنْ اُمَّتِیْ خَلِيْلًا لَا تَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ خَلِيْلًا اَلَا وَاِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ، اَلَا فَلَا تَتَّخِذُوْا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ، فَاِنِّیْ اَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ))[2]

''میں اللہ کی بارگاہ میں اس بات سے اظہارِ برأت کرتا ہوں کہ تم میں سے میرا کوئی خلیل ہو۔ کیونکہ اللہ نے مجھے اپنا خلیل بنا لیا ہے جس طرح اس نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تھا۔ اور اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا۔ آگاہ رہو! تم سے پہلے کے لوگ اپنے نبیوں اور صلحاء کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا کرتے تھے، خبردار! تم قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا۔ میں تم لوگوں کو اس سے منع کرتا ہوں۔''

درحقیقت مسجدوں میں قبریں بنانے یا قبروں کو سجدہ گاہوں اور مزارات میں تبدیل کرنے کا آغاز ان لوگوں کے ہاتھوں ہوا جو انبیاء، اولیاء اور صلحائے امت کی عقیدت میں غلو پسندی کے نتیجے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ کائنات میں تصرف کا اختیار رکھتے ہیں۔ ان کے توسط سے اللہ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ان لوگوں نے صلحائے امت کو مسجدوں میں دفن کرنا شروع کر دیا یا ان کی قبروں

[1] صحیح مسلم: ح ۱۱۸۴، ۵۲۹ [2] صحیح مسلم: ح ۱۱۸۸، ۵۳۲

پر مسجدیں بنانا شروع کر دیں۔ یا ان کی قبروں کو مزاروں میں تبدیل کر دیا تاکہ اس طرح وہ اللہ کی عبادت کے ساتھ ان کی عبادت کو بھی شامل کر لیں۔

اور جن لوگوں نے مقدس مقامات کی تاریخیں لکھیں انہوں نے ان میں ان مقامات کے فضائل کے ضمن میں ایسی بے بنیاد روایتیں بھر دیں جو توحید کی روح اور مزاج سے براہ راست متصادم ہوتی ہیں۔ بعد میں یہی روایتیں دوسری کتابوں میں نقل در نقل ہوتی رہیں یہاں تک کہ ان کو مسلمہ تاریخی حقائق قرار دے لیا گیا۔

ازرقی اور تاریخ مکہ:

مکہ کی تاریخ کے موضوع پر پہلی مدون کتاب ابوالولید ازرقی احمد بن محمد بن ولید بن عقبہ بن ازرق کی تصنیف ''تاریخ مکہ'' ہے جس کی تہذیب و تنقیح ان کے پوتے ابوالولید محمد بن عبداللہ بن احمد ازرقی متوفی ۲۵۰ھ نے کی۔[۱]

ازرقی نے اپنی اس کتاب میں مسجد حرام کو ''قبرستان'' بنا دیا ہے۔ معروف و غیر معروف تابعین سے ایسی مقطوع اور مرسل روایتیں نقل کی ہیں جن کے ذریعے مسجد حرام میں کثیر تعداد میں انبیاء اور رسولوں کی قبروں کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے:

محمد بن سابط[۲] کا قول ہے:

انبیاء میں سے ایک نبی کی امت جب ہلاک ہوگئی تو وہ مکہ آ گئے۔ وہ اور ان کے اصحاب وہیں اللہ کی عبادت کرنے لگے اور وہیں ان کی اور ان کے اصحاب کی وفات ہوئی۔ چنانچہ نوح، ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام کی وفات مکہ میں ہوئی جن کی قبریں زمزم اور حجر اسود کے درمیان موجود ہیں۔[۳]

آگے لکھتے ہیں:

میں نے عبدالرحمٰن بن سابط[۴] سے کہتے ہوئے سنا ہے: انہوں نے کہا: میں نے عبداللہ بن ضمرہ سلولی[۵] کو کہتے ہوئے سنا ہے:

رکن سے مقام ابراہیم تک اور یہاں سے حجر کے درمیانی رقبہ میں ۹۹ نبیوں کی قبریں ہیں۔ یہ سب حج کے لیے آئے تھے۔ یہیں ان کی وفات ہوئی اور یہیں مدفون ہوئے۔[۶]

---

[۱] فوائد سزکین: تاریخ التراث العربی: ص ۲۰۱-۲۰۲ ج ۱، ۲

[۲] غیر معروف تابعی [۳] تاریخ مکہ: ص ۵۱۴ ج ۲ [۴] ایک تابعی

[۵] ایک تابعی کا نام ہے۔ [۶] تاریخ مکہ: ص ۵۱۵

حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے بارے میں ازرقی لکھتے ہیں:

جب اسماعیل علیہ السلام کی وفات ہوئی تو وہ حجر میں اپنی ماں کے ساتھ دفن کیے گئے۔[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

جب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کعبہ کی تعمیر نو کی غرض سے حجر میں کھدائی کی تو ان کو بیت اللہ کی بنیاد میں سرخ پتھر ملے...... اور اس میں ان کو ایک قبر کی جگہ ملی۔ انہوں نے کہا: یہ اسماعیل علیہ السلام کی قبر ہے۔ انہوں نے قریش کو جمع کیا اور فرمایا: گواہ رہو۔[2]

صرف یہی نہیں بلکہ ازرقی نے یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی کنواری بیٹیوں کو مسجد حرام کے رکن شامی کے پاس دفن کیا گیا۔[3]

مسجد حرام میں انبیاء ﷩ کی قبروں کی حقیقت:

اوپر مسجد حرام میں حضرت نوح اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی قبروں سے متعلق جو روایت نقل کی گئی ہیں وہ سنداً اور متناً مردود اور باطل ہیں۔

سند کے اعتبار سے ان کے مردود اور باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی روایت مرفوع نہیں ہے۔ مزید یہ کہ ان میں سے کسی بھی روایت کی سند تابعین تک قابل اعتبار نہیں ہے۔ بعض روایتیں تو سند سے عاری ہیں اور جن روایتوں کی سند تابعین تک بیان ہوئی ہے ان میں سے بعض تابعی مجہول ہیں۔ جو تابعی سچے اور ثقہ ہیں انہوں نے بھی یہ صراحت نہیں کی ہے کہ وہ جو کچھ بیان کر رہے ہیں وہ کسی صحابی سے سن کر بیان کر رہے ہیں۔

ان روایتوں کے باطل ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی روایت صحیحین، سنن اربعہ، مسند امام احمد، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، امام طبرانی کی تینوں معاجم اور حدیث کی دوسری معروف کتابوں میں بیان نہیں ہوئی ہے۔

رہا مذکورہ روایتوں کا متن تو اس کے باطل ہونے کے دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) یہ روایتیں اسلام کے توحیدی مزاج اور روح کے خلاف ہیں اور رسول اکرم ﷺ کے ان ارشادات سے براہ راست ٹکراتی ہیں جن میں قبروں کو عبادت گاہ بنانے سے منع فرمایا گیا ہے۔ جبکہ یہ جھوٹی روایتیں اس زمین پر اللہ تعالیٰ کی سب سے پہلی عبادت گاہ مسجد حرام کو قبرستان ثابت کر رہی ہیں۔

---

[1] تاریخ مکہ: ص ۱۰۸، ج۱ [2] تاریخ مکہ: ص ۲۳۲۔۲۳۳
[3] ص ۴۴۷، ج۲

(۲) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں کعبہ مشرفہ کی تعمیر نو کے موقع پر کھدائی کے دوران حجر میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر پانے کا دعویٰ کیا گیا ہے جبکہ صحیحین اور حدیث کی دوسری مستند کتابوں میں اس واقعہ سے متعلق جو روایات آئی ہیں ان میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ مشہور تابعی حضرت یزید بن رومان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

میں اس وقت حاضر تھا جب ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے کعبہ کی دیواریں گرائیں، اس کی تعمیر کی اور اس میں حجر کو شامل کر دیا۔ میں نے آپس میں جڑے ہوئے پتھروں کی شکل میں ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد دیکھی ہے جو آپس میں ملے ہوئے اونٹوں کے کوہان کی مانند تھی۔ [1]

(۳) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے عہد میں حجر یا حطیم کا حصہ اسی شکل میں تھا جس شکل میں موجودہ وقت میں ہے۔ جب انہوں نے کعبہ کی تعمیر نو کی تو حطیم کو اس میں شامل کر دیا۔ جب کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کردہ عمارت کے اندر تھا لہٰذا اس میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے مدفون ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت ہاجرہ کا انتقال ہوا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ان کو کعبہ کے اندر دفن کیا اور اپنے انتقال سے قبل اپنے بیٹوں کو یہ وصیت فرمائی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو مجھے کعبہ کے اندر میری ماں کے پہلو میں دفن کرنا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ سورۃ الحج میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْــٴًـا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىٕفِیْنَ وَ الْقَآىٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾ [الحج:٢٦]

''اے نبی! یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر کی جگہ متعین کی تھی (اور اس کو حکم دیا تھا کہ) میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھنا''

اس آیت مبارکہ میں ابراہیم علیہ السلام کو کعبہ مشرفہ کو جس چیز سے پاک رکھنے کا حکم دیا گیا ہے وہ شرک اور آلائش شرک کے سوا کچھ اور ہو سکتی ہے؟ اور کیا قبر سے بڑھ کر شرک کا ذریعہ وسبب کچھ اور ہو سکتا ہے؟ جس کا ثبوت ان قبروں سے ملتا ہے جن کو عبادت گاہوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

پھر اس آیت مبارکہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد:

((اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا))

---

[1] صحیح بخاری: ١٥٨٦، صحیح مسلم: ٣٤٤٥، ٣٢٤٦۔ سنن نسائی ح ٢٩٠٣

''اے اللہ! تو میری قبر کو پوجا کی چیز نہ بننے دیجیو''[۱]

کو سامنے رکھ کر ان روایتوں پر غور کیجیے جن میں مسجد حرام کے اندر انبیاء علیہم السلام کے مدفون ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ تو ان کے موضوع اور جھوٹ ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جائے گا۔

(۴) رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ أَنْ تَأْكُلَ أَجْسَادَ الْأَنْبِيَاءِ))[۲]

''بے شک اللہ نے زمین پر یہ حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھائے''

اس حدیث پاک کی رو سے تمام انبیاء علیہم السلام کے جسم قبروں میں بالکل صحیح سالم موجود ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ حجر اسود سے مقام ابراہیم اور وہاں سے حجر تک ۹۹ نبیوں کی قبریں ہوں؟ ظاہری بات ہے کہ یہ تمام نبی ایک ہی وقت میں فوت نہیں ہوئے۔ لہٰذا جب ایک کے بعد دوسرے نبی کو دفن کرنے کے لیے قبر کھودی گئی تو پہلے سے مدفون نبی یا انبیاء کی لاش ظاہر ہوگئی ہوں گی۔ ایسی صورت میں اس مختصر سے رقبے میں اتنے سارے نبیوں کو کس طرح دفن کیا گیا؟ بلکہ محمد طاہر کُردی نے تو "التاریخ القویم لمکه والحرم"[۳] میں یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ رکن یمانی سے حجر اسود کے درمیانی حصے میں ۶۳ نبیوں کی قبریں ہیں اور مسجد حرام کے پورے صحن میں ۳۰۰ نبی مدفون ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اتنی مختصر جگہ میں اتنی بڑی تعداد کو کس طرح دفن کیا گیا؟ تو کیا ان تمام نبیوں کو ایک دوسرے پر دفن کیا گیا؟

مزید یہ کہ عہد عثمانی اور عہد سعودی میں مسجد حرام کی متعدد بار تعمیر ہوئی ہے متعدد بار مطاف کو کھودا گیا اور اس میں توسیع کی گئی ہے۔ موجودہ توسیع کے موقع پر پورے مطاف کو کھود کر نیچے خاص قسم کے پائپ ڈالے گئے ہیں اور پورے مطاف میں جدید طرز کے ٹائلس بچھائے گئے ہیں۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کھدائی کے دوران کوئی انسانی لاش ملی ہو۔ ورنہ کہرام مچ جاتا ہے۔ حالانکہ اگر حرم کے صحن یا مطاف میں کسی جگہ کسی ایک نبی کی قبر ہوتی تو وہ کھل جاتی اور لاش ظاہر ہو جاتی۔

مذکورہ وضاحت سے معلوم ہوا کہ مسجد حرام میں انبیاء علیہم السلام کے دفن کیے جانے کے واقعات من گھڑت اور جھوٹ ہیں۔

---

[۱] اس کی تخریج اوپر گزر چکی ہے۔

[۲] ابوداؤد: ۱۰۴۷، ۱۵۳۱، سنن نسائی: ۱۳۷۳۔ سنن ابن ماجه: ۱۰۸۵، ۱۶۳۶۔ صحیح ابن خزیمه: ۱۷۳۳، ۱۷۳٤

[۳] ص ۵۰۰، ج۱

تحریف کی بدترین مثال:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((صَلَّى فِيْ مَسْجِدِ الْخَيْفِ سَبْعُوْنَ نَبِيًّا مِنْهُمْ مُوْسَى كَأَنِّيْ انْظُرُ إِلَيْهِ وَعَلَيْهِ عَبَاءَتَانِ قَطْوَانِيَّتَانِ وَهُوَ مُحْرِمٌ عَلَى بَعِيْرٍ مِنْ اِبِلِ شَنُوْءَةَ مَخْطُوْمٍ بِخِطَامِ لِيْفٍ، لَهُ ضَفِيْرَتَانِ))[1]

"مسجد خیف میں ستر نبیوں نے نماز پڑھی ہے جن میں سے ایک موسیٰ بھی ہیں۔ گویا میں ان کو دیکھ رہا ہوں کہ ان کے اوپر دو جھالر دار عبائیں ہیں اور وہ محرم ہیں۔ وہ شنوءۃ کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ پر سوار ہیں جس کو کھجور کے درخت کی چھالوں سے بنی نکیل ڈالی گئی ہے اور موسیٰ کے بالوں کی دو لٹیں بنی ہوئی ہیں......"

حافظ طبرانی نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس حدیث کو عطاء بن سائب سے صرف محمد بن فضیل نے روایت کیا ہے۔ جس کی روایت میں عبداللہ بن ہاشم طوسی منفرد ہیں۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

عبداللہ بن ہاشم ثقہ ہیں اور ان کا شمار امام مسلم کے شیوخ میں ہوتا ہے۔ ان کے اوپر کے راوی بھی ثقہ ہیں سوائے عطاء بن سائب کے۔ جن کا ذہنی توازن آخری عمر میں خراب ہوگیا تھا۔ لیکن یہ حدیث حسن ہے۔[2]

یہ حدیث اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ اس سے مسجد خیف کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو اس کی جگہ سے مطلع فرما دیا تھا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ بعد میں اس حدیث میں "صلی" کی جگہ "قُبِّرَ" کر دیا گیا اس طرح عبارت یوں ہوگئی:

(۲۲۵)......قُبِّرَ فِيْ مَسْجِدِ الْخَيْفِ سَبْعُوْنَ نَبِيًّا۔

"مسجد خیف میں ستر نبیوں کو دفن کیا گیا"

---

[1] المعجم الاوسط للطبرانی ح ۵۴۰۳۔ کنز العمال ح ۳۴۷۹۳، "شنوءہ" یمن کا ایک قبیلہ ہے جو عبداللہ بن کعب بن عبداللہ بن مالک بن نصر بن ازد کی طرف منسوب ہے، جس کا لقب "شنوءۃ" تھا۔ اس کو یہ لقب اس کے اور اس کے گھر والوں کے درمیان عداوت کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ (فتح الباری: ص۱۵۶۴، ج۲)

[2] الصحیحہ: ص ۳۷، ج۵

اس طرح یہ حدیث ان لوگوں کے دعویٰ سے ہم آہنگ ہوگئی جو مسجدوں میں بزرگوں اور اولیاء اللہ کو دفن کرنے اور ایسی مسجدوں میں نماز کو صحیح کہتے ہیں جن میں قبریں ہوں۔

محدّث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ ''تحذیر الساجد من اتخاذ القبور مساجد'' میں لکھتے ہیں:

مذکورہ لفظ کے ساتھ اس حدیث کو ہم صحیح نہیں سمجھتے۔ کیونکہ صحیح حدیثوں کی تدوین سے جن ائمہ کا تعلق رہا ہے ان میں سے کسی نے اس کی روایت نہیں کی۔ قدیم ائمہ حدیث میں جن کی تصحیح کا اعتبار رہا ہے ان میں سے کسی نے بھی اس کو صحیح نہیں قرار دیا ہے۔ اس کی سند میں ایسے راوی شامل ہیں جو نامانوس اور غیر معقول روایتیں نقل کرنے میں مشہور تھے۔ چنانچہ حافظ طبرانی المعجم الکبیر[1] میں لکھتے ہیں:

ہم سے عبدان بن احمد نے بیان کیا، کہا: ہم کو عیسیٰ بن شاذان نے خبر دی، کہا ہم کو ابو ہمام دلال نے خبر دی، کہا: ہم کو ابراہیم بن طہمان نے منصور سے، انہوں نے مجاہد سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے خبر دی:

((فِيْ مَسْجِدِ الْخِيْفِ قَبْرُ سَبْعِيْنَ نَبِيًّا))

''مسجد خیف میں ستر نبیوں کی قبریں ہیں''

اور حافظ ہیثمی نے مجمع الزوائد[2] میں یہ روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے۔

((فِيْ مَسْجِدِ الْخِيْفِ قُبِرَ سَبْعُوْنَ نَبِيًّا))

''مسجد خیف میں ستر نبی دفن کیے گئے''

ھیثمی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس کی روایت حافظ بزار نے کی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

محدث البانی لکھتے ہیں:

طبرانی کے راوی بھی ثقہ ہیں سوائے عبدان بن احمد کے۔ جس کا لقب اہوازی ہے۔ جب کہ طبرانی نے المعجم الصغیر[3] میں لکھا ہے اور مجھے اس کا کوئی ترجمہ نہیں ملا۔ اور وہ عبدان بن محمد مروزی کے علاوہ ہے۔ یہ مروزی بھی حافظ طبرانی کے شیوخ میں شمار ہوتے ہیں۔ ثقہ اور حافظ حدیث ہیں۔ تاریخ[4] بغداد اور تذکرۃ الحفاظ[5] وغیرہ میں ان کا ترجمہ موجود ہے۔

۱۔ المعجم الکبیر: ص ٢٠٤، ج ٢، ٣ ۲۔ مجمع الزوائد: ص ٢٩٨، ج ٣
۳۔ المعجم الصغیر: ص ٢٣٤
۴۔ تاریخ بغداد: ص ١٣٥، ج ١١ ۵۔ تذکرۃ الحفاظ: ص ٢٣٠، ج ٢

لیکن اس سند کے راویوں میں ایسے راوی بھی شامل ہیں جو نامعقول اور غریب روایتیں بیان کیا کرتے تھے۔ جیسے: عیس بن شاذان جس کے بارے میں امام ابن حبان نے ''الثقات'' میں لکھا ہے کہ وہ غریب اور انوکھی روایتیں بیان کرتا تھا۔

ابراہیم بن طہمان کے بارے میں حافظ ابوجعفر محمد بن عبد اللہ بن عمار موصلی کا قول ہے کہ: وہ روایت حدیث میں ضعیف تھا اور اس کی روایتوں میں تضاد ہوتا تھا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مذکورہ روایت:

((فِي مَسْجِدِ الْخَيْفِ قَبْرُ سَبْعِيْنَ نَبِيًّا))

''مسجد خیف میں ستر نبیوں کی قبریں ہیں'' یا

((فِي مَسْجِدِ الْخَيْفِ قُبِرَ سَبْعُوْنَ نَبِيًّا))

''مسجد خیف میں ستر نبی دفن کیے گئے تھے''

یا تو ابراہیم بن طہمان کے عجائبات میں سے ایک ہے یا عیس بن شاذان کے۔[1]

اوپر محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی مذکورہ روایت کے بارے میں جو وضاحتیں نقل کی گئی ہیں وہ علمی اعتبار سے بے حد وقیع ہیں۔ مگر ان سے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ روایت سند کے اعتبار سے صرف ضعیف ہے۔ جبکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ایک صحیح حدیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے وہ شاذ ہے۔ اور شاذ روایت مردود ہوتی ہے۔ خاص طور پر جبکہ اس کا متن اسلام کے توحیدی مزاج کے خلاف ہو اور وہ ایسے امر واقعہ سے ٹکراتا ہو جو ہر طرح کے شک وشبہ سے پاک ہو۔ امر واقعہ اور مسلمہ حقیت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام ان کی قبروں میں بالکل تر و تازہ اور محفوظ ہیں۔ جیسا کہ اوپر ایک صحیح حدیث کی روشنی میں بیان کیا جا چکا ہے۔

لہٰذا مسجد خیف کی تعمیر کے وقت اس کی بنیاد رکھنے کے لیے جب اس جگہ کھدائی ہوئی ہوگی تو وہاں مدفون انبیاء علیہم السلام کے اجسام ظاہر ہوگئے ہوں گے۔ جبکہ تاریخ کی کتابوں میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ مسجد خیف کی جگہ کھدائی کے موقع پر کسی بھی نبی کا جسم یا اس کا کوئی حصہ ظاہر ہوا ہو۔ حالانکہ اس مسجد کی تعمیر متعدد بار ہوئی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مسجد خیف میں ستر نبیوں کے مدفون ہونے کا واقعہ محض

[1] تحذير الساجد: ص ۹۳-۹۶

ایک دعویٰ ہے جس کے پیچھے کوئی دلیل نہیں ہے۔

اوپر میں نے جو مفروضہ پیش کیا ہے اس کی دلیل کے طور پر صحیح واقعات نقل کر رہا ہوں جن سے قبروں میں انبیاء علیہم السلام کے جسموں کے بالکل صحیح وسالم شکل میں موجود ہونے کا یقینی ثبوت ملتا ہے۔

(۱) امام مالک رحمہ اللہ مؤطا میں لکھتے ہیں:

حضرت عمرو بن جموح اور حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی قبر کو سیلاب نے کھول دیا تھا۔ یہ دونوں غزوۂ احد میں شہید ہوئے اور ایک ہی قبر میں دفن کیے گئے تھے۔ چنانچہ ان کی لاشوں کو دوسری جگہ دفن کرنے کے لیے ان کی قبر کو کھودا گیا تو ان کی لاشیں جوں کی توں تھیں جیسے ان دونوں کی کل ہی وفات ہوئی ہو۔ ان دونوں میں سے ایک زخمی ہو گئے تھے اور انہوں نے زخم پر اپنا ہاتھ رکھ لیا تھا اور اسی طرح ان کی تدفین ہوئی تھی اور کھدائی کے بعد جب ان کا ہاتھ زخم سے ہٹا کر چھوڑ دیا گیا تو وہ دوبارہ زخم پر چلا گیا۔ ان دونوں کی قبروں کو کھودنے اور غزوۂ احد کے درمیان ۴۶ سال کی مدت کا فاصلہ تھا۔[1]

(۲) اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک کے حکم سے مسجد نبوی شریف کی توسیع اور اس میں امہات المومنین کے حجروں کو شامل کرنے کے لیے قدیم عمارت گرائی گئی اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی مشرقی دیوار کھودی گئی تو ایک پاؤں ظاہر ہو گیا۔ لوگوں کو خوف ہوا کہ کہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک پاؤں نہ ہو۔ مگر تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پاؤں ہے۔[2] واضح رہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی تدفین ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں ہوئی تھی۔

مسجد نبوی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک سے غلط استدلال:

موجودہ وقت میں پوری دنیا میں بزرگان دین، اولیاء اور صالحین کی حقیقی اور مزعومہ قبروں کے پاس جن مشرکانہ اعمال کا ارتکاب ہوتا ہے ان کی روشنی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کو سمجھا جا سکتا ہے جن میں آپ نے قبروں کو عبادت گاہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس بیماری میں جس

[1] كتاب الجهاد، باب الدفن في قبر واحد: ص ٤٠٦، ح ٤٩

[2] البداية والنهاية ص ٤٤٣، ج٦، اور صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عروہ نے کہا: اللہ کی قسم یہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاؤں مبارک نہیں بلکہ حضرت عمر کا پاؤں ہے۔ حدیث: ۱۳۹۰

سے آپ جاں بر نہ ہو سکے تھے، فرمایا:

((لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ، اِتَّخَذُوا قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ، قَالَتْ عَائِشَةُ: لَوْلَا ذٰلِكَ لَأُبْرِزَ قَبْرُهُ، خَشِيَ أَنْ يُتَّخَذَ مَسْجِدًا))[1]

''اللہ لعنت فرمائے یہودیوں پر جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو آپ کی قبر نمایاں کردی جاتی۔ مگر خوف ہوا کہ یہ سجدہ گاہ نہ بنالی جائے''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ أُوْلَئِكَ إِذَا كَانَ فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ، فَمَاتَ بَنَوْا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا وَصَوَّرُوْا فِيهِ تِلْكَ الصُّوَرَ، أُوْلَئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))[2]

''درحقیقت یہ وہ لوگ تھے کہ اگر ان میں کوئی صالح مرد ہوتا اور وہ مرجاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے، اس میں وہ تصویریں بناتے۔ قیامت کے روز یہ بدترین مخلوق ہوں گے''

حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَلَا وَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِهِمْ وَصَالِحِيهِمْ مَسَاجِدَ، أَلَا، فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ، إِنِّي أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ))[3]

''خبردار، درحقیقت تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء اور صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے۔ خبردار، قبروں کو سجدہ گاہ مت بنانا، میں تم لوگوں کو اس سے منع کرتا ہوں''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِيْنَ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ))[4]

''اللہ نے لعنت فرمائی ہے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں پر مسجدیں بنانے

---

[1] صحیح بخاری: ح ٤٤٤١۔ صحیح مسلم ٥٣١۔ نسائی ٢٠٤٦

[2] صحیح بخاری: ح ٤٢٧۔ صحیح مسلم: ح ٥٢٨۔ نسائی ح ٧٠٣۔ مسند امام احمد ٢٤٧٥٦

[3] صحیح مسلم: ح ٥٣٢

[4] ابوداؤد: ح ٣٢٣٦۔ ترمذی ٣٢٠۔ نسائی ٢٠٤٢۔ مسند امام أحمد: ٢٩٨٥، ٣١١٨

اور چراغ روشن کرنے والوں پر۔“

رسول اکرم ﷺ کے یہ ارشادات قبروں پر مسجدیں بنانے کی حرمت پر کس قدر واضح ہیں۔ ایسا کرنے والوں کے لیے ان میں کس قدر وعید ہے۔ مگر برا ہو ذہنیتوں کے فتور کا کہ بدعقیدہ لوگوں نے اس ذات اطہر کی قبر مبارک کو قبر پرستی کی دلیل بنالیا جس کی زبان مبارک سے یہ ارشادات نکلے ہیں۔ کہتے ہیں:

اگر قبروں پر مسجد یا عمارت بنانا اور مسجد میں قبر بنانا حرام ہوتا تو نبی مکرم ﷺ کو مسجد میں دفن نہ کیا جاتا۔“ کس قدر مغالطہ آمیز اور گمراہ کن ہے یہ دعویٰ۔ کیونکہ جس شخص کو بھی سیرت پاک کے واقعات کا علم ہے اسے یہ بات معلوم ہوگی کہ مسجد نبوی علی صاحبہ الصلاۃ والسلام قبروں پر نہیں بنائی گئی ہے۔ بلکہ جس جگہ اس کی تعمیر ہوئی وہاں زمین میں مشرکین کی چند پرانی قبریں، کچھ ویرانہ اور کھجور کے کچھ درخت تھے۔ مشرکین کی قبریں اکھڑوا دی گئیں۔ ویرانہ برابر کر دیا گیا اور کھجور کے درختوں کو کاٹ کر قبلے کی جانب لگوا دیا گیا۔[۱]

اور جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ کو ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں دفن کیا گیا کیونکہ آپ کی وفات وہیں ہوئی تھی۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی روح قبض کی گئی تو لوگوں میں آپ کے دفن کے بارے میں اختلاف ہوگیا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر اختلاف ختم کر دیا:

((سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا مَا نَسِيْتُهُ، قَالَ: مَا قَبَضَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا فِي الْمَوْضِعِ الَّذِيْ يُحِبُّ أَنْ يُدْفَنَ فِيْهِ۔ فَادْفِنُوْهُ فِيْ مَوْضِعِ فِرَاشِهِ))[۲]

”اللہ نے ہر نبی کی روح اس جگہ قبض کی ہے جہاں وہ دفن ہونا چاہتا تھا۔ لہٰذا آپ کو آپ کے بستر کی جگہ دفن کرو۔“

امام ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ جس کا سبب یہ بتایا کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس حدیث کے راوی عبدالرحمٰن بن ابوبکر ملیکی حافظہ کے کمزور تھے۔ مگر امام ترمذی نے یہ

---

[۱] صحیح بخاری: ح ۳۹۳۲ [۲] جامع ترمذی: ح ۱۰۱۸

بھی لکھا ہے کہ یہ حدیث ایک سے زیادہ سندوں سے مروی ہے جن میں سے ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عباس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے۔ اسی وجہ سے محدث محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے احکام الجنائز میں لکھا ہے:

"یہ حدیث دوسری سندوں اور شواہد کی وجہ سے ثابت ہے"[1]

بہر حال یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں ہوئی اور اس کا سبب اوپر نقل کردہ حدیث کے علاوہ یہ بھی تھا کہ آپ کی قبر کھلی جگہ نہ ہو جیسا کہ اوپر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں اس کی صراحت ہے تاکہ وہ سجدہ گاہ، بت اور جشن گاہ نہ بننے پائے۔ جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا میں اپنی حیات پاک کے آخری لمحات میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی اور قبروں کو سجدہ گاہ اور مزار بنانے والوں پر لعنت بھیجی تھی۔

اس کے بعد جب خلیفہ راشد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں اور آپ کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں مسجد نبوی میں توسیع فرمائی تو حجروں سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ حجرے جوں کے توں باقی رہے اور دوسری طرف سے اس میں توسیع کی گئی۔

اس سے یہ واضح ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین مسجد نبوی میں نہیں بلکہ اس سے باہر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں ہوئی تھی۔ خلفائے راشدین کے عہد میمون میں جب دو بار اس کی توسیع ہوئی تو اس وقت بھی آپ کی قبر مبارک مسجد سے باہر ہی رہی۔ لہٰذا جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد نبوی میں دفن کیا گیا تھا اس لیے مسجدوں میں مردوں کو دفن کرنا جائز ہے۔ وہ اسلام کی بیّن اور واضح تعلیمات کے ساتھ ساتھ مسلمہ تاریخی حقیقت کو بھی جھٹلانے کا ارتکاب کرتے ہیں۔

البتہ یہ بات صحیح ہے کہ بعد میں جب مسجد نبوی میں توسیع ہوئی تو امہات المومنین کے حجروں کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا اور اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک بھی مسجد میں داخل ہو گئی۔ مگر چونکہ یہ کام خلفائے راشدین کے عہد مبارک میں نہیں بلکہ اس سے نصف صدی بعد ایک ایسے مسلم حکمران کے ہاتھوں ہوا تھا جو کسی بھی حال میں شرعی دلیل نہیں ہے۔

۸۸ ہجری میں اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے مدینہ منورہ میں اپنے گورنر عمر بن عبدالعزیز کو لکھا کہ امہات المومنین کے حجروں کو گرا کر ان کو مسجد نبوی میں شامل کر دیا جائے۔[2] اس طرح قبر مبارک مسجد

---

[1] احکام الجنائز: ص ۱۷٤

[2] البدایہ والنہایہ: ص ٤٤٣، ج ٦

میں آ گئی۔ ۸۸ ہجری میں اگر چہ بعض صحابہ کرام باحیات تھے لیکن اس وقت مدینہ منورہ میں کوئی بھی صحابی نہیں تھا۔ اگر چہ بعض مؤرخین نے یہ دعویٰ کیا ہے۔

ولید بن عبد الملک کا یہ عمل رسول اکرم ﷺ کے ان تمام ارشادات کے خلاف تھا جن میں آپ نے مسجدوں میں مردوں کو دفن کرنے اور قبروں پر مسجدیں بنانے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((أَنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى أَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ وَأَنْ يُبْنٰى عَلَيْهِ))[1]

''نبی مکرم ﷺ نے قبر کو پختہ کرنے، اس پر بیٹھنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے''

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر ولید بن عبد الملک کا یہ عمل غلط تھا تو اس وقت کے علماء نے اس کو اس سے منع کیوں نہیں کیا تھا؟ تو اس کے جواب میں ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ: ولید کا یہ عمل سو فیصد غلط تھا رہی یہ بات کہ اس وقت کے علماء نے اس کو اس عمل سے روکا نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر چہ تاریخ میں صحیح سند سے کوئی ایسا واقعہ مذکور نہیں ہے کہ کسی عالم نے ولید کو امہات المومنین کے حجروں کی جانب سے مسجد نبوی میں توسیع سے منع کیا ہو۔ لیکن اس وقت کے علماء میں حق کے اظہار و اعلان اور باطل کے انکار کی جو بے مثال جرأت تھی اس کی روشنی میں قرین عقل یہی ہے کہ اس وقت کے علماء نے ولید کو ایسا کرنے سے ضرور روکا ہوگا۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ حکام جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر اس کی تنقید کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں ولید تو خیر ان پڑھ تھا لیکن اس کا باپ عبد الملک بن مروان جو زبردست عالم و فاضل اور فقیہ تھا اس نے بھی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے تعمیر کردہ کعبہ مشرفہ کو بلا کسی تحقیق کے محض حجاج کے کہنے پر منہدم کرا کے دوبارہ اس نقشے کے مطابق تعمیر کرا دیا تھا جس کے مطابق عربوں نے اس کی تعمیر کی تھی۔ اور جب اس کو یہ بتایا گیا کہ ابن زبیر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر کعبہ مشرفہ کی تعمیر اپنی خالہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ سننے کے بعد کی تھی کہ رسول اکرم ﷺ کی خود یہ خواہش تھی مگر تعمیر کے مصارف کی کمی اور عہد جاہلیت کے قرب کی وجہ سے آپ نے ایسا نہیں کیا، تو اس نے افسوس کا اظہار کیا تھا۔[2]

بہر حال ولید بن عبد الملک کی توسیع اور پھر اس کے بعد کی توسیعات اور سعودی عہد کی تاریخی توسیع

---

[1] صحیح مسلم: ۹۷۰

[2] صحیح مسلم: ح ۳۲۴۶، ۳۲۴۸۔ الصحیحۃ: ص ۱۰۵، ج ۱، ح ۴۳

کے بعد اگرچہ قبر مبارک مسجد میں داخل ہے لیکن اس طرح کہ وہ مسجد سے الگ ایک مستقل حجرے میں ہے اور دیواروں میں گھری ہوئی ہے۔ اس کو قبلہ سے الگ رکھا گیا ہے بایں طور کہ نماز پڑھتے ہوئے کسی کا منہ اس کی طرف نہیں ہوتا۔

مزید یہ کہ سعودی عہد کے آغاز سے محافظین کا ایک دستہ ہمہ وقت وہاں موجود رہتا ہے جو کسی بھی شخص کو وہاں کوئی خلاف شرع حرکت کرنے سے باز رکھتا ہے۔

لہٰذا مسجد نبوی میں رسول اکرم ﷺ کی قبر مبارک کا ہونا اہل قبور کے لیے کسی بھی حال میں وجہ استدلال نہیں ہوسکتا۔

کشتی نوح کا طواف کعبہ:

یوں تو کائنات میں جتنی چیزیں پائی جاتی ہیں چاہے ان کا تعلق جمادات سے ہو یا نباتات سے وہ ذی عقل ہوں یا غیر ذی عقل، تکوینی طور پر اللہ کی حمد و تسبیح بیان کرتی رہتی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ط ﴾ [الاسراء:٤٤]

''اس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں جو ان کے اندر ہیں، بیان کر رہی ہیں۔ کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو''

لیکن اللہ تعالیٰ نے جو حسی عبادات فرض کی ہیں ان کے مکلّف صرف ذی عقل ہیں۔ جمادات، نباتات اور غیر ذی عقل حیوانات نہ ان کے مکلّف ہیں اور نہ اپنے اختیار و ارادے سے حسی طور پر یہ عبادات کرنے پر قادر ہی ہیں۔

ابو الولید ازرقی تاریخ مکہ میں اور حافظ ابن کثیر البدایۃ والنہایہ میں لکھتے ہیں کہ عکرمہ سے روایت ہے اور وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

(٢٢٦)......كَانَ مَعَ نُوْحٍ فِي السَّفِيْنَةِ ثَمَانُوْنَ رَجُلًا، مَعَهُمْ أَهْلُوْهُمْ، وَأَنَّهُمْ كَانُوْا فِي السَّفِيْنَةِ مِائَةً وَخَمْسِيْنَ يَوْمًا وَأَنَّ اللّٰهَ تَعَالَى وَجَّهَ السَّفِيْنَةَ إِلَى مَكَّةَ، فَدَارَتْ بِالْبَيْتِ أَرْبَعِيْنَ يَوْمًا، ثُمَّ وَجَّهَهَا اللّٰهُ تَعَالَى إِلَى الْجُوْدِيِّ۔

''حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں ۸۰ مرد اپنے اہل و عیال کے ساتھ سوار تھے اور کشتی

میں وہ ۱۵۰ دن تک سوار رہے۔ اللہ تعالیٰ نے کشتی کا رخ مکہ کی طرف پھیر دیا جہاں اس نے چالیس روز تک بیت اللہ کا طواف کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا رخ جودی پہاڑ کی طرف پھیر دیا"[۱]

یہ روایت بالکل من گھڑت ہے جس کا لفظ لفظ اس کے من گھڑت ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی صحیح حدیث میں حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں کی تعداد اور ان کے کشتی میں قیام کی مدت بیان نہیں کی گئی ہے رہا کشتی کا طواف بیت اللہ کرنا تو اس کی غیر معقولیت وضاحت کی محتاج نہیں۔

ازرقی کی کتاب تاریخ مکہ اس طرح کی من گھڑت اور بے بنیاد روایتوں سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن حافظ ابن کثیر نے بھی یہ روایت نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ حالانکہ ان کو اس کی نکارت بیان کرنی چاہیے تھی۔

البتہ البدایہ والنہایہ میں بیت عتیق کے ذکر کے موقع پر انہوں نے دوسری چیزوں کے ضمن میں کشتی نوح کے طواف کعبہ کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کو اسرائیلیات سے ماخوذ قرار دیا ہے۔[۲]

عوج بن عوق:

قصص الانبیاء کے موضوع پر عربی، فارسی اور اردو میں جو کتابیں ملتی ہیں ان میں ایک افسانوی انسان کا ذکر ملتا ہے جس کا نام عوج بن عنق بتایا گیا ہے۔ لیکن علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے القاموس المحیط میں لکھا ہے کہ صحیح لفظ عوج بن عوق ہے۔ اس شخص کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کے گھر میں پیدا ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک زندہ رہا۔

تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں عوج بن عوق کے درج ذیل اوصاف بیان ہوئے ہیں:

(۲۲۷)......كَانَ طُوْلُهُ ثَلَاثَةَ آلَافِ ذِرَاعٍ وَثَلَاثَمِائَةٍ وَثَلَاثَةً وَثَلَاثِيْنَ وَأَنَّ نُوْحًا لَمَّا خَوَّفَهُ الْغَرَقَ، قَالَ لَهُ: إِحْمِلْنِيْ فِيْ قَصْعَتِكَ هٰذِهِ وَأَنَّ الطُّوْفَانَ لَمْ يَصِلْ إِلَى كَعْبِهِ وَأَنَّهُ خَاضَ الْبَحْرَ فَوَصَلَ إِلَى حُجْزَتِهِ وَأَنَّهُ كَانَ يَأْخُذَ الْحُوْتَ الشَّمْسِ وَأَنَّهُ قَلَعَ صَخْرَةً عَظِيْمَةً عَلَى قَدَرِ عَسْكَرِ مُوْسَى وَأَرَادَ أَنْ

---

[۱] تاریخ مکہ: ص ۷۰، ج۱، البدایہ والنہایہ: ص ۱۳۳، ج۱

[۲] البدایہ والنہایة: ص ۱۸۹، ۱۹۰، ج۱

مِنْ قَرَارِ الْبَحْرِ فَيَشْوِيْهِ فِي عَيْنٍ يَرْضُخُهُمْ بِهَا، فَطَوَّقَهَا اللّٰهُ فِي عُنُقِهِ مِثْلَ الطَّوْقِ۔

''عوج بن عوق کی لمبائی تین ہزار تین سو تینتیس ذراع یعنی ہاتھ تھی (۱۲و۲۱۳۳ میٹر) اور جب نوح علیہ السلام نے اس کو طوفان میں غرق ہونے کا خوف دلایا تو اس نے کہا: مجھے اپنے پیالے (کشتی) میں سوار کر لیجیے۔ اس وقت طوفانِ نوح کا پانی اس کے ٹخنے تک بھی نہیں پہنچا اور جب وہ سمندر میں اترا تو اس کا پانی صرف اس کی کمر تک تھا۔ وہ سمندر کی گہرائی سے مچھلی پکڑ کر قرصِ آفتاب میں بھون لیا کرتا تھا۔ اس نے ایک بہت بڑی چٹان کو جڑ سے اکھاڑ لیا جو موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کے برابر تھی اور اس کو موسیٰ علیہ السلام کے لشکر پر ڈال دینا چاہا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس چٹان کو اس کے گلے میں طوق بنا کر پہنا دیا۔''

یہ جھوٹی روایت ملا علی قاری نے الاسرار المرفوعہ[۱] میں، حافظ بغوی نے معالم التنزیل[۲] میں، حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ[۳] میں، حافظ سیوطی نے الاوج فی خبر عوج[۴] میں اور علامہ مرعی بن یوسف کرمی مقدسی نے الفوائد الموضوعہ[۵] میں نقل کی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر جو عذاب آیا تھا اس سے صرف وہی لوگ محفوظ رہے تھے جو ان پر ایمان لائے تھے۔ چاہے وہ ان کے اہل بیت ہوں یا ان کی قوم کے مومن افراد۔ قرآن یہ صراحت کرتا ہے کہ ان کی بیوی اور بیٹا کافروں میں شامل تھے۔ لہٰذا اگر عوج بن عوق کا واقعہ صحیح ہوتا تو اس کی ضخامت کے پیشِ نظر قرآن یا حدیث میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔ یہ بیان کیا جاتا کہ نوح علیہ السلام کے بیٹے کے ساتھ ایسا ضخیم اور طویل القامت انسان بھی سیلاب سے محفوظ نہ رہ سکا۔ دوسرے مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ نہایت سرکش کافر تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ تو اس کا تباہ ہونا ضروری تھا تاکہ سرکشوں کے لیے عبرت کا باعث ہو۔

حافظ ابن کثیر عوج بن عوق کی خیالی لمبائی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

عوج بن عوق کی یہ لمبائی یاوہ گوئی کے سوا کچھ اور نہیں ہے کیونکہ یہ عقل و نقل کے خلاف ہے۔

---

۱ الاسرار ص ۴۲۵
۲ معالم التنزیل: ص ۶۲۱
۳ البدایہ والنہایہ: ص ۱۳۱، ج۱
۴ الأوج فی خبر عوج ص ۵۷۳-۵۷۸، ج۲
۵ الفوائد الموضوعہ: ص ۸۰، ح ۲۲

حدیث میں ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی لمبائی ساٹھ ذراع بتائی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

((خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ وَطُوْلُهُ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا...... فَلَمْ یَزَلِ الْخَلْقُ یَنْقُصُ حَتّٰی الْآنَ))[1]

"اللہ نے آدم کو اس حال میں پیدا کیا کہ ان کی لمبائی ساٹھ ہاتھ (۲۸و۴ میٹر) تھی اس وقت سے انسانوں کی لمبائی گھٹتے گھٹتے ان کی موجودہ لمبائی تک پہنچی ہے"

اس حدیث مبارک نے اس بات کی وضاحت کروی کہ آدم علیہ السلام کی ذریت میں ان سے زیادہ دراز قامت کوئی نہیں پیدا ہوا۔

درحقیقت عوج بن عوق کا قصہ اہل کتاب کے ان ملحدوں اور فاجروں کا گھڑا ہوا ہے جو انبیاء علیہم السلام سے عدوات رکھتے تھے۔

اور ملا علی قاری یہ جھوٹی روایت نقل کرنے کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تعجب اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے کذاب کی جرأت پر نہیں، بلکہ ان علماء پر ہے جنہوں نے اپنی تفسیروں اور دوسری تصنیفات میں اس کو نقل کیا ہے اور اس کی حقیقت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔

حافظ حسین بن مسعود بغوی کا قول زیادہ قابل تعجب ہے جنہوں نے معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ عوج بن عوق کے بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قتل کیا تھا۔ طوفانِ نوح سے اس کی نجات کا سبب یہ تھا کہ نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کے لیے ساگوان کی لکڑی کی ضرورت تھی جس کو وہ خود نہیں لا سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے عوج بن عوق سے مدد لی اور وہ یہ لکڑی شام سے ان کے لیے لایا۔ اس طرح وہ طوفان نوح میں ڈوبنے سے محفوظ رہا"۔

یعنی اس کی اس خدمت کے عوض اللہ تعالیٰ نے اس کے کفر و عناد کے باوجود اس کو طوفان میں ڈوبنے سے محفوظ رکھا۔

ایک جھوٹے واقعہ کی یہ جھوٹی توجیہہ کس قدر عجیب اور قرآن پاک کی اس تصریح کے کس قدر خلاف ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهُ هُمُ الْبٰقِیْنَ ۝ ﴾ [الاعراف:۷۷]

[1] صحیح بخاری: ح ۳۳۲۶، صحیح مسلم: ۷۱۶۳، ۲۸٤۱

''اور ہم نے صرف نوح کی ذریت ہی کو باقی رکھا''

اور اگر عوج بن عوق کا کوئی وجود ہوتا بھی اور اس کی مذکورہ لمبائی کی کوئی حقیقت بھی ہوتی تو اس کی اس فاصلے سے کیا نسبت تھی جو زمین اور سورج کے درمیان پایا جاتا ہے۔ عوج کی افسانوی لمبائی ۲۱۳۳۲ و ۲۱ میٹر تھی جبکہ علم فلک اور سائنس کی تحقیق کی رو سے زمین سے سورج کا فاصلہ ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ سورج کا درجہ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ سنٹی گریڈ ہے۔ اس حرارت کا لاکھواں حصہ بھی لوہا اور پتھر نہیں برداشت کر سکتا تو پھر ایک گوشت پوست کا انسان جو سورج کو براہ راست دیکھ نہیں سکتا، اس میں مچھلی کیونکر بھون سکتا اور خود اس کی حرارت سے محفوظ کیسے رہتا ہوگا؟

کیا تمام انسان حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں؟

سورۃ الصفات کی مذکورہ بالا آیت کے ظاہری الفاظ کی بنیاد پر بیشتر مفسرین اس کے قائل ہیں کہ طوفان کے بعد صرف نوح علیہ السلام کی اولاد ہی دنیا میں باقی رہی اور تمام انسان انہی کی اولاد ہیں۔ لیکن قرآن پاک کی دوسری آیات یہ مراد لینے میں مانع ہیں۔ مثال کے طور پر سورۃ الاسراء کی درج ذیل آیت:

﴿ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ﴾ [الاسراء:۳]

''اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کرایا تھا، بے شک وہ ایک شکر گزار بندہ تھا''

یہ آیت اس امر میں صریح ہے کہ نزول قرآن کے وقت زمین میں پائے جانے والے انسان حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد اور ان پر ایمان لانے والوں کی اولاد تھے۔ اسی وجہ سے ان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ تم ان لوگوں کی ذریت اور اولاد ہو جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی نوح پر ایمان لانے کی وجہ سے طوفان میں ڈوبنے اور ہلاک ہونے سے محفوظ رکھا۔ لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کو یاد رکھو اور اپنے نبی کی طرح اپنے رب کے شکر گزار بندے بنو۔

دراصل کسی قوم کا نبی ان کا مجازی باپ ہوتا ہے جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ، أُعَلِّمُكُمْ؛ فَإِذَا أَتَى أَحَدُكُمُ الْغَائِطَ فَلَا يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَلَا يَسْتَدْبِرْهَا، وَلَا يَسْتَطِبْ بِيَمِينِهِ))[1]

''بلاشبہ میں تمہارے لیے باپ کے درجے میں ہوں اور تمہیں تعلیم دیتا ہوں۔ لہٰذا جب تم

[1] ابوداؤد: ح ۸۔ نسائی ۴۰۔ ابن ماجہ ۳۱۸۔ مسند امام احمد ۳۷۶۲۔ صحیح ابن حبان ۱۴۴۰

میں سے کوئی قضائے حاجت کے لیے جائے تو نہ قبلے کی طرف منہ کرے اور نہ پیٹھ۔ اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت حاصل کرے۔“

مفسرین نے جس حدیث کی بنیاد پر تمام انسانوں کو حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں کی اولاد قرار دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

(۲۲۸)......سَامُ أَبُو الْعَرَبِ، وَحَامُ أَبُو الْحَبَشِ وَيَافِثُ أَبُو الرُّوْمِ۔

”سام عربوں کے جدامجد، حام حبشیوں کے جدامجد اور یافث رومیوں کے جدامجد ہیں۔“

یہ روایت ضعیف ہے جس کی تخریج امام ترمذی نے سنن[1] میں، حاکم نے مستدرک[2] میں اور امام احمد نے مسند[3] میں حسن بصری کے طریق سے کی ہے۔

سمرہ بن جندب سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:......

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے حسن بصری کا سماع مختلف فیہ ہے اور اگر یہ سماع ثابت بھی ہوتا تو چونکہ وہ مدلس تھے اور انہوں نے یہ حدیث ”عنعنہ“ سے روایت کی ہے اس لیے ضعیف ہے۔

یہ حدیث دوسرے الفاظ میں بھی مروی ہے:

(۲۲۹)......وُلِدَ لِنُوْحٍ ثَلَاثَةٌ: سَامُ، وَحَامُ، وَيَافِثُ، فَوَلَدُ سَام: الْعَرَبُ وَفَارِسُ وَالرُّوْمُ وَالْخَيْرُ فِيْهِمْ، وَوَلَدُ يَافِثَ، يَاجُوْجُ وَمَاجُوْجُ وَالصَّقَالِبَةُ وَلَا خَيْرَ فِيْهِمْ، وَوَلَدُ حَامَ: الْقِبْطَ وَالْبَرْ بَرُ وَلَا خَيْرَ فِيْهِمْ۔

”نوح کے تین بیٹے ہوئے: سام، حام اور یافث۔ سام کی اولاد عرب، اہل فارس اور رومی ہیں، جن میں بھلائی ہے۔ یافث کی اولاد یاجوج ماجوج، ترک اور صلاوی ہیں۔ ان میں کوئی خیر نہیں۔ اور حام کی اولاد قبطی اور بر ابر ہیں۔ ان میں بھی کوئی خیر نہیں ہے“

یہ روایت بھی صحیح نہیں۔ اس کی تخریج حافظ احمد بن عمرو البزار نے مسند[4] میں اور حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق[5] میں محمد بن یزید بن سنان کی سند سے کی ہے:

ہم سے یزید بن سنان نے بیان کیا، کہا: مجھ سے یحییٰ بن سعد نے، سعید بن مسیب سے اور انہوں

---

[1] جامع ترمذی: ح ۳۲۳۱
[2] مسند امام احمد ح ۲۰۳۵۹
[3] مستدرك حاكم: ح ۴۰۶۰
[4] مسند البزار: ح ۲۹
[5] تاريخ دمشق: ص ۳۳۵، ج ۱۷

نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا:

یہ روایت نقل کرنے کے بعد حافظ بزار لکھتے ہیں:

''اس کی روایت میں یزید بن سنان منفرد ہے اور اس سے اس کا بیٹا محمد منفرد ہے۔ دوسروں نے اس کی روایت مرسل کی ہے اور اس کو سعید بن مسیب کا قول قرار دیا ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

حافظ ہیثمی کا قول ہے: یزید کو یحییٰ بن معین اور دوسروں نے ضعیف قرار دیا ہے۔ جبکہ امام ابو حاتم نے اس کی توثیق کی ہے۔

حافظ زین الدین عراقی نے "محجة القرب الى فضل العرب"[1] میں لکھا ہے:

یہ روایت یزید بن سنان کی سند کے علاوہ دوسری سند سے بھی مروی ہے جس کا ذکر امام ابن عدی نے الکامل میں اور حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں اس سند سے کیا ہے۔

''سلیمان بن ارقم، زہری سے روایت کرتا ہے، وہ سعید بن مسیب سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے۔ سلیمان بن ارقم متروک الحدیث ہے اور ابن عدی نے بھی الکامل میں یزید بن سنان کے ترجمہ کے ضمن میں اس کو متروک قرار دیا ہے۔ امام نسائی کا قول ہے: اس کی روایت کردہ بیشتر حدیثیں غیر محفوظ ہیں اور یزید بن سنان متروک ہے۔

اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث جتنے طرق سے بھی مروی ہے ان میں سے کسی بھی طریق سے صحیح نہیں۔[2]

معلوم ہوا کہ تمام انسانوں کے حضرت نوح علیہ السلام کے تینوں بیٹوں کی نسل سے ہونے کے بارے میں کوئی بھی روایت صحیح نہیں ہے۔ بلکہ کسی بھی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے صرف تین بیٹے طوفان سے محفوظ رہے تھے۔

(۲۳۰)......إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَا جُوجَ مِنْ وَلَدِ آدَمَ، وَإِنَّهُمْ لَوْ أُرْسِلُوْا إِلَى النَّاسِ لَأَفْسَدُوْا عَلَيْهِمْ مَعَايِشَهُمْ، وَلَنْ يَمُوْتَ مِنْهُمْ اَحَدٌ إِلَّا تَرَكَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِ أَلْفًا فَصَاعِدًا، وَإِنَّ مِنْ وَرَائِهِمْ ثَلَاثَ أُمَمٍ: تَاوِيْلُ، وَتَارِيْسُ وَمَنْسَكُ۔

---

[1] محجّة القرب إلى فضل العرب: ص ٤، ج١ [2] الضعيفہ: ص ١٦٠-١٦١، ج٨

''یاجوج ماجوج آدم کی اولاد سے ہیں اور ان کو آزاد کر دیا جائے تو وہ لوگوں کے ذرائع معاش کو تباہ کر کے رکھ دیں۔ اور ان میں سے کوئی اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک کہ اپنی ذریت میں سے ایک ہزار یا اس سے زیادہ نہ چھوڑ دے گا اور ان کے پیچھے تین قومیں ہیں تاویل، تاریس اور منسک''

یہ روایت منکر ہے۔ اوپر جو روایت گزری ہے اس میں یاجوج ماجوج کو حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ اس زیر بحث منکر روایت میں ان کے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے!

اس منکر روایت کی تخریج حافظ ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند[1] میں کی ہے اور انہی کی سند سے حافظ طبرانی نے المعجم الصغیر[2] میں کچھ مختلف الفاظ میں کی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ[3] میں اس روایت کو مسند طیالسی سے اوپر مذکور الفاظ میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے:

یہ بے حد ضعیف ہے۔ اس کی سند کمزور ہے اور اس میں شدید نکارت پائی جاتی ہے۔

حافظ ہیثمی نے یہ روایت مجمع الزوائد[4] میں نقل کی ہے۔ لکھا ہے کہ الطبرانی نے اس کی روایت المعجم الکبیر اور المعجم الاوسط میں کی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

محدث محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

حافظ ہیثمی کی یہ بات صحیح نہیں ہے اور اس میں دو علتیں پائی جاتی ہیں:

(۱) اس روایت کی سند کا ایک راوی، وہب بن جابر مجہول ہے۔ کیونکہ اس کو ابن حبان کے سوا کسی اور نے ثقہ نہیں قرار دیا۔ ابن حبان نے وہب بن جابر سے روایت کرنے والے صرف ایک راوی ابواسحاق سبیعی کا ذکر کیا ہے۔ اسی وجہ سے امام ذہبی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

امام ابن مدینی نے اس کو مجہول بتایا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ تقریباً غیر معروف ہے اور اس سے یہ حدیث روایت کرنے میں ابواسحاق منفرد ہے۔

(۲) اب رہا ابواسحاق سبیعی تو اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا اور اس روایت کی سند میں اس سے غلطی ہوگئی ہے۔

---

[1] مسند طیالسی: ح ۲۲۸۲ [2] المعجم الصغیر: ص ۲۷۲، ج۹، ح ۸۵۹۳
[3] البدایہ والنہایہ: ص ۵۱۲، ج۱ [4] مجمع الزوائد: ص ۶، ج۸

محدث البانی مزید لکھتے ہیں:

اس روایت کی تیسری علت اس کا موقوف ہونا ہے۔[1]

واضح رہے کہ قرآن پاک میں صرف دو مقام پر یاجوج ماجوج کا ذکر آیا ہے اور وہ بھی اجمال کے ساتھ۔ اسی طرح کسی صحیح حدیث میں ان کی کوئی تفصیل بیان نہیں ہوئی ہے۔

حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ[2] میں امام ابن جریر طبری کے قول: رسول اللہ ﷺ اسراء کی رات ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو اللہ پر ایمان کی دعوت دی تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور آپ کی اتباع سے پہلوتہی کی۔ پھر آپ نے وہاں موجود دوسری قوموں تاریس، تاویل اور منسک کو دعوت دی تو انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی...... تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ واقعہ موضوع اور جھوٹ ہے۔

(۲۳۱)......يَأْجُوجُ أُمَّةٌ وَمَاجُوجُ أُمَّةٌ، كُلُّ أُمَّةٍ أَرْبَعُ مِئَةِ أَلْفٍ، لَا يَمُوتُ الرَّجُلُ حَتَّى يَنْظُرَ إِلَى أَلْفِ ذَكَرٍ بَيْنَ يَدَيْهِ مِنْ صُلْبِهِ، كُلٌّ قَدْ حَمَلَ السِّلَاحَ۔ قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! صِفْهُمْ لَنَا۔ قَالَ:

هُمْ ثَلَاثَةُ أَصْنَافٍ: صِنْفٌ مِنْهُمْ أَمْثَالُ الْأَرْزِ۔ قُلْتُ: وَمَا الْأَرْزُ؟ قَالَ: شَجَرٌ بِالشَّامِ، طُولُ الشَّجَرَةِ عِشْرُونَ وَمِئَةُ ذِرَاعٍ فِي السَّمَاءِ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هٰؤُلَاءِ لَا يَقُومُ لَهُمْ جَبَلٌ وَلَا حَدِيدٌ۔ وَصِنْفٌ مِنْهُمْ يَفْتَرِشُ بِأُذُنِهِ وَيَلْتَحِفُ بِالْأُخْرَى، لَا يَمُرُّونَ بِفِيلٍ وَلَا وَحْشٍ وَلَا جَمَلٍ وَلَا خِنْزِيرٍ إِلَّا أَكَلُوهُ، وَمَنْ مَاتَ مِنْهُمْ أَكَلُوهُ، مُقَدِّمَتُهُمْ بِالشَّامِ وَسَاقَتُهُمْ بِخُرَاسَانَ، يَشْرَبُونَ أَنْهَارَ الْمَشْرِقِ وَبُحَيْرَةَ طَبَرِيَّةَ۔

''یاجوج ایک امت ہے اور ماجوج ایک امت۔ ہر امت کی تعداد چار لاکھ ہے۔ ان میں سے کوئی اس وقت تک نہیں مرتا جب تک کہ وہ اپنی صلب سے ایک ہزار مردوں کو اپنے سامنے نہ دیکھ لے جو سب کے سب ہتھیار اٹھانے کے قابل ہوں۔

میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم سے ان کا وصف بیان فرما دیجیے۔ فرمایا: ان کی تین

[1] الضعیفہ: ص ۱۵۹-۱۶۰، ج۹ [2] البدایہ والنہایہ: ص ۵۱۲، ج۱

قسمیں ہیں: ان کی ایک قسم توارز کی مانند ہے۔ میں نے عرض کیا: ارز کیا ہے؟ فرمایا: شام میں ایک قسم کا درخت۔ ایک درخت کی لمبائی فضاء میں ۱۲۰ ہاتھ (۶و۸۷ میٹر) ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان کی راہ میں نہ کوئی پہاڑ رکاوٹ بن سکے گا اور نہ لوہا۔''

ان میں سے دوسری قسم وہ ہے جو اپنے ایک کان کو بچھاتی ہے اور دوسرے کو اوڑھتی ہے۔ یہ لوگ جب کسی ہاتھی، وحشی جانور، اونٹ یا سئور کے پاس سے گزرتے ہیں تو اس کو کھا جاتے ہیں اور جو ان میں سے مرتا ہے اس کو بھی کھا لیتے ہیں۔ ان کی فوج کا اگلا حصہ شام میں ہوگا اور پچھلا حصہ خراسان میں۔ وہ مشرق کی نہروں اور بحیرۂ طبریہ کا پانی پی جائیں گے۔''

یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج امام عبداللہ بن عدی نے الکامل[1] میں اور انہی کے طریق سے امام ابن الجوزی نے الموضوعات[2] میں، حافظ طبرانی نے المعجم الاوسط[3] میں اور ابوالحسن واحدی نے الوجیز[4] میں یحییٰ بن سعید عطاء کی سند سے کی ہے:

ہم کو محمد بن اسحاق نے اعمش سے، انہوں نے شقیق بن سلمہ سے اور انہوں نے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے خبر دی۔ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے یاجوج و ماجوج کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا......

حافظ طبرانی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس کی روایت اعمش سے صرف محمد بن اسحاق نے اور محمد بن اسحاق سے صرف یحییٰ بن سعید عطار نے کی ہے۔ یحییٰ بن سعید عطار ضعیف ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب[5] میں لکھا ہے اور فتح الباری[6] میں اس کو بے حد ضعیف قرار دیا ہے۔

اور اس کا شیخ محمد بن اسحاق عکاشی اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ امام ابن عدی نے اس کے ترجمہ کے ضمن میں اس کی روایت کردہ حدیثوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''یہ سب منکر اور موضوع ہیں''

---

[1] الکامل: ص ١٦٩، ج٦ [2] الموضوعات: ص ٣٣١، ٣٣٢، ج١، ح ٤١٦

[3] المعجم الأوسط: ص ٥٠٩-٥١٠، ج٤، ح ٣٨٦٧

[4] الوجیز: ص ١٩٣، ج١ [5] تقریب التھذیب: ترجمہ: ٧٥٥٨

[6] فتح الباری: ص ٣١٩٢، ج٣

اور امام ابن الجوزی نے لکھا ہے:

محمد بن اسحاق جو عکاشی ہے، اس کو امام ابن معین نے کذاب قرار دیا ہے۔

یاجوج ماجوج سے کون سی قوم مراد ہے؟

قرآن پاک میں جن شخصیتوں، افراد اور جماعتوں کا ذکر مجملاً آیا ہے جیسے: اہل کہف، حضرت خضر علیہ السلام ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج، ان کے بارے میں قدیم مفسرین اور مؤرخین نے بہت کچھ لکھا ہے اور ان کے تعین کے لیے بہت ریسرچ اور بڑی تحقیق کی ہے مگر کوئی مفسر یا مؤرخ یہ ثابت نہیں کر سکا ہے کہ ان سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس میدان میں ریسرچ اور تحقیق کا کام عصر حاضر میں بھی ہوا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ لیکن کوئی بھی تحقیق ایسی نہیں ہے اور نہ آئندہ ہوگی جس کو حرف آخر کہا جا سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان شخصیتوں اور افراد کا تعلق امور غیب سے ہے۔ جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے یا اللہ تعالیٰ کے بتانے سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ لیکن مذکورہ شخصیتوں اور افراد کے بارے میں چونکہ قرآن پاک کی طرح صحیح احادیث میں بھی کوئی تفصیل نہیں بیان ہوئی ہے اس لیے تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں ان کے بارے میں موجودہ تفصیلات یا تو اہل کتاب سے ماخوذ ہیں یا لوگوں کے ذہنوں کی پیداوار ہیں۔

جہاں تک زیر بحث قوم یاجوج ماجوج کا تعلق ہے تو قرآن پاک میں ان کا ذکر جس سیاق وسباق میں آیا ہے اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج کوئی فوق الفطرت لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ اولاد آدم ہی سے تعلق رکھتے ہیں البتہ وہ مفسر لوگ ہیں۔ جس زمانے میں ذوالقرنین ان کے علاقے میں پہنچے تھے اس وقت ان کی ہمسایہ ایک دوسری قوم ان کے شر وفساد سے بے حد پریشان تھی اور وہ ایسے وسائل و ذرائع سے محروم تھی جن کے ذریعہ وہ اپنا دفاع کر سکے۔ یاجوج ماجوج یا تو جسمانی طور پر ایسے طاقت ور تھے کہ وہ جب چاہتے اس قوم کو اپنی زیادتیوں اور اپنے شر وفساد کا نشانہ بنا دیتے یا ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کی ہمسایہ قوم ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے پر قادر نہ تھی۔ وہ جب چاہتے ان پر چڑھ دوڑتے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ذوالقرنین سے یہ درخواست کی کہ وہ ان دو پہاڑوں کے درمیانی خلا کو بند کر دیں جس سے ہو کر یاجوج ماجوج ان پر حملہ کرتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کمزور قوم کا علاقہ یاجوج ماجوج کے علاقے سے الگ تھا اور ان دونوں کے درمیان بلند پہاڑ حائل تھے۔ کسی جگہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک درہ یا خلا موجود تھا۔ کمزور قوم نے ذوالقرنین اور ان کے لاؤ لشکر کو دیکھ کر جہاں

یہ اندازہ لگالیا کہ وہ ان کی مدد کرسکتا ہے وہیں اس کو ذوالقرنین اور اس کی عظیم فوج کی نقل وحرکت سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ لوگ مفسد نہیں بلکہ شریف اور صالح لوگ ہیں ورنہ وہ ذوالقرنین سے ایسی مدد کی درخواست نہ کرتے یہ ساری باتیں قرآن پاک کی صرف ایک آیت میں نہایت اعجاز کے ساتھ بیان کردی گئی ہیں۔ارشادالٰہی ہے:

﴿ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا۝ ﴾ [الکھف:۹٤]

"ان لوگوں نے کہا: اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج زمین میں فساد پھیلانے والے لوگ ہیں، تو کیا ہم تجھے اس غرض کے لیے کچھ اجرت ادا کریں کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند بنادے۔"

چونکہ ذوالقرنین ایک مصلح اور خدا ترس بادشاہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو مال و دولت دے رکھی تھی اس پر قانع تھا اس لیے ان کی پیش کش کے جواب میں کہا:

﴿ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا۝ ﴾

"(ذوالقرنین نے) کہا: میرے رب نے مجھے جو کچھ مال و اقتدار دے رکھا ہے وہ بہت ہے۔تم (جسمانی) طاقت کے ذریعہ میری مدد کرو میں تمہارے اور ان کے درمیان کوئی دیوار بنادوں گا۔" [الکھف:۹۵]

اس طرح ذوالقرنین نے ان دونوں پہاڑوں کے درمیانی خلا کو ایک نہایت مضبوط آہنی دیوار سے بند کردیا جس کی بلندی پہاڑوں کے برابر تھی اور جس پر چڑھنا اور اس میں نقب لگانا ان کے لیے ممکن نہ رہا اور وہ کمزور اور مظلوم قوم یاجوج ماجوج کے شر سے اس وقت تک کے لیے محفوظ ہوگئی جب تک اللہ چاہے۔ارشادالٰہی ہے:

﴿ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا۝ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا۝ ﴾ [الکھف:۹۷، ۹۸]

"پس وہ (یاجوج ماجوج) نہ تو اس پر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں نقب ہی لگا سکتے تھے۔ (ذوالقرنین نے) کہا: یہ میرے رب کی رحمت ہے اور جب میرے رب کے وعدے کا

وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوند خاک کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے“

کیا یاجوج ماجوج ابھی تک بند ہیں؟

سورۃ الکہف کی مذکورہ آیت سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ ذوالقرنین نے دو پہاڑوں کے درمیان جو دیوار بنائی تھی اس پر چڑھنا یا اس میں سوراخ کرنا اس وقت یاجوج ماجوج کی قدرت میں نہیں تھا۔ لیکن مذکورہ آیت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آئندہ بھی وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ بلکہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۹۶ میں تو یہ صراحت ہے کہ جب یاجوج ماجوج کھول دیے جائیں گے اور آزاد کر دیے جائیں گے تو وہ ہر طرف سے نکل پڑیں گے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ٥ ﴾

”یہاں تک کہ جب یاجوج ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے“[الانبیاء:۹٦]

اس آیت مبارکہ میں یاجوج ماجوج کے جس نکلنے یا خروج کی خبر دی گئی ہے وہ ان کا عمومی خروج ہوگا جس پر...... ”مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ“...... کا فقرہ دلالت کرتا ہے۔ مگر اس آخری اور عمومی خروج سے پہلے ان کے کسی خروج کی اگرچہ قرآن پاک یا کسی صحیح حدیث میں خبر نہیں دی گئی ہے لیکن صحیح حدیث میں سد ذوالقرنین میں شگاف پڑنے کی خبر دی گئی ہے۔ چنانچہ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن ان کے پاس خوف زدہ حالت میں یہ فرماتے ہوئے تشریف لائے:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ، فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَاجُوْجَ وَمَا جُوْجَ مِثْلُ هٰذِهِ، وَحَلَّقَ بِإِصْبَعَيْهِ الْإِبْهَامَ وَالَّتِيْ تَلِيْهَا))[1]

”اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔ عربوں کے لیے اس برائی کی وجہ سے بربادی ہے جو قریب آ گئی ہے۔ یاجوج ماجوج کے بند سے آج اس کی مانند سوراخ ہو گیا ہے۔ آپ نے انگوٹھے اور اس سے ملی ہوئی دونوں انگلیوں سے حلقہ بنایا۔“

یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں سد ذوالقرنین میں اتنا سوراخ ہو گیا تھا جس کی مقدار آپ نے انگوٹھے اور انگشت شہادت سے حلقہ بنا کر واضح فرمائی۔

[1] صحیح بخاری: ح ۷۱۳۵۔ صحیح مسلم: ح ۲۸۸۰

تفسیر "تیسیر الکریم الرحمن فی تفسیر کلام المنان" کے مصنف علامہ عبد الرحمٰن بن ناصر سعدی تحریر فرماتے ہیں:

یہ حدیث اس امر میں صریح ہے کہ جس دن نبی اکرم ﷺ نے یہ بات فرمائی اس دن یاجوج ماجوج کے نکلنے کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ اس وقت سے ان میں برابر وسعت ہوتی رہی اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد چاہے تمثیل ہو جس کے ذریعہ آپ نے یہ حقیقت ذہنوں سے قریب کرنی چاہی ہو کہ انہوں نے بند سے نکلنے اور زمین میں پھیل جانے کی ابتدا کر دی ہے یا حدیث کا مطلب یہ ہو کہ یاجوج ماجوج کا بند اس وقت اس مقدار میں کھل گیا تھا اور اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ پوری دیوار زمیں بوس ہو گئی۔[1]

علامہ سعدی اپنی اس رائے میں منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ دوسرے علمائے اسلام نے بھی اس طرح کی رائے پیش کی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے مشہور محدث علامہ محمد انور کشمیری رحمہ اللہ متوفی ۱۳۵۲ھ صحیح بخاری کی شرح فیض الباری میں لکھتے ہیں:

سد ذوالقرنین اس وقت پیوند خاک ہو چکا ہے اور قرآن میں یہ وعدہ نہیں ہے کہ وہ یاجوج ماجوج کے خروج تک باقی رہے گا۔ اور ایسی بھی کوئی خبر نہیں ہے کہ سد ان کے نکلنے کی راہ میں حائل رہے گا بلکہ ایسی بات محض وہم وخیال کی پیداوار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ..... اس دن ہم ان کو چھوڑ دیں گے کہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں" اور...... حَتَّى إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ "حتیٰ کہ جب یاجوج ماجوج کھول دیے جائیں گے" سے معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج بار بار نکلتے رہے ہیں۔ وہ پہلے بھی نکل چکے ہیں اور زمین میں ایسا فساد مچا چکے ہیں جس سے پناہ مانگنی چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ آخری زمانے میں ان کا وہ خروج ہوگا جس کا وعدہ کیا جا چکا ہے اور یہ خروج سب سے زیادہ تباہ کن ہوگا۔ قرآن میں یہ نہیں آیا ہے کہ ان کا یہ آخری خروج سد کے زمیں بوس ہونے کے معاً بعد ہوگا بلکہ قرآن میں صرف سد کے زمین بوس ہونے کی خبر ہے اور اس وعدے کے بموجب وہ زمیں بوس ہو چکا ہے۔ رہی یہ بات کہ سد کے زمیں بوس ہونے کے فوراً بعد بلا کسی فاصلے کے ان کا خروج ہوگا تو اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں ہے۔[2]

ڈاکٹر شفیع ماحی احمد نے اپنی کتاب یاجوج و ماجوج، فتنة الماضی والحاضر والمستقبل میں لکھا ہے:

---

[1] فتنه الدجال و یأجوج و ماجوج: ص ۷۹

[2] بحواله فتنه الدجال و یاجوج ماجوج: ص ۵۵

قرب قیامت کے زمانے میں اپنے آخری خروج سے پہلے یاجوج ماجوج اپنے اصلی وطن ''منگولیا'' سے سات مرتبہ نکل چکے ہیں اور وہ تاریخ میں متعدد ناموں سے معروف رہے ہیں۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں آشوریوں کے ہاں وہ سیتھین Scythians کے نام سے معروف رہے۔

تیسری صدی قبل مسیح میں چینی علماء نے ان کو ''ہسیونو'' Hsinun-nu کا نام دیا۔

یورپی علماء چوتھی صدی عیسوی میں ان کو ھیون Hun کے نام سے یاد کرتے رہے۔

قرآن کریم میں ان کا ذکر یاجوج و ماجوج کے نام سے کیا گیا ہے۔

تیرہویں صدی عیسوی میں مسلمان، چینی اور یورپی مؤرخین نے ان کا ذکر مغل اور تاتاریوں کے نام سے کیا ہے۔[۱]

علامہ عبدالرحمٰن سعدی کی تحقیق یہ ہے کہ ''یاجوج ماجوج'' اَجَّ یَؤُجُّ اَجًّا وَاَجِیْجًا سے مشتق ہے جس کے معنی تیزی اور سرعت سے چلنے اور حرکت کرنے کے ہیں۔ اگر اس کا فاعل آگ ہو تو بھڑک اٹھنے کا مفہوم نکلتا ہے۔ اس تناظر میں یاجوج ماجوج یفعول اور مفعول کے وزن پر صفت ہے۔ لکھتے ہیں:

یاجوج ماجوج کے صفت ہونے کی بنا پر اس کا ''اسم جنس'' ہونا اولی ہے۔[۲]

کیا تاتاری یاجوج ماجوج تھے؟

امام ابن جریر طبری، حافظ ابن اثیر اور حافظ ابن کثیر وغیرہ نے یاجوج ماجوج سے ترکوں، مغلوں اور تاتاریوں کو مراد لیا ہے۔ ان کے نزدیک ان کی اصل ایک ہے اگرچہ بعد میں ان کی کئی شاخیں ہوگئی ہوں۔

علامہ سعدی کے نزدیک یاجوج ماجوج کا اصلی وطن اگرچہ منگولیا اور مشرقی ترکستان تھا لیکن صفت میں اشتراک کی وجہ سے روسی، چینی، امریکی اور فرنگی سب پر یاجوج ماجوج کا اطلاق ہوتا ہے۔ انہوں نے سورۃ الانبیاء کی آیت: ''حَتّٰی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ'' میں وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ اور وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے، سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ صفت عام ہے جو مذکورہ قوموں پر منطبق ہوتی ہے۔ اور عملاً بھی وہ ہر طرف سے دنیا میں پھیل چکے ہیں اور ہر جگہ کے لوگوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔[۳]

علامہ سعدی رحمہ اللہ نے یاجوج ماجوج کے مسئلے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ جس سے ان کا

---

[۱] یاجوج وماجوج ص ۵ [۲] فتنه الدجال ویأجوج و ماجوج: ص ۹۳

[۳] فتنه الدجال و یاجوج و ماجوج: ص ۷۶

تشخص باقی نہیں رہا اور انہوں نے ان کو مخصوص قوم کی بجائے اسم جنس قرار دے کر ان میں دنیا کی تقریباً ساری قوموں کو شامل کرنے کی جو سعی کی ہے وہ بڑی دور از کار انہ لگتی ہے۔ اگر وہ سورۃ الانبیاء کی مذکورہ آیت پر صحیح مسلم میں مروی حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی حدیث کی روشنی میں غور کرتے تو وہ اس دور از کار مبالغہ آرائی سے بچ جاتے۔ اور ان کے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی کہ مذکورہ آیت میں یاجوج ماجوج کے جس ہمہ جہت خروج کی خبر دی گئی ہے اس کا تعلق قرب قیامت کے زمانے سے ہے۔ ان کا یہ خروج ان کو ان کے آخری انجام کو پہنچا دے گا۔ چنانچہ حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم ﷺ سے جو طویل حدیث روایت کی ہے اس میں دجال کے ذکر کے بعد رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

((فَبَيْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ إِذْ أَوْحَى اللّٰهُ إِلَى عِيسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ: إِنِّي قَدْ أَخْرَجْتُ عِبَادًا لِي، لَا يَدَانِ لِأَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ، فَحَرِّزْ عِبَادِي إِلَى الطُّورِ، وَيَبْعَثُ اللّٰهُ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ، وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ، فَيَمُرُّ أَوَائِلُهُمْ عَلَى بُحَيْرَةِ طَبَرِيَّةَ، فَيَشْرَبُونَ مَا فِيهَا، وَيَمُرُّ آخِرُهُمْ فَيَقُولُونَ: لَقَدْ كَانَ بِهٰذِهِ، مَرَّةً، مَاءٌ، وَيُحْصَرُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيسٰى وَأَصْحَابُهُ، حَتّٰى يَكُونَ رَأْسُ الثَّوْرِ لِأَحَدِهِمْ خَيْرًا مِنْ مِائَةِ دِينَارٍ لِأَحَدِكُمُ الْيَوْمَ، فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيسٰى وَأَصْحَابُهُ، فَيُرْسِلُ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ النَّغَفَ فِي رِقَابِهِمْ، فَيُصْبِحُونَ فَرْسٰى كَمَوْتِ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ، ثُمَّ يَهْبِطُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيسٰى وَأَصْحَابُهُ إِلَى الْأَرْضِ، فَلَا يَجِدُونَ فِي الْأَرْضِ مَوْضِعَ شِبْرٍ إِلَّا مَلَأَهُ زَهَمُهُمْ وَنَتْنُهُمْ، فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيسٰى وَأَصْحَابُهُ إِلَى اللّٰهِ، فَيُرْسِلُ اللّٰهُ طَيْرًا كَأَعْنَاقِ الْبُخْتِ، فَتَحْمِلُهُمْ فَتَطْرَحُهُمْ حَيْثُ شَاءَ اللّٰهُ، ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ مَطَرًا لَا يَكُنُّ مِنْهُ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ، فَيَغْسِلُ الْأَرْضَ حَتّٰى يَتْرُكَهَا كَالزَّلَفَةِ......))

"اسی اثناء میں اللہ عیسیٰ علیہ السلام کو وحی کرے گا کہ میں نے اپنے ایسے بندے نکال دیے ہیں جن سے لڑنے کی کسی کے اندر طاقت نہیں ہے، لہٰذا تم میرے بندوں کو بحفاظت لے کر طور چلے جاؤ۔ اور اللہ یاجوج ماجوج کو بیدار کر دے گا اور وہ ہر بلندی سے نکل کر پھیل جائیں گے

---

[1] صحیح مسلم: ح ۷۳۷۳-۲۹۳۷

ان کا ہراول دستہ بحیرۂ طبریہ پر سے گزرے گا تو اس کا سارا پانی پی جائے گا اور ان کا پچھلا دستہ وہاں سے گزرے گا تو کہے گا کہ یقیناً یہاں پانی تھا۔ اور اللہ کے نبی اور ان کے ساتھیوں کو روک رکھا جائے گا۔ حالت یہ ہو جائے گی کہ ان میں سے کسی کے لیے بیل کا سر آج تم میں سے کسی کے لیے سو دینار سے بہتر ہوگا، پس اللہ کے نبی عیسیٰ اور ان کے ساتھی دعا کریں گے اور اللہ ان پر ان کی گردنوں میں کیڑے پڑنے کی بیماری نازل فرما دے گا۔ تو وہ یکبارگی ہلاک ہو جائیں گے۔ پھر اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی زمین پر اتر آئیں گے اور انہیں زمین میں ایک بالشت بھر جگہ ایسی نہ ملے گی جو ان کی سڑی گلی لاشوں اور ان کی بدبو سے پاک ہو۔ اللہ کے نبی اور ان کے ساتھی اللہ سے دعا کریں گے تو اللہ اونٹوں کی گردنوں کی مانند پرندے بھیج دے گا جو ان کو اٹھا کر ایسی جگہ پھینک دیں گے جہاں اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ ایسی بارش بھیج دے گا جس سے مٹی کا مکان یا اونٹ کے بالوں کا خیمہ کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکے گا اور وہ بارش زمین کو دھو کر آئینہ کی مانند کر دے گی۔"

اس حدیث سے تین چیزیں بصراحت معلوم ہوتی ہیں:

(۱) یاجوج ماجوج کا خروج حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور ان کے ہاتھوں دجال کی ہلاکت کے بعد ان کی موجودگی میں ہوگا۔

(۲) یاجوج ماجوج سے لڑنے کی طاقت اس وقت کسی کے اندر نہیں ہوگی اس لیے اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں یعنی مسلمانوں کو لے کر طور پر چلے جائیں۔ واضح رہے کہ دجال کی ہلاکت کے بعد یہودیت اور عیسائیت کا خاتمہ ہو جائے گا اور صرف اسلام باقی رہ جائے گا۔

(۳) یاجوج ماجوج کی تعداد بہت زیادہ ہوگی یہاں تک کہ وہ بحیرۂ طبریہ کا سارا پانی پی جائیں گے۔

اور جن احادیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی خبر دی گئی ہے جہاں وہ تواتر کے درجے کو پہنچی ہوئی ہیں وہ اس امر میں صریح ہیں کہ وہ قرب قیامت کے زمانے میں نازل ہوں گے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَيُوشِكَنَّ أَنْ يَنْزِلَ فِيكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا، فَيَكْسِرَ الصَّلِيبَ وَيَقْتُلَ الْخِنْزِيرَ، وَيَضَعَ الْجِزْيَةَ، وَيَفِيضَ الْمَالُ حَتَّى لَا يَقْبَلَهُ أَحَدٌ حَتَّى تَكُونَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا))

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور اتریں گے تمہارے درمیان ابن مریم حاکم عادل بن کر۔ پھر وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، خنزیر کو ہلاک کر دیں گے اور جزیہ ختم کر دیں گے۔ مال کی اتنی کثرت ہوگی کہ اس کو کوئی قبول نہیں کرے گا اور حالت یہ ہوگی کہ ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا''[1]

اس حدیث میں صلیب توڑ دینے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے سے یہ مراد ہے کہ عیسائیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ چونکہ تمام ملتیں بھی ختم ہو جائیں گی اور صرف اسلام باقی رہ جائے گا اس لیے جزیہ کا خاتمہ بھی کر دیں گے۔ بعض روایتوں میں الجزیہ کے بجائے ''الحرب'' جنگ کا لفظ ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کوئی کسی سے جنگ نہیں کرے گا۔

ایک دوسری حدیث میں رسول اکرم ﷺ نے قیامت سے پہلے جن دس نشانیوں کا ذکر فرمایا ہے ان میں سے ایک یاجوج ماجوج کا ظہور بھی ہے۔ چنانچہ حضرت حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی مکرم ﷺ ہمارے پاس اس حال میں تشریف لائے کہ ہم آپس میں گفتگو کر رہے تھے، آپ نے فرمایا: کس چیز کا ذکر کر رہے ہو؟ عرض کیا: ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔ فرمایا:

((اِنَّهَا لَنْ تَقُومَ حَتّٰى تَرَوْنَ قَبْلَهَا عَشْرَ آيَاتٍ۔ فَذَكَرَ الدُّخَانَ، وَالدَّجَّالَ وَالدَّآبَّةَ وَطُلُوعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَنُزُولَ عِيسٰى ابْنِ مَرْيَمَ وَيَاْجُوجَ وَمَاْجُوجَ، وَثَلَاثَةَ خُسُوفٍ: خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ بِجَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَآخِرُ ذٰلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ اِلَى مَحْشَرِهِمْ))[2]

''قیامت اس وقت تک ہرگز نہ قائم ہوگی جب تک کہ تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو اور آپ نے دھویں، دجال، دابۃ الارض، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے، عیسیٰ علیہ السلام کے نزول، یاجوج ماجوج، تین خسف (زمین کا دھنس جانا) ایک مشرق میں دوسرا مغرب میں، تیسرا جزیرۃ العرب میں۔ اور ان سب کے آخر میں ایک آگ کا ذکر کیا جو یمن سے نکلے گی اور لوگوں کو ہانکتی ہوئی محشر کی طرف لے جائے گی۔''

---

[1] صحیح بخاری: ح ۲۲۲۲، ۲۴۷۶، ۳۴۴۸، ۳۴۴۹۔ صحیح مسلم ح ۳۸۹۔۱۵۵

[2] صحیح مسلم: ح ۷۲۸۵، ۲۹۰۱۔ ابو داؤد: ح ۴۳۱۱

اس حدیث سے بھی بصراحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج کا خروج قیامت سے بالکل قریبی زمانے میں ہوگا۔

بعض صحیح حدیثوں میں ایسی قوم کا ضرور ذکر آیا ہے جس سے قیامت سے پہلے مسلمانوں کی لڑائی ہوگی اور اس قوم کے کچھ ظاہری اوصاف بھی بیان ہوئے۔ لیکن ان حدیثوں میں اس قوم کو یاجوج ماجوج نہیں کہا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تُقَاتِلُوا التُّرْكَ صِغَارَ الْأَعْيُنِ، حُمْرَ الْوُجُوهِ، ذُلْفَ الْأُنُوفِ. كَأَنَّ وُجُوهَهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطْرَقَةُ، وَلَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تُقَاتِلُوا قَوْمًا نِعَالُهُمُ الشَّعْرُ))[1]

''قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم ان ترکوں سے جنگ نہ کرلو گے جن کی آنکھیں چھوٹی، چہرے سرخ اور ناک بیٹھی ہوئی ہوگی۔ ان کے چہرے تہہ در تہہ ڈھال کی طرح ہوں گے۔ اور قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک ایسی قوم سے جنگ نہ کرلو گے جن کے جوتے بالوں والے چمڑے کے ہوں گے''

اس حدیث میں قیامت کی آمد سے پہلے جس قوم سے مسلمانوں کی جنگ کی خبر دی گئی ہے اس سے یاجوج ماجوج کو مراد لینا اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جبکہ کتاب وسنت میں ان کا کوئی ایسا ظاہری وصف بیان کیا گیا ہو جو مذکورہ حدیث میں بیان کردہ قوم کے وصف کے مطابق ہو۔ جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن پاک یا احادیث میں یاجوج ماجوج کا کوئی ظاہری وصف بیان ہی نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ان کو ''مفسد'' کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ صحیح احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفسد ہونے کے ساتھ ساتھ یاجوج ماجوج کی تعداد بہت زیادہ ہوگی اور وہ اتنے طاقت ور ہوں گے کہ مسلمانوں کے اندر ان سے لڑنے کی طاقت نہیں ہوگی۔

رہے تاتاری تو ان کے ہاتھوں مسلمانوں کی جو تباہی ہوئی ہے اور انہوں نے مسلمانوں کا جس طرح قتل عام کیا اس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ انہوں نے لاکھوں مسلمانوں کو نہایت بے دردی سے ہلاک کردیا۔ بخارا، سمرقند، رے، ہمدان، زنجان، قزوین، مرو اور نیشاپور کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ ۶۵۶ ہجری میں دنیائے اسلام کے دارالخلافت اور اس دور کے سب سے بڑے علمی مرکز اور متمدن شہر بغداد کی اینٹ

[1] صحیح بخاری: ۲۹۲۸۔ صحیح مسلم: ۷۳۱۰، ۲۹۱۲۔ ابوداؤد: ح ۴۳۰۴

سے اینٹ بجادی۔ عباسی خلیفہ مستعصم کو نہایت بے دردی سے قتل کر دیا۔ مشہور مؤرخ اور محدث حافظ عز الدین ابو الحسن علی بن محمد ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۵۵۵ھ نے اپنی مشہور تاریخ ''الکامل فی التاریخ'' میں تاتاریوں کے ہاتھوں ہونے والی تباہی و بربادی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

میں کئی برس تک اس پس و پیش میں رہا کہ اس واقعہ کا ذکر کروں یا نہ کروں۔ آخر کون ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی موت کی داستان قلم بند کرے اور کس کے لیے یہ آسان ہے کہ وہ ان کی ذلت و رسوائی بیان کرے۔ کاش میں پیدا نہ ہوا ہوتا۔ کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر جاتا اور بھولی بسری کہانی بن چکا ہوتا۔ لیکن بعض دوستوں نے مجھے یہ واقعہ لکھنے پر آمادہ کیا، پھر بھی مجھے تردد رہا۔ پھر مجھے خیال ہوا کہ اس واقعہ کو نہ لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ حادثہ ایسی سنگین نکبت اور ایسی عظیم مصیبت سے عبارت ہے جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس کی لپیٹ میں پوری خلائق آئی اور خاص طور پر مسلمان اس سے دو چار ہوئے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ اس دنیا میں پیش نہیں آیا ہے تو اس کا یہ دعویٰ سچا ہوگا۔ اس لیے کہ تاریخوں میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا۔[1]

تاتاریوں کی ہیبت اور مسلمانوں کی وحشت کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ اگر ایک تاتاری ایک گلی میں گھستا جہاں سو مسلمان ہوتے تو ان میں سے کسی کو اس کے مقابلے کی ہمت نہ ہوتی۔ وہ ایک ایک کرکے سب کو قتل کر دیتا۔ یہاں تک کہ ان کا ناقابل شکست ہونا ایک اٹل حقیقت بن چکا تھا۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس بظاہر ناقابل شکست قوم کو ایمان و عزم صادق سے بھرپور مسلمانوں کی ایک مختصر سی فوج نے ایسی شکست فاش دی کہ تاتاریوں کا نام و نشان تک مٹ گیا۔

اس وقت کے سلطان مصر الملک المظفر سیف الدین قطز کے کانوں میں تاتاریوں کی تباہ کاریوں کی خبریں پہنچ رہی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ مصر بھی ان کے نشانے پر ہے اس لیے اس نے تاتاریوں کا لقمہ تر بننے کی بجائے یہ فیصلہ کیا کہ قبل اس کے تاتاری مصر پر حملہ کریں وہ خود ان پر حملہ کر دے۔ اس نے اپنے فیصلہ کو اس طرح عملی جامہ پہنایا کہ ۲۵ رمضان ۶۵۸ ہجری مطابق ۱۲۶۰ء کو مصر کی اسلامی فوج لے کر جانب شام نکل کھڑا ہوا اور ارض فلسطین کے مشہور تاریخی مقام ''عین جالوت'' پر ٹڈی دل تاتاری فوج سے جا ٹکرایا۔ تاتاریوں کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ کوئی ایسی فوج دنیا میں موجود ہے جو ان

---

[1] الکامل فی التاریخ: ص ۱۹۰۳

سے ٹکرلے سکتی ہے۔ چونکہ وہ کئی سالوں سے مسلمانوں کو ہر جگہ پیٹتے چلے آرہے تھے اس لیے مصر کی اس اسلامی فوج کے حملے نے ان کو حواس باختہ کر دیا۔ سابق تجربوں کے برخلاف عین جالوت کے معرکے میں مسلمانوں نے ان کو شکست فاش دے دی جس کے بعد وہ بری طرح بھاگنے لگے۔ اس چیز نے مصریوں کا حوصلہ کافی بڑھا دیا اور انہوں نے تاتاریوں کا تعاقب کر کے کثرت سے ان کو قتل کیا اور بہت بڑی تعداد میں ان کو گرفتار بھی کیا۔

مسلمان کے ہاتھوں تاتاریوں کی اس عبرتناک شکست نے ان کی ذہنیت بدل کر رکھ دی اور وہ مسلمانوں سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ ان کے دین یعنی اسلام میں داخل ہونے لگے۔

اوپر کی وضاحتوں سے بھی یہ معلوم ہوا کہ جن مؤرخین نے تاتاریوں کو یاجوج ماجوج قرار دیا ہے ان کی بات بھی قرآن پاک اور صحیح احادیث سے مطابقت نہیں رکھتی۔

مسلمانوں کی نکبت کے اسباب:

علامہ عبدالرحمٰن سعدی نے اپنے رسالے ''فتنہ الدجال و یاجوج ماجوج'' میں چینیوں، روسیوں، امریکیوں اور فرنگیوں کو یاجوج ماجوج قرار دیا ہے۔ جہاں تک ان کی قوموں کی اسلام دشمنی کا مسئلہ ہے تو یہ بات بالکل درست ہے کہ عصر حاضر میں صرف وہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ دوسری قومیں بھی اسلام کے خلاف متحد ہو چکی ہیں۔ لیکن صرف اس کی وجہ سے ان تمام قوموں کو یاجوج ماجوج قرار دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو ان صحیح احادیث میں ان قوموں کو یاجوج ماجوج کہنے میں کیا چیز مانع تھی جن میں مسلمانوں کی مغلوبیت بیان ہوئی ہے اور یہ خبر دی گئی ہے کہ تمام قومیں مسلمانوں کے خلاف متحد ہو جائیں گی اور ایک ساتھ ان پر پل پڑیں گی۔ چنانچہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((یُوْشِكُ الْأُمَمُ أَنْ تَدَاعَى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلَى قَصْعَتِهَا، فَقَالَ قَائِلٌ: وَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: بَلْ أَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيرٌ وَلَكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ! وَلَيَنْزَعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ وَلَيَقْذِفَنَّ اللّٰهُ فِي قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنَ" فَقَالَ قَائِلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَمَا الْوَهْنُ؟ قَالَ: حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ"[1]

---

[1] ابوداؤد: ح ۴۲۹۷۔ الصحیحہ: ص ۶۴۷، ج ۲، ح ۹۵۸

"قریب ہے کہ قومیں تم پر پل پڑنے کے لیے ایک دوسری کو دعوت دیں گی جس طرح کھانے والے ایک دوسرے کو کھانے کے پیالے کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ایک کہنے والے نے کہا: کیا ایسا ہماری قلت تعداد کی وجہ سے ہوگا؟ فرمایا: "بلکہ تم بہت زیادہ ہوگے۔ لیکن سیلاب کے جھاگ کی طرح جھاگ ہوگے۔ اللہ تمہارے دشمنوں کے سینوں سے تمہاری ہیبت اور رعب کو نکال دے گا۔ اور تمہارے دلوں میں وہن کمزوری ڈال دے گا۔" پوچھنے والے نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہن کیا ہے؟ فرمایا: "دنیا کی محبت اور موت سے نفرت"

یہ حدیث درحقیقت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مسلمان اپنی صحیح تصویر دیکھ سکتے اور ان اسباب کو بھی معلوم کر سکتے ہیں جنہوں نے ان کو اس شرمناک حالت تک پہنچایا ہے۔

آج مسلمان تعداد میں بہت زیادہ ہیں، مگر بے وزن، بے قیمت اور بے ثبات۔ "غثاء كغثاء السيل" سیلاب کے جھاگ کی طرح ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد مبارک "ایک پیشین گوئی" ہے جس کا لفظ لفظ موجودہ دور کے مسلمانوں پر صادق آرہا ہے۔

موجودہ دور کے مسلمانوں، خاص طور پر ان مسلمانوں پر جن کے آباء و اجداد دعوت اسلامی کے اولین مخاطب تھے، دولت کی بارش ہورہی ہے اور ایسی کوئی دنیاوی نعمت نہیں ہے جو ان کو حاصل نہ ہو یا وہ اس سے محروم ہوں۔ پھر آخر اس قدر بے وزن اور بے قیمت کیوں ہو چکے ہیں؟

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر مسلموں بلکہ اسلام دشمنوں میں اپنی دھاک اور اپنا رعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لیے جو واضح تعلیمات دی تھیں ان کو انہوں نے بھلا دیا اور اسلام دشمنوں کو اپنا دوست بنالیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴾ [الانفال:٦٠]

"اور تم لوگ جہاں تک تمہاری استطاعت ہو، ان کے مقابلے کے لیے طاقت اور تیار، بندھے رہنے والے گھوڑے تیار رکھو۔ تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے دشمنوں کو خوف زدہ رکھو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ

کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔''

اس آیت کی تفسیر میں علامہ عبدالرحمٰن بن ناصر سعدی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

اپنے کفار دشمنوں کے لیے جو تمہیں ہلاک کرنے اور تمہارے دین کے ابطال کے درپے ہیں۔ اپنی طاقت بھر قوت تیار کرو۔ یعنی عقلی قوت، جسمانی قوت اور مختلف النوع اسلحہ جات۔ جو دشمن کے خلاف جنگ میں تمہارے کام آئیں۔ کفار کے خلاف اس تیاری میں وہ تمام صنعتیں داخل ہیں جن سے اسلحہ اور آلات حرب بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً توپیں، مشین گنیں، بندوقیں، جنگی طیارے، بری اور بحری سواریاں، دفاعی قلعہ بندیاں، مورچے اور دیگر دفاعی آلات حرب۔ اسی طرح اس تیاری میں فوجی حکمت عملی اور سیاست کاری میں مہارت پیدا کرنا بھی داخل ہے...... اور گھوڑوں کو تیار رکھ کر ''تیاری'' کرنے کا مقصد دشمن کو مرعوب اور خوف زدہ رکھنا بتایا گیا ہے۔ اس حکم کی علت اس زمانے میں بھی موجود ہے۔ یعنی دشمن کو مرعوب اور خوف زدہ رکھنا۔ اگر دنیا میں ایسے آلات اور سامان حرب موجود ہوں جن کے ذریعہ سے دشمن کو مذکورہ چیزوں سے زیادہ خوف زدہ رکھا جا سکتا ہو۔ یعنی گاڑیاں اور جنگی طیارے تو ان کو حاصل کر کے ان کے ذریعہ سے جنگی استعداد بڑھانا فرض ہے۔ حتیٰ کہ اگر اس سامان حرب کی صنعت کو تعلیم کے بغیر حاصل کرنا ناممکن ہو تو یہ تعلیم حاصل کرنا بھی فرض ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے صرف ان لوگوں کو خوف زدہ رکھنے کے لیے جنگی تیاری کرنے کا حکم نہیں دیا ہے جن کی اللہ اور مسلمانوں سے دشمنی عیاں ہے۔ بلکہ ان کو بھی خوف زدہ رکھنے کا حکم دیا ہے جن کی دشمنیاں مخفی ہیں۔ مگر اس واضح اور صریح حکم کے باوجود ان لوگوں کو دوست بنا لیا گیا جو اسلام اور مسلمانوں کے سبب سے بڑے دشمن ہیں اور جن کی ہر نقل و حرکت اسلام کی جڑ کاٹنے اور مسلمانوں کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے ہے۔

طلوع اسلام کے وقت کفار مکہ نے اسلامی دعوت کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ یہ دعوت اس مشرکانہ طریقے کے بالکل خلاف تھی جس پر وہ اپنے باپ دادا کے زمانے سے عمل پیرا تھے۔ لیکن جب ان کو حق کی معرفت حاصل ہو جاتی تو اس کی پیروی کرنے لگتے۔

یہود و نصاریٰ تو ایک نبی کی بعثت کے منتظر تھے۔ جس نبی کے منتظر تھے وہ توریت و انجیل کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ مگر یہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی انہوں نے اسلام کی مخالفت مشرکین مکہ سے زیادہ

[1] تیسیر الکریم الرحمن: ص ۳۶۸

کی اور اُس وقت سے لے کر آج تک اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کی عداوت و دشمنی میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ جبکہ مسلمانوں نے اپنے طویل دور اقتدار میں اہل کتاب ہونے کے ناطے یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہمیشہ منصفانہ برتاؤ کیا اور ان پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہونے دیا۔ لیکن اس حسن سلوک کے باوجود وہ ہمیشہ آستین کے سانپ بنے رہے۔ جب بھی موقع ملا مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے سے دریغ نہ کیا۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ محض خیال آرائی نہیں بلکہ ایسے حقائق ہیں جن کا تجربہ مسلمانوں کو آغاز و اسلام سے اب تک مختلف شکلوں میں ہوتا آرہا ہے۔ قرآن نازل کرنے والے نے تو اہل کتاب سے تعلقات استوار کرنے میں احتیاط برتنے کی تاکید اسی دن کردی تھی جب مدینہ میں اسلامی معاشرہ تشکیل پارہا تھا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًاؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَ مَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ۝ هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ لَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔاؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ۝ ﴾ [آل عمران:۱۱۸تا۱۲۰]

’’اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے سوا دوسرے مذاہب والوں کو اپنا رازدار مت بناؤ۔ وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ تمہاری کلفت و مشقت انہیں عزیز ہے۔ ان کے دلوں کا بغض ان کے مونہوں سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ انہوں نے اپنے سینوں میں چھپا رکھا ہے وہ زیادہ سنگین ہے۔ ہم نے اپنی ہدایات تم سے کھول کر بیان کردی ہیں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ یہ تو تم ہو جو ان سے محبت رکھتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں رکھتے۔ اور تم ساری کتابوں کو مانتے ہو۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے اور جب تم سے جدا ہو کر آپس میں ملتے ہیں تو تم پر غصہ کی وجہ سے اپنی انگلیاں کاٹ ڈالتے ہیں۔ ان سے کہہ دو اپنے غصے میں مر مٹو۔ اللہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک سے واقف ہے۔ اگر تمہیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو اس سے ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور اگر تم کو

کوئی گزند پہنچتا ہے تو اس پر وہ خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر تم صبر کرو گے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے تو ان کی چال بازی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے''

کس قدر واضح اور دوٹوک اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو چودہ سو سال قبل یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوا اور آج بھی ان پر سو فیصد صادق آ رہا ہے۔ یہودی اور عیسائی مذہبی پیشواؤں، ارباب اقتدار اور اصحاب علم و دانش کی زبانوں پر وقفے وقفے سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو زہر افشانیاں ہوتی رہتی ہیں ان سے اسلام اور مسلمانوں کے ان کے دلوں میں چھپے کینہ و بغض کی سنگینی کا اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں۔

لیکن کتاب و سنت کی ان واضح تنبیہات اور اہل کتاب کی طویل خونی تاریخ کے باوجود مسلم رہنما انہی اسلام دشمنوں کو اپنا نجات دہندہ بنائے ہوئے ہیں۔ انہی کے اشاروں پر چلتے ہیں اور کھانے پینے کی اشیاء سے لے کر کمالیات اور اپنے تحفظ و دفاع کے آلات اور فوجی ساز و سامان تک ہر چیز انہی سے خریدتے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں جو اسلامی ریاست بنائی تھی وہ متعدد آزمائشوں سے گزر کر اپنے پیروں پر کھڑی ہو چکی تھی۔ غزوۂ بدر، غزوۂ احد غزوۂ خندق، غزوۂ بنو نضیر اور غزوۂ بنو قریظہ میں مسلمان جہاں شجاعت و بہادری کے جوہر دکھا چکے تھے وہیں وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے اپنی سچی محبت اور دین کی راہ میں ایثار و قربانی کے نہایت تابناک نمونے بھی پیش کر چکے تھے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک ایسی اصول ہدایت دی جو ان کے تشخص کو برقرار رکھنے اور مسلم معاشرے کو اہل کتاب کی شرانگیزیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے بے حد ضروری تھی۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ o فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ط فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ o ﴾

[المائدہ:۵۱، ۵۲]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور نصرانیوں کو اپنا دوست مت بناؤ وہ آپس میں

ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا دوست بنائے گا تو اس کا شمار انہی میں ہوگا۔ درحقیقت اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ تم ان کو جن کے دلوں میں روگ ہے، دیکھتے ہو کہ وہ انہیں میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں کہتے ہیں کہ ہمیں یہ خوف ہے کہ ہمیں کوئی مصیبت نہ آلے۔ تو بہت ممکن ہے کہ اللہ فتح یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے تو انہیں اس چیز پر جو یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں ندامت ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جس وقت یہ حکم دیا تھا اس وقت وہ ایسی طاقت نہیں بنے تھے کہ وہ اپنے آپ کو گردو پیش کی غیر مسلم طاقتوں سے محفوظ تصور کریں۔ ان کو نہ تو کوئی فوجی طاقت حاصل تھی اور نہ ان کی تعداد ہی بہت زیادہ تھی اور خود مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے اندر منافقین کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی جو مسلمانوں کے برعکس یہود و نصاریٰ سے ہمدردی رکھتے تھے اور محض مسلمانوں کی پیہم کامیابیوں اور فتوحات کی وجہ سے انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ ورنہ دل سے وہ مسلمانوں سے سخت پرخاش رکھتے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ صریح اور دوٹوک حکم دیا کہ یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ۔

اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کو مخلص دوست بنانے سے منع فرمایا ہے۔ البتہ ان سے تعلقات رکھنے اور معاملات کرنے سے منع نہیں کیا ہے۔ قرآن پاک میں اولیاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اولیاء ولی کی جمع ہے۔ ولی...... مخلص اور قریبی دوست کو کہتے ہیں۔ ان کو دوست نہ بنانے کا سبب یہ بتایا ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! یہود و نصاریٰ تمہارے دوست نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ وہ تو صرف آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں ایسی صورت میں ان کو دوست بنانا تمہارے حق میں سخت تباہ کن ہو سکتا ہے کیونکہ دوستی دوطرفہ ہوتی ہے اور اس کا سوتا دل سے پھوٹتا ہے۔ لہٰذا جو جذبات وہ تمہارے لیے رکھتے ہیں اگر وہی جذبات تم ان کے لیے رکھو تو تم ان سے تعلقات رکھ سکتے ہو اور ان کے ساتھ معاملات بھی کر سکتے ہو مگر اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھ کر۔

قرآن کے اعجاز پر غور کیجیے کہ جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئی تھیں اس وقت بھی یہ حالات کے مطابق تھیں اور آج اپنے نزول پر چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی حالات کے پہلے سے زیادہ مطابق ہیں۔ البتہ ان عناصر نے مسلمانوں کے خیر خواہ کا روپ دھار لیا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر ۵۲ میں ''دلوں کا روگی'' قرار دیا ہے، جو نزول قرآن کے وقت ''منافقین'' کے نام سے جانے جاتے تھے لیکن

آج ان کو نام عاقبت اندیش، امن پسند اور صلح جو وغیرہ رکھ دیا گیا ہے۔ جبکہ صحیح العقیدہ والمسلک مسلمانوں کو دہشت گرد، تشدد پسند اور تخریب کار کا نام دے دیا گیا ہے۔

اوپر حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی جس نکبت اور ان کی جس بے وزنی اور بے ثباتی کی پیشین گوئی فرمائی ہے آج کا مسلمان اس کی سچی تصویر پیش کر رہا ہے۔ اوپر جو قرآنی آیات پیش کی گئی ہیں وہ ببانگ دہل یہ اعلان کر رہی ہیں کہ مسلمانوں کی یہ حالت خود ان کی اپنی پیدا کردہ ہے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی واضح ہدایات پر عمل کرتے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کو نمونہ عمل بنائے رکھتے تو ان کی یہ حالت کبھی نہ ہوتی۔

﴿ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۝ ﴾ [الرعد:۱۱]

"اس (انسان) کے آگے اور پیچھے اس کے ایسے نگراں لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ درحقیقت اللہ کسی قوم کے حال کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف اور اپنے اعمال نہ بدل لے۔ اور جب اللہ کسی قوم کے اعمالِ بد کا برا بدلہ اس کو دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کو ٹالنے والا کوئی نہیں ہوتا اور نہ ایسی شامت زدہ قوم کا کوئی مددگار ہی ہوسکتا ہے"

مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ انسانوں کا خالق علیم وخبیر اللہ ان کی تمام حرکات و سکنات سے واقف ہے اور اس نے ہر شخص کے ساتھ ایسے نگراں لگا رکھے ہیں جو اس کے تمام اقوال اور اعمال کو ریکارڈ کرتے ہیں اور اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اللہ کی جو سنت اس دنیا میں جاری وساری ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو انعام واکرام سے اس وقت تک نہیں نوازتا جب تک کہ وہ اپنے حسن عمل سے اپنے آپ کو اس کا مستحق نہ ٹھہرا لے۔ اسی طرح جب تک کوئی اپنی بدعقیدگی اور بدعملی سے ذلت ونکبت کا مستحق نہیں بن جاتا اس وقت تک وہ اللہ تعالیٰ کی حمایت وحفاظت میں رہتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ آج مسلمان اپنی کثرت تعداد اور مال ودولت کی فراوانی کے باوجود جس ذلت ونکبت سے دوچار ہیں وہ درحقیقت ان کے اعمال بد کی پاداش ہے۔ مسلمانوں نے اپنے رب کی تعلیمات وہدایات کو پس پشت ڈال دیا، اس کی عطا کردہ نعمتوں اور صلاحیتوں کو تعیش میں ضائع کر رہے ہیں۔ اپنے اور اللہ کے

دشمنوں کو اپنا حامی و سرپرست اور جگری دوست بنالیا ہے۔ ان کے ارشادوں پر مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو ذبح کر رہے ہیں۔ کتاب وسنت کی صریح اور واضح تعلیمات کی تاویلیں کر کے ان کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں، ایسی صورت میں ان کا جو انجام ہونا چاہیے تھا وہ ہو رہا ہے۔ دشمنوں کے دلوں سے ان کا رعب و دبدبہ اور ہیبت وخوف نکل چکا ہے اور ان کو جس طرح چاہتے ہیں استعمال کر رہے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام

مکی دور کا وہ آخری زمانہ جو ہجرت مدینہ سے متصل تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جان نثار ساتھیوں کے لیے حد درجہ روح فرسا اور حوصلہ شکن تھا۔ رسول اکرم فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب اور غمگسار بیوی ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی یکے بعد دیگرے وفات نے قریش مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بہت دلیر اور جری بنا دیا تھا۔ ہجرت مدینہ سے متصل زمانے تک پہنچتے پہنچتے وہ یہ ناپاک منصوبہ بنانے لگے تھے کہ نعوذ باللہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیں۔

شدید ابتلا و آزمائش کے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ یوسف نازل فرمائی جو اس اعتبار سے قرآن پاک کی ایک منفرد سورت ہے کہ اس میں کسی نبی کا مکمل قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ان کے ساتھ کسی اور نبی کا قصہ شامل نہیں ہے۔ پھر یہ قصہ قرآن کی کسی اور سورت میں دہرایا بھی نہیں گیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کی ایک اور انفرادیت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ''احسن القصص'' بہترین قصہ یا سرگذشت سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس سورت کے اول تا آخر مطالعہ سے اس قصہ کو احسن القصص قرار دیے جانے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اور اس وقت مکہ کے حالات میں نمایاں مماثلت پائی جاتی تھی۔

برادران یوسف نے اپنے معصوم اور فرشتہ صفت بھائی کے خلاف جو ناپاک سازش کی تھی اور ان سے گلو خلاصی کے لیے جو گندا منصوبہ بنایا تھا اور پھر جس انسانیت سوز طریقے سے ان کو لے جا کر ایک اندھے کنویں میں پھینک دیا تھا، ٹھیک ویسا ہی کچھ کفار مکہ بھی کر رہے تھے۔ جبکہ وہ برادران یوسف کی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسب اور خون کا تعلق رکھتے تھے اور بقول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما قریش کے گھرانوں میں سے کوئی بھی گھرانہ ایسا نہ تھا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی قرابت داری نہ رہی ہو۔''[1]

دعوتِ اسلامی کے اس نہایت صبر آزما اور حوصلہ شکن مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم سورت نازل کر کے مسلمانوں کو دو نہایت اہم پیغام دیے۔

[1] صحیح بخاری: ح ۴۸۱۸

(۱) اہل حق بظاہر کتنے ہی کمزور و بے سہارا کیوں نہ ہوں اور اہل باطل کو جو طاقت وشوکت بھی حاصل ہو انجام کار فتح وکامرانی اہل حق کے لیے ہے اور باطل کا انجام شکست وریخت ہے۔ اس طرح حضرت یوسف علیہا السلام کا قصہ سنا کر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ تسلی دی ہے کہ وہ ابتلا و آزمائش سے پست ہمت نہ ہوں اور یاس وقنوطیت کو اپنے قریب نہ آنے دیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وہ دن دور نہیں جب فتح ونصرت ان کے ہمرکاب ہوگی۔ حق کامیاب ہوگا اور باطل کو شکست ہوگی۔ اہل باطل رسول اللہ ﷺ سے عفو درگزر کی بھیک مانگیں گے۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکیزہ سیرت، ابتلا و آزمائش کی راہ میں ان کی غیر معمولی استقامت اور ثابت قدمی کی مثال پیش کر کے مسلمانوں کو اللہ عزوجل نے یہ تلقین فرمائی ہے کہ وہ راہِ حق میں ثابت قدم رہیں اور اس راہ میں آنے والی آزمائشوں پر نہ دل شکستہ ہوں اور نہ صرف شکایت زبان پر لائیں۔ جس طرح اس کے عظیم بندے یوسف علیہ السلام نے ایک ایک کر کے تمام آزمائش جھیل ڈالیں اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔ نہ کبھی مصائب وآلام کے ہجوم پر ہمت ہاری۔ کم سنی میں جب پیار ومحبت کے محتاج تھے، ظالم بھائیوں نے اذیتیں دیں اور آبادی سے بہت دور لے جا کر ایک تاریک کنویں میں پھینک دیا مگر وہ صبر کا پہاڑ بنے رہے۔ نہ کوئی شور مچایا اور نہ کوئی واویلا کیا۔ جوانی کی عمر کو پہنچے تو ان کی عصمت وعفت کا ایسا امتحان لیا گیا جو ان سے پہلے کسی کا نہیں لیا گیا تھا۔ شیطان نے معصیت کو خوب بنا سنوار کر ان کے سامنے پیش کیا لیکن وہ عصمت وعفت اور پاکیزگی کا مضبوط پہاڑ بنے رہے۔ نہ ان کے دل میں برائی کا کوئی خیال پیدا ہوا اور نہ ان کے قدم ڈگمگائے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے وافر مقدار میں نوازا تھا۔

جہاں تک حسن صورت کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے حسن وجمال کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ تنہا ان کو اور بقیہ آدھا حصہ قیامت تک پیدا ہونے والوں میں تقسیم کر دیا۔[1]

رہا حسنِ سیرت تو وہ اللہ کے نبی تھے۔ جس کی علامتیں ان کے کردار کے ذریعے بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگی تھیں۔ ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔'' اور ان کا خواب سن کر ان کے نبی باپ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے نبی ہونے کی پیشین گوئی بھی کر دی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے حسنِ صورت، حُسنِ سیرت اور اپنی شرافت ونجابت کی وجہ سے اپنے والد

---

[1] صحیح مسلم: ح ۴۱۱

کو زیادہ محبوب تھے۔ اس محبوبیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا خواب سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ توقع تھی کہ وہی ان کی نبوت کے وارث ہوں گے۔ لیکن اپنے والد کی نظر میں ان کی یہ محبوبیت ان کے سوتیلے بھائیوں کے دلوں میں کانٹا بن کر چبھ رہی تھی۔ بجائے اس کے کہ سارے اپنے والد کی نگاہ میں محبوب بننے کے لیے اپنی سیرت وکردار کو درست کرتے انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے راستے سے ہٹا دینے کا فیصلہ کر ڈالا اور اپنے بوڑھے باپ کا کچھ خیال نہ کیا۔

جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے شیطان صفت سوتیلے بھائیوں نے ان کو گھر سے دور لے جا کر ایک اندھے کنویں میں ڈالنا چاہا اسی وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کو بذریعہ وحی یہ تسلی دی کہ ہماری تائید وحمایت تیرے ساتھ ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ ”تو ان کے اس کالے کرتوت کی ان کو خبر دے کر“ ان کو شرمسار کرے گا جس سے اس وقت یہ بے خبر ہیں۔

اس طرح وہاں سے گزرنے والے ایک قافلے نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکال لیا اور ان کو مصر لے جا کر فروخت کر دیا۔

قرآن پاک میں یہ صراحت نہیں ہے کہ جس وقت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا گیا اور پھر اس سے نکال کر ان کو مصر میں فروخت کیا گیا اس وقت ان کی عمر کیا تھی؟ اور نہ کسی صحیح حدیث میں اس کا ذکر آیا ہے۔ لیکن قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ ۱۲۔۱۳ سال کے بچے رہے ہوں گے۔ کیونکہ جب ان کے بھائیوں نے اپنے باپ سے ان کو اپنے ساتھ لیجانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ ”کہیں اس کو بھیڑیا نہ کھا جائے۔“

بہرحال جب یوسف علیہ السلام ایک غلام کی حیثیت سے عزیز مصر کے گھر میں داخل ہوئے اس وقت وہ بچے تھے۔ اسی گھر میں جوان ہوئے۔ عزیز مصر کے گھر میں وہ جس آزمائش سے گزرنے والے تھے اس کے ذکر سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرما دیا کہ: ”جب وہ بھرپور جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو قوت فیصلہ اور علم عطا کیا“ یہ ایسے دو ہتھیار ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول لیس ہوتے رہے ہیں۔

قرآن پاک میں حضرت لوط، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے بارے میں بھی یہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم اور علم سے نوازا۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کو حکم اور علم عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا: اسی طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔

عزیز مصر کی بیوی ایک ”بدکار“ عورت تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام اس کے سامنے جوان ہوئے تھے

اور اس کے زرخرید غلام بھی تھے۔ اس لیے اس نے ان سے اپنی جنسی خواہش پوری کرنی چاہی۔ آغاز امر میں اس نے اس غرض کے لیے اشارے کنائے کی زبان استعمال کی۔ قرآن میں اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے معنی ہیں: کسی مقصد کے لیے نرمی سے پھسلانا، ورغلانا اور ڈورے ڈالنا وغیرہ۔ لیکن یوسف علیہ السلام کے اوپر اس کی ان حرکتوں کا کوئی اثر نہ ہوا یعنی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ قرآن میں اس کے لیے "استعصم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں: شدت کے ساتھ گناہ سے باز رہنا۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اشارے کنائے کی زبان سنی ان سنی کر دی تو عزیز مصر کی بیوی نے قصر کے دروازے بند کر دیے اور حیا و شرم کی ردا اتار کر بولی: "آ جا"

اس موقع پر یوسف علیہ السلام نے فرمایا: معاذ اللہ" میں اس برے کام سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

اس صریح اور دوٹوک جواب پر اس نے یہ ارادہ کیا کہ وہ ان کو اپنے ساتھ بدکاری پر آمادہ کرنے کے لیے کوئی عملی اقدام کرے۔ ادھر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے دل میں یہ ارادہ کیا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ مزاحمت کریں گے۔ مگر اس حالت میں جبکہ سامنا نہایت بدکار اور بے شرم عورت سے ہو، مزاحمت سے سنگین نتائج نکلنے کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ وہ عورت مقصد میں ناکامی پر اپنے کپڑے پھاڑ سکتی تھی اور اپنے کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے کوئی بھی حرکت کر سکتی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ اور محبوب بندے کے دل میں یہ خیال (برہان) ڈال دیا کہ وہ دروازے کی طرف بھاگیں۔ اسی لمحے کہ جب وہ دروازے کی طرف بھاگے ان کے پیچھے وہ بھی بھاگی اور ان کو روکنے کے لیے پیچھے سے ان کا کرتہ پکڑ کر زور سے کھینچا اور وہ پھٹ کر ان کی بے گناہی کی ایک اہم دلیل دے گیا۔ عین اسی وقت قصر کا دروازہ کھل گیا اور سامنے عزیز مصر کھڑا ملا۔ یہ سب کچھ لمحوں میں ہو گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکیزگی کے امتحان و آزمائش کا ایک نہایت خطرناک مرحلہ بخیر و خوبی گزر گیا۔

عزیز مصر کا سامنا ہوتے ہی اس کی بیوی نے اپنے چہرے پر معصومیت کا نقاب ڈال لیا اور سارا قصور حضرت یوسف علیہ السلام پر ڈال دیا۔ کہنے لگی:

جس نے تمہاری بیوی کے ساتھ برے کام کا ارادہ کیا اس کی سزا کیا ہے؟ کیا یہی نہیں کہ اس کو قید کر دیا جائے یا المناک سزا دی جائے؟

یہاں اگر یوسف علیہ السلام اس کے اس جھوٹے الزام پر خاموش رہتے تو یہ اعتراف گناہ ہوتا اس لیے فرمایا: اس نے مجھے بدکاری پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کی بیوی کے اہل خانہ ہی میں سے ایک ایسے شخص کو درمیان میں ڈال دیا جو منصف اور حق شناس تھا۔ اس نے یہ گواہی دی کہ اگر یوسف کا کرتہ آگے سے پھٹا ہو تو زیادتی اس نے کی ہے اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو تو قصوروار یہ عورت ہے۔ جب عزیز نے یہ گواہی سن کر دیکھا تو یوسف علیہ السلام کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا ملا جس سے اس کو یہ یقین ہو گیا کہ قصور اس کی بیوی کا ہے۔ یوسف علیہ السلام کی طرف سے کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے اس نے یوسف علیہ السلام سے کہا:

''یوسف اس معاملے سے درگزر کرو۔ اور اپنی بیوی سے کہا:

تو اپنے قصور کی معافی مانگ درحقیقت تو ہی خطا کار ہے۔

ادھر کشاں کشاں اس واقعہ کی خبر شہر کی ان عورتوں تک پہنچ گئی جو عزیز کی بیوی کی طرح اس وقت کے بڑے عہدے داروں کی بیویاں رہی ہوں گی اور ان کی اخلاقی حالت اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ رہی ہوگی۔ یہ خبر سن کر ان عورتوں نے عزیز مصر کی بیوی کو قصوروار قرار دیا کہ وہ ایک غلام پر ریجھ گئی ہے اور اس سے اپنی جنسی پیاس بجھانا چاہتی ہے۔

عزیز مصر کی بیوی نے طعنہ سن کر ان کے صبر وضبط کا امتحان لینا چاہا اور انہیں کھانے پر مدعو کیا۔ پھل کاٹنے کے لیے ان کے ہاتھوں میں چھریاں تھما دیں۔ پھر اسی وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ باہر آئیں۔ ان عورتوں نے جب ان کو دیکھا تو ان کی خوبصورتی اور عظمت سے مبہوت ہو کر رہ گئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے اور بیک زبان بولیں:

ماشاءاللہ۔ ہر عیب اور نقص سے پاکی اللہ کے لیے ہے۔ یہ کوئی انسان نہیں یہ تو کوئی فرشتہ ہے۔

یہ سن کر عزیز کی بیوی بولی:

یہی ہے وہ جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کر رہی تھیں۔ درحقیقت میں نے اس پر ڈورے ڈالے پس وہ پوری شدت سے باز رہا۔ اگر اس نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو یقیناً قید کیا جائے گا اور ذلیل ہوگا۔

اس مرحلے پر حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ محسوس کیا کہ شیطان نے تو معصیت کا جال پر جال بچھا رکھا ہے۔ ان کو معصیت میں ڈالنے کے لیے بڑے جتن کیے جا چکے ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر انہوں نے اللہ کو پکارا:

اے میرے پروردگار! مجھے اس برے کام کے مقابلے میں قید ہو جانا زیادہ محبوب ہے جس کی دعوت زنانِ معصیت۔ مجھے دے رہی ہیں۔ اگر تو نے مجھ سے ان کے مکر وفریب کو دور نہ کیا تو میں انکی طرف

جھک پڑوں گا اور نادانوں میں شامل ہو جاؤں گا''

اوپر سورۂ یوسف کی جن آیتوں کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے ان سے ایک نہایت پاکباز صابر، خدا ترس اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے کی تصویر بنتی ہے جو اپنی زندگی فکر و خیال اور اخلاق و کردار...... ہر ایک میں اللہ تعالیٰ کی معصیت سے پاک ہے۔ اس سلسلے کی آخری آیت جو دراصل ایک دعا ہے اس امر پر بصراحت دلالت کرتی ہے کہ ان کے اندر عزیز مصر کی بیوی اور دوسری زنان مصر کی طرف ادنیٰ میلان اور جھکاؤ بھی نہیں پیدا ہوا تھا۔

ایک طرف یہ مہکتی ہوئی شخصیت، یہ پاکیزہ کردار اور عصمت وعفت کا پیکر ہے اور دوسری طرف وہ گندی اور موضوع روایات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے اس عظیم اور برگزیدہ بندے کی کردار کشی کی گئی ہے۔ جو وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا کی غلط تاویل کے نتیجے میں تفسیر اور تاریخ کی بہت سی کتابوں میں راہ پا گئی ہیں۔ ان جھوٹی روایتوں سے متاثر ہو کر بیشتر مفسرین اور مؤرخین نے ان کی جو تصویر پیش کی ہے وہ ایک عام مسلمان پر بھی صادق نہیں آتی چہ جائیکہ ایک ایسے برگزیدہ نبی پر صادق آئے جس کے قصے اور سرگزشت کو اللہ تعالیٰ نے ''احسن القصص'' سے تعبیر کیا ہے۔

میں سورۂ یوسف کی چوبیسویں آیت کے اس فقرے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا اور عورت نے درحقیقت اس کا ارادہ کیا اور اس نے اس عورت کا ارادہ کیا'' کے اس کے صحیح سیاق وسباق اور عصمت انبیاء کی روشنی میں ''معنی'' پیش کرنے سے پہلے ایسی چند صحیح احادیث نقل کر دینا چاہتا ہوں جن میں رسول اکرم ﷺ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت کے چند تابناک پہلوؤں کو واضح فرمایا ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: لوگوں میں سب سے زیادہ باعزت کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: جو ان میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو۔ صحابہ نے عرض کیا: ہم آپ سے اس کے بارے میں نہیں پوچھ رہے ہیں، تو نبی ﷺ نے فرمایا:

((فَأَكْرَمُ النَّاسِ يُوْسُفُ نَبِيُّ اللّٰهِ ابْنُ نَبِيِّ اللّٰهِ ابْنِ نَبِيِّ اللّٰهِ ابْنِ خَلِيْلِ اللّٰهِ))

''لوگوں میں سب سے زیادہ باعزت اللہ کے نبی یوسف تھے جو اللہ کے ایک نبی کے بیٹے، اللہ کے ایک نبی کے پوتے اور خلیل اللہ کے پڑپوتے تھے۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَلْكَرِيْمُ ابْنُ الْكَرِيْمِ ابْنِ الْكَرِيْمِ ابْنِ الْكَرِيْمِ يُوْسُفُ بْنُ يَعْقُوْبَ بْنِ

اِسْحٰقَ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ))

''خود باعزت، باعزت کا بیٹا، باعزت کا پوتا، باعزت کا پڑپوتا یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام تھے۔''[1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((وَلَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ مَالَبِثَ يُوْسُفُ، ثُمَّ اَتَانِيَ الدَّاعِيْ لَأَجَبْتُ))[2]

''اگر میں اتنی مدت قید میں رہتا جتنی مدت یوسف رہے، پھر میرے پاس بلانے والا آتا تو میں اس کی دعوت کو قبول کر لیتا۔''

سورۂ یوسف کی آیت نمبر ۵۰ کا معنی ومفہوم:

اور بادشاہ نے کہا: اسے میرے پاس لاؤ پس جب قاصد اس کے پاس گیا تو اس نے کہا: اپنے مالک کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ درحقیقت میرا رب ان کی مکاری سے خوب واقف ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے معراج کی ایک طویل حدیث مروی ہے جس میں مختلف آسمانوں پر مختلف انبیاء اور رسولوں کے نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقاتوں کا ذکر آیا ہے۔ اس حدیث میں تیسرے آسمان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کا ذکر بھی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرے آسمان پر پہنچنے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

((فَإِذَا أَنَا بِيُوْسُفَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَإِذَا هُوَ قَدْ أُعْطِيَ شَطْرَ الْحُسْنِ))[3]

''میں نے اپنے آپ کو یوسف صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پایا جن کو حسن کا آدھا حصہ عطا کیا گیا تھا. نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انہوں نے میرا خیر مقدم کیا اور میرے لیے دعائے خیر کی۔''

اب آیئے سورہ یوسف کی ۲۳ ویں آیت پر غور کریں جس میں ان کی عصمت وعفت کے امتحان کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ﴾

---

[1] صحیح بخاری: ح ۳۳۸۲، ۳۳۸۳، ۳۳۹۰، صحیح مسلم: ح ۶۱۶۱۔

[2] صحیح بخاری: ح ۳۲۷۲، ۳۳۸۷۔ صحیح مسلم: ح ۲۸۲، ۶۱۳۲

[3] صحیح مسلم: ح ۴۱۱

''اور وہ جس عورت کے گھر میں تھا اس نے اس کو حاصل کرنے کے لیے اس کو پھسلانا شروع کیا۔ عورت نے دروازے مضبوطی سے بند کر دیے اور بولی: آ جا''

اس آیت میں عزیز مصر کی بیوی کی جانب سے حضرت یوسف علیہ السلام کو بدکاری پر آمادہ کرنے کی جس کوشش کا ذکر ہے وہ دو مرحلوں پر مشتمل ہے:

پہلا مرحلہ: وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ..... میں بیان ہوا ہے اور

دوسرا مرحلہ: وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ..... میں

رَاوَدَ يُرَاوِدُ عَنِ الشَيءِ کی لغوی تحقیق:

رَاوَدَ يُرَاوِدُ کے معنی ہیں:

کسی سے کوئی کام لینے، کسی کام پر آمادہ کرنے، یا اس سے کوئی چیز یا مقصد حاصل کرنے کے لیے اس پر ڈورے ڈالنا، اس کو ورغلانا اور پھسلانا۔ اور مذکورہ شخص سے جو چیز مطلوب ہو اس کا ذکر صراحت کے بجائے اشارے اور کنائے سے کرنا۔ اس میں سختی کے بجائے نرمی کا مفہوم ہوتا ہے اور اس میں دھوکے اور فریب کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ یہ ان افعال سے تعلق رکھتا ہے جن میں تسلسل ہو۔ آغاز میں نرمی اور لطف سے کام لیا جاتا ہے۔ پھر ترغیب کا مرحلہ آتا ہے اور بروقت کامیابی نہ ہونے یا طرفِ مقابل کے تجاہل کے موقع پر خفگی اور پھر دھمکی کا بھی اظہار کیا جا سکتا ہے۔

اس فعل رَاوَدَ يُرَاوِدُ کے دو مفعول بہ آتے ہیں۔ پہلا مفعول بہ وہ ہوتا ہے جس سے ''مراودۃ'' کیا جائے۔ یہ فعل کے فوراً بعد آتا ہے اور دوسرا مفعول بہ وہ ہوتا ہے جو مطلوب ہو اور اس پر حرفِ جر ''عن'' آتا ہے۔ آیت مبارکہ میں عَنْ نَفْسِهِ کی ضمیر کا مرجع حضرت یوسف ہیں۔ اور یہ کنایہ ہے ''جنسی'' عمل کرنے سے۔ پورے فقرے کا مطلب ہے:

یوسف علیہ السلام جس عورت کے گھر میں تھے اس نے ان کو اپنے ساتھ جنسی عمل کرنے پر آمادہ کرنے کی غرض سے، ان کو نرمی اور خوش مزاجی سے پھسلانا اور ورغلانا شروع کیا۔

واضح رہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب عزیز مصر نے خریدا تھا اس وقت وہ بچے تھے۔ قصر میں عزیز اور اس کی بیوی کے سامنے جوان ہوئے۔ خانوادہ نبوت کے آپ چشم و چراغ تھے۔ مسلسل تین پشتوں سے نبوت کا سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ ان کے پردادا حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ اس لیے اپنی سیرت کی پاکیزگی کے ساتھ ان کا جسمانی کمال بھی جاذب نظر رہا ہوگا۔ مزید یہ کہ ان کو جو حسن و جمال عطا کیا گیا تھا

وہ معجزاتی اور بے مثال تھا۔ ویسے بھی انبیاء علیہم السلام صورت و سیرت میں کامل الخلقت ہوتے تھے۔

عزیز مصر کی بیوی ایک بدکار عورت تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام اس کے زر خرید غلام تھے۔ اس کی خدمت پر مامور تھے جس کی وجہ سے بلا روک ٹوک قصر کے ہر حصے بلکہ اس کی خلوت گاہ میں بھی آتے جاتے رہے ہوں گے۔ لہٰذا عزیز کی بیوی کے دل میں رہ رہ کر یہ شیطانی خواہش پیدا ہوتی رہتی ہوگی کہ وہ ان کو اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے استعمال کرے۔ لیکن یوسف علیہ السلام اپنی صالح فطرت اور اس عصمت کی وجہ سے جو لازمہ نبوت ہے اس کی حرکتوں اور اس کے اشاروں کنایوں کو نظر انداز کرتے رہے جس کی گواہی بعد میں عزیز کی بیوی نے ''زنان مصر'' کی مجلس میں خود دی ہے:

﴿ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهُ عَنْ نَّفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ﴾

''میں نے اس کو آمادہ گناہ کرنے کے لیے ورغلایا پس وہ پوری قوت سے گناہ سے باز رہا''

یہ لفظ پورے قرآن پاک میں صرف ایک بار اسی جگہ آیا ہے۔ اِسْتَعْصَمَ کا مصدر استعصام ہے۔ جس کے معنی ہیں پورے عزم اور قوت کے ساتھ معصیت سے باز رہنا۔ آیت مبارکہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالہ سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ عصمت کے اندر چلے گئے اور اس میں سما گئے۔[1]

جب عزیز کی بیوی نے دیکھا کہ یوسف علیہ السلام اس کے اشارے کنائے کی زبان سنی ان سنی کرتے جا رہے ہیں تو اس نے شرم وحیا کی ''ردا'' اتار دی اور صنف نازک کی معروف صفت سے بالکل عاری ہو کر نہایت واضح اور دوٹوک الفاظ میں ان کو دعوت گناہ دے دی۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ﴾

''اور اس عورت نے دروازے مضبوطی سے بند کر دیے اور بولی: آجا''

اس فقرے میں عزیز کی بیوی کی جو تصویر نظر آتی ہے وہ ایک نہایت بدکار اور بے حیا ''مالکن'' کی تصویر ہے جس نے اپنا حقِ ملکیت استعمال کرتے ہوئے اپنے غلام کو یہ صریح حکم دے دیا کہ میری شیطانی خواہش کی تکمیل کر۔

اس مرحلے مین حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے خاموش رہنا مناسب نہیں تھا۔ بلکہ جس قوت، زور اور صاف گوئی کے ساتھ حکم ملا تھا اسی قوت، زور اور صراحت کے ساتھ ان کو جواب بھی دینا تھا۔ لہٰذا اس کھلی دعوت گناہ کے جواب میں زبانِ نبوت یوں گویا ہوئی:

[1] الکشاف: ص ۲۸۱ ج ۳۔ القاموس القویم: ص ۲۴ ج ۲۔ النور المبین: ص ۲۳۹

﴿ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ط اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾

''میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ بلاشبہ وہ میرا رب ہے۔ اس نے مجھے بہترین ٹھکانا بخشا درحقیقت ظالم لوگ فلاح یاب نہیں ہوتے''

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ جواب نہایت واضح اور صریح تھا۔ انہوں نے ایک مومن صادق کی حیثیت سے اللہ کی پناہ لی تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں آنے والے کو کبھی خائب و خاسر نہیں کرتا۔ اس جواب نے عزیز کی بیوی کو اس اعتبار سے بالکل مایوس کر دیا کہ یوسف علیہ السلام کی نفسانی خواہش پوری کریں گے۔

آئمہ نحو میں امام ابو اسحاق ابراہیم بن سری زجاج قرآن پاک کا بڑا استھرا ذوق رکھتے تھے۔ قرآن پاک کی نحوی باریکیوں کو بیان کرتے ہوئے قرآنی آیتوں کی ایسی تاویل وتفسیر کرتے تھے جو دینی اور توحیدی روح سے بڑی ہم آہنگ ہوتی تھی۔ چنانچہ مذکورہ فقرے کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اِنَّهٗ رَبِّيْ'' میں ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے اور اس فقرے کا مطلب ہے کہ اللہ کی پناہ جو میرا رب ہے۔ اس نے مجھے اپنے لطف ومہربانی سے نوازا ہے۔ لہٰذا میں اس فعل کا ارتکاب نہیں کر سکتا جس کو اس نے حرام کر دیا ہے۔[1]

عزیز کی بیوی نے اپنے ناپاک مقصد کی تکمیل کے لیے اشارے کنائے کی زبان استعمال کی اور ناکام رہی۔ صریح حکم کا سہارا لیا پھر بھی کامیاب نہ ہوئی۔ اب اس کے سامنے تیسرا اور آخری راستہ یہ رہ گیا تھا کہ وہ ان سے اپنا ناپاک مقصد حاصل کرنے کے لیے ان کو مجبور کرے۔ کیونکہ وہ بدکار بھی تھی اور بااختیار بھی۔ رہے حضرت یوسف علیہ السلام تو وہ اس کی صریح دعوت گناہ کا جواب ''معاذ اللہ'' کہہ کر دے چکے تھے۔ لہٰذا ان کے دل میں یہ ارادہ پیدا ہوا کہ اگر عزیز کی بیوی نے کوئی عملی قدم اٹھایا تو وہ مزاحمت کریں گے۔ ان دونوں کے ارادوں کو آیت نمبر ۲۴ میں بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا ط ﴾

''درحقیقت عورت نے اس کا ارادہ کیا اور اس نے عورت کا ارادہ کیا''

هَمَّ يَهُمُّ کی لغوی تحقیق اور طریقہ استعمال

هَمَّ يَهُمُّ هَمًّا کے معنی ہیں:

کسی فعل یا کام کا دل میں ارادہ اور قصد کرنا، مگر اس پر عمل نہ کرنا۔

[1] بحواله فتح القدير: ص ٢٢ ج ٣۔ الجامع الاحكام القرآن: ص ١١٦ ج ٥

اس فعل کا مفعول بہ یا تو کوئی کام اور عمل ہوتا ہے یا کوئی اسم۔ یعنی شخص اور جماعت۔ اگر اس کا مفعول بہ کوئی کام یا عمل ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ دل میں اس کا ارادہ کیا لیکن اس کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ﴾ [المائدہ: ۱۱]

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد کرو جب ایک قوم نے تم پر دست درازی کا ارادہ کیا تو اللہ نے ان کے ہاتھ تم سے رد کر دیے"

اس آیت میں قوم سے مراد یہودی ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں پر دست درازی کا ارادہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو ان سے محفوظ رکھا۔

اور نبی مکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً))[1]

"جس نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہیں کیا تو اللہ اس کے لیے اپنے پاس پوری ایک نیکی لکھے گا۔"

لیکن اگر هَمَّ يَهُمُّ کا مفعول بہ فعل نہیں بلکہ کوئی شخص یا جماعت ہو تو متکلم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ یا تو واضح کرے کہ اس سے اسکی مراد کیا ہے؟ یا کلام میں کوئی ایسا قرینہ چھوڑ دے جو اس کی مراد پر دلالت کرتا ہو۔

پہلی صورت کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد و مبارک ہے:

﴿ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ ﴾ [المومن: ۵]

"ہر امت نے اپنے رسول کا ارادہ کیا کہ وہ اس کو قید کر دیں (یا قتل کر دیں) اور انہوں نے باطل کے ساتھ (ان پیغمبروں سے) جھگڑا کیا، تا کہ اس کے ذریعے حق کو پھسلا دیں۔ تو میں نے ان کفر کو پکڑ لیا۔ پھر میری سزا کیسی تھی؟"

اس ارشاد ربانی میں "هَمَّتْ" کا مفعول بہ "بِرَسُوْلِهِمْ" ہے اور ارادہ کرنے سے کیا مراد ہے یہ آیت کے پہلے فقرے میں واضح نہیں ہے "لِيَاْخُذُوْهُ" کہہ کر اس کو واضح کر دیا۔

یہاں یہ واضح رہے کہ هَمَّ يَهُمُّ کے مفعول بہ پر ہمیشہ حرف "ب" آتا ہے جس کا الگ سے کوئی

---

[1] صحیح بخاری ح ٦٤٩١، صحیح مسلم ح ١٣١

مفہوم نہیں ہوتا۔

اب رہی دوسری صورت یعنی کہ متکلم یہ واضح نہ کرے کہ هَمَّ يَهُمُّ کے فاعل کا اپنے مفعول بہ سے کیا ارادہ ہے۔ بلکہ اس سے پہلے کوئی ایسا قرینہ چھوڑ دے جو اس کی مراد پر دلالت کرتا ہو تو اس کی مثال سورہ یوسف کی ۲۴ ویں آیت کا یہ فقرہ ہے:

﴿ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا ﴾

''اور در حقیقت عورت نے اس کا ارادہ کیا اور اس نے عورت کا ارادہ کیا''

تو اس فقرے میں بھی هَمَّتْ اور هَمَّ کا مفعول بہ فعل نہیں بلکہ اشخاص ہیں۔ مطلب یہ کہ: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ میں ''بِهٖ'' هَمَّتْ کا مفعول بہ ہے اور ''بِهٖ'' کی ضمیر کا مرجع یوسف علیہ السلام ہیں۔ جبکہ ''هَمَّ بِهَا'' میں هَمَّ کا مفعول بہ ''بِهَا'' ہے جس کی ضمیر ''ھا'' سے عزیز مصر کی بیوی مراد ہے۔

آیت مبارکہ میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جو عزیز مصر کی بیوی اور حضرت یوسف علیہ السلام کے ارادوں کو واضح کر رہا ہو۔ البتہ سابقہ آیت کا یہ فقرہ:

﴿ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَیْتَ لَكَ ط ﴾

''اور وہ جس عورت کے گھر میں تھا اس نے اس کو حاصل کرنے کے لیے اس کو پھسلانا شروع کیا۔ اور دروازے مضبوطی سے بند کر دیے اور بولی: آ جا''

ایک ایسا واضح قرینہ ہے جو اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ عزیز کی بیوی نے یوسف علیہ السلام سے کس چیز کا ارادہ کیا؟ یعنی اس نے یوسف علیہ السلام سے یہ ارادہ کیا کہ وہ اس کے ساتھ بدکاری کریں۔ اور ''هَمَّتْ'' سے پہلے ''ل'' اور ''قد'' کا مطلب ہے:

عزیز کی بیوی نے یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ بدکاری کرنے پر مجبور کرنے کا نہایت پختہ اور مصمم ارادہ کر لیا۔

رہا اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَهَمَّ بِهَا اور اس نے (یوسف نے) اس کا ارادہ کیا کا صحیح مفہوم متعین کرنے والا قرینہ تو وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ o ﴾

''میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ بلاشبہ وہ میرا رب ہے۔ اس نے مجھے اچھا ٹھکانا بخشا۔ در حقیقت ظالم لوگ فلاح یاب نہیں ہوتے۔''

یہ قرینہ بتا رہا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے یہ ارادہ کیا کہ اگر عزیز کی بیوی ان کو اپنے ساتھ بدکاری پر مجبور کرنے کے لیے کوئی عملی قدم اٹھائے گی تو وہ مزاحمت کریں گے۔ لیکن وہ طالب نہیں بلکہ مطلوب تھے اس لیے ان کا ارادہ اس عزم سے خالی ہے جو عزم عزیز کی بیوی کے ارادے میں ہے۔ کیونکہ وہ طالب تھی۔ اسی وجہ سے ان کے ارادے کی تعبیر کے لیے ''وَهَمَّ بِهَا'' استعمال کیا گیا ہے جو تاکیدی حروف سے خالی ایک سادہ فعل ہے۔

اوپر حضرت یوسف علیہ السلام کے جس ارادے کا ذکر کیا گیا ہے عصمت انبیاء اور سیاق وسباق کی روشنی میں اس کے سوا ان کا کوئی اور ارادہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ عصمت وعفت کے پیکر جس عظیم انسان کی زبان مبارک سے دعوت گناہ کے جواب میں ''معاذ اللہ'' نکلا ہو اس کے دل میں بدکاری کے ارتکاب کا ارادہ کرنا ناممکن ہے۔ الا یہ کہ اس نے یہ عظیم اور دل ہلا دینے والا کلمہ صرف زبان سے ادا کر دیا ہو درآنحالیکہ اس کے دل میں برائی کی خواہش بھی ہو۔ تو کسی نبی کے بارے میں اس طرح کی بات وہی شخص سوچ یا کہہ سکتا ہے جو عصمت انبیاء کے مفہوم سے ناواقف ہو یا اس کا دل ایمان سے خالی ہو۔

قدیم مفسرین کی ایک جماعت سے بھی ''وَهَمَّ بِهَا'' کی یہی تفسیر منقول ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی بیوی کو دفع کرنے اور اس کی مزاحمت کا ارادہ کیا۔ چنانچہ امام ابو محمد عبدالحق بن عطیہ اندلسی اور امام ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی نے اپنی تفسیروں میں اس کا ذکر کیا ہے۔[1] لیکن ابن عطیہ نے اس کو بہت ضعیف قول قرار دیا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ قول ضعیف کیوں ہے؟ حالانکہ عصمت انبیاء اور سیاق وسباق کی روشنی میں یہ قول ضعیف نہیں بلکہ قوی ہے۔ اور اسلوب زبان کے اعتبار سے بھی یہ مفہوم مراد لینے میں کوئی مانع نہیں ہے۔ بلکہ برائی کا ارادہ کرنا اور مزاحمت کرنا دونوں مفہوم اس سے نکلتے ہیں۔ البتہ عصمت انبیاء اور سیاق وسباق کی روشنی میں ''مزاحمت'' کا ارادہ یقینی ہے۔

لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں اسرائیلی روایات اور ان روایات کی روشنی میں گھڑی جانے والی دوسری روایات میں یہی دعویٰ کیا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی بیوی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کیا تھا لیکن اپنے رب کی برھان دیکھ لینے کی وجہ سے اس کے ارتکاب سے باز رہے۔ چونکہ بیشتر مفسرین کسی نہ کسی درجے میں ان روایات سے متاثر تھے اس لیے سب نے ''وَهَمَّ بِهَا'' کی یہی تفسیر کی ہے کہ یوسف علیہ السلام نے عزیز کی بیوی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کیا اور پھر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ''دل میں برائی کا خیال یا ارادہ قابل مواخذہ نہیں ہے۔ بلکہ قابل مؤاخذہ برائی کو عملی جامعہ پہنانا ہے۔

[1] المحرر الوجيز: ص ۹۸۸ ، الجامع لأحكام القرآن: ص ۱۱۷ ، ج ۵

بعض مفسرین نے تو یہ لکھا ہے کہ "وَهَمَّ بِهَا" اگلے فقرے "لَوْلَا أَنْ رَاٰى بُرْهَانَ رَبِّهِ" کا جواب مقدم ہے۔ اس صورت میں "وَهَمَّ بِهَا" "وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ" پر معطوف نہیں ہے۔ بلکہ مستقل جملہ ہے۔ اس طرح: وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَاٰى بُرْهَانَ رَبِّهِ..... کا مطلب ہوگا:

اور یوسف بھی اس کا (عورت کا) ارادہ کرتا اگر اس نے اپنے رب کی برھان نہ دیکھ لی ہوتی "۔ چونکہ انہوں نے اپنے رب کی برھان دیکھ لی تھی اس لیے اس کا ارادہ نہیں کیا۔

مگر یہ دونوں تفسیریں باطل ہیں۔

(۱) جہاں تک پہلی تفسیر کا تعلق ہے یعنی دل میں کسی برائی کا خیال اور ارادہ، برائی نہیں بلکہ اس ارادے اور خیال کو عملی جامہ پہنانا برائی ہے۔ یہ بات عام انسانوں کے حوالے سے تو درست ہوسکتی ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کے حوالہ سے درست نہیں ہے۔ خاص طور پر جبکہ زیر بحث برائی زنا اور بدکاری ہے۔ جو بہیمیت ہے اور پاکیزہ فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حد درجہ برا فعل قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَ سَآءَ سَبِيْلًا ﴾ [الاسراء:۳۲]

"اور زنا کے پاس نہ پھٹکو کیونکہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت بری راہ ہے"

تو ایسی بدکاری کے ارتکاب کا خیال ایک معصوم نبی کے دل میں کیونکر پیدا ہوسکتا ہے۔ جبکہ وہ اس برائی کی دعوت کے جواب میں اللہ کی پناہ مانگ چکا ہو۔

رہی دوسری تفسیر: یوسف علیہ السلام بھی اس کا ارادہ کرتے اگر انہوں نے اپنے رب کی برھان نہ دیکھ لی ہوتی۔ چونکہ انہوں نے اپنے رب کی برھان دیکھ لی تھی اس لیے اس کا ارادہ نہیں کیا۔"

تو یہ تفسیر دو وجوہات کی بنا پر سے باطل ہے۔

(۱) "لَوْلَا" کا جواب "لَوْلَا" سے پہلے نہیں آتا۔ اس قاعدے کی رو سے وَهَمَّ بِهَا کو "لَوْلَا" کا جواب قرار دینے کی صورت میں یہ لازم آئے گا کہ یوسف علیہ السلام نے عزیز کی بیوی کا ارادہ کیا بھی اور ارادہ نہیں بھی کیا اور یہ محال ہے۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ارادے کے لیے فعل ماضی "هَمَّ" استعمال کیا ہے اور فعل ماضی کسی چیز اور کام ہوجانے پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی "وَهَمَّ بِهَا" کے معنی ہیں:

"انہوں نے اس عورت کے بارے میں ارادہ کرلیا۔"

اور لَوْلَا کو حرفِ امتناع کہتے ہیں جس کے بعد دو جملے آتے ہیں۔ جن میں سے پہلے جملے کے وجود یا ہونے کی بنا پر دوسرا جملہ یا فعل غیر موجود ہوتا ہے یا ناممکن الوجود ہوتا ہے۔ اس طرح اگر "وَهَمَّ بِهَا" کو "لَوْلَا" کا جواب قرار دیا جائے تو عبارت یوں ہوگی وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَاٰى بُرْهَانَ رَبِّهِ لَهَمَّ بِهَا.

"اور یوسف نے اس عورت کا ارادہ کر لیا اگر اس نے اپنے رب کی برھان نہ دیکھ لی ہوتی تو اس عورت کا ارادہ کرتا۔" اس کا مطلب ہوا"

یوسف علیہ السلام نے اس عورت کا ارادہ کیا، چونکہ انہوں نے اپنے رب کی برھان دیکھ لی اس لیے اس عورت کا ارادہ نہیں کیا۔ اور یہ ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں انہوں نے ایک چیز کا ارادہ کیا بھی اور نہیں بھی کیا۔

اردو کی تفسیر میں مذکورہ فقرے کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

قصد نہ کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نفس میں ہیجان اور تحریک ہی پیدا نہ ہوئی ہو۔ ممکن ہے ہیجان پیدا ہوا ہو۔ مگر ہیجان اور تحریک کا پیدا ہو جانا الگ بات ہے اور قصد کر لینا الگ بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سرے سے ہیجان اور تحریک ہی پیدا نہ ہو تو ایسے شخص کا گناہ سے بچ جانا کوئی کمال نہیں۔[1]

اس عبارت کا مطلب ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے جسم میں بدکاری اور زنا کے لیے ہیجان اور تحریک پیدا ہوئی اور انہوں نے اس پر کنٹرول کیا۔

یاد رہے کہ ہیجان اور تحریک شہوت کی شدت کو کہتے ہیں۔ تو کیا ایک معصوم نبی کے حق میں یہ تصور کہ اس کے دل میں زنا اور بدکاری کے لیے شدید خواہش پیدا ہوئی اور اس نے اس پر کنٹرول کیا، کسی بھی حال میں جائز ہو سکتا ہے؟!

درحقیقت ایک معصوم نبی کی شخصیت کو مسخ کرنے والی اور اس کی کردار کشی کرنے والی یہ ساری تفسیریں اس "مفروضے" پر مبنی ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بہر حال "زنا" کا ارادہ کیا اور یہ مفروضہ ان جھوٹی روایات پر مبنی ہے جو تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "لَوْلَا أَنْ رَاٰى بُرْهَانَ رَبِّهِ" میں برھان سے مراد ایسی برھان یا حسی دلیل یا نشانی نہیں ہے جو معصیت سے باز رہنے میں مدد دے۔ کیونکہ اگر کوئی نبی زنا جیسی برائی اور بدکاری سے بچنے کے لیے اس طرح کی برھان کا محتاج ہے تو پھر دنیا میں کوئی بھی زانی گنہگار نہیں ہے۔

---

[1] تفسیر احسن البیان: ص ۵۷۹

اس لیے کہ وہ ارتکاب زنا کے وقت اپنے سامنے ایسی کوئی دلیل اور برہان نہیں دیکھتا۔ لہٰذا دنیا کے سارے زانی اور بدکار معذور ہیں۔

درحقیقت مذکورہ فقرے میں برھان سے مراد حسی برھان اور دلیل نہیں ہے۔ جب کہ جھوٹی روایات اور اسرائیلیات میں دعویٰ کیا گیا ہے۔ بلکہ اس ''برھان'' سے مراد کوئی ایسا خیال یا روشنی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں عین اس وقت ڈال دی گئی جب انہوں نے عزیز مصر کی بیوی کی عملی اقدام کی صورت میں ''مزاحمت'' کا ارادہ کیا اور یہ خیال آتے ہی وہ دروازے کی طرف بھاگے۔

امام قرطبی لکھتے ہیں:

یوسف علیہ السلام نے عزیز کی بیوی کو اپنے سے دفع کرنے اور ہٹانے کا ارادہ کیا اور ''برھان'' یہ تھی کہ وہ مزاحمت اور دفع کرنے سے باز رہیں۔ کیونکہ اگر انہوں نے اس کو مارا یا دفع کیا یا مزاحمت کی تو اس سے یہ خیال اور تاثر مل سکتا تھا کہ انہوں نے اس کے ساتھ بدکاری کرنی چاہی اور وہ باز رہی۔ جس پر انہوں نے اس کو مارا''۔[1]

عصمت انبیاء، روح قرآن اور سیاق وسباق سے یہی تفسیر ہم آہنگ ہے اور اس کی تائید دروازے پر عزیز مصر کے سامنے اس کی بیوی کے اس جھوٹے الزام سے ہوتی ہے جو اس نے اچانک یوسف علیہ السلام پر دھر دیا اور خود مظلوم بن گئی۔

﴿ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [یوسف:۲۵]

''اس شخص کی کیا سزا ہے جس نے تیری بیوی کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا سوائے اس کے کہ وہ قید کیا جائے یا اس کو دردناک سزا دی جائے۔''

بعض موضوع اور جھوٹی روایات کے ذکر سے پہلے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام معصیت سے باز رہنے کے لیے کسی برھان کی محتاج نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ یہ برھان ان سے کسی بھی حال میں جدا نہیں ہوتی تھی۔ حتی کہ نیند میں بھی نہیں۔ اسی وجہ سے نیند میں انبیاء علیہم السلام کی صرف آنکھیں سوتی ہیں ان کے دل نہیں سوتے تھے۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا:

---

[1] الجامع لاحکام القرآن: ص ۱۱۷ ج ۵

((يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ تَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُوْتِرَ؟ قَالَ: تَنَامُ عَيْنِیْ وَلَا يَنَامُ قَلْبِیْ))[1]

''اے اللہ کے رسول! کیا آپ وتر پڑھنے سے پہلے سوئیں گے؟ فرمایا میری آنکھیں سوتی ہیں اور میرا دل نہیں سوتا۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ ''اسراء کی رات'' کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((وَكَذٰلِكَ الْأَنْبِيَاءُ تَنَامُ أَعْيُنُهُمْ وَلَا تَنَامُ قُلُوْبُهُمْ))[2]

''اسی طرح انبیاء بھی ہیں کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے''

امام بخاری نے اپنی صحیح میں حدیث نمبر ۱۳۸ نقل کرنے کے بعد عمرو بن دینار مکی کی روایت سے مشہور تابعی عبید بن عمیر رحمہم اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''انبیاء کے خواب وحی کا درجہ رکھتے ہیں اور دلیل میں سورۃ الصافات کی آیت ۱۰۲ پیش کی ہے۔ جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب کا ذکر آیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ چونکہ نیند کی حالت میں بھی انبیاء علیہم السلام کے دل عام لوگوں کے برعکس بیدار رہتے ہیں اس لیے وہ جو خواب دیکھتے ہیں ان کا مصدر ذات الٰہی ہوتی ہے اور اس حالت میں بھی وہ شیطانی وسوسوں سے کلی طور پر محفوظ رہتے ہیں۔ انبیاء اپنی قوم کے حق میں باپ کا درجہ رکھتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ أُعَلِّمُكُمْ......))[3]

''درحقیقت میں تم لوگوں کے لیے والد کا درجہ رکھتا ہوں اور تمہیں تعلیم دیتا ہوں۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے ہر فرد کے لیے باپ کا درجہ رکھتے تھے اور تمام انبیاء اگرچہ فضائل ومناقب میں ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن امت کے حق میں سب کی یکساں حیثیت تھی۔ لہٰذا کسی بھی نبی کے دل میں اپنی امت کی کسی عورت کے ساتھ بدکاری کا خیال اور ارادہ محال تھا۔

اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم کے بعد فرشتوں اور ابلیس کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ ان کو سجدہ کریں۔ فرشتے تو اس حکم الٰہی کی تعمیل میں فوراً سجدے میں گر گئے مگر ابلیس نے یہ کہہ کر ان کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا کہ اس کی تخلیق جس مادے (آگ) سے ہوئی ہے وہ آدم کے مادہ تخلیق (مٹی) سے بہتر ہے۔ اس حکم

---

[1] صحیح بخاری: ح ۳۵۶۹، صحیح مسلم: ح ۱۷۳۳

[2] صحیح بخاری: ۳۵۷۰

[3] ابوداؤد: ح ۸۔ نسائی: ح ۴۰۔ ابن ماجہ: ۳۱۳

عدولی پر اللہ تعالیٰ نے اس کو قیامت تک کے لیے ملعون قرار دے دیا۔ اس پر ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لیے مہلت عمر مانگ لی اور یہ قسم کھالی کہ وہ آدم کی اولاد کو گمراہ کرنے کے لیے اپنی ساری کوششیں وقف کر دے گا۔ مگر اسی کے ساتھ اس نے یہ اعتراف کیا کہ وہ اولاد آدم میں سے ان لوگوں کو گمراہ نہ کر سکے گا جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خالص کر کے چن لیا ہے۔ اس فضل اور توفیق کے مستحق بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ''اَلْمُخْلَصِیْنَ'' کی تعبیر استعمال فرمائی ہے جو ''اَلْمُخْلَصُ'' کی جمع ہے۔ یہ أَخْلَصَ یَخْلِصُ کا اسم مفعول ہے اور اس کا مصدر الاخلاص ہے۔ جس کے معنی ہیں عبودیت کو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کر دینا۔ سچے دل اور ریا کاری سے پاک ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا۔

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کا ''مخلص'' بندہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید اور اپنی عبودیت کے لیے خاص کر لیا اور چن لیا ہو۔ اس کو شیطان کی فریب کاریوں سے بالکل محفوظ کر دیا ہو۔

عمومی طور پر تمام انبیاء اور رسول اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور ''مُخْلَصُ'' بندے تھے۔ لیکن قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مخصوص طور پر اپنے جس بندے کو ''مخلصین'' میں شمار کیا ہے وہ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں: فرمایا: اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ. بلاشبہ وہ ہمارے برگزیدہ اور چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔''

اللہ تعالیٰ نے مخصوص طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کو اس فضل سے اس لیے نوازا ہے کہ ان کو جس آزمائش میں ڈالا گیا تھا وہ اپنی نوعیت کی ایک بالکل منفرد آزمائش تھی جس میں ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی بھی نبی اور رسول کو نہیں ڈالا گیا۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عفت و عصمت، ان کے فکر و خیال اور اخلاق و کردار کی پاکی کی ان تمام تاکیدات کے باوجود تقریباً تمام ہی تفسیروں میں ان کی اس قدر گندی تصویر کیوں پیش کی گئی ہے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ ان کی عظیم شخصیت کو مسخ کرنے والی جھوٹی روایات اس قدر پھیلا دی گئیں اور اس قدر عام کر دی گئیں کہ بڑے سے بڑا مفسر اور مؤرخ بھی ان کی سیرت بیان کرتے وقت اپنے ذہن و دماغ کو ان کے اثر سے پاک نہ کر سکا۔

اب میں ان جھوٹی روایات میں سے بعض کا ذکر کرتا ہوں جن کو تقریباً تمام ہی مشہور تفسیروں میں نقل کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ان روایات میں سے بیشتر کی کوئی سند بھی نہیں بیان کی گئی۔ البتہ بعض کو حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے منسوب کیا گیا ہے۔ جبکہ ان جلیل القدر صحابیوں کا دامن ان

سے پاک ہے۔

(٢٣٤)......عَنْ مُجَاهِدٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: وَهَمَّ بِهَا: قَالَ: حَلَّ سَرَاوِيْلَهُ وَقَعَدَ مِنْهَا مَقْعَدَ الرَّجُلِ مِنِ امْرَأَتِهِ، فَإِذَا بِكَفٍّ قَدْ بَدَتْ بَيْنَهُمَا بِلَا مِعْصَمٍ وَلَا عَضُدٍ مَكْتُوْبٍ عَلَيْهَا: ﴿ وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كٰتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾ فَقَامَ هَارِبًا وَقَامَتْ، فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْهُمَا الرُّعْبُ عَادَتْ وَعَادَ، فَظَهَرَتْ تِلْكَ الْكَفُّ مَكْتُوْبًا عَلَيْهَا: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ ﴾ فَقَامَ هَارِبًا وَقَامَتْ، فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْهُمَا الرُّعْبُ عَادَتْ وَعَادَ، فَظَهَرَ فَرَأَ تِلْكَ الْكَفَّ مَكْتُوْبًا عَلَيْهَا: ﴿ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ط ﴾ فَقَامَ هَارِبًا وَقَامَتْ، فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْهُمَا الرُّعْبُ عَادَتْ وَعَادَ، فَقَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لِجِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: أَدْرِكْ عَبْدِيْ قَبْلَ أَنْ يُصِيْبَ الْخَطِيْئَةَ، فَانْحَطَّ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَاضًا عَلَى أُصْبُعِهِ، يَقُوْلُ: يَا يُوْسُفُ: تَعْمَلُ عَمَلَ السُّفَهَاءِ وَأَنْتَ مَكْتُوْبٌ عِنْدَ اللّٰهِ فِي الْأَنْبِيَاءِ۔

”مجاہد سے روایت ہے کہ اور وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: یوسف نے عورت کا ارادہ کیا: کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: یوسف علیہ السلام نے اپنا پائجامہ کھولا اور عزیز مصر کی بیوی کے پیروں کے درمیان اس طرح بیٹھ گئے جس طرح مرد اپنی بیوی کے پیروں کے درمیان بیٹھتا ہے۔ اچانک ایک ہتھیلی کلائی اور بازو کے بغیر ان کے درمیان ظاہر ہوئی جس پر لکھا ہوا تھا: اور بے شک تم پر نگران مقرر ہیں۔ ایسے معزز کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔ (الانفطار: ۱۰۔۱۲) یوسف کھڑے ہو کر بھاگے اور وہ بھی بھاگی۔ جب ان دونوں کی گھبراہٹ دور ہوگئی تو وہ عورت اور وہ دوبارہ اس حالت میں لوٹ آئے۔ اس وقت وہی ہتھیلی اس طرح نمودار ہوئی۔ اس پر لکھا ہوا تھا: اور تم لوگ زنا کے قریب نہ بھٹکو۔ وہ بہت بڑی بے حیائی اور بڑا برا راستہ ہے (الاسرا: ۳۲) یوسف اٹھ کر بھاگے اور وہ بھی بھاگی۔ جب دونوں کا خوف زائل ہو گیا تو وہ عورت اور وہ دوبارہ وہی عمل کرنے لگے۔ اس وقت انہوں نے وہی ہتھیلی اس شکل میں دیکھی کہ اس پر لکھا ہوا تھا:

تم لوگ اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کے پاس واپس جاؤ گے۔'' یہ دیکھ کر یوسف اور وہ عورت کھڑے ہو کر بھاگے اور جب ان کا ڈر جاتا رہا تو اسی عمل میں دوبارہ مصروف ہو گئے۔

اس وقت اللہ عزوجل نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا: میرے بندے کو، قبل اس کے کہ وہ گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے، پکڑو۔ پس جبریل علیہ السلام اپنی انگلی دانتوں سے کاٹتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے نازل ہوئے: اے یوسف! تم نادانوں کے فعل کا ارتکاب کر رہے ہو جبکہ اللہ کے یہاں تمہارا نام انبیا میں لکھا ہوا ہے۔''

یہ گندی روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نام پر جھوٹ ہے۔ جس کے لفظ لفظ سے ایک معصوم نبی کی کردارکشی کی بو آتی ہے۔ اس روایت میں ان کی جو گندی تصویر پیش کی گئی ہے وہی تصویر یہودیوں نے اپنی کتابوں میں اپنے انبیاء کی پیش کی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جس دشمن اسلام نے یہ روایت گھڑی ہے اس نے ''پلاٹ'' تو اسرائیلیات سے لیا ہے اور اس میں قرآنی آیات ملا کر اس کو حدیث کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ غور فرمایئے: کیا ایسا شخص کوئی نبی ہوسکتا ہے جو برہان پر برہان دیکھتا ہے پھر بھی زنا جیسی بدکاری کرنے پر مصر ہے؟ اس جھوٹی روایت میں ایک معصوم اور برگزیدہ نبی اور ایک بدکار عورت کو ایک ہی مقام پر رکھ دیا گیا ہے ﴿ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ط اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝ ﴾ بڑی بری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ وہ تو صرف جھوٹ بکتے ہیں۔

عجیب اور افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ اور اس طرح کی دوسری گندی روایات نقل کرنے میں بغوی، ابن عطیہ اندلسی، قرطبی اور امام شوکانی جیسے بڑے مفسرین ملوث ہیں۔ البتہ قاضی ابوبکر ابن العربی نے ایسے تمام مفسرین پر سخت تنقید کی ہے جنہوں نے اس طرح کی روایات نقل کی ہیں اور لکھا ہے کہ: ''ان مفسرین کو کیا ہوا: کوئی بات سمجھتے نہیں اور کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے یہ کہا اور یہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے تو صرف یہ فرمایا ہے: هَمَّ بِهَا اس نے اس عورت کا ارادہ کیا۔[1]

بعض مفسرین نے تو یہاں تک جرأت کی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قول: ''مَعَاذَ اللّٰهِ'' پر بھی اعتراض کر دیا ہے۔ چنانچہ ابن عطیہ اندلس لکھتے ہیں۔

جب یوسف علیہ السلام نے ''مَعَاذَ اللّٰهِ'' کہا اور معاملہ کی احتجاج اور نرمی کے ساتھ مزاحمت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس ''ارادے سے جو انہوں نے کیا، ان کا امتحان لیا۔ اگر انہوں نے ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ

---

[1] احکام القرآن: ص ۳۸ ج ۳

اِلَّا بِاللّٰهِ" کہا ہوتا تو آزمائش میں نہ ڈالے جاتے۔"[۱]

انبیاء کی زبان تو حق کی ترجمان ہوتی ہے اور جو بات ان کی زبان مبارک سے نکلتی ہے وہ سراسر صداقت اور حق کی ترجمانی کرتی ہے۔

(۲۳۳)......عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: جَاءَ اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَهُوْدِيٌّ يُقَالُ لَهُ: بُسْتَانٌ، فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ! أَخْبِرْنِي عَنِ الْكَوَاكِبِ الَّتِي رَاهَا يُوْسُفُ سَاجِدَةً لَهُ، وَمَا أَسْمَاؤُهَا؟، قَالَ: فَسَكَتَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ يُجِبْهُ، فَنَزَلَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِأَسْمَائِهَا، فَبَعَثَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: هَلْ اَنْتَ مُؤْمِنٌ إِنْ أَخْبَرْتُكَ بِأَسْمَائِهَا؟ قَالَ: نَعَمْ، فَقَالَ: هِيَ جَرَيَّانُ، وَالطَّارِقُ، وَالذَّيَّالُ، وَذُوالْكَتِفَيْنِ، وَقَابِسٌ، وَوَثَّابٌ وَعَمُوْدَانُ، وَالْفَيْلَقُ وَالْمُصْبِحُ وَالضَّرُوْحُ وَذُوالْفَرْعِ وَالضِّيَاءُ وَالنُّوْرُ۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک یہودی حاضر ہوا جس کا نام بستان تھا، اس نے عرض کیا: اے محمد! مجھے ان ستاروں کے نام بتایئے جن کو یوسف علیہ السلام نے انہیں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا؟ حضرت جابر کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چپ رہے اور اس کو کوئی جواب نہیں دیا۔ چنانچہ جبریل علیہ السلام ستاروں کے نام لے کر نازل ہوئے۔ حضرت جابر کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کو بلوا بھیجا اور فرمایا: اگر میں تجھے ان ستاروں کے نام بتا دوں تو کیا تو ایمان لے آئے گا؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: وہ ستارے ہیں، جریان، طارق، ذیال، ذوالکتفین، قابس، وثاب، عمودان، فیلق، مصبح، ضروح، ذوفرع، ضیاء اور نور"

یہ روایت بھی موضوع اور جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج بیہقی نے دلائل النبوہ میں کی ہے۔[۲]

اور الھیثمی نے مجمع الزوائد[۳] میں لکھا ہے: اس کی روایت بزار نے المصنف میں کی ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی حکم بن ظہیر شامل ہے جو متروک تھا اور جس کو تمام ائمہ حدیث نے ناقابل

---

[۱] المحرر الوجیز: ص ۹۸۷ [۲] دلائل النبوّة: ص ٤٦٩، ج ٢

[۳] مجمع الزوائد: ص ۳۹ ج ۷

اعتبار قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب [۱] میں لکھا ہے: حکم بن ظہیر جس کی کنیت ابو محمد اور اس کے باپ کی کنیت ابولیلیٰ تھی متروک ہے۔ امام یحییٰ بن معین نے اس پر وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔ اس پر رافضی ہونے کا بھی الزام ہے۔ امام ابن عدی نے مختصر الکامل [۲] میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ امام بخاری نے حکم بن ظہیر عن اسدی عن عاصم کو منکر الحدیث قرار دیا ہے۔ امام نسائی فرماتے ہیں: وہ متروک الحدیث تھا۔ امام ابوداؤد نے امام یحییٰ بن معین کے حوالہ سے اس کو کذاب لکھا ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں اس کی روایت کردہ بیشتر حدیثیں غیر محفوظ یعنی شاذ ہیں۔ امام ابن الجوزی نے الموضوعات [۳] میں اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔

(۲۳۴)......عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: رَحِمَ اللّٰهُ يُوْسُفَ لَوْلَا الْكَلِمَةُ الَّتِيْ قَالَهَا: أُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ" مَالَبِثَ فِي السِّجْنِ مَالَبِثَ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اللہ یوسف پر رحم فرمائے۔ اگر انہوں نے یہ کلمہ "أُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ" اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا" نہ کہا ہوتا تو وہ قید میں اتنی مدت نہ رہتے جتنی مدت وہ رہے"

یہ روایت اپنی سند اور متن دونوں اعتبار سے منکر ہے۔ لیکن اس کی نکارت بیان کرنے سے قبل اس پوری آیت کا سرسری مطالعہ ضروری ہے جس میں مذکورہ فقرہ: "أُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ" آیا ہے، اور وہ آیت یہ ہے:

﴿ وَ قَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ۝ ﴾ [یوسف:۴۲]

"ان دونوں (قیدیوں) میں سے جس کے متعلق یوسف کا خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا اس سے کہا: اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا" تو شیطان نے اس کو اس کے مالک سے اس کا ذکر کرنا بھلا دیا۔ اس طرح (یوسف) قید میں چند سال اور پڑا رہا"

---

[۱] تقریب التہذیب: ص ۱۱۴ ترجمہ: ۱۴۴۵ [۲] مختصر الکامل: ص ۲۴۰

[۳] الموضوعات: ص ۲۱۶۔ ۲۱۷ ج ۱ ح ۳۰۲

بے گناہ اور مظلوم کا اپنی رہائی کے لیے دنیوی تدابیر اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کے آغاز سے اوپر نقل کردہ آیت تک ان کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ ایک ایسے پاکیزہ اور فرشتہ صفت انسان کی تصویر ہے جس نے ہر طرف سے شیطانی یلغار کے باوجود اپنے دامن عصمت وعفت کو داغدار نہیں ہونے دیا۔ لیکن ان کی براءت و بے گناہی کے تمام دلائل وشواہد کے باوجود عزیز مصر اور اس کی بدکردار بیوی نے یہی فیصلہ کیا کہ کچھ مدت کے لیے ان کو قید کر دیں تا کہ عزیز مصر کی بیوی کے غرور نفس کو کچھ تسکین ہو جائے:

﴿ وَ لَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَ لَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ۝ ﴾ [یوسف:۳۲]

''اگر اس نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو یقیناً قید کیا جائے گا اور ذلیل ہوگا۔''

اگر چہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک خاص مدت کے لیے قید خانے میں ڈالا گیا تھا، کیونکہ ان کی بے گناہی اور پاکدامنی واضح اور عیاں تھی۔

﴿ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ۝ ﴾ [یوسف:۳۵]

''پھر نشانیاں دیکھ لینے کے بعد انہیں مصلحت یہی معلوم ہوئی کہ اس کو کچھ مدت کے لیے ضرور قید کر دیں''

مگر قید کرنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو بھلا دیا گیا۔ اس تناظر میں حضرت یوسف علیہ السلام کا رہائی پانے والے اپنے قیدی ساتھی سے یہ کہنا کہ ''اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا'' دنیوی تدابیر میں سے ایک تدبیر تھی جو اللہ تعالیٰ پر اعتماد و توکل کے قطعاً منافی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دنیا دار الاسباب ہے۔ جس میں جائز مقصد کے حصول کے لیے مادی اسباب و وسائل کا سہارا لینا اور نتائج کو اللہ تعالیٰ کی رضا پر چھوڑنا ہی عین توکل ہے اور یوسف علیہ السلام نے یہی کیا تھا۔

اوپر کی وضاحتوں کی روشنی میں زیر بحث روایت

اللہ یوسف پر رحم فرمائے اگر انہوں نے یہ کلمہ: ''اُذْكُرْنِىْ عِنْدَ رَبِّكَ'' اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا...... اپنی سند اور متن دونوں اعتبار سے منکر اور مردود ہے۔

حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں:

یہ روایت منکر ہے اور اس کا راوی محمد بن عمرو بن علقمہ نے ایسی بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں جن

کی روایت میں وہ منفرد ہے اور ان میں نکارت پائی جاتی ہے۔[1]

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

میرے خیال میں اس روایت کی نکارت ابن حبان کے شیخ کی طرف سے ہے محمد بن عمرو کی طرف سے نہیں۔ اور یہ حدیث امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے:

ہم سے سفیان بن وکیع نے بیان کیا، کہا: ہم سے عمرو بن محمد نے ابراہیم بن یزید سے، انہوں نے عمرو بن دینار سے، انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۲۳۵)......لَوْ لَمْ يَقُلْ۔ يُوْسُفُ۔ الْكَلِمَةَ الَّتِيْ قَالَ، مَالَبِثَ فِي السِّجْنِ طُوْلَ مَالَبِثَ، حَيْثُ ابْتَغَى الْفَرَجَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ۔

''اگر یوسف نے وہ کلمہ نہ کہا ہوتا جو انہوں نے کہا تو وہ قید خانے میں اتنی طویل مدت نہ رہتے۔ کیونکہ انہوں نے غیر اللہ کے پاس مصیبت سے چھٹکارا تلاش کیا۔''

اس روایت کو حافظ ابن کثیر نے ہر سند سے حد درجہ ضعیف قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس کی روایت میں ابراہیم بن یزید خوری منفرد ہے اور وہ ''متروک'' تھا۔[2]

کلام اللہ میں تحریف

بعض مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

''وَ قَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ'' کے کلمہ فَاَنْسٰهُ میں ''ہ'' ضمیر مفعول سے حضرت یوسف علیہ السلام کو مراد لیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف کا درجہ رکھتا ہے۔ اس تفسیر کی رو سے مذکورہ فقرے:

فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ کا مطلب ہے:

شیطان نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے رب کی یاد سے غافل کر دیا۔

تو یہ تفسیر نہیں بلکہ تحریف ہے۔ جو سلسلہ کلام سے غیر مربوط ہونے کے ساتھ خود قرآن پاک کی تصریح کے خلاف ہے۔ کیونکہ مذکورہ آیت میں ''فَاَنْسٰهُ'' کی ضمیر کا مرجع وہ قیدی ہے جس کے بارے میں

---

[1] البدایه والنهایه: ص ٢٤١ ج ١

[2] الصحیحه: ص ٤٨٤ ج ٤۔ البدایه والنهایه: ص ٢٤٠ ج ١

حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ گمان تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا۔

چنانچہ قرآن پاک یہ صراحت کرتا ہے کہ جب بادشاہ نے خواب دیکھا اور اپنے درباریوں سے اس کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے اسے ''خواب پریشان'' قرار دیا۔ اس موقع پر رہائی پانے والے قیدی کو یہ بات یاد آ گئی کہ یوسف علیہ السلام نے اس سے کچھ کہا تھا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ قَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ۝ ﴾

''ان دو قیدیوں میں سے جو قید سے رہا ہو گیا تھا اور جس کو ایک مدت کے بعد یاد آیا، اس نے کہا کہ میں آپ لوگوں کو اس کی تعبیر کی خبر دیتا ہوں، مجھے بھیجئے''

یاد آنا بھول جانے کے ضد ہے اور وہ شخص جو بات بھول گیا تھا وہ یہی تو تھی کہ اس نے اپنے مالک سے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا۔ لہٰذا لامحالہ اسے بادشاہ کا خواب سن کر جو بات یاد آئی وہ اس کے سوا کوئی اور بات نہیں ہو سکتی تھی۔

حافظ ابن کثیر مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

بادشاہ کے خواب اور اہل دربار کے اس کو ''خواب پریشان'' کہہ کر اس کی تعبیر سے معذرت سن کر ان دونو جوانوں میں سے جو یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید میں تھے، رہائی پانے والے کو وہ بات یاد آ گئی جس کی وصیت یوسف علیہ السلام نے اس سے کی تھی کہ وہ ان کے معاملے کو بادشاہ سے بیان کرے جس کو شیطان نے بھلا دیا تھا تاکہ اللہ کے نبی قید سے رہائی نہ پا سکیں۔''[1]

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جہاں ''رب'' سے اللہ تعالیٰ کی ذات مراد لینا راجح ہے وہاں اس سے غیر اللہ مراد لینے پر اصرار ہے (آیت ۲۳) اور جہاں ''رب'' سے یقینی طور پر غیر اللہ مراد ہے وہاں اس سے اللہ تعالیٰ کو مراد لیا گیا ہے۔ (آیت ۴۲) اس غلط تاویل بلکہ ''تحریف'' کو صحیح ثابت کرنے کے لیے جھوٹی روایات کا سہارا لینے سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔ چنانچہ امام قرطبی الجامع لاحکام القرآن[2] اور ابن عطیہ المحرر الوجیز[3] میں لکھتے ہیں۔

(۲۳۶)......دَخَلَ جِبْرِیْلُ عَلٰی یُوْسُفَ النَّبِیِّ عَلَیْهِ السَّلَامُ فِی السِّجْنِ فَعَرَفَهٗ یُوْسُفُ. فَقَالَ: یَا أَخَا الْمُنْذِرِیْنَ! مَالِیْ أَرَاكَ بَیْنَ الْخَاطِئِیْنَ؟ فَقَالَ جِبْرِیْلُ

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ص ۲۵۱۔ ۲۵۲ [2] الجامع للأحکام القرآن: ص ۱۳۷ ج ۵

[3] المحرر الوجیز: ص ۹۹۷

عَلَيْهِ السَّلَامُ يَا طَاهِرَ ابْنَ الطَّاهِرِيْنَ! يَقْرَأُكَ السَّلَامَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ وَيَقُوْلُ: أَمَا اسْتَحَيْتَ إِذَا اسْتَغَثْتَ بِالْآدَمِيِّيْنَ؟! وَعِزَّتِي لَأُلْبِثَنَّكَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ، فَقَالَ: يَا جِبْرِيْلُ اَهُوَ عَنِّيْ رَاضٍ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: لَا أُبَالِي السَّاعَةَ۔

وَرُوِيَ أَنَّ جِبْرِيْلَ جَاءَهُ فَعَاتَبَهُ عَنِ اللّٰهِ تَعَالٰى فِيْ ذٰلِكَ وَطَوَّلَ سِجْنَهُ، وَقَالَ لَهُ: يَا يُوْسُفُ! مَنْ خَلَّصَكَ مِنَ الْقَتْلِ مِنْ اَيْدِيْ اِخْوَتِكَ؟ قَالَ: اللّٰهُ تَعَالٰى: قَالَ: فَمَنْ أَخْرَجَكَ مِنَ الْجُبِّ قَالَ: اللّٰهُ تَعَالٰى، قَالَ: فَمَنْ عَصَمَكَ مِنَ الْفَاحِشَةِ؟ قَالَ: اللّٰهُ تَعَالٰى. قَالَ: فَمَنْ صَرَفَ عَنْكَ كَيْدَ النِّسَاءِ؟ قَالَ: اللّٰهُ تَعَالٰى، قَالَ: فَكَيْفَ وَثِقْتَ بِمَخْلُوْقٍ وَتَرَكْتَ رَبَّكَ فَلَمْ تَسْأَلْهُ؟ قَالَ: يَا رَبِّ! كَلِمَةٌ زَلَّتْ مِنِّيْ! أَسْأَلُكَ يَا إِلٰهَ إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْحَاقَ وَالشَّيْخِ يَعْقُوْبَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ أَنْ تَرْحَمَنِيْ، فَقَالَ لَهُ جِبْرِيْلُ: فَإِنَّ عُقُوْبَتَكَ أَنْ تَلْبَثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ۔

جبریل نبی یوسف علیہما السلام کے پاس قید خانے میں آئے اور یوسف نے ان کو پہچان لیا۔ کہا: اے خبردار کرنے والوں کے بھائی! میں آپ کو خطا کاروں کے درمیان کیوں دیکھ رہا ہوں؟ جبریل علیہ السلام نے جواب دیا: اے پاکبازوں کے پاکباز بیٹے! سارے جہانوں کا پروردگار آپ کو سلام سناتا ہے اور فرما رہا ہے: کیا تمہیں آدمیوں سے فریاد کرتے ہوئے شرم نہ آئی؟ میری عزت کی قسم! میں تمہیں قید خانے میں مزید چند سال باقی رکھوں گا۔ یوسف علیہ السلام نے کہا: کیا وہ مجھ سے راضی ہے؟ جواب دیا: ہاں۔ کہا: اس وقت مجھے کوئی پروا نہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جبریل جناب یوسف علیہما السلام کے پاس آئے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملامت کی اور ان کے قید کی مدت بڑھا دی اور ان سے کہا: اے یوسف! تمہیں تمہارے بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے کس نے بچایا؟ کہا: اللہ تعالیٰ نے۔ کہا: تم کو کنویں سے کس نے نکالا؟ کہا: اللہ تعالیٰ نے۔ پوچھا: تم کو بدکاری سے کس نے محفوظ رکھا؟ جواب دیا: اللہ تعالیٰ نے۔ دریافت کیا: تم سے عورتوں کی مکاری کس نے دور کی؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے۔ کہا: تو تم نے کس طرح ایک مخلوق پر بھروسہ کر لیا اور اپنے رب کو ترک کر دیا اور اس سے سوال

نہیں کیا؟ یوسف نے کہا: اے میرے رب! یہ ایک کلمہ تھا جو مجھ سے سرزد ہو گیا۔ اے ابراہیم، اسحاق اور بوڑھے یعقوب کے معبود! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو میرے اوپر رحم فرما۔ پس جبریل نے ان سے کہا: تیری سزا یہ ہے کہ تو قید میں کچھ سال اور رہے۔"

دراصل یہ کہانی سراسر جھوٹ اور بیمار ذہن کی پیداوار ہے۔ قرطبی اور ابن عطیہ نے اس کی کوئی سند بیان نہیں کی ہے۔ صرف عبدالعزیز بن عمیر کندی کے قول کی حیثیت سے نقل کر دیا ہے۔ یہ کہانی جس نے بھی گھڑی ہو بہرحال وہ انبیاء علیہم السلام کے مقام سے ناواقف ہے۔ سورہ یوسف کی آیات ۳۸ تا ۴۰ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی جو تقریر بیان ہوئی ہے اس میں انہوں نے اس دعوت توحید کو نہایت مدلل اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے جو دعوت تمام انبیاء دیتے رہے تھے اور جو دعوت مختلف انداز میں پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس تقریر میں یوسف علیہ السلام کی تابناک شخصیت پوری طرح نمایاں ہے۔

جو شخص مذکورہ آیات پر نظر رکھتا ہو اس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ مذکورہ کہانی اور اس جیسی دوسری کہانیاں اور قصے جن لوگوں نے گھڑے ہیں ان کا مقصد حضرت یوسف علیہ السلام کی کردار کشی کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

جب یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے خواب کی تعبیر اس کے قاصد سے بیان کی اور اس نے واپس جا کر بادشاہ کو وہ تعبیر سنائی تو وہ ان کے علم و معرفت سے بے حد متاثر ہوا اور اسی لمحہ یہ حکم دیا کہ ان کو حاضر کیا جائے۔ "اِئْتُوْنِیْ بِهٖ" اور فوراً ایک قاصد یہ حکم لے کر حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کو توقع رہی ہوگی کہ یہ حکم سن کر حضرت یوسف علیہ السلام خوش ہو جائیں گے۔ اور اس کے ساتھ فرحاں وشاداں چل کھڑے ہوں گے، لیکن اللہ کے محبوب نبی نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور اس سے فرمایا: اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے تھے:

﴿ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ﴾ [یوسف: ۵۰]

"جب قاصد اس کے پاس پہنچا تو اس نے کہا: اپنے مالک کے پاس واپس جاؤ اور اس سے دریافت کرو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب ان کی مکاری سے خوب واقف ہے"

حضرت یوسف علیہ السلام جس ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہے تھے رہائی سے پہلے ان کے دامن سے اس گناہ کا داغ مٹانا ضروری تھا اور جن لوگوں نے ان کے خلاف بہتان تراشی کی تھی ان کو سامنے آ کر یہ

اعلان کرنا تھا کہ اصل مجرم تو ہم ہیں۔ یوسف کی ذات تو دودھ کی طرح بے داغ ہے۔

اسی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام نے زنان مصر کے معاملے کی تحقیق کا مطالبہ کرنے کے ساتھ اس کا سبب بھی واضح فرما دیا:

﴿ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ۝ ﴾ [یوسف:۵۲]

''وہ اس لیے کہ (عزیز مصر) یہ جان لے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کی چالوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتا''

واضح رہے کہ آیت نمبر ۵۰ اور اس آیت کے درمیان کی آیت ۵۱ جملہ معترضہ ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہ نے زنان مصر کو طلب کر کے ان سے پوچھا کہ جب تم نے یوسف کو آمادہ گناہ کرنے کے لیے ان کو پھسلانے اور رجھانے کی کوشش کی تو ان کو کیسا پایا تھا؟ سب نے یک زبان ہو کر ان کے بے گناہ ہونے اور ہر برائی سے پاک ہونے کی گواہی دی۔ اور عزیز مصر کی بیوی نے یہ اعتراف کیا کہ اسی نے ان کو بدکاری کے ارتکاب پر آمادہ کرنے کے لیے ان پر ڈورے ڈالے تھے۔ رہے جناب یوسف تو وہ اپنے اس قول میں بالکل سچے ہیں۔ انہوں نے ایسی کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے آیت نمبر ۵۲ جو کچھ فرمایا ہے وہ آیت نمبر ۲۶ میں موجود ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

''قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَفْسِي'' یوسف نے کہا: اسی نے مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی۔

یہ انہوں نے اس وقت کہا تھا جب دروازے پر اچانک عزیز مصر کو پانے پر اس کی بیوی نے چشم زدن میں اپنے کو بری اور یوسف علیہ السلام کو مجرم قرار دے ڈالا تھا۔

﴿ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوْٓءًا إِلَّآ أَنْ يُّسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ۝ ﴾

''اس نے کہا: جس نے تمہاری بیوی کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کیا ہو اس کی سزا کیا ہو سکتی ہے؟ کیا یہی نہیں کہ اس کو قید کر دیا جائے یا اسے دردناک تکلیف دی جائے۔''

لٰہذا بادشاہ کے سامنے عزیز مصر کی بیوی نے اپنے قصور کا اعتراف اس لیے نہیں کیا تھا کہ اس کا ضمیر بیدار ہو گیا تھا اور خوف الٰہی نے اس کو اس اعتراف پر مجبور کر دیا تھا، بلکہ اس کے قصور کے اعتراف کا سبب زنانِ مصر کا وہ اعلان تھا جس میں انہوں نے کہا تھا:

''اللہ کی پناہ ہمیں اس کی ذات میں کوئی بھی برائی معلوم نہیں ہے۔''

اگر وہ اپنی براءت اور یوسف علیہ السلام کے قصور وار ہونے پر اصرار کرتی تو زنان مصر خود اس کا بھانڈا پھوڑ دیتیں کیونکہ وہ ان کے سامنے پہلے ہی یہ اعتراف کر چکی تھی۔

﴿ وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَ لَئِنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَ لَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ ۝ ﴾ [یوسف:۳۲]

''بلاشبہ میں نے اس پر ڈورے ڈالے پس وہ پوری قوت سے باز رہا اور اگر اس نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو یقیناً قید کیا جائے گا اور ذلیل ہوگا''

اوپر کی قرآنی صراحتوں کی روشنی میں:

﴿ ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ ۝ ﴾ [یوسف:۵۲]

''وہ اس لیے کہ (عزیز مصر) یہ جان لے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کی چالوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتا''

عزیز مصر کی بیوی کا قول ہرگز نہیں ہوسکتا۔ چاہے ''أَخُنْهُ'' کی ضمیر کا مرجع عزیز مصر کو قرار دیا جائے یا حضرت یوسف علیہ السلام کو۔ جہاں تک اس کے شوہر عزیز مصر کو اس کا مرجع قرار دینے کا مسئلہ ہے تو یہ اس وجہ سے صحیح نہیں ہے کہ وہ اس کے حق میں خائن تھی۔ اگرچہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ بدکاری کرنے پر آمادہ نہیں کر سکی تھی۔

اور اگر ''اَخُنْهُ'' کی ضمیر کا مرجع حضرت یوسف علیہ السلام کو قرار دیا جائے تو یہ بھی درست نہیں ہوگا کیونکہ:

یہاں جو خیانت مراد ہے وہ ''زوجیت میں خیانت'' ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام اس کے شوہر نہیں تھے۔

اور اگر خیانت سے یہ مراد لیا جائے کہ عزیز مصر کی بیوی نے ان کی غیر موجودگی میں ان کی عیب جوئی نہیں کی اور ان پر کوئی بہتان تراشی نہیں کی تو واقعات کی روشنی میں یہ تفسیر حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ:

حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کی سختیاں صرف اس کے جھوٹے الزام کی وجہ سے برداشت کرنی پڑیں اور جتنی مدت وہ قید میں رہے اس کے پل پل کی اس کو خبر رہی ہوگی۔ اس لیے کہ ملک کے فرماں روا کے بعد دوسرے سب سے بڑے صاحب اقتدار کی وہ بیوی تھی۔ ان کی امانت وراست بازی، عصمت وعفت اور عالی ظرفی سے وہ سب سے زیادہ واقف تھی۔ اس کے دل میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ صرف اس کے جھوٹے الزام کے بنا پر اور اس کی شیطانی خواہش کو ٹھکرا دینے کی وجہ سے ایک

نہایت پارسا اور فرشتہ صفت انسان قید خانے میں دس بارہ سال سے پڑا سڑ رہا ہے۔ اگر اس کا ضمیر زندہ ہوتا تو وہ اپنے شوہر کو صحیح صورتحال سے آگاہ کر کے ان کی رہائی کی کوشش کرتی۔

اس پس منظر میں:

﴿ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَo ﴾ [یوسف:۵۱]

''عزیز کی بیوی نے کہا: اب حق آشکارا ہو گیا۔ میں نے ہی اس کو بدکاری پر آمادہ کرنے کے لیے ورغلایا تھا۔ بے شک وہ ان لوگوں میں سے ہے جو سچ بولتے ہیں''

عزیز مصر کی بیوی کی مجبوری تھی۔ اس کے ضمیر کی آواز نہیں تھی''!!

لٰہذا:

﴿ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَo ﴾

حتمی طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ہے جس کی گواہی آیت ۲۳ تا ۳۳ دے رہی ہیں۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ تو ان مفسرین کے اقوال کا خلاصہ تھا جو اسرائیلی روایات کے خلاف ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے سورہ یوسف کی تفسیر میں ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو اسلامی روح، قرآن کے سیاق و سباق، زبان و بیان اور عصمت انبیاء کے خلاف ہیں۔ اب ذیل میں ایسی چند روایتیں نقل کر دینا چاہتا ہوں جو اپنی سند کے اعتبار سے تو باطل ہیں ہی لیکن اپنے متن کے اعتبار سے بھی قرآن پاک اور عصمت انبیاء کے خلاف ہیں۔ مگر اس کے باوجود بہت سے مشہور مفسرین نے اپنی تفسیروں میں بے دھڑک ان کو نقل کر دیا ہے۔

(۲۳۷) ...... احمد بن موسیٰ بن مردویہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

((لَمَّا قَالَ يُوْسُفُ: ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّيْ لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ" قَالَ لَهُ جِبْرِيْلُ: يَا يُوْسُفُ! أُذْكُرْ هَمَّكَ ، قَالَ: وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ))

''جب یوسف نے کہا: اس لیے تاکہ وہ ...... عزیز مصر ...... جان لے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی ہے۔ تو جبریل علیہ السلام نے ان سے کہا: اے یوسف! اپنے ارادے کو یاد کرو'' تو یوسف نے کہا: میں اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں''

یہ روایت نبی مکرم ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے۔ اولاً تو یہ روایت ابن مردویہ نے کسی سند کے بغیر بیان کی ہے اور حافظ سیوطی نے بھی الاتقان [۱] اور الدر المنثور [۲] میں اس کی کوئی سند بیان کرنے کی بجائے اس کو حاکم، ابن مردویہ اور دیلمی سے منسوب کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ دوم اس کا متن اللہ تعالیٰ کے قول وَهَمَّ بِهَا اور اس نے اس کا ارادہ کیا...... کی غلط تفسیر پر مبنی ہے جس کی صحیح تفسیر اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ اور سیاق وسباق اور قرآنی دلائل سے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں عزیز مصر کی بیوی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ تو درکنار اس کا خیال تک نہیں گزرا تھا۔ کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام تمام انبیاء کی طرح معصوم تھے۔

یہ روایت حارث بن اسامہ موقوف شکل میں کی ہے۔ جس کی سند بھی ضعیف ہے۔ کیونکہ اس میں خصیف بن عبدالرحمٰن جزری شامل ہے جو برے حافظہ کا مالک تھا۔ آخری عمر میں اس کا ذہنی توازن بھی بگڑ گیا تھا۔ مزید برآں اس پر "مرجئہ" فرقے سے نسبت رکھنے کا بھی الزام تھا [۳]۔ انبیاء کرام کے حق میں اس کی روایات نہایت واہیات اور ناقابل اعتبار ہوتی تھیں۔

امام ابو محمد حسین بغوی نے "معالم التنزیل" [۴] میں یہی روایت صیغۂ تمریض: قیل کہہ کر نقل کی ہے:

((لَمَّا قَالَ يُوْسُفُ: ذَلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ" قَالَ لَهُ جِبْرِيْلُ: وَلَا حِيْنَ هَمَمْتَ بِهَا؟ فَقَالَ يُوْسُفُ عِنْدَ ذَلِكَ وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ))

"جب یوسف علیہ السلام نے کہا: وہ اس لیے تاکہ عزیز مصر جان لے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی ہے۔ تو جبریل نے ان سے کہا: کیا تم نے اس وقت بھی اس کی خیانت نہیں کی جب اس کی بیوی کا ارادہ کیا؟ اس وقت یوسف علیہ السلام نے کہا: میں اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں"

بغوی آگے لکھتے ہیں: سدی کا بیان ہے:

((إِنَّمَا قَالَتْ لَهُ امْرَأَةُ الْعَزِيْزِ: وَلَا حِيْنَ حَلَلْتَ سَرَا وِيْلَكَ يَا يُوْسُفُ! فَقَالَ: يُوْسُفُ عِنْدَ ذَلِكَ: وَمَآ أُبَرِّئُ نَفْسِيْ))

۱ الاتقان: ص ۵۱۰ ج ۲ ۲ الدر المنثور: ص ۲۳ ج ٤
۳ تقریب التہذیب ص ۱۳۳ ترجمہ: ۱۷۱۸ ۴ معالم التنزیل: ص ٦٤٩

"دراصل یہ عزیز مصر کی بیوی نے کہا تھا: اے یوسف! کیا تم نے اس وقت بھی عزیز کی خیانت نہیں کی جب تم نے اپنا ازار بند کھولا تھا؟ اس موقع پر یوسف علیہ السلام نے کہا: میں اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں۔"

ایک معصوم اور فرشتہ صفت نبی کی عصمت وعفت کو مسخ کر دینے والی ان گندی روایتوں کو نقل کرنے والوں نے اگر اس آیت سے پہلے کی آیت پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لی ہوتی جس کی تفسیر میں انہوں نے یہ گندی اور جھوٹی روایات نقل کی ہیں تو شاید وہ ایسا نہ کرتے۔ کیونکہ اس سے پہلے کی آیت میں عزیز مصر کی بیوی کا اعتراف بیان ہوا ہے:

﴿ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ○ ﴾ [یوسف:۵۱]

"عزیز مصر کی بیوی نے کہا: اب حق آشکارا ہو گیا۔ میں نے ہی اس کو بدکاری پر آمادہ کرنے کے لیے ورغلایا تھا۔ بے شک وہ ان لوگوں میں سے ہے جو سچ بولتے ہیں"

واضح رہے کہ "وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ" سے عزیز کی بیوی کا اشارہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول کی طرف ہے:

﴿ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِيْ○ ﴾ [یوسف:۲۶]

"اسی نے مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی"

اور اس سے قبل زنان مصر کے درمیان بیٹھ کر عزیز کی بیوی اس سے بھی بڑا اعتراف کر چکی تھی:

﴿ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ○ ﴾

"بلاشبہ میں نے اس پر (بدکاری کے لیے) ڈورے ڈالے مگر وہ پوری شدت سے باز رہا"

تو کیا عزیز کی بیوی کے ان صریح اعترافات کے بعد اس کی زبان سے اس طرح کے الزامات نکل سکتے تھے جن کا دعویٰ اوپر نقل کردہ جھوٹی روایات میں کیا گیا ہے؟

(۲۳۸)...... يَرْحَمُ اللّٰهُ أَخِيْ يُوْسُفَ لَوْ لَمْ يَقُلْ: اِجْعَلْنِيْ عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ لَاسْتَعْمَلَهٗ مِنْ سَاعَتِهٖ وَلٰكِنْ اَخَّرَ ذٰلِكَ سَنَةً۔[۱]

---

[۱] سند کے اعتبار سے بھی یہ روایت ساقط ہے۔ حافظ ابن حجر نے تخریج الکشاف میں اس کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ حاشیہ علی الکشاف ص ۳۰۰، ج ۳

"اللہ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے اگر انہوں نے یہ نہ کہا ہوتا: مجھے زمین کے خزانوں کا نگراں مقرر کر دیجیے۔ تو اسی وقت ان کو اس منصب پر مقرر کر دیتا۔ لیکن ان کو اس درخواست کی وجہ سے ان کی تقرری کو ایک سال تک مؤخر کر دیا۔"

یہ روایت رسول اللہ ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ بلکہ بعض مفسرین نے اپنی کتابوں میں زیب داستان کے لیے نقل کر دی ہے۔ اور جس نے یہ روایت گھڑ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف اسے منسوب کیا ہے اس نے اپنے ذہن میں یہ فرض کر لیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا یہ کہنا: مجھے زمین کے خزانوں پر نگراں مقرر کر دیجئے نعوذ باللہ ان کی غلطی تھی۔ اس لیے سزا کے طور پر ان کو ایک سال تک زمین کے خزانوں کا نگراں نہیں مقرر کیا گیا۔ اس طرح اس نے دو نبیوں کے حق میں گستاخی کی ہے۔ درحقیقت تفسیر کی بیشتر کتابوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کی ذات، سیرت اور کردار پر ایک نبی کی ذات، سیرت اور کردار کے تناظر میں بحث نہیں کی گئی۔ بلکہ ایک عام انسان کی حیثیت سے بحث کی گئی ہے جو فکر و خیال اور قول و عمل میں مسلسل غلطیوں کا مرتکب ہوتا رہا۔ اس نے دعوتِ گناہ کے جواب میں "معاذ اللہ" کہنے کی غلطی کی۔ اس لیے عزیز کی بیوی کے ساتھ بدکاری کے قصد کی سزا پائی۔ اپنے قیدی ساتھی کی رہائی کے وقت اس سے کہا کہ اپنے آقا سے میرا حال بیان کرنا...... تو اس کو یہ سزا دی گئی کہ اس کی مدت قید میں اضافہ کر دیا گیا۔ اور جب بادشاہ نے اپنے ساقی کی زبانی اس کی راست روی، حسن اخلاق اور حق شناسی کے بارے میں سنا اور اپنے عجیب و غریب خواب کی نہایت بصیرت افروز اور حق کی ترجمان تعبیر سنی تو اس سے متاثر ہو کر اور اس کی عظمت کا معترف ہو کر یہ حکم دیا کہ "اس کو میرے پاس لاؤ تاکہ میں اس کو اپنا خاص معتمد بنا لوں۔ اور جب بادشاہ نے اس سے بات چیت کر کے اس کے علم و معرفت کی مزید گہرائی اور وسعت کا حال معلوم کیا اور اس کو اپنے پاس صاحب قدر و منزلت اور امین بنانے کا فیصلہ کیا تو اس عظیم ہستی نے بادشاہ سے فرمایا: میرا مقام یہ نہیں ہے۔ بلکہ میرا مقام یہ ہے کہ آپ مجھے زمین کے تمام ذرائع آمدنی کا نگراں اور ذمہ دار بنا دیجیے تاکہ ملک جس تباہ کن قحط کا سامنا کرنے والا ہے اس میں ملک کی پیداوار اور ذرائع آمدنی کے حسن استعمال کے اصول و ضوابط بنا سکوں۔ اس طرح حسن تدبیر کے ذریعہ قحط سالی کی تباہ کاریوں سے اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے محفوظ رہا جا سکے گا۔ تو اس کے مشورے کو بھی ایک ایسا گناہ قرار دے دیا گیا جس کی سزا یہ ملی کہ ایک سال تک بادشاہ نے اس کو زمین کے خزانوں کا نگراں مقرر نہیں کیا۔

آخر بادشاہ کے خواب کی تعبیر تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ہی بتائی تھی اور صرف تعبیر ہی نہیں بتائی تھی

بلکہ اس خواب میں جس ہولناک اور تباہ کن قحط کی پیشین گوئی کی گئی تھی اس کا مقابلہ کرنے اور اس سے نمٹنے کا طریقہ کار بھی بتایا تھا تو پھر اس میں نعوذ باللہ کیا گناہ تھا جو انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے اپنا معتمد خاص بنانے کی بجائے ملک کے تمام ذرائع آمدنی کا نگران بنا دو۔ کیونکہ صرف مجھے ہی یہ معلوم ہے کہ آئندہ آنے والے قحط کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا۔

دراصل تمام تفسیروں میں اس عظیم سورت کی تفسیر کچھ یوں کی گئی ہے کہ جتنے نقائص ذہنوں میں آ سکتے تھے وہ حضرت یوسف علیہ السلام پر تھوپ دیے گئے ہیں۔ اور جو محاسن تھے وہ عزیز مصر کی بدکار بیوی کی جھولی میں ڈال دیے گئے۔ اسرائیلیات اور من گھڑت روایتوں پر مبنی اس کہانی کا بھیانک اور شرمناک انجام جس طرح دکھایا گیا ہے اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''جب اس دن کے بعد ایک سال گزر گیا جس دن یوسف علیہ السلام نے ''امارت'' طلب کی تھی تو بادشاہ نے ان کو بلایا اور ان کے گلے میں اپنی تلوار حمائل کی۔ ان کے لیے سونے کی چارپائی رکھی گئی جو موتیوں سے آراستہ تھی اور اس پر ریشمی چادر ڈالی گئی۔ اس چارپائی کی لمبائی ۳۰ ہاتھ اور چوڑائی دس ہاتھ تھی اس پر تیس بستر اور ساٹھ تکیے تھے۔ پھر اس نے یوسف علیہ السلام کو نکلنے کا حکم دیا اور وہ تاج پہن کر نکلے۔ ان کا رنگ برف کی طرح سفید اور چہرہ چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ چارپائی پر جلوہ افروز ہوئے اور تمام بادشاہ ان کے سامنے عاجزی سے کھڑے ہو گئے۔ بادشاہ اپنی عورتوں کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہو گیا اور مصر کے تمام معاملات یوسف علیہ السلام کو تفویض کر دیے۔ قطفیر ...... عزیز مصر ...... کو اس کے عہدے سے بے دخل کر دیا اور یوسف علیہ السلام کو اس کی جگہ تعینات کر دیا۔ شاہ مصر فرعون کے پاس کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ بہت سارے خزانے تھے جن سب کا مالک اس نے یوسف علیہ السلام کو بنا دیا۔ انہی راتوں میں سے کسی رات میں قطفیر کی وفات ہو گئی۔ بادشاہ نے عزیز کی بیوی راعیل سے یوسف کا نکاح کر دیا اور جب یوسف علیہ السلام اس کے پاس خلوت میں گئے تو اس سے کہا: کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں؟ تو اس نے جواب دیا: اے سراپا راستی! مجھے ملامت نہ کیجیے۔ کیونکہ میں خوبصورت اور نرم و نازک عورت تھی جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اور تمہارا صاحب عزیز مصر عورتوں سے بے تعلق تھا۔ جبکہ تم اللہ کے عطا کردہ حسن کے مالک تھے اس طرح میرا نفس مجھ پر غالب آ گیا۔ یوسف نے اس کو دوشیزہ پایا اور اس سے تعلق قائم کیا۔ جس کے نتیجے میں اس کے بطن سے ان کے دو بیٹے پیدا ہوئے: افرائیم بن یوسف اور منشا بن یوسف۔

وہب بن منبہ کا بیان ہے کہ زلیخا سے یوسف علیہ السلام کا نکاح اس وقت ہوا جب ان کے بھائی ان کے

پاس آئے اور زلیخا کا شوہر اس وقت وفات پا گیا تھا جب یوسف علیہ السلام ابھی قید میں تھے۔ اس کا مال ختم ہو گیا۔ یوسف علیہ السلام کی محبت میں روتے روتے اس کی بصارت چلی گئی اور وہ بھیک مانگنے لگی۔ کچھ لوگ اس پر ترس کھاتے اور کچھ نہیں۔ اور یوسف علیہ السلام کا جلوس ہر ہفتہ نکلتا جس میں ان کی قوم کے ایک لاکھ سردار حصہ لیتے۔ اس سے کہا گیا کہ اگر تو یوسف کے سامنے آ جائے تو ممکن ہے کہ وہ تیری مدد کریں۔ پھر اس سے یہ کہا گیا کہ نہیں تو ان سے تعرض مت کر۔ ممکن ہے کہ ان کو تیری حرکتیں یعنی ان کو تیر اور غلانہ اور اپنا قید ہو جانا یاد آ جائے اور تجھ سے برا برتاؤ کریں۔ تو اس نے جواب دیا: مجھے اپنے محبوب کے اخلاق کا تم سے زیادہ علم ہے۔ یہاں تک کہ جب یوسف علیہ السلام کا جلوس نکلا تو اس نے بلند آواز سے کہا: پاک ہے وہ ذات جس نے بادشاہوں کو ان کی معصیت کی پاداش میں غلام اور غلاموں کو ان کی اطاعت کے نتیجے میں بادشاہ بنا دیا۔ یہ سن کر یوسف علیہ السلام نے فرمایا: یہ کون ہے؟ تو لوگ اس کو ان کے پاس لائے۔ اس نے کہا: میں وہ ہوں جو اپنے پیروں پر تمہاری خدمت کرتی تھی اور تمہاری زلفیں اپنے ہاتھوں سے سنوارتی تھی۔ میرے گھر میں تمہاری تربیت ہوئی۔ میں نے تمہیں بہترین ٹھکانہ دیا لیکن میری جہالت اور سرکشی کی وجہ سے مجھ سے بعض حرکتوں کا صدور ہو گیا جس کی سزا بھگت رہی ہوں۔ میرے پیسے جاتے رہے، طاقت جاتی رہی اور میری ذلت و مسکنت طویل ہو گئی۔ آنکھیں چلی گئیں۔ ایک وقت تھا کہ لوگ میرے اوپر رشک کرتے تھے اور آج ان کے رحم و کرم کی محتاج ہوں۔ لوگوں سے بھیک مانگتی ہوں کوئی مجھ پر رحم کھاتا ہے کوئی نہیں کھاتا۔ یہ جزا ہے مفسدین کی۔ اس پر یوسف علیہ السلام رو پڑے اور فرمایا: کیا اب بھی تمہارے دل میں میری محبت ہے؟ اس نے جواب دیا: تمہارے انور امور پر ایک نظر ڈال لینا میرے لیے دنیا اور اس کے ساری متاع سے زیادہ محبوب ہے۔ تم مجھے اتنے کوڑے کا کنارا پکڑواؤ۔ یوسف علیہ السلام نے اس کو اپنے کوڑے کا کنارہ پکڑوایا تو اس نے اس کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کے دل کی تیز دھڑکن سے کوڑا ان کے ہاتھ میں لرز رہا ہے۔ یوسف علیہ السلام رونے لگے۔ پھر اپنے گھر چلے گئے اور اس کے پاس اپنا قاصد یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اگر تم بے شوہر ہو تو ہم تم سے شادی کر لیں گے۔ اور اگر تم شوہر دار ہو تو ہم تم کو دولت سے مالا مال کر دیں گے۔ اس نے قاصد سے کہا: اللہ کی پناہ مانگتی ہوں کہ بادشاہ مجھ سے مذاق کرے۔ بادشاہ نے اس وقت مجھ کو نہیں چاہا جب میں جوان تھی، غنی تھی، صاحب مال تھی، عزت دار تھی کیا وہ مجھے آج چاہتا ہے جبکہ میں بوڑھی ہوں، اندھی ہوں اور فقیر و محتاج ہوں۔ قاصد نے واپس جا کر یوسف علیہ السلام کو اس کی بات پہنچائی۔ پھر جب دوسرے ہفتے یوسف علیہ السلام کی سواری نکلی تو وہ ان کے

سامنے آئی۔ انہوں نے اس سے فرمایا: کیا قاصد نے تمہیں میرا پیغام نہیں پہنچایا؟ اس نے جواب دیا: میں نے آپ کو یہ بتا دیا کہ آپ کے رخ انور پر ایک نظر میرے نزدیک دنیا اور اس کی ساری دولت سے زیادہ محبوب ہے۔ یہ سن کر یوسف علیہ السلام کے حکم پر اس کے حالات درست کیے گئے۔ اس کو سنوارا گیا اور ان کے گھر اس کی رخصتی ہوئی۔ یوسف علیہ السلام نماز کے لیے کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگے۔ وہ بھی ان کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ یوسف علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی کہ اس کی جوانی، خوبصورتی اور بصارت واپس کر دے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی جوانی، حسن و جمال اور بصارت لوٹا دی یہاں تک کہ وہ اس دن سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی جس دن اس نے یوسف علیہ السلام پر ڈورے ڈالے تھے۔ یہ سب کچھ اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے یوسف کے بچے رہنے کی وجہ سے، ان کی تکریم کے طور پر ہوا۔ اور جب انہوں نے اس کے ساتھ تعلق قائم کیا تو اس کو دوشیزہ پایا۔ اس طرح دونوں نے نہایت عیش و عشرت کی زندگی گزاری اور اس کے بطن سے یوسف علیہ السلام کے دو بیٹے افرائیم اور منشا پیدا ہوئے۔

اس جھوٹی اور من گھڑت روایت میں جس انسان کی تصویر پیش کی گئی ہے وہ ''فسانہ عجائب'' کا کوئی کردار تو ہو سکتا ہے لیکن کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے پردادا ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شدید ابتلاء اور آزمائش میں ڈالا اور کامیاب ہونے پر ان کو دنیا کا امام بنا دیا۔

لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پرپوتا ایک ایک کر کے تمام آزمائشوں میں کامیاب رہا جس کی گواہی سورۂ یوسف کی آیتیں دے رہی ہیں تو اس کو ''داستانِ حسن و عشق'' کا ہیرو بنا دیا گیا۔ ایں چہ بوالعجبی است''!

صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اہل تصوف نے حضرت یوسف علیہ السلام جیسے معصوم اور اللہ کے برگزیدہ نبی...... اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ...... کی پاکیزہ سیرت کو نظر انداز کر کے ان کے بارے میں جھوٹی اور من گھڑت روایات کی بنیاد پر ''داستان یوسف و زلیخا'' تصنیف کر ڈالی۔ جس میں اللہ کے نبی کو ایک عاشق کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ عزیز مصر کی بیوی اور دوسری زنانِ معصیت کو دعوتِ گناہ اور ان کی بدکاریوں اور ایک معصوم انسان کو بدکاری میں مبتلا کرنے کے لیے ان کی مکاریوں اور فریب کاریوں کو ''عشق'' کی کارفرمائی قرار دے کر ان کو ولایت کے مقام پر فائز کر دیا گیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی ''تلوین'' اور ''تمکین'' کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

صاحب تلوین صاحب حال ہے اور صاحب تمکین حقیقت شناس ہے۔ صاحب تلوین ابھی راہ میں ہے اور صاحب تمکین واصل ہو چکا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں زنان مصر صاحب تلوین تھیں اور

حضرت زلیخا صاحب تمکین۔[1]

اہل تصوف کے نزدیک تلوین و تمکین کی کتنی کچھ اہمیت ہے اس کو جاننے کے لیے مولانا کی کتاب ''تفسیر بیان القرآن'' میں سورۃ الفاتحہ کی آیت ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ٥'' کی تفسیر کا مطالعہ کیجیے۔ وہاں آپ کو توحید کا ایک نیا مفہوم ملے گا۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ہر طرح کی آزمائشوں میں ڈال کر پرکھ لیا اور وہ ہر آزمائش میں کامیاب نکلے تو ان کو مصر کی اس سرزمین میں مکمل اقتدار و اختیار بخش دیا جس میں وہ ایک زر خرید غلام کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ یَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ ؕ نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ٥ ﴾ [یوسف:۵٦]

''اور اس طرح ہم نے یوسف کو زمین میں اقتدار بخش دیا کہ وہ اس میں جہاں چاہے تصرف کرے۔ ہم اپنے فضل سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں اور ہم نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے''

اس ''تمکین فی الارض'' کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے اس دینِ توحید کی نشر و اشاعت کے لیے اپنا سارا وقت صرف کر دیا ہوگا جس کا آغاز انہوں نے قید میں ذرا سی فرصت ملنے پر اپنے قیدی ساتھیوں کے درمیان کر دیا تھا۔

اور جب سخت قحط اور مالی پریشانی کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے سامنے اپنی بے مائیگی کا اظہار کرتے ہوئے ان سے صدقہ و خیرات کی درخواست کی۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَیْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَیْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ٥ ﴾ [یوسف:۸۸]

''اے عزیز! ہم کو اور ہمارے اہل و عیال کو سخت تکلیف نے آ لیا ہے اور ہم معمولی سی پونجی لے کر آئے ہیں لہٰذا آپ ہمیں پورا غلہ دیجیے اور ہمیں صدقہ بھی عنایت فرمایے بے شک اللہ صدقہ دینے کو بدلہ دیتا ہے''

یہ وہ مقام تھا جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے پورے وجود کو ہلا ڈالا۔ ان کے سامنے ان کے وہ سوتیلے بھائی کھڑے ان سے صدقہ و خیرات کی بھیک مانگ رہے تھے جنہوں نے ان کو گھر سے بہت دور

---

[1] شریعت و طریقت ص: ۳۵۲

لے جا کر نہایت بے دردی سے ایک اندھے کنویں میں پھینک دیا تھا۔ اس وقت یوسف علیہ السلام کی نگاہوں میں ان کے بوڑھے باپ کا منظر گھوم گیا ہوگا جن کی بے کسی اور فقر و محتاجی کی ان کے بیٹے نمائندگی کر رہے تھے۔ اب ان کے لیے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ اپنے اور اپنے بھائیوں کے درمیان حائل اجنبیت کے پردے کو مزید باقی رہنے دیں۔ چنانچہ آپ بول پڑے:

﴿ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴾ [یوسف:۸۹]

''کیا تمہیں علم ہے کہ تم نے اپنی نادانی کے زمانے میں یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کچھ کیا تھا؟''

حضرت یوسف علیہ السلام کے اس سوال نے ان کو چونکا دیا اور وہ بول اٹھے:

﴿ قَالُوْٓا ءَ اِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَآ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ○ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ○ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ؗ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ○ ﴾ [یوسف:۹۰، ۹۱، ۹۲]

''انہوں نے کہا: کیا آپ واقعی یوسف ہیں؟ اس نے کہا: میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر فضل فرمایا ہے۔ بے شک جو تقویٰ اختیار کرتے اور صبر کرتے ہیں تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت بخشی اور واقعی ہم خطا کار تھے۔ اس نے کہا: آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے''

کس قدر اثر انگیز ہے وہ منظر جو ان آیتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف وہ مجرم بھائی کھڑے ہیں اور دوسری طرف وہ برگزیدہ نبی ہے جو بلا شرکت غیرے ایک بہت بڑی سلطنت کا فرماں روا ہے۔ وہ ان کے کالے کرتوتوں اور ان کے ہاتھوں اپنے اوپر ہونے والے ہر ہر ظلم کی نہایت عبرتناک سزا دے سکتا تھا۔ لیکن اس کی عظیم زبان نے ان کے جرائم کا ذکر تک گوارا نہ کیا بلکہ فرمایا تو یہ:

''آج تم پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ اللہ تمہیں معاف کرے۔ وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے''

اور نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا تھا:

''خود باعزت، باعزت کا بیٹا، باعزت کا پوتا اور باعزت کا پڑپوتا...... یوسف بن یعقوب بن

اسحاق بن ابراہیم تھے'' علیہم الصلوٰۃ والسلام اجمعین

تو اس ارشاد نبوی میں حضرت یوسف علیہ السلام کی جو صفت ''کریم ابن کریم'' بیان کی گئی ہے اس نے ان کی عظیم شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ یعنی باعزت، درگزر کرنے والا، وسیع الظرف، عالی ہمت اور برگزیدہ انسان۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے کردار کی عظمت اس وقت اور نمایاں ہوگئی جب ان کے والدین ان کے پاس پہنچ گئے۔

﴿ وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا وَ قَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَایَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا ط وَ قَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِیْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِیْ ط اِنَّ رَبِّیْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ط اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○ ﴾ [یوسف:۱۰۰]

''اور یوسف نے اپنے والدین کو اٹھا کر تخت پر بٹھا لیا اور سب اس کے آگے سجدے[1] میں گر گئے۔ یوسف نے کہا: ابا جان! یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا۔ اس نے اس وقت میرے اوپر بڑا افضل فرمایا جب اس نے مجھے قید خانے سے نکالا اور آپ لوگوں کو بادیہ سے یہاں لایا بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان رنجش پیدا کر دی تھی۔ بے شک میرا رب جو کچھ چاہتا ہے اس کے لیے نہایت باریک بیں ہے۔ بے شک وہ علیم وحکیم ہے۔''

کس قدر تواضع اور انکسار ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ میں۔ وہ دنیوی عروج وترقی کی آخری بلندی پر ہیں۔ جبکہ ان کے مجرم اور حاسد بھائی ان کے سامنے سرنگوں کھڑے ہیں۔ مگر ان کی زبان مبارک سے اپنے بھائیوں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں نکلتا۔ بلکہ انہوں نے ان کے خلاف جن جرائم کا ارتکاب کیا ہے ان پر ان کی ملامت کرنے یا ان سے کوئی شکایت کرنے کے بجائے یہ کہہ کر ان کی صفائی پیش کر دی کہ ''دراصل میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان رنجش اور فساد کے بیج شیطان نے بوئے تھے''

برادران یوسف موحد تھے:

اہل کتاب، خصوصیت کے ساتھ یہودیوں کے اس دعویٰ کی اللہ تعالیٰ نے تردید فرمائی ہے کہ ان کے آباء واجداد یہودی تھے۔ ان کے جد امجد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس وصیت کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے ان کے خود ساختہ دین یہودیت کی جڑ کاٹ دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

[1] اس سجدے کی حقیقت فرشتوں کے سجدۂ آدم کے ذیلی عنوان کے تحت دلائل کے ساتھ واضح کی جا چکی ہے۔

﴿ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴾ [البقرۃ:۱۳۳]

”کیا تم اس وقت حاضر تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا تھا؟ جب اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا: تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا: ہم تیرے معبود اور تیرے آباء و اجداد: ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق (علیہم السلام) کے معبود کی عبادت کریں گے جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے مسلم و فرماں بردار ہیں“

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ یہودیوں کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی آخری وصیت اس لیے یاد دلائی گئی ہے کیونکہ وہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد بنو اسرائیل ہیں۔ تاکہ ان پر یہ حجت قائم کی جاسکے کہ اگر انہوں نے دین توحید اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کر رکھا ہے تو وہ مردود ہے۔ اس لیے کہ جن عظیم بزرگوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب (۳۸) سے نسبت کا ان کو دعویٰ ہے ان کا دین تو اسلام ہی تھا۔ یعقوب علیہ السلام کی اولاد نے اپنے باپ کے سامنے یہ اقرار کیا تھا کہ وہ صرف اللہ واحد کی عبادت کریں گے اور صرف اسی کی اطاعت و فرماں برداری کریں گے۔ اس دینِ توحید کا آخری نسخہ نبی آخر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس دنیا میں دوبارہ بھیجا گیا ہے جس پر ان کا ایمان لانا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نبی اور رسول ماننا فرض تھا۔

لیکن جب خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو یہودیوں نے آپ کو نبی ماننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے یہودی اس نبی کا نہایت شدت سے انتظار کر رہے تھے جن کی بعثت کی پیشین گوئیاں ان کے انبیاء نے کی تھیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ وہ نبی جلد آئے اور کفار کا غلبہ مٹے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾

[البقرۃ:۸۹]

”اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آگئی جو اس کتاب کی تصدیق کر رہی تھی جو ان کے پاس تھی اور اس کی آمد سے پہلے وہ ان لوگوں پر فتح و نصرت کی دعا مانگا کرتے تھے جنہوں نے کفر کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ اور جب وہ رسول آگیا جسے انہوں نے پہچان لیا تو

انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ پس اللہ کی لعنت ہو منکرین حق پر"

یہودیوں کی حق دشمنی کی مثالیں:

اوپر نقل کردہ آیت مبارکہ میں رسول اکرم ﷺ کی دعوت حق کے بارے میں یہودیوں کے جس معاندانہ موقف کو بیان کیا گیا ہے اس کی وضاحت اس واقعہ سے ہوتی ہے جسے ابن اسحاق نے حسن سند سے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں:

مجھ سے صالح بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف نے محمود بن لبید سے اور انہوں نے حضرت سلمہ بن سلامہ بن وقش رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: ہمارا ایک یہودی پڑوسی تھا۔ ایک دن وہ اپنے گھر سے نکلا اور بنو عبدالاشہل کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت میں کمسن تھا۔ اس نے قیامت، حساب و کتاب، میزان اور جنت و جہنم کا ذکر شروع کر دیا۔ یہ باتیں اس نے جن لوگوں کے سامنے کہیں وہ بت پرست تھے اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے اس سے کہا: برا ہو تمہارا، کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ ایسا ہو گا اور لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ لوگوں نے پوچھا: تمہاری اس بات کی دلیل کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: اس ملک سے ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے۔ اس نے مکہ اور یمن کی جانب اشارہ کیا۔ لوگوں نے دریافت کیا: ہم اس نبی کو کب دیکھیں گے؟ اس نے میری طرف دیکھا درآنحالیکہ میں کمسن تھا اور کہا: اگر یہ لڑکا اپنی آخری عمر کو پہنچے گا تو اس نبی کو پالے گا۔

حضرت سلمہ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم رات اور دن کی گردش جاری رہی یہاں تک کہ اللہ نے محمد بن عبداللہ ﷺ کو مبعوث فرما دیا اور وہ یہودی ہمارے درمیان زندہ رہا۔ ہم نبی مکرم ﷺ پر ایمان لائے جبکہ اس نے سرکشی اور حسد کی بنا پر آپ کی نبوت کا انکار کر دیا۔ ہم نے اس سے کہا:

اے فلاں! تم پر افسوس! کیا تم وہ نہیں جس نے نبی مکرم ﷺ سے متعلق یہ اور یہ باتیں کہی تھیں؟ اس نے کہا: کیوں نہیں؟ لیکن محمد ﷺ وہ نہیں ہیں۔[1]

ابن اسحاق نے دوسرا واقعہ منقطع سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

بنو قریظہ کے بھائی، بنو ہدل کے یہودیوں سے تعلق رکھنے والے ثعلبہ بن سعید، اسید بن سعید اور اسد بن عبید کے اسلام لانے کا سبب یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت سے چند سال قبل شام کا ایک یہودی

[1] سيرة ابن هشام: ص ٢١٢، ج١ - سير أعلام النبلاء: ص ٦٨-٦٩، ج١

مدینہ آیا تھا جس کا نام ''ابن الھیّبان'' تھا۔ اس نے ان کو یہ بتایا تھا کہ شام سے اس کے مدینہ آنے کا سبب یہ ہے کہ اس کو ایک نبی کی بعثت کی امید ہے اور وہ ان کی اتباع کی غرض سے شام سے ہجرت کر کے مدینہ آیا ہے۔ اس نے مدینہ کے یہودیوں کو یہ دعوت دی کہ اگر وہ اس نبی کا زمانہ پائیں تو اس کی اتباع کریں۔ اور اس فضیلت میں کسی کو اپنے سے سبقت نہ لے جانے دیں۔ اس نے نبی منتظر کی بعض صفات بھی بتائی تھیں۔ چنانچہ جس وقت نبی کریم محمد رسول اللہ ﷺ نے خیبر میں بنونضیر کا محاصرہ کیا اس وقت ثعلبہ بن سعید، اسید بن سعید اور اسد بن عبید نوجوان تھے۔ انہوں نے ابن الھیبان کی بیان کردہ صفات سے نبی کریم ﷺ کو پہچان لیا اور انہوں نے بنونضیر سے کہا:

''اللہ کی قسم یہ وہی نبی ہیں جن پر ایمان لانے کا عہد تم سے ابن الھیّبان نے لیا تھا'' لیکن بنو نضیر نے ان کو جواب دیا کہ ''یہ وہ نہیں ہیں''۔ بنونضیر کا یہ جواب سن کر وہ تینوں قلعہ سے اترے اور نبی مکرم ﷺ پر ایمان لے آئے۔ اس طرح اپنی جان و مال اور اہل خانہ کو بچالیا''[1]

اس واقعہ کی اصل صحیحین میں ہے البتہ ابن اسحاق کی بیان کردہ تفصیلات ان میں نہیں ہیں۔[2]

قرآنی آیات، صحیح احادیث اور حلقہ بگوش اسلام ہونے والے یہودیوں کے اعترافات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہودیوں نے نبی اکرم ﷺ کی نبوت کا انکار نادانی اور جہالت کے نتیجے میں نہیں کیا تھا بلکہ یہ یقین و اذعان حاصل ہو جانے کے بعد کیا تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے وہی نبی اور رسول ہیں جن کے اوصاف ان کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں۔

یہودیوں کے انکار حق کے اسباب:

آغاز امر میں بنواسرائیل دین توحید ہی پر کاربند تھے اور ان کے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام نے، جن کا لقب اسرائیل...... اللہ کا بندہ...... تھا اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے بیٹوں سے یہی عہد لیا تھا کہ وہ اپنے آباء و اجداد کے عقیدہ توحید کے حامل اور ان کے طریقہ عبادت پر عمل پیرا رہیں گے جس کی ہدایت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو کی تھی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ وَصّٰی بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَo اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا

[1] سیرۃ ابن ھشام: ص ۲۱۳، ۲۱۴، ج ۱۔ سیر أعلام النبلا: ص ۶۹، ج ۱

[2] دیکھئے: صحیح بخاری: ح ۴۰۲۸۔ صحیح مسلم: ح ۱۷۶۶

تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰـهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ○ ﴾ [البقرہ:۱۳۲، ۱۳۳]

''اس کی...... یعنی اسلام کی...... ہدایت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کی تھی کہ اے میرے بیٹو! درحقیقت اللہ نے تمہارے لیے دین اسلام کو چن لیا ہے۔ لہٰذا تم لوگ مرتے دم تک مسلمان رہنا۔ کیا تم اس وقت حاضر تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا۔ جس وقت اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا تھا کہ ہم آپ کے معبود، آپ کے باپ دادا: ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود واحد کی عبادت کریں گے اور ہم اسی کے مطیع وفرمانبردار ہیں''

بنواسرائیل نے اپنے باپ سے جو عہد کیا تھا اس عہد پر وہ ایک عرصہ تک قائم رہے اور اپنے گرد و پیش کی مشرک اور گمراہ قوموں کے درمیان تنہا وہی اپنے عقیدہ وعمل سے توحید کی نمائندگی کرتے رہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے انعام واکرام کی بارش کی۔ دوسری قوموں پر ان کو فضیلت بخشی اور ان کو دنیا کا امام بنائے رکھا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ جَعَلَ فِيۡكُمۡ اَنۡۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمۡ مُّلُوۡكًا ۖ وَّ اٰتٰٮكُمۡ مَّا لَمۡ يُؤۡتِ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ○ ﴾ [المائدہ:۲۰]

''یاد کر اس وقت کو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تمہیں عطا کی تھی۔ اس نے تم میں نبی پیدا کیے اور تم کو فرماں روا بنایا۔ اور تم کو وہ کچھ دیا جو اس نے دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا''

اس آیت مبارکہ میں بنواسرائیل کی اس عظمت کی طرف اشارہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کسی زمانے میں ان کو حاصل تھی۔ ایک طرف ان میں حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام جیسے جلیل القدر نبی پیدا ہوئے اور دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں اور ان کے بعد مصر میں ان کو بڑا اقتدار نصیب ہوا۔ مدت دراز تک یہی اس زمانے کے مہذب اور دنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے۔

درحقیقت بنواسرائیل مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنی عظمت وسربلندی کے اسباب سے دور ہوتے چلے گئے اور ان اعمال کی بجائے جو ان کے رب کی رضا اور خوشنودی کے موجب تھے ایسے اعمال کا

ارتکاب کرنے لگے جو اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی ناراضگی کے موجب تھے۔ انہوں نے اس دینی میراث کو بھلا دیا جوان کو اپنے انبیاء اور رسولوں سے ملی تھی۔ اپنے اوپر ہونے والے انعام واکرام نے ان کے اندر شکر و امتنان کے جذبات پیدا کرنے کی بجائے غرور نفس پیدا کر دیا اور وہ اس خود فریبی میں مبتلا ہو گئے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں سے بلند و برتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا پر جو فضیلت بخشی تھی وہ ان کا ذاتی استحقاق تھی اس لیے کہ وہ اللہ کے چہیتے ہیں:

﴿ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ﴾ [المائدہ:۱۸]

''اور یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں''

اور یہ محض یہودی عوام کا جاہلانہ خیال نہ تھا بلکہ ان کے بڑے بڑے علماء اور مذہبی پیشوا بھی یہی خیال رکھتے تھے۔ تمام غیر یہودیوں اور غیر اسرائیلیوں سے اپنے آپ کو برتر تصور کرتے تھے اور معاملات میں ان کے ساتھ ظلم اور زیادتی کو روا رکھتے تھے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ۝ ﴾ [آل عمران:۷۵]

''اور اہل کتاب میں ایسا بھی ہے کہ اگر تم اس کے پاس ڈھیروں مال امانت رکھ دو تو وہ اسے تم کو ادا کر دے گا۔ اور ان میں ایسا بھی ہے کہ اگر تم اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ اسے تم کو ادا نہ کرے گا الا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ان کا یہ دعویٰ ہے: امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ جبکہ وہ اللہ پر جانتے بوجھتے جھوٹ گھڑتے ہیں''

جس زمانے میں یہ آیت نازل ہوئی اس زمانے میں مدینے کے یہودیوں کی اکثریت اس اخلاقی پستی میں گر چکی تھی اور ان میں حق پسندوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان میں سے صرف بعض یہودیوں کو امانت میں خیانت کرنے والا قرار دیا ہے۔

یہودیوں کے جھوٹے پندار اور بنو اسماعیل...... یعنی عربوں پر ان کے احساس برتری نے ان کو نبی عربی ﷺ پر ایمان لانے سے باز رکھا۔ حالانکہ ان کو پورے یقینِ قلب کے ساتھ یہ معلوم تھا کہ محمد

عربی ﷺ اللہ کے وہی رسول ہیں جن کا ذکر ان کی کتابوں میں آیا ہے۔ اور جن کی بعثت کا وہ انتظار کر رہے تھے اور جن پر ایمان لانے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ان کو اپنی رحمتوں سے نوازے گا۔

چنانچہ کوہ سینا پر حاضری کے موقع پر جب بنواسرائیل کی گاؤ پرستی کے نتیجے میں ان کو ایک شدید زلزلے نے آلیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے جو عاجزانہ دعا کی اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا کہ وہ اپنی رحمت ان لوگوں کے حق میں لکھے گا جو اس کا تقویٰ اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور اس کی آیتوں پر ایمان لائیں گے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس کی اس رحمت کے مستحق نبی امی کی اتباع کرنے والے بھی ہوں گے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ ﴾ [الاعراف:١٥٧]

”(یہ رحمت ان لوگوں کے حصے میں بھی آئے گی) جو رسول، نبی امی کی اتباع کریں گے جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں“

مطلب یہ ہے کہ نبی امی ﷺ کا ذکر یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں مثبت ہے۔ محض سنی سنائی باتوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس نبی کو پانے والوں کی فلاح و کامیابی اس نبی پر صدق دل سے ایمان اور اس کی پیروی پر موقوف ہے۔

قرآن یہ بھی صراحت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کے ذریعہ ان کی امتوں سے یہ عہد لیتا رہا ہے کہ ان کے پیروؤں میں سے جس کو بھی کسی اور نبی کا زمانہ ملے گا تو اس کو اپنے نبی کے ساتھ ساتھ اس نبی پر بھی ایمان لانا ہوگا۔ اور جو کوئی بعد میں آنے والے نبی پر ایمان نہ لائے گا وہ اس نبی کا بھی انکاری مانا جائے گا جس کی امت سے وہ نسبت رکھتا ہوگا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ۝ ﴾ [آل عمران:٨١]

”یاد کرو اس وقت کو جب اللہ نے نبیوں سے یہ عہد لیا تھا کہ میں نے تمہیں جو کتاب و حکمت

دی ہے اس کے بعد اگر پھر کوئی رسول اس کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو تمہارے پاس موجود ہے تو یقیناً تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ اللہ نے فرمایا: ''کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: اچھا تو تم گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں''

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جو کوئی اس عہد و میثاق کی خلاف ورزی کرے گا وہ ایمان سے خارج ہو جائے گا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ [آل عمران:۸۲]

''جو کوئی اس کے بعد اس عہد سے پھر جائے گا تو ایسے لوگ فاسق ہیں''

یعنی ایمان سے خارج ہیں۔

اس حقیقت کو نبی ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں یوں واضح فرمایا ہے:

((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ لَوْ بَدَالَکُمْ مُوْسٰی فَاتَّبَعْتُمُوْهُ وَتَرَکْتُمُوْنِیْ لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِیْلِ وَلَوْ کَانَ حَیًّا وَاَدْرَکَ نُبُوَّتِیْ لَاتَّبَعَنِیْ))[1]

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اگر تمہارے سامنے موسیٰ ظاہر ہو جائیں اور تم ان کے پیرو بن جاؤ اور مجھے چھوڑ دو تو تم سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ گے اور اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور ان کو میری نبوت کا زمانہ ملتا تو وہ میری پیروی کرتے''

اوپر کی وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ اللہ کے بھیجے ہوئے تمام انبیاء اور رسولوں پر ایمان لانا اور ان کو اللہ کا رسول ماننا اسلامی عقیدہ ہے۔ کسی ایک بھی رسول کی رسالت کا انکار تمام رسولوں کا انکار ہے جو منافی ایمان ہے۔

اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی نبی کی بعثت کے بعد اس پر ایمان لانا اور اس کی پیروی کرنا جس طرح ان لوگوں پر فرض رہا ہے جو کسی نبی کے پیرو نہیں تھے، اسی طرح ان لوگوں پر اس کو رسول ماننا اور اس کی پیروی کرنا بھی فرض تھا جو اس سے پہلے آنے والے کسی نبی کے پیرو تھے۔

جس طرح یہ قرآنی عقیدہ ہے ٹھیک اسی طرح یہ اہل کتاب کا بھی عقیدہ رہا ہے اور یہود و نصاریٰ نے اگرچہ اپنے انبیاء کی لائی ہوئی بیشتر تعلیمات بھلا دی ہیں مگر یہ عقیدہ ان کی کتابوں میں باقی رہ گیا

[1] سنن دارمی: ح ۴۳۹

جس کا ثبوت درج ذیل واقعہ ہے:

صیہونی تحریک کا بانی ہرٹزل Hertzel اپنی اس تحریک کی تائید حمایت حاصل کرنے کے لیے جب عیسائی پوپ دہم PIUS کے پاس گیا تو پوپ نے اس کی باتوں کو نہایت سرد مہری سے سنا اور یہودیوں کو ''بے دین'' قرار دے کر ان کی حمایت اور مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے ہرٹزل سے کہا:

درحقیقت یہودیت ہی ہمارے دین کی اساس اور اصل ہے لیکن مسیحیت نے اپنی آمد کے بعد یہودیت کی جگہ لے لی ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ ہم یہودیوں کی جو مدد کر چکے ہیں اس میں مزید اضافہ کریں۔ یہودیوں سے جس بات کی توقع تھی وہ یہ کہ مسیح کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہتے، مگر انہوں نے آج تک ایسا نہیں کیا۔[1]

انہوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت کا انکار کر دیا بلکہ ان کا مذاق اڑایا۔ ان پر اور ان کی پاکباز ماں پر نہایت گھناؤنے الزامات لگائے۔ آخر میں ان کو شہید کرنے کی ناپاک کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بچا لیا۔

جب نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو انہوں نے اپنی اسی گندی ذہنیت کا مظاہرہ کیا جس کا مظاہرہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں کر چکے تھے۔ حالانکہ آپ کی بعثت سے قبل وہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جب وہ آخری نبی آئے گا تو وہ اس پر ایمان لا کر اہل شرک کی جڑ کاٹ دیں گے۔

دعوت اسلامی کے مکی دور میں نازل ہونے والی بہت سی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے دین کی راہ میں بنواسرائیل کی قربانیوں اور ان کے صبر و تحمل کی تعریف کی ہے۔ اس دور میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مخاطب بنیادی طور پر مشرکین مکہ ہی تھے اور ان کا ذکر اولاً تو ضمناً آیا ہے۔ ثانیاً جا بجا ان کی تعریف کی گئی ہے اور ایک مؤمن جماعت کی حیثیت سے ان کو پیش کیا گیا ہے۔ مگر اس احسان فراموش قوم نے اسلامی دعوت پر کان دھرنے کی بجائے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ حالانکہ ان کو پورے یقین قلب سے یہ معلوم تھا کہ اسلام وہی دین ہے جس کی دعوت ان کے انبیاء دیتے آئے تھے۔ توحید سے لے کر عبادات اور معاملات تک میں قرآن کی تعلیمات میں وہی روح کارفرما ہے جو روح تورات کی تعلیمات میں کارفرما تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے اسلامی دعوت کے بارے میں معاندانہ موقف ہی اختیار کیا۔

ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ یہودی علماء اور مذہبی پیشوا اس ہٹ دھرمی پر اتر آئے کہ مشرکین

---

[1] الیہود المتعدون ص ١٥٦

مکہ کو نبی اکرم ﷺ کے پیرو اہل توحید سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دے دیا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴾ [النساء:۵۱]

''(اے نبی!) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا وہ جبت اور طاغوت پر ایمان لاتے ہیں۔ اور کفر کرنے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان لانے والوں سے زیادہ ہدایت پر ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ اور جس پر اللہ لعنت کرے تو تم اس کا کوئی مددگار نہیں پا سکتے''

دراصل بنواسماعیل سے بغض و نفرت، ان سے افضل اور برتر ہونے کے احساس اور دنیوی فوائد کی خاطر یہودیوں نے رسول اکرم ﷺ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا اور اپنی ساری ذہنی اور مادی توانائی اس دعوت کو ناکام بنانے کے لیے وقف کر دی۔ اس طرح وہ اللہ کی لعنت کے مستحق قرار پائے اور اس روحانی امامت سے محروم کر دیے گئے جس پر وہ مسلسل کئی صدیوں سے فائز چلے آ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو مسلسل چھوٹ دیتا آ رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے سلسلہ نبوت و رسالت کی آخری کڑی حضرت محمد ﷺ پر ایمان نہ لا کر دنیا اور آخرت دونوں کی ناکامی اور خسران کو اختیار کر لیا۔

اسراء و معراج کا پیغام:

قرآن پاک کی سورۃ الاسراء...... بنی اسرائیل...... کی پہلی آیت میں رسول عربی و امی محمد رسول اللہ ﷺ کو مسجد حرام سے راتوں رات مسجد اقصیٰ تک پہنچانے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ [الاسراء:۱]

''پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے گرد و پیش کو ہم نے برکت دے رکھی ہے تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ درحقیقت وہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد مبارک کا آغاز ''سبحان'' سے کیا ہے جو اس کی ذات کے ہر نقص اور عیب سے پاک ہونے اور اس کی غیر محدود اور مطلق قدرت پر دلالت کرتا ہے۔ اس لفظ سے اس امر کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس کے آخری اور محبوب نبی کا یہ سفر ایک ایسا خارق عادت اور معجزاتی سفر

ہے جس سے اس نے اپنے کسی بندے کو نہیں نوازا تھا۔
قرآن پاک میں اس سفر اسراء کی مزید کوئی تفصیل بیان نہیں ہوئی۔ لیکن صحیح احادیث میں متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اس واقعہ کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے بیت المقدس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء اور رسولوں کی نماز میں امامت فرمائی جن کی مقدس روحوں کو ''ممثل'' کر کے وہاں جمع کیا گیا تھا۔
نماز تمام عبادتوں کی معراج ہے اور انبیائے بنی اسرائیل کے مرکز بیت المقدس میں رسول عربی وامی محمد رسول اللہ ﷺ کو نماز میں تمام انبیاء اور رسولوں کی امامت پر سرفراز کرنا یہ مفہوم رکھتا ہے کہ آج سے تمام دنیا کی امامت آپ کے حصے میں آ رہی ہے۔ آپ کے بعد اس منصب پر آپ کی امت کے صالح افراد فائز ہوں گے۔ رہے بنو اسرائیل تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی مسلسل نافرمانیوں اور آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا انکار کر کے اپنے آپ کو اس عظیم منصب کے لیے ''نا اہل'' ثابت کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ''لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ'' کا مصداق بنا لیا ہے۔
سورۃ الاسراء سے سابقہ سورت ''النحل'' کی آخری آیت سے پہلے کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی کو راہ حق میں صبر کی تلقین فرمائی ہے اور دشمنان حق کی دسیسہ کاریوں اور مکر و فریب پر کبیرہ خاطر اور رنجیدہ ہونے سے منع فرمایا ہے۔ سورت کا اختتام اس تاکید کے ساتھ کیا ہے کہ اللہ کی معیت اور اس کی حمایت و نصرت ہمیشہ ان خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہے جو تقویٰ اور احسان پر فائز ہوتے ہیں۔ چونکہ رسول اکرم ﷺ امام المتقین اور امام المحسنین تھے اس لیے اللہ تعالیٰ کی حمایت و نصرت آپ سے اور آپ کے مخلص اور جاں نثار ساتھیوں اور پیروکاروں سے کسی حال میں جدا نہیں ہو سکتی۔ بنو اسرائیل جنہوں نے آپ کی مخالفت اور مشرکین کی تائید و حمایت کا راستہ اختیار کر لیا اللہ تعالیٰ کی اس معیت اور حمایت و نصرت سے محروم کر دیے گئے۔
سورۃ الاسراء کی دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمایا ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب تورات دی وہ بنو اسرائیل کے لیے ہدایت نامہ تھی اور اس میں ان کو اللہ کے سوا کسی اور کو وکیل اور کارساز بنانے سے منع فرمایا گیا تھا لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل نہیں کی۔
پھر تیسری آیت میں اہل ایمان کو ان لوگوں کی ''ذریت'' کہہ کر جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے جلیل القدر رسول حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ طوفان سے نجات دی یہ تلقین فرمائی ہے کہ وہ اللہ کے شکر گزار

بندے بنیں کیونکہ اسی صفت سے حضرت نوح علیہ السلام موصوف تھے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک حتمی اور اٹل فیصلے کا ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِ يْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴾ [الاسراء:٤]

''اور ہم نے ''الکتاب'' میں بنواسرائیل کو اپنے اس حتمی فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا کہ یقیناً تم زمین میں دو بار فساد مچاؤ گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے''

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں تقریباً تمام ہی مفسرین اور مؤرخین اس طرف گئے ہیں کہ اس میں بنواسرائیل کے زمین میں دو بار فساد پھیلانے کا جو ذکر آیا ہے وہ اسلام کی آمد سے قبل وقوع پذیر ہو چکا ہے اور ان کو اس کی سزا بھی مل چکی ہے۔ لیکن یہ رائے اس آیت مبارکہ کے سیاق وسباق اور امر واقعہ کے بالکل خلاف ہے اور اس کے پیچھے کوئی نقلی دلیل بھی نہیں ہے۔

بخت نصر کا افسانہ:

عام طور پر مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بنواسرائیل کے پہلے فساد کے موقع پر ان پر جالوت کو مسلط کیا گیا اور دوسرے فساد کے موقعے پر بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور یہودیوں کا قتل عام کر کے ان کا نام ونشان مٹا دیا۔

تفسیر کی بعض کتابوں میں آیات ۵ اور ۷ کی تفسیر کے ضمن میں بعض روایات بھی نقل کی گئی ہیں جن میں سے کوئی بھی روایت صحیح نہیں ہے۔ بلکہ سب من گھڑت اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جھوٹ ہیں۔ ذیل میں ایک طویل روایت کا ترجمہ درج کر رہا ہوں۔

(۲۳۹)...... جب بنواسرائیل نے جارحانہ روش اختیار کی، سرکشی کر کے اور انبیاء کو قتل کیا تو اللہ نے ان پر شاہ فارس بخت نصر کو مسلط کر دیا۔ اللہ نے اس کو سات سو سال تک اقتدار بخشا تھا۔ بخت نصر نے بنواسرائیل کا رخ کیا یہاں تک کہ وہ بیت المقدس میں داخل ہو گیا، اس کی ناکہ بندی کی اور اس کو فتح کر لیا۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام کے خون کے بدلے اس نے ستر ہزار یہودیوں کو قتل کیا۔ ان کے اہل خانہ اور انبیاء کی اولاد کو گرفتار کر لیا۔ اس نے بیت المقدس کے زیورات لوٹ لیے اور اس کے خزانوں سے ایک لاکھ ستر ہزار زیورات نکال کر ان کو بابل منتقل کیا۔

حضرت حذیفہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا بیت المقدس اللہ کے نزدیک بڑا

درجہ رکھتا تھا؟ فرمایا:

ہاں، سلیمان بن داؤد نے بیت المقدس کی تعمیر سونے، موتیوں، یاقوت اور زبرجد سے کی تھی۔ اس کا فرش سونے اور چاندی سے بنایا گیا تھا اور اس کے ستون بھی سونے کے تھے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کیا تھا۔ شیاطین کو ان کے تابع کر دیا تھا جو پلک جھپکتے ان کے پاس یہ چیزیں حاضر کر دیتے تھے۔ یہ تمام چیزیں بخت نصر لے کر بابل چلا گیا اور بنواسرائیل نے سو سال تک اس کی غلامی کی۔ جنہیں مجوسی اور ان کی اولاد تعذیب رہتی رہی۔ ان میں انبیاء اور ان کی اولاد بھی تھی۔ اس کے بعد اللہ نے ان پر رحم فرمایا اور فارس کے ایک بادشاہ کو جس کا نام ''کورس'' تھا اور جو مؤمن تھا یہ وحی کی کہ تم بنواسرائیل میں سے زندہ بچ جانے والوں کے پاس جاؤ اور ان کو بچاؤ۔ یہ حکم پا کر کورس بنواسرائیل کو لے کر بیت المقدس گیا اور اس کے زیورات بھی وہاں واپس پہنچائے۔ اس کے بعد بنواسرائیل سو سال تک اللہ کے مطیع و فرماں بردار رہے۔ لیکن اس کے بعد دوبارہ معاصی میں مبتلا ہو گئے۔ اس کی پاداش میں اللہ نے ان پر ''ربطیان حوس'' کو مسلط کر دیا جس نے بخت نصر کے ساتھ مل کر ان پر لشکر کشی کی۔ بیت المقدس میں ان کے پاس گیا اور ان کو اور ان کے اہل خانہ کو قیدی بنایا۔ بیت المقدس کو نذر آتش کر دیا اور بنواسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اے بنواسرائیل! جب تم معاصی کا ارتکاب کرو گے تب تب ہم تم کو قیدی بناتے رہیں گے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ معاصی کا ارتکاب کرنے لگے۔ اس بار اللہ نے روم کے بادشاہ قاقس بن رسپایوس کو ان پر مسلط کیا جس نے سمندر اور خشکی سے ان پر لشکر کشی کی۔ بنواسرائیل کو قیدی بنایا، بیت المقدس کے زیورات لوٹے اور بیت المقدس میں آگ لگا دی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بیت المقدس کے یہ زیورات مہدی وہاں واپس لوٹائیں گے جو ایک ہزار سات سو کشتیوں سے عبارت ہوں گے۔ ان کو ''یافا'' کی بندرگاہ پر لنگر انداز کیا جائے گا اور یہاں سے زیورات کو بیت المقدس منتقل کیا جائے گا۔ جہاں اللہ اگلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا۔

یہ روایت بھی موضوع ہے۔ محدث محمد ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں:

اس کی تخریج امام طبری نے کی ہے اور اس کی صحت و سقم کے بارے میں سکوت فرمایا ہے۔ لیکن حافظ ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کرنے کی وجہ سے ان کی نکیر کی ہے اور لکھا ہے کہ بلاشبہ یہ روایت موضوع ہے۔ جس کو علم حدیث کی معمولی معرفت حاصل ہوگی وہ اس کے موضوع اور من گھڑت ہونے میں شک نہیں

کرے گا۔ تعجب ہے کہ امام طبری کی جلالت شان اور امامت کے باوجود ان کے نزدیک یہ کیونکر رواج پا گئی۔ ہمارے شیخ حافظ علامہ ابوالحجاج مزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو موضوع اور جھوٹ قرار دیا ہے۔[1]

اس طرح کی نہ جانے کتنی جھوٹی روایتیں تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔

اولاً: اگر سورۃ الاسراء کی آیت نمبر ۴ کے فقرہ: لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ ''یقیناً تم زمین میں دو مرتبہ فساد برپا کرو گے'' کو قبل از اسلام کا واقعہ قرار دیا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ بنو اسرائیل نے اسلام کی آمد سے قبل صرف دو بار زمین میں فساد برپا کیا اور یہ خلاف واقعہ اور خود قرآن پاک کی تصریحات کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن پاک میں ان کی جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس کے تتبع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے متعدد بار زمین میں فساد برپا کیے اور متعدد بار ان کو سزائیں دی گئیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں متعدد انبیاء کو قتل کیا، اللہ کی کتاب میں مسلسل تحریفات کیں، حضرت عیسیٰ اور ان کی پاکباز والدہ حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان لگایا، دوسرے بہت سے رسولوں اور نبیوں کی کردار کشی کی، رشوت خوری اور سودی کاروبار کی ترویج کی، جادوگری سیکھنے اور سکھانے کا ارتکاب کیا، سبت کا قانون توڑا، اللہ تعالیٰ پر بخل کا الزام لگایا، حضرت جبریل علیہ السلام کو اپنا دشمن قرار دیا اور فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کلی طور پر کنارہ کش ہو گئے۔ ان تمام برائیوں کا ارتکاب صرف ان کے عوام نے نہ کیا بلکہ خود قرآن پاک کی تصریحات کے مطابق ان کے علما اور مذہبی پیشوا ان برائیوں میں ملوث ہوئے۔ ایسی صورت میں قبل از اسلام ان کے صرف دو بار فساد برپا کرنے کی بات خلاف واقعہ نہیں تو اور کیا ہے؟!

دوم: اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کے دوسری بار فساد برپا کرنے کے لیے ''الآخرۃ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ ﴾

''اور جب آخری وعدے کا وقت آئے گا''

اس کا ترجمہ عام طور پر مترجمین نے ''دوسرے وعدے کا وقت'' کیا ہے جو صحیح نہیں۔ الآخرۃ الأخری سے مختلف چیز ہے جو ناقابل تکرار ہے۔ اسی وجہ سے اس دنیا کے بعد دوبارہ پیدا کیے جانے کے دن کا نام ''الآخرۃ'' یوم آخرت ہے۔ جس کے بعد کوئی اور دن نہیں ہے۔ اس وضاحت کی روشنی میں اگر

[1] سلسلة الاحاديث الضعيفه: ص ۱۲۳-۱۲۴، ج ۱٤، ح ٦٥٥١

بنو اسرائیل کو ان کے دوسرے فساد کی سزا قبل از اسلام مل چکی ہے تو پھر اس دنیا میں ان کو کوئی اور سزا نہیں ملنی چاہیے۔ جبکہ صحیح متواتر احادیث یہ صراحت کرتی ہیں کہ ان کی شر انگیزیوں اور ان کے فتنہ وفساد کی آخری سزا ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ان کے اور مسلمانوں کے ہاتھوں ملنے والی ہے۔

سوم: پہلی بار بنو اسرائیل کے فتنہ وفساد پھیلانے اور سرکشی کرنے کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر جن لوگوں کو مسلط فرمایا ان کے لیے اس نے "عِبَادًا لَّنَآ" کی تعبیر اختیار فرمائی ہے:

﴿ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ ﴾ [الاسراء:۵]

"پس جب ان میں سے پہلے فساد کا وقت موعود آئے گا تو ہم تمہارے خلاف اپنے ایسے بندے اٹھائیں گے جو بڑے زور آور ہوں گے"

اور قرآن پاک میں دو مقامات کے سوا بقیہ تمام جگہوں پر عبد یا عباد کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ کے مومن بندوں کو مراد لیا گیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے عبد، یا عباد کی اپنی طرف اضافت فرمائی ہے وہاں ان سے اس کے مومن بندے ہی مراد ہیں۔ چاہے وہ اس کے رسول ہوں یا عام مومن بندے۔ البتہ "عبید" کا لفظ عام ہے جس میں مومن اور کافر دونوں شامل ہیں۔ جبکہ مفسرین کے مطابق جن لوگوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کو دونوں بار سزا دی اور ان کی بیخ کنی وہ کافر ومشرک لوگ تھے۔ چنانچہ شیخ عبدالرحمٰن آل سعدی لکھتے ہیں:

"اصحاب تفسیر کا بنو اسرائیل پر مسلط کی جانے والی قوم کے تعین کے بارے میں اختلاف ہے البتہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ کافر قوم تھی" [1]

اور جن دو مقامات پر "عباد" کا اطلاق کافروں پر کیا گیا ہے، ان میں سے پہلا مقام وہ ہے جب قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ان لوگوں کے حق میں جنہوں نے ان کو اور ان کی والدہ کو معبود قرار دے ڈالا ہے عرض کریں گے:

﴿ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ ﴾ [المائدہ:۱۱۸]

"اگر آپ ان کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں"

اور دوسرا مقام وہ ہے جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے سوا دوسرے بنائے جانے والے معبودوں سے پوچھے گا:

---

[1] تیسیر الرحمن فی تفسیر کلام المنان: ص ۵۲۸

﴿ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَقُولُ ءَ اَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝ ﴾ [الفرقان:۲۵]

''کیا تم لوگوں نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا یہ خود ہی صحیح راہ سے بھٹک گئے تھے؟''

اور ان دونوں مقامات کا تعلق دنیا سے نہیں بلکہ یوم آخرت سے ہے جہاں تمام کفار ایمان لے آئیں گے مگر ان کے ایمان کا اعتبار نہ ہوگا۔

چہارم: بنواسرائیل کے پہلے فساد اور سرکشی کے ذکر کے موقع پر دور یا قریب کہیں سے بھی بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ صرف ''الدیار'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو ''الدار'' کی جمع ہے۔ اس کا اطلاق گھر، آبادی اور شہر پر ہوتا ہے۔ معلوم نہیں مفسرین نے اس لفظ ''الدیار'' سے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کا مفہوم کہاں سے نکال لیا؟!

اوپر کی وضاحتوں کے تناظر میں بنواسرائیل کے دو بار فساد مچانے اور سرکشی کرنے اور ان کی سزا پانے کے جن واقعات کا ذکر سورۃ الاسراء کی آیات ۴، ۵ اور ۷ میں آیا ہے ان کا تعلق اسلام کی آمد کے بعد کے زمانے سے ہے۔ جن میں سے ایک وعدہ پورا ہو چکا ہے اور دوسرا باقی ہے۔ تفصیلات درج ذیل ہیں:

(۱)...... جب نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی تو کفار مکہ سے پہلے یہودیوں پر یہ فرض تھا کہ وہ بڑھ کر آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی رسالت کی تصدیق کریں۔ کیونکہ اولاً تو وہ آخری نبی کی بعثت کے منتظر تھے۔ ثانیاً ان کی کتاب میں ان کو بصراحت یہ حکم دیا گیا تھا کہ اگر ان کو نبی ﷺ کا زمانہ ملے تو وہ آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی تائید وحمایت کریں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو اس کا حکم دے کر ان پر اتمام حجت بھی کر دی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝ ﴾ [البقرة:٤١]

''اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے تمہارے پاس پہلے سے موجود کتاب کی تائید میں نازل فرمائی ہے اور تم ہی اس کے پہلے منکر نہ بنو اور نہ معمولی قیمت پر میری آیات کو بیچو اور صرف مجھ سے ڈرو''

لیکن بنواسرائیل نے قرآن پاک کی اس دعوت اور اپنے انبیاء کی دعوتوں کو ٹھکرا دیا اور تمام لوگوں سے پہلے رسول اکرم ﷺ کی رسالت کے منکر بن گئے۔ حقیر دنیوی فوائد کی خاطر اور بنواسماعیل پر

برتری کے احساس سے مغلوب ہو کر اسلام اور رسولِ اسلام کے دشمن بن گئے۔

دعوت اسلامی کے مکی دور میں اگرچہ وہ اولین اور براہ راست مخاطب نہ تھے پھر بھی انہوں نے مسلمانوں کے خلاف دور ہی سے سہی معاندانہ موقف ہی اختیار کیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے مشرکین مکہ کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ اور راست رو قرار دے کر حق دشمنی کی نہایت گندی مثال پیش کی۔

چونکہ یہودی مدینہ میں آباد تھے اس لیے نبی مکرم ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد سب سے پہلے وہاں کے دونوں خاندانوں اوس وخزرج اور مہاجرین کو ملا کر ایک برادری بنائی۔ مدینہ کے شہری ہونے کی بنیاد پر یہودیوں کے ساتھ پر امن بقائے باہم کی غرض سے ایک معاہدہ کیا۔ جس میں اس امر کی ضمانت کی گئی تھی کہ کسی کے حقوق پر دست درازی نہیں کی جائے گی اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں سب مل کر مدینہ کا دفاع کریں گے۔ لیکن اس معاہدے کی شرائط قبول کرنے کے باوجود یہودیوں نے اس پر عمل نہیں کیا بلکہ در پردہ وہ رسول اکرم ﷺ، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ روش پر ہی قائم رہے۔

ہجرت مدینہ کے دوسرے ہی سال غزوۂ بدر برپا ہوا۔ مسلمان مادی اعتبار سے نہایت مفلوک الحال تھے۔ ان کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ تھی۔ تن ڈھانکنے کو کپڑے نہ تھے اور جنگی ساز وسامان بھی نہ تھا۔ ان حالات میں یہ غزوہ پیش آیا جو مسلمانوں کے ایمان کے لیے نہایت صبر آزما امتحان تھا۔ جبکہ مدمقابل فوج اپنی تعداد اور فوجی ساز وسامان سے لیس اور نہایت مضبوط تھی، چونکہ یہ معرکہ اللہ کے لیے تھا، اس لیے اللہ نے اپنے محبوب نبی کی فریادیں سن لیں اور مسلمانوں کو فتح عظیم سے نوازا۔

مسلمانوں کی اس فتح سے کفار مکہ سے زیادہ یہودیوں کو دکھ ہوا جو مسلمانوں کے پڑوسی، معاہدۂ امن میں ان کے شریک اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نسبت کے دعویٰ کی رو سے ان کے دینی بھائی تھے۔ ان آستین کے سانپوں میں سے ایک سانپ کعب بن اشرف مدینہ منورہ سے سفر کر کے مکہ پہنچا اور وہاں نہایت دردانگیز طریقے سے قریش کے مقتولوں کے مرثیے کہہ کہہ کر ان کو جوشِ انتقال دلایا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کا عناد بڑھتا گیا اور نتیجے کے طور پر قریش مکہ اور یہودیوں کے مابین اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ قریش مکہ ان کو غداری پر اکساتے رہے اور بسا اوقات ان کو دھمکیاں بھی دیں کہ اگر وہ مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار نہ رہے تو وہ ان پر چڑھائی کر دیں گے۔

ماہ صفر ۴ ہجری میں پیش آنے والے رجیع اور بئر معونہ کے سانحوں کے بعد حضرت عمرو بن امیہ

ضمری رضی اللہ عنہ نے غلطی سے بنوکلاب کے دو مردوں کو قتل کر دیا تھا جن سے رسول اللہ ﷺ کا معاہدہ تھا۔ جس کے موجب رسول اکرم ﷺ کو ان کا خون بہا ادا کرنا تھا۔ چونکہ یہود بنونضیر مدینہ کے معاہد تھے اس لیے ان پر بھی دیت اور خونبہا میں حصہ لینا واجب تھا۔ جب رسول اکرم ﷺ اپنے چند اصحاب کے ہمراہ ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے بنوکلاب کے دونوں مقتولین کے خون بہا میں اعانت کے مسئلے پر بات چیت کی تو وہ رضا مند ہو گئے اور کہا آپ یہاں تشریف رکھیے ہم ابھی مطلوبہ رقم لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ نبی مکرم ﷺ ان کے ایک گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ وہ آستین کے سانپ وہاں سے جانے کے بعد آپس میں کہنے لگے کہ ایسا موقع پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا جو کرنا ہے ابھی کر لو۔ ان میں سے ایک بدبخت عمرو بن حجاش اس بات پر تیار ہو گیا کہ وہ اس گھر کے اوپر جائے اور وہاں سے آپ پر ایک بھاری پتھر گرا کر آپ کو شہید کر دے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے اس ناپاک ارادے پر عمل کرتا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس سے مطلع کر دیا اور آپ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔[1]

اسی زمانے میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ یہودیوں نے رسول اکرم ﷺ کو کہلا بھیجا کہ آپ اپنے تیس آدمی لے کر آیئے اور ہمارے بھی تیس عالم نکلیں گے۔ ایک درمیانی مقام پر ان سے آپ کی بحث ہو گی۔ اگر آپ ان پر اپنے دین کی حقانیت ثابت کر دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ جب وہ درمیانی مقام کے قریب پہنچے تو انہوں نے یہ تجویز رکھی کہ آپ اپنے تین صحابیوں کے ہمراہ ان کے تین عالموں سے ملیں درآنحالیکہ یہ تینوں یہودی اپنے ساتھ خنجر لیے ہوئے تھے۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ ملاقات عمل میں آتی خود بنو نضیر کی ایک عورت نے اپنے مسلمان بھائی کو یہ اطلاع دے دی کہ یہودی خنجر لے کر آ رہے ہیں اور تمہارے نبی کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد نبی کریم ﷺ نے اپنا ارادہ بدل دیا۔[2]

ان دو واقعات سے یہودیوں کی گندی ذہنیت اور ان کی غدار طبیعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اہل حق خصوصاً انبیائے کرام علیہم السلام کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے وہ کیسی ناپاک حرکتیں کرتے رہے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ ایک طرف اللہ کے نبی اور رسول تھے تو دوسری طرف آپ ایک اسلامی ریاست

---

[1] سیرت ابن شام: ص ۱۹۰، ج۲۔ فتح الباری: ص ۱۷۸۶، ۱۷۸۷، ج۲، شرح حدیث البخاری: ۴۰۲۸

[2] مصنف عبد الرزاق: ص ۳۵۹۔۳۶۰۔ سنن ابوداؤد: ح ۳۰۰۴

کے سربراہ تھے۔ جس کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ان تمام لوگوں کو سزائے موت دے دینے کے احکام جاری کردیتے۔ لیکن آپ نے ان مجرمین کو یہ الٹی میٹم دینے پر اکتفا فرمایا:

''تم نے میرے ساتھ غدر کیا ہے لہٰذا تم یا تو خود دس دن کے اندر مدینہ سے نکل جاؤ ورنہ مجھے تم سے جنگ کرنی پڑے گی''

رسول اللہ ﷺ کا یہ الٹی میٹم ملتے ہی بنو نضیر مدینہ سے نکل جانے پر تیار ہو گئے لیکن منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی نے انہیں کہلا بھیجا کہ تم ہرگز نہ نکلنا ہم تمہاری مدد کریں گے۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی کے اکسانے پر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ جواب دیا:

((إِنَّا لاَ نَخْرُجُ فَاصْنَعْ مَا بَدَالَكَ)) [1]

''ہم نہیں نکلیں گے تمہارا جو جی چاہے کرو''

ان کے اس جواب کے بعد رسول اکرم ﷺ کے سامنے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں رہ گیا تھا، کہ آپ ان سے جنگ کریں۔ لہٰذا آپ نے اور آپ کے اصحاب نے اللہ اکبر کہا اور ان سے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے ان کو یہ پیغام بھیجا:

((إِنَّكُمْ وَاللّٰهِ لاَ تَأْمَنُوْنَ عِنْدِي إِلَّا بِعَهْدٍ تُعَاهِدُوْنِي عَلَيْهِ)) [2]

''اللہ کی قسم! تم لوگ میرے نزدیک قابل اعتماد نہیں ہو۔ الا یہ کہ تم مجھ سے عہد و پیمان کرو''

لیکن ان بدبختوں نے نبی مکرم ﷺ سے کوئی عہد و پیمان کرنے سے انکار کردیا جس کے باعث آپ کو ان سے جنگ کرنی پڑی۔

اسی اثناء میں آپ نے بنو قریظہ کا بھی رخ کیا اور ان سے معاہدہ کرنے کے لیے کہا تو وہ تیار ہو گئے۔ اس لیے آپ نے ان سے صرف نظر فرمایا۔ لیکن بنو نضیر کا محاصرہ کرلیا۔ اس محاصرے نے چھ دن میں ان کے حوصلے پست کرادیے اور وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو کے مدینہ سے جلا وطن ہونے پر راضی ہو گئے۔ رسول اکرم ﷺ نے ان کی درخواست پر یہ بات منظور فرمائی کہ وہ اسلحے کے سوا باقی جتنا ساز و سامان چاہیں اونٹوں پر لاد کر بال بچوں سمیت چلے جائیں۔

اس طرح بنو نضیر کے بیشتر افراد اور ان کے سردار حی بن اخطب اور سلام بن ابی الحقیق نے خیبر کا

---

[1] فتح الباری: ص ۱۷۸۷، ج۲ [2] سنن ابوداؤد: ح ۳۰۰۴

رخ کیا اور ان کے کچھ افراد شام چلے گئے لیکن ان کے دو آدمیوں یامین بن عمرو اور ابو سعید بن وہب رضی اللہ عنہما نے اسلام قبول کرلیا۔

غزوۂ خندق:

غزوۂ بنی نضیر اور مدینہ سے ان کی جلاوطنی پر ابھی صرف ایک سال کا عرصہ گزرا تھا کہ انہوں نے دوبارہ اپنی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ مسلمانوں کا امن و سکون ان کے لیے سوہان روح بن گیا۔ انہوں نے اپنے دل کی آگ بجھانے اور مسلمانوں پر آخری کاری ضرب لگانے کے لیے قریش مکہ کے ساتھ سلسلہ جنبانیاں شروع کر دیں۔

خیبر میں سکونت پذیر ہونے کے بعد یہود بنونضیر کے سرداروں نے قریش مکہ اور دوسرے عرب قبیلوں سے رابطے شروع کر دیے اور ان کو مسلمانوں سے انتقام لینے کی خاطر مدینہ پر لشکر کشی کرنے پر ورغلانے لگے۔ اس غرض کے لیے بنونضیر کا ایک وفد مکہ گیا۔ اس وفد میں سلام بن ابی الحقیق، حی بن اخطب، کنانہ بن ابی الحقیق، ھوذہ بن قیس اور ابو عمار نیز دوسرے بڑے زعماء شامل تھے۔ اس وفد نے قریش کے سرداروں سے ملاقاتیں کر کے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف جنگ بھڑکانے پر اکسایا اور ان کو اپنی طرف سے بھرپور مدد کا یقین دلایا۔ نیز ان سے یہ بھی کہا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے بہتر اور ان سے زیادہ راست رو ہیں۔ چونکہ قریش مکہ خود مسلمانوں کے خلاف جنگ کا شعلہ بھڑکانے اور ان کے وجود کو ختم کر دینے کے آرزومند تھے اس لیے انہوں نے بنونضیر کے سرداروں کی پیش کش فوراً قبول کرلی۔

یہودیوں کا یہ وفد قریش مکہ سے ساز باز کرنے کے بعد بنوغطفان کے پاس گیا اور ان کو بھی خوب پٹی پڑھائی۔ ان سے یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ قریش کے ساتھ متحد ہو کر مدینہ پر حملہ کر دیں تو ادھر سے تمام یہودی ان کے ساتھ مل جائیں گے۔

بنوغطفان کو راضی کر کے یہودیوں کا یہ وفد دوسرے عرب قبائل کے پاس بھی گیا اور ان کو جنگ کی ترغیب دی۔ اس طرح انہوں نے اپنی دسیسہ کاریوں اور مکر و فریب کے ذریعہ اہل شرک کے بڑے بڑے قبیلوں اور جتھوں کو نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف جنگ پر تیار کرلیا۔

اس کے بعد طے شدہ منصوبے کے تحت مختلف عرب قبیلوں کے کوئی دس ہزار افراد فوجی ساز و سامان اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر جانب مدینہ روانہ ہوگئے۔ ادھر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سراغ رسانوں، اسلامی

دعوت سے متاثر اور اس سے ہمدردی رکھنے والوں نے ان کے ارادوں سے آپ کو مطلع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ آپ خندق کھدوا کر اہل مدینہ کو حملہ آوروں سے محفوظ کر لیں[1] چنانچہ آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ کے شمال مغربی رخ پر ایک خندق کھودنے کا حکم دے دیا۔ یہ خندق چھ دن کی قلیل مدت میں کھود کر تیار کر لی گئی۔ جس کی کھدائی میں تمام مسلمانوں کے ساتھ خود رسول اکرم ﷺ نے بھی حصہ لیا۔

اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ مدینہ میں مقیم یہودیوں کے تیسرے قبیلے بنوقریظہ نے مسلمانوں کے خلاف اب تک کوئی بدعہدی نہیں کی تھی اور وہ ان کے ساتھ اپنے حلیفانہ معاہدے پر قائم تھا۔ جس کی رو سے مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدافعت کرنے کا پابند تھا۔ بنونضیر نے مدینہ پر حملہ آور عرب قبیلوں کی مدد کا جو وعدہ کیا تھا اس سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ قبیلہ مدینہ کے جنوب مشرقی علاقے میں آباد تھا۔ اس لیے مسلمان اس کی طرف سے بے فکر تھے اور اپنے بال بچوں کو ان گڑھیوں میں بھجوا دیا جو اس جانب تھیں اور ادھر سے دفاع کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ صورتحال کے اس نازک پہلو سے فائدہ اٹھانے کے لیے بنونضیر کا سردار حی بن اخطب بنوقریظہ کے پاس گیا اور ان کے سردار کعب بن اسد قرظی کو مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے معاہدے کو توڑ کر ان کے خلاف جنگ میں شریک ہونے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ ابتداء میں تو کعب نے اس کی بات سننے سے انکار کر دیا مگر جب حی بن اخطب نے اس کو بتایا کہ میں اس وقت مسلمانوں پر عرب کی متحدہ طاقت چڑھا لایا ہوں اور یہ ان کے وجود کو ختم کر دینے کا نادر موقع ہے تو یہودی ذہن کی اسلام دشمنی اخلاق کے پاس ولحاظ پر غالب آ گئی اور بنوقریظہ عہد توڑنے پر راضی ہو گئے۔

کفار مکہ اور دوسرے عرب قبیلوں نے مدینہ پر چڑھائی کا منصوبہ بناتے وقت یہ سوچا بھی نہ تھا کہ ان کا سامنا مدینہ سے باہر کسی خندق سے ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنی تاریخ میں اس طریقِ دفاع سے بالکل ناآشنا تھے۔ لہٰذا مدینہ پر حملہ کرنے کی بجائے ان کو اس کا محاصرہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور اگر کوئی خندق کے قریب آتا تاکہ اسے پار کرے تو مسلمانوں کی طرف سے اس پر تیروں کی بارش ہو جاتی۔

یہ صبر آزما مگر لاحاصل محاصرہ اگرچہ ۲۵ دن سے زیادہ طویل رہا لیکن ناقابل برداشت سردی نے اہل کفر کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ ادھر رحمت الٰہی جوش میں آئی اور اس نے اپنی غیبی فوج کے ذریعہ

---

[1] سیرت کی کتابوں میں جو یہ بات مشہور ہے کہ خندق کھودنے کا مشورہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دیا تھا اس کی کوئی قابل اعتماد بنیاد نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اس کتاب کی جلد اول ص ۳۳۵-۳۳۸

اپنے اور اپنے رسول کے دشمنوں کو خائب وخاسر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

یہ حملہ کتنا سخت اور حوصلہ شکن تھا؟ اس کا اندازہ ان آیات مبارکہ سے ہوتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے اس کی منظر کشی فرمائی ہے اور پھر اپنی مدد کا ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا۝ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۝ ﴾

[الاحزاب:۹، ۱۰، ۱۱]

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو یاد کرو اللہ کی اس نعمت کو جو اس نے تم پر کی ہے۔ جب لشکر تم پر چڑھ آئے تھے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی اور ایسی فوجیں بھیج دیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں۔ اور اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم کر رہے تھے۔ جب وہ اوپر سے اور تمہارے نیچے سے تم پر چڑھ آئے تھے۔ جب خوف سے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آ گئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے۔''

بالآخر اہل کفر نے راہ فرار اختیار کی اور راتوں رات بھاگ کھڑے ہوئے۔ صبح جب مسلمان اٹھے تو میدان خالی تھا۔ اس وقت نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَلْآنَ نَغْزُوْهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَنَا))[1]

''اب ہم ان پر چڑھائی کریں گے اور وہ ہم پر چڑھائی نہ کر سکیں گے۔''

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ فرمایا:

((لَمَّا رَجَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْخَنْدَقِ وَوَضَعَ السِّلَاحَ وَاغْتَسَلَ أَتَاهُ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَام، فَقَالَ: قَدْ وَضَعْتَ السِّلَاحَ وَاللّٰهِ مَا وَضَعْنَاهُ فَاخْرُجْ إِلَيْهِمْ، قَالَ: فَإِلَى أَيْنَ؟ قَالَ: هَاهُنَا وَأَشَارَ إِلَى بَنِي قُرَيْظَةَ، فَخَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِمْ))[2]

---

[1] صحيح بخاري: ح ٤١٠٩، ٤١١٠

[2] صحيح بخاري: ح ٤٦٣، ٤١١٧ - صحيح مسلم: ح ١٧٦٩

"جب نبی مکرم ﷺ خندق سے واپس پہنچے، ہتھیار رکھ دیے اور غسل فرمایا تو حضرت جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: آپ نے ہتھیار رکھ دیے، لیکن اللہ کی قسم ہم نے ابھی ہتھیار نہیں رکھے ہیں لہٰذا ان کی طرف نکلیے۔ نبی معظم ﷺ نے پوچھا: کدھر؟ جبریل علیہ السلام نے کہا: یہاں اور بنوقریظہ کی طرف اشارہ کیا۔ اس طرح نبی کریم ﷺ بنوقریظہ کی طرف روانہ ہوئے۔"

اس حکم الٰہی پر عمل کرتے ہوئے رسول اکرم ﷺ صحابہ کرام کی ایک فوج لے کر بنوقریظہ کی بستی میں پہنچ گئے اور اس کا محاصرہ کرلیا جو ۲۵ دن جاری رہا۔ انہوں نے اس شرط پر اپنے آپ کو نبی مکرم ﷺ کے حوالہ کردیا کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کے حق میں جو فیصلہ بھی کردیں اسے وہ مان لیں گے۔ چنانچہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عین بیرونی حملے کے موقع پر ان کی بدعہدی کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کردیا کہ ان کے تمام مرد قتل کردیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے اور ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کردی جائے...... یہ سن کر نبی مکرم ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کے بارے میں فرمایا:

((قَضَيْتَ بِحُكْمِ اللّٰهِ))[1]

"تم نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔"

واضح رہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے بنوقریظہ کے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا موجودہ دور کی حکومتیں بھی ان خائنوں کے حق میں یہی فیصلہ کرتی ہیں جو ان کے دشمنوں سے مل جائیں۔

خیبر کے یہودیوں کی بیخ کنی:

اوپر غزوۂ خندق کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں ان سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ غزوۂ خندق میں مشرکین کو مدینہ پر چڑھائی کرنے کی ترغیب درحقیقت مدینہ کے یہودیوں کی سازش تھی اور انہوں نے ہی مدینہ میں مقیم بنوقریظہ کو غداری پر آمادہ کیا تھا۔ لہٰذا ان مفسدین اور سرکشوں کا صفایا ضروری تھا تاکہ جزیرۂ عرب کو یہودیوں کی شرانگیزیوں سے پاک کردیا جائے۔ یہاں یہ واضح کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خیبر کے یہودیوں نے اس وقت تک مسلمانوں کے خلاف کھل کر معاندانہ موقف اختیار نہیں کیا تھا جب تک بنونضیر کے سردار سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق اور حیی بن اخطب مدینہ سے جلاوطن

[1] صحيح بخاری: ح ٤١٢١۔ صحيح مسلم: ح ١٧٦٨

کیے جانے کے بعد وہاں جا کر آباد نہیں ہو گئے۔

صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں اور عربوں کے مابین کسی بڑی معرکہ آرائی کا خطرہ تقریباً ٹل گیا تھا لہٰذا اب رسول اکرم ﷺ اور آپ کے وہ جاں نثار جنہوں نے بیعت رضوان میں حصہ لیا تھا خیبر میں موجود یہودی مفسدین کو آخری سبق سکھانے کی طرف متوجہ ہوئے جو دراصل صلح حدیبیہ کا ثمرہ تھا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًاo وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًاo ﴾ [الفتح:۱۸، ۱۹]

''اللہ اس وقت مؤمنین سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔ اس کو ان کے دلوں کا حال معلوم تھا۔ اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی، ان کو انعام کے طور پر قریبی فتح بخشی اور بہت سا مال غنیمت انہیں عطا کر دیا جسے وہ حاصل کریں گے۔ اور اللہ زبردست قوت والا اور صاحب حکمت والا ہے''

اس زمانے میں مسلمانوں نے خیبر کو فتح کر لیا جہاں یہودیوں نے نہایت مضبوط قلع بنا رکھے تھے اور ان یہودی سرداروں کو قتل کر دیا جو عربوں کو مسلمانوں کے خلاف شہ دلانے اور اکسانے میں پیش پیش تھے۔ جیسے حی بن اخطب جو اس غزوہ سے پہلے ہی قتل کیا جا چکا تھا اور اسلام بن ابی الحقیق اور اسیر بن زارم وغیرہ۔ فتح خیبر کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فدک، وادی القری، تیما اور تبوک کی یہودی بستیاں زیر نگیں کر لیں۔

اوپر کے صفحات میں نبی کریم ﷺ کی بعثت سے لے کر غزوۂ خیبر تک یہودیوں کی شرانگیزیوں، دسیسہ کاریوں اور فتنہ و فساد کا جو سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے اس سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی کہ انہوں نے بعثت کے بعد سے غزوۂ خیبر تک دعوت اسلامی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے، حق کی آواز دبانے مسلمانوں کی بیخ کنی کرنے کے لیے عربوں کو مسلسل اکساتے رہنے اور رسول رحمت فداہ ابی وامی ﷺ کو شہید کرنے کی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی۔ اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے ان میں سے صرف انہی لوگوں کو موت کی سزا دی جو صرف شریعت اسلامی ہی نہیں بلکہ شریعت موسوی کے مطابق بھی اس کے مستحق تھے۔ ورنہ اکثر کو مدینہ سے جلاوطن کرنے پر اکتفا کیا اور اسلحوں کے سوا تمام ساز و سامان ساتھ لے جانے کی بھی آزادی دی۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب:

لیکن فتح خیبر کے بعد آغاز امر میں رسول اکرم ﷺ سے یہودی کی صلح اس شرط پر ہوئی تھی کہ آپ ان کی جان بخشی فرمائیں گے اور وہ اس علاقے کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے۔ لیکن صلح ہونے کے بعد جب زمین کے باقاعدہ بندوبست کا موقع آیا تو اہل خیبر نے آپ سے درخواست کی کہ:

آپ ہمیں یہیں رہنے دیں اور ہم سے معاملہ کرلیں۔ کیونکہ ہم زراعت اور نخلستان کے کام سے اچھی طرح واقف ہیں۔

نبی مکرم ﷺ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمالی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں خیبر کے ان یہودیوں کو بھی نکال دیا تو کیا یہ ان کے ساتھ ہونے والے معاہدے کی خلاف ورزی نہیں تھی؟

جواب: نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام نبی مکرم ﷺ کے فیصلے یا معاملے کے خلاف نہیں تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔

دراصل نبی کریم ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کے وہاں رہنے اور بٹائی پر ان کو وہاں کی زرعی زمینیں دینے کی جو منظوری دی تھی وہ اس بات سے مشروط تھی کہ جب تک اللہ ان کو وہاں باقی رکھنا چاہے گا وہ باقی رکھے جائیں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انہوں نے کوئی ایسی حرکت کی یا کسی ایسے جرم کا ارتکاب کیا جو وہاں سے ان کے اخراج کا موجب ہوگا تو وہاں سے ان کو نکال دیا جائے گا۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا ظَهَرَ عَلَى خَيْبَرَ، أَرَادَ إِخْرَاجَ الْيَهُودِ مِنْهَا وَكَانَتِ الْأَرْضُ حِينَ ظَهَرَ عَلَيْهَا لِلّٰهِ وَلِرَسُولِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلِلْمُسْلِمِينَ وَأَرَادَ إِخْرَاجَ الْيَهُودِ مِنْهَا، فَسَأَلَتِ الْيَهُودُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُقِرَّهُمْ بِهَا أَنْ يَكْفُوا عَمَلَهَا وَلَهُمْ نِصْفُ الثَّمَرِ، فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نُقِرُّكُمْ بِهَا عَلَى ذٰلِكَ مَا شِئْنَا))[1]

"......جب رسول اللہ ﷺ کو خیبر پر فتح ہوئی تو آپ نے وہاں سے یہودیوں کو نکال دینا چاہا اور جب آپ کو اس پر فتح ہوئی تو اس کی زمین اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کی

---

[1] صحیح بخاری: ح ۲۳۳۸، ۳۱۵۲۔ صحیح مسلم: ح ۱۵۵۱، (۳۹۶۵۔۳۹۶۷)

ملکیت ہوگئی۔ آپ نے یہ ارادہ فرمایا کہ یہودیوں کو وہاں سے نکال دیں، اس پر یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ان کو اس شرط پر برقرار رہنے دیں کہ زراعت کا کام وہ کریں گے اور آدھی پیداوار ان کی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ہم جب تک چاہیں گے وہاں تم کو برقرار رکھیں گے"

بعض روایتوں میں ہے:

((أُقِرُّكُمْ مَا أَقَرَّكُمُ اللّٰهُ))

"اللہ جب تک تم کو برقرار رکھنا چاہے گا میں تم کو برقرار رکھوں گا۔"

یہود خیبر کی شرانگیزیاں:

فتح خیبر پر ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ اہل خیبر کی ایک عورت نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک زہر آلود بکری بھیجی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: "جب خیبر فتح ہوا تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک بھنی ہوئی بکری کا تحفہ بھیجا گیا جو زہر آلود تھی۔"[1]

ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ یہ بکری زینب بنت حارث نے بھیجی تھی جو سلام بن مشکم کی بیوی تھی۔ اس نے پہلے یہ دریافت کرلیا تھا کہ نبی کریم ﷺ کو بکری کا کون سا حصہ زیادہ پسند ہے۔ اور جب اس کو بتایا گیا کہ آپ کو دستی زیادہ پسند ہے تو اس نے اس میں زہر زیادہ ملا دیا۔ اور جب آپ نے اس کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھ کر چبایا تو نگلنے کی بجائے اسے تھوک دیا اور فرمایا: یہ ہڈی مجھے بتا رہی ہے کہ وہ زہر آلود ہے[2]۔ اور صرف منہ میں رکھ کر اسے چبانے سے اس کا جو زہر آپ کے جسم مبارک میں پھیل گیا تھا اس کا اثر آپ اپنی زندگی کی آخری سانس تک محسوس کرتے رہے۔[3]

خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں وہ علانیہ بغاوت پر آمادہ ہوگئے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو سوتے میں پکڑ کر کوٹھے سے نیچے پھینک دیا جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((لَمَّا فَدَعَ أَهْلُ خَيْبَرَ عَبْدَاللّٰهِ ابْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، قَامَ عُمَرُ

---

[1] صحيح بخاري: ح ٣١٦٩، ٤٢٤٩، ٥٧٧٧

[2] سيرت ابن هشام: ص ٣٣٧، ٣٣٨، ج ٢

[3] صحيح بخاري: ح ٤٤٢٨

خَطِيبًا، فَقَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ عَامَلَ يَهُودَ خَيْبَرَ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَقَالَ: نُقِرُّكُمْ مَا أَقَرَّكُمُ اللَّهُ وَإِنَّ عَبْدَاللَّهِ بْنَ عُمَرَ خَرَجَ إِلَى مَالِهِ هُنَاكَ، فَعُدِيَ عَلَيْهِ مِنَ اللَّيْلِ، فَفُدِعَتْ يَدَاهُ وَرِجْلَاهُ، وَلَيْسَ لَنَا هُنَاكَ عَدُوٌّ غَيْرُهُمْ هُمْ، عَدُوُّنَا وَتُهْمَتُنَا، وَقَدْ رَأَيْتُ إِجْلَاءَهُمْ ...... فَأَجْلَاهُمْ عُمَرُ وَأَعْطَاهُمْ قِيمَةَ مَا كَانَ لَهُمْ مِنَ الثَّمَرِ، مَالًا وَإِبِلًا وَعُرُوضًا مِنْ أَقْتَابٍ وَحِبَالٍ وَغَيْرِ ذَلِكَ))[1]

''جب اہل خیبر نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر کے ساتھ ان کے اموال پر معاملہ کیا تھا اور فرمایا تھا: جب تک اللہ تم لوگوں کو برقرار رکھے گا ہم تمہیں برقرار رکھیں گے۔ عبد اللہ بن عمر وہاں اپنی جائداد کی دیکھ بھال کے لیے گئے تو رات میں ان پر حملہ کر کے ان کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے گئے۔ درآنحالیکہ وہاں ان کے علاوہ ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے۔ وہی ہمارے دشمن ہیں اور انہیں پر ہم الزام لگا سکتے ہیں۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ ان کو جلا وطن کر دیا جائے...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو جلا وطن کر دیا اور ان کی زرعی پیداوار کی قیمت، مال، اونٹ دیے گئے اور رہٹ کا معاوضہ اور رسیاں وغیرہ دی گئیں''

اس حدیث سے وہ سبب بالکل واضح ہو گیا جس کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خیبر کے یہودیوں کو وہاں سے جلا وطن کیا تھا۔ دراصل ان کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد عدل ہے کہ انہوں نے کبھی کسی عہد کا پاس نہیں کیا۔ جو بھی ہاتھ ان کی جانب خیر و بھلائی کے ساتھ بڑھا اسی کو انہوں نے پہلے کاٹا یا کاٹنے کی کوشش کی۔

اب آیئے ان وضاحتوں کی روشنی میں سورۃ الاسراء کی پانچویں آیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہود کا پہلا فساد:

﴿ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُولَىٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَٰلَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝ ﴾ [الاسراء:۵]

[1] صحیح بخاری: ح ۲۷۳۰

"پس جب ان میں سے پہلے فساد اور سرکشی کا وقت موعود آئے گا تو ہم تمہارے خلاف اپنے ایسے بندے اٹھائیں گے جو نہایت زور آور ہوں گے اور تمہارے گھروں اور شہروں میں پھیل جائیں گے۔ یہ ایسا وعدہ ہے جسے پورا ہو کر رہنا ہے"

اس آیت مبارکہ کی واقعاتی تفسیر یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد غیر مسلم برادری کے طور پر یہودیوں کے ساتھ جو امن معاہدہ کیا تھا اور جس کے بموجب ان کو تمام شہری حقوق دیے تھے انہوں نے اس معاہدے کو توڑ دیا۔ اس معاہدے کو توڑنے میں ان کے جس قبیلے نے پہل کی وہ بنو قینقاع تھا جو مدینہ کے اندر ایک محلے میں آباد تھا۔ یہ قبیلہ لوہاری، سوناری اور ظروف سازی کا کام کرتا تھا۔ یہ یہودی اس قدر دلیر اور جری ہو گئے تھے کہ اپنے بازار میں آنے والے مسلمان پر دست درازی کرتے اور مسلم خواتین کو چھیڑتے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن انہوں نے ایک مسلمان عورت کو سر عام برہنہ کر دیا۔ جس پر ان کے اور مسلمانوں کے مابین سخت جھگڑا ہو گیا۔ جس میں ایک مسلمان اور ایک یہودی قتل ہو گیا[۱]۔ ۲ ہجری میں ہونے والے غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی فتح کے بعد انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے گستاخیاں شروع کر دیں اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ قریش لڑنا نہیں جانتے تھے اس لیے تم ان پر غالب آ گئے۔ اگر ہم سے سابقہ پیش آئے گا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔[۲] گویا اس طرح انہوں نے اعلان جنگ کر دیا۔ لہٰذا رسول اکرم ﷺ نے ان کو مدینہ سے جلاء وطن کر دیا۔[۳]

رہے بنو نضیر تو اوپر گزر چکا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا ان کو بھی مدینہ منورہ سے نکال دیا گیا۔

رہے بنو قریظہ تو غزوۂ خندق تک انہوں نے نبی مکرم ﷺ کے معاہدہ کا پاس کیا لیکن عین اس وقت جب مشرکین کا لشکر جرار مدینہ پر حملہ آور ہوا تو وہ یہ معاہدہ توڑ کر حملہ آور دشمن سے مل گئے۔ لہٰذا اس غزوہ کے اختتام پر ان غداروں کو یہ سزا دی گئی کہ ان کے مردوں کو قتل کر دیا گیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا گیا۔

رہے اہل خیبر تو صلح حدیبیہ کے بعد ان سرداروں کو قتل کر دیا گیا جو وہاں بیٹھ کر مسلمانوں کے خلاف منصوبے بناتے تھے۔ انہوں نے ہی قریش مکہ اور دوسرے عرب قبائل کو مدینہ پر چڑھائی کے لیے اکسایا تھا۔

---

[۱] سیرت ابن هشام: ص ٤٧، ج٢ — [۲] سنن ابوداؤد: ح ٣٠٠١

[۳] صحيح بخاری: ح ٤٠٢٨۔ صحيح مسلم: ح ١٧٦٦

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہ جاتا کہ مذکورہ آیت مبارکہ میں یہودیوں کے پہلے فساد فی الارض اور سرکشی سے مراد ان کی مذکورہ بدعہدیاں، دسیسہ کاریاں، غداریاں اور خیانتیں ہیں۔

اور آیت مبارکہ "عبادا لنا" سے مراد نبی مکرم ﷺ اور مسلمان ہیں جو مدینہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل وتوفیق سے زور آور ہو چکے تھے۔ ان کو اللہ کے دشمنوں پر غلبہ واقتدار حاصل ہو چکا تھا۔

اور "عِبَادًا لَّنَا" کی اس قرآنی تعبیر میں اللہ تعالیٰ اور اس کے صالح بندوں کے درمیان پائے جانے والے جس تعلق اور جس اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے اس کو اہل زبان محسوس کر سکتے ہیں۔ ''لام اضافت...... ''لنا'' کے اظہار نے اس تعلق اور اپنائیت کو مزید واضح کر کے اللہ تعالیٰ کے لیے ان کی صفت ''عبدیت'' کو نمایاں کر دیا ہے۔

اس وضاحت کے تناظر میں بخت نصر اور اس کی مفسد فوج پر "عِبَادًا لَّنَا" کا اطلاق کس قدر خلاف واقعہ ہے؟

فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ سے نبی اکرم ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ کے ان اعمال کی کھلی عکاسی ہوتی ہے جو انہوں نے مدینہ کے صالح اور پر امن معاشرے کو یہودی مفسدین، تخریب کاروں اور غداروں سے پاک کرنے کے لیے انجام دیے۔

جَاسَ يَجُوْسُ جَوْسًا کے معنی ہیں: ادھر ادھر پھیل جانا، تتبع کرنا، ٹوہ لگانا اور لوگوں میں گھس جانا۔

آیت مبارکہ کے مذکورہ فقرے کا مطلب ہے: اللہ کے بندے گھروں، محلوں اور شہروں میں گھس گھس کر یہودیوں کا تتبع اور تعاقب کر کے ان میں سے کچھ کو قتل، کچھ کو قید اور کچھ کو جلاء وطن کریں گے۔

یہ فقرہ بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا..... پر عطف ہے جو ''فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰهُمَا'' کا دوسرا جواب ہے۔ اور "اذا" جب فعل ماضی پر داخل ہوتا ہے تو اس کو مستقبل کے معنی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس طرح: جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت یہ ایک وعدہ تھا جو دعوت اسلامی کے مدنی عہد میں پورا ہوا۔ اور جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے کہ اس آیت مبارکہ میں قریب یا دور سے بھی رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد میں یہ صراحت نہیں ملتی ہے کہ ''الدیار'' سے مراد بیت المقدس ہے۔

اسی طرح مذکورہ آیت میں ''مسجد اقصیٰ'' میں ''اللہ کے بندوں'' کے داخلے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ مفسرین نے آیت نمبر ۷ کے فقرے ''كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ'' سے زبردستی یہ مفہوم نکالنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ''مسجد اقصیٰ'' میں اپنے بندوں کے آخری داخلے کو پہلے داخلے سے تشبیہ دی ہے

اور پہلا داخلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوا۔ جو اپنی اسلامی فوج کے ساتھ وہاں داخل ہوئے۔ یہ داخلہ فاتحانہ تو ضرور تھا مگر مفسدانہ اور تخریب کارانہ نہ تھا۔ بلکہ مسلمانوں نے اپنی طویل فتوحات کے دور میں کسی بھی آبادی اور شہر میں فساد نہیں مچایا اور نہ کوئی تخریب کاری کی۔ جس کے معترف غیر مسلم مؤرخین بھی ہیں۔

جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس میں داخل ہوئے اس وقت اس پر یہود کا نہیں عیسائیوں کا قبضہ تھا۔ یہودیوں نے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ پر ۵ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کیا ہے اور اس وقت سے اب تک یہ انہی کے قبضے میں ہیں۔ جب ''اللہ کے بندے'' آخری بار بیت المقدس میں داخل ہوں گے تو اس وقت بھی وہ یہودیوں کے قبضے میں ہی ہوگا اور مسلمانوں کے ہاتھوں ہی ان کا وہاں سے خاتمہ ہوگا۔

آخری بار ''اللہ کے بندوں'' کے بیت المقدس میں داخل ہونے سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے اور پھر داخل ہوں گے۔ کیونکہ کسی جگہ دوبارہ داخل ہونا اس جگہ سے نکلنے کا متقاضی ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ آیات نمبر ۵ اور ۷ میں فَجَاسُوْا، لِيَسُوْءُا، لِيَدْخُلُوْا، دَخَلُوْا..... اور لِيُتَبِّرُوْا کی فاعل ضمیروں کا مرجع ''عِبَادًا لَّنَا'' ہی ہے جس پر سیاق دلالت کرتا ہے۔ چھٹی آیت:

﴿ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ ﴾ [الاسراء:٦]

''پھر ہم تمہاری باری ان پر لوٹا دیں گے اور مال و اولاد سے تمہاری مدد کریں گے اور تمہیں زیادہ تعداد والے بنا دیں گے''

کے مخاطب یہود ہیں اور جن پر ان کی باری لوٹا دینے کا وعدہ فرمایا گیا ہے وہ ''عِبَادًا لَّنَا'' ہیں۔ جن کا ذکر پانچویں آیت میں آیا ہے اور باری لوٹا دینے سے مراد غلبہ دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں کو ان پر غلبہ اور برتری حاصل ہو جائے گی۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ ''عبادا لنا'' سے مراد مخصوص صفات سے متصف لوگ ہیں نہ کہ ہر حملہ کرنے والا۔ اور یہ صفات سورۃ الفرقان کی آیات ۶۳ تا ۷۴ میں تفصیل سے بیان ہوئی ہیں جن کو اگر کسی ایک صفت میں جمع کیا جا سکتا ہے تو وہ صفت ایمان ہے۔ جس سے متصف بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے غلبہ اور سر بلندی کا وعدہ فرمایا ہے:

﴿ وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ [آل عمران:۱۳۹]

''اور نہ تم دل شکستہ ہو اور نہ غم کرو۔ تم ہی غالب رہو گے اگر تم مؤمن ہو''

مطلب یہ ہے کہ جب تک تم صفت ایمان سے متصف رہو گے اس وقت تک غلبہ اور سر بلندی سے بہرہ مند رہو گے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جس وقت یہودیوں کو مسلمانوں پر غلبہ حاصل ہوگا اس وقت ان کے اندر ایمان کی روح مطلوبہ شکل میں باقی نہ ہوگی۔ اس بات کو رسول اکرم ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں پوری طرح واضح فرما دیا ہے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يُوْشِكُ الْأُمَمُ أَنْ تَدَاعَى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلَى قَصْعَتِهَا، فَقَالَ قَائِلٌ: وَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: بَلْ أَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ، وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ، وَلَيَنْزِعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ وَلَيَقْذِفَنَّ اللّٰهُ فِي قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنَ۔ فَقَالَ قَائِلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْوَهْنُ؟ قَالَ: حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ))[1]

''جس طرح کھانے والے ایک دوسرے کو اپنے دستر خواں کی طرف دعوت دیتے ہیں اسی طرح عنقریب ایسا ہوگا کہ قومیں تم پر ہلہ بول دیں گی۔ ایک شخص نے سوال کیا: کیا ایسا ہماری قلت تعداد کی وجہ سے ہوگا؟ فرمایا: نہیں۔ بلکہ تم اس وقت تعداد میں بہت زیادہ ہو گے، لیکن تم سیلاب کے جھاگ کی مانند جھاگ ہو گے اور اللہ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت اور رعب نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں ''وہن'' (کمزوری اور بزدلی) ڈال دے گا۔ سوال کرنے والے نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہن کیا ہے؟ فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔''

یہ حدیث پاک ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس ذلت و پستی اور ضعف و شکست خوردگی کو دیکھا جا سکتا ہے جس سے مسلمان تقریباً پچھلی ایک صدی سے دوچار ہیں۔ اور غیر مسلموں میں ان کی کوئی وقعت اور کوئی اعتبار نہیں رہا ہے۔ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تمام دنیوی نعمتوں سے بہرہ ور ہیں۔ اسی طرح یہ حدیث مسلمانوں کے دشمنوں کی بھی حقیقی تصویر پیش کر رہی ہے جو اپنے تمام مذہبی اور نسلی اختلافات کو بھلا کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف متفق ہو چکے ہیں اور مسلمانوں کو اپنے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح نچا رہے ہیں۔

---

[1] سنن ابو داؤد: ح ٤٢٩٧

حدیث پاک میں دنیا کی جس محبت کو مسلمانوں کی کمزوری اور بزدلی کا سبب قرار دیا گیا ہے وہ دنیا پرستی ہے۔ اس سے دنیا اور دنیاوی اسباب سے استفادہ کرنا مراد نہیں ہے۔ اسلام نے اس دنیا سے متعلق مومن کو جو تعلیمات دی ہیں وہ یہ کہ اس دنیا کو آخرت کے لیے ایک گزرگاہ سمجھے۔ اس میں غرق ہونے کے بجائے دنیوی متاع کو اس طرح استعمال کرے جس طرح ایک مسافر کسی شہر اور ملک سے گزرتے ہوئے وہاں کی چیزوں کو استعمال کرتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ))[1]

"دنیا میں ایک اجنبی یا مسافر کی طرح رہو"

جب تک مسلمان اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا، ایمان اور عمل صالح سے متصف، اتحاد و اتفاق پر قائم، اور دنیا میں غلبہ و اقتدار کے اسباب پر عمل کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے دشمنوں پر غالب رکھا۔ کیونکہ اس کا یہ وعدہ ہے۔ فرمایا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ﴾ [النور:٥٥]

"اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور جو نیک عمل کریں یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو خلیفہ بنا چکا ہے۔ ان کے لیے ان کے اس دین کو غلبہ عطا کرے گا جسے اس نے ان کے حق میں پسند فرما لیا ہے اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ لہٰذا وہ صرف میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو وہی لوگ فاسق ہیں"

یہ آیت اپنے مفہوم میں اس قدر واضح اور مسلمانوں کے روشن ماضی سے اس کی اس طرح تائید ہوتی ہے کہ مزید کسی توضیح کی محتاج نہیں ہے۔

بنو اسرائیل کا دوسرا اور آخری فساد:

دعوت اسلامی کو ناکام بنانے اور اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے یہودیوں نے

[1] صحیح بخاری: ح ٦٤١٦

اسی وقت اپنی کوشش شروع کر دی تھیں جب ابھی اس کا آغاز ہوا تھا۔ مگر یہ دعوت برگ و بار لاتی گئی یہاں تک کہ اس کی آواز مدینہ تک پہنچ گئی۔ اور جب رسول اکرم ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تو مدینہ کے تینوں یہودی قبیلے رسول اکرم ﷺ اور مسلمانوں کو نیچا دکھانے اور مدینہ کی اسلامی ریاست کو ختم کر دینے کے لیے متحد ہو گئے۔ مگر اپنی سازش کا نتیجہ انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کا ایک قبیلہ بنو قینقاع تو بالکل تباہ ہو گیا اور دو قبیلوں کو جلاوطن ہونا پڑا۔ پھر وہ سازشیں کر کے عرب کے بہت سے قبیلوں کو مدینے پر چڑھا لائے۔ لیکن ان کو اور عربوں کو عبرتناک شکست ہوئی تھی ایسی شکست کہ جس کے بعد کفار کو پھر مدینہ پر لشکر کشی کی جرأت نہ ہوئی۔

غزوۂ احزاب کے بعد رسول اکرم ﷺ اور مسلمانوں نے بنو قریظہ کو ان کی بدعہدی اور غداری کا سبق سکھایا اور ان کا خاتمہ کر دیا۔ اب صرف خیبر میں یہودی رہ گئے تھے جو دراصل مدینہ سے نکالے جانے کے بعد وہاں جمع ہو گئے تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے ان کے اس آخری گڑھ پر حملہ کر کے ان کے شر پسند عناصر کا خاتمہ کر دیا اور جو یہودی بچ گئے وہ مسلمانوں کے کاشت کاروں کی حیثیت سے وہاں رہنے پر راضی ہو گئے۔ خیبر کی فتح کے بعد وادی القری، فدک، تیما اور تبوک وغیرہ میں جو یہودی آباد تھے انہوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح عرب کے وہ تمام یہودی اس اسلام کی رعایا بن کر رہ گئے جس کے وجود کو برداشت کرنا تو درکنار جس کا نام تک سننا ان کو گوارا نہ تھا۔

اس کے بعد مسلمانوں کی طویل تاریخ میں یہودیوں نے سر نہیں اٹھایا بلکہ مسلمانوں کی رعایا بن کر زندگی گزارتے رہے۔ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ پر پھیلا ہوا یہ زمانہ یہودیوں کے لیے سب سے پر امن زمانہ مانا جاتا ہے جس میں ان کی جان و مال کو وہ تحفظ حاصل رہا جو ان کی تاریخ میں ان کو کبھی بھی حاصل نہ رہا تھا مسلمانوں کے زیر سایہ وہ خوب پھولے پھلے۔ مشہور یہودی مؤرخ اور صحافی یوری افنیری لکھتا ہے:

......اسلامی عہد میں یہودیوں پر دین محمد ﷺ کو تھوپنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اسپین میں مسلمانوں کے زیر اقتدار یہودیوں نے جو عروج حاصل کیا یہودیوں کی زندگی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حتیٰ کہ ہمارے اس زمانے میں بھی ان کو وہ عروج حاصل نہیں ہے۔ ''یہودا ھلیفی'' جیسے شعراء عربی زبان میں شعر کہتے تھے۔ اسی طرح حاخام موشیہ بھی میمون بھی عربی میں لکھتا تھا۔ مسلم ملک اندلس میں یہودی وزیروں، شاعروں اور عالموں کی کثرت تھی۔ ہر صاحب ''استقامت'' یہودی جو اپنی قوم کی تاریخ کا علم رکھتا ہو وہ اسلام کے فضل و احسان کا انکار نہیں کر سکتا۔ جس اسلام نے ۵۰ نسلوں تک یہودیوں کو تحفظ

فراہم کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائی دنیا یہودیوں کا تعاقب کر رہی تھی اور ان کو تلوار کی دھار پر اپنا مذہب بدلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اور جب کیتھولک عیسائیوں نے اسپین پر قبضہ کر لیا تو وہاں انہوں نے مذہبی دہشت گردی کا جال پھیلا دیا۔ یہودی اور مسلمان دونوں کے سامنے دو راستوں کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا: یا تو عیسائی مذہب قبول کر لیں یا مرنے یا ملک سے فرار ہونے پر تیار ہو جائیں۔ اور جن لاکھوں یہودیوں نے اپنا مذہب بدلنے سے انکار کر دیا وہ کہاں گئے؟ ان سب کو ایک ایک کر کے مسلم ملکوں میں پناہ دی گئی۔ اندلس سے بھاگنے والے یہ یہودی مغرب عربی، عراق، ترکوں کے زیر حکم بلغاریا اور سوڈان میں آباد ہوئے۔ ان ملکوں میں مذہب کی بنیاد پر ان کا تعاقب نہیں کیا گیا۔ ان کے ساتھ کوئی نسلی امتیاز نہیں برتا گیا۔ جبکہ بیشتر عیسائی ملکوں میں مقدس یسوع مسیح کے نام سے ان کو ذبح کیا جاتا رہا۔[1]

لیکن یہودی دراصل ایک ایسی احسان فراموش قوم ہے کہ اس نے اسی ہاتھ کو کاٹا جو اس کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور انہی لوگوں سے غداری کی اور انہی کے درپہ آزار ہوئی جنہوں نے اس کے ساتھ حسن سلوک کیا۔ پچھلی تیرہ چودہ صدیوں میں یہودیوں کو اگر کہیں امن نصیب ہوا تو صرف مسلمان ملکوں میں ہوا۔ اور جو یہودی عیسائی ملکوں میں رہے ان کو وہاں ہمیشہ ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ مگر ایک وقت ایسا آیا کہ انہی عیسائیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے انہوں نے فلسطین میں اپنی مذہبی حکومت ''اسرائیل'' قائم کی جہاں ہزاروں سال سے عرب آباد تھے۔ ۱۹۱۷ء میں رسوائے زمانہ اعلان بالفور کے بعد سے فلسطین میں دنیا کے گوشے گوشے سے یہودیوں کو لا کر بسایا جانے لگا۔ اور اس کے اصل باشندوں کو وہاں سے مختلف حیلے بہانوں سے نکالنے اور بے دخل کرنے کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد جاری کر کے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں میں تقسیم کر دیا۔ اس ظالمانہ بندر بانٹ کے ذریعہ فلسطین کا ۵۵ فیصد رقبہ یہودیوں کو اور ۴۵ فیصد رقبہ وہاں کے اصل باشندوں، عربوں کو دے دیا گیا۔ مگر یہودی اس ظالمانہ تقسیم پر بھی راضی نہ ہوئے۔ بلکہ عربوں کو مار دھاڑ اور قتل و غارت گری کے ذریعہ وہاں سے نکالنا، ان کی زمینوں اور گھروں پر قبضہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

اس کے علاوہ فلسطین میں یہودیوں نے معصوم انسانوں کے خون کی جو ہولی کھیلی اور ان کا جس طرح قتل عام کیا وہ ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں پر کیے جانے والے مظالم سے زیادہ روح فرسا تھے۔ دیر یاسین، بحر البقر، رام اللہ اور غزہ میں فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا۔ جس کا سلسلہ یورپی ملکوں، خاص طور

[1] سعودی روزنامہ ''الوطن'' ۲۹ رمضان ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۱/ اکتوبر ۲۰۰۶ء

پر امریکہ کے اشاروں اور اس کے آشیر واد سے جاری ہے۔
۵ جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل نے مکمل بیت المقدس، مسجد اقصیٰ، اردن کے اہم حصوں، شام کے پہاڑی علاقے جولان اور مصر کے صحرائے سینا پر قبضہ کر لیا۔
اوپر کی وضاحتوں کی روشنی میں سورۃ الاسراء کی ساتویں آیت پر غور کیجیے جس میں بنو اسرائیل کے دوسرے اور آخری فساد اور اس کے انجام کی خبر دی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَاط فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ﴾ [الاسراء:۷]

''اگر تم بھلائی کرو گے تو اپنے لیے اور اگر برائی کرو گے تو وہ بھی اپنے لیے۔ پس جب آخری فساد کا وقت موعود آئے گا (تو ہم تمہارے خلاف اپنے بندوں کو اٹھائیں گے) تا کہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد میں اسی طرح...... فاتحانہ...... داخل ہوں جس طرح پہلی بار داخل ہوئے تھے۔ اور ان (یہود) کی سرکشی کے مظاہر کو تباہ و برباد کر دیں''

ساتویں آیت کی تشریح:

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ کے...... بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ...... محذوف ہے۔ جس پر سیاق و سباق دلالت کرتا ہے۔

''مَا عَلَوْا'' کی ضمیر مرفوع کا مرجع ''بنو اسرائیل'' ہے۔ کیونکہ چوتھی آیت میں ان کے افساد فی الارض اور سرکشی دو چیزوں کا ذکر ہے۔ لیکن خطاب ''عَلَوْتُمْ'' کی بجائے غائب ''عَلَوْا'' کا اسلوب اس لیے اختیار کیا گیا ہے کیونکہ ان کی بڑائی، تکبر اور سرکشی کے مظاہر خود ان کے ہاتھوں وجود میں نہیں آئے ہیں۔ بلکہ ان کے آقاؤں اور حامیوں کے تعاون سے وجود میں آئے ہیں۔ ان کی قبل از اسلام کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ وہ کبھی اپنے بل بوتے پر سر بلند نہیں ہوئے۔ اور اگر ان کو کبھی امن و سکون حاصل رہا تو یا تو اللہ کے ذمہ میں۔ یعنی یا تو مسلمانوں نے اللہ کے نام پر ان کو امان دی یا دوسروں کی حمایت میں رہے۔ (آل عمران:۱۱۲)

تَبَّرَ يُتَبِّرُ کے معنی ہیں ''تباہ و برباد کر دینا، مٹا دینا۔'' مطلب ہے کہ یہودی فلسطین میں اپنے آقاؤں کی مدد سے اپنی سرکشی اور سر بلندی کے جو مظاہر قائم کریں گے وہ اللہ کے بندوں کے ہاتھوں تباہ و

برباد کر دیے جائیں گے۔

بنواسرائیل کے پہلے فساد کی پاداش میں ان کی جو تباہی ہوئی اس کو صرف ایک فقرے ''فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَار''..... وہ گھروں اور شہروں میں پھیل جائیں گے، میں بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کیونکہ پہلی بار انہوں نے ابھی سر اٹھایا ہی تھا کہ پیس ڈالے گئے۔

لیکن اپنے آخری فساد کے موقع پر چونکہ ان کو بڑا عروج حاصل ہو جائے گا۔ سیاسی، اقتصادی اور فوجی اعتبار سے وہ اپنے ہمسایہ ملکوں پر بے پناہ برتری حاصل کرلیں گے اس لیے ان کی تباہی اور بربادی اسی کے شایان شان ہوگی۔

اس آیت کو سمجھنے کے لیے اسی سورت کی آیت نمبر ۱۰۴ کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًاؕ ﴾ [الاسراء:١٠٤]

''اور کہا ہم نے اس کے بعد بنواسرائیل سے کہ بس جاؤ زمین میں پس جب آئے گا آخری فساد کا وقت موعود تو لائیں گے ہم تم کو اکٹھا کرکے''

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنواسرائیل سے یہ بات فرمائی۔

عام طور پر مفسرین نے یہاں ''الارض'' سے بیت المقدس کو مراد لیا ہے۔ حالانکہ اس کے ساتھ کوئی ایسی صفت نہیں آئی ہے جو بیت المقدس پر دلالت کرتی ہو۔ جبکہ قرآن کریم میں اس طرح کے مواقع پر جب کسی خاص خطہ زمین کو مراد لیا گیا ہے تو اس کے ساتھ اس کی صفت بھی لائی گئی ہے۔ جیسے "الارض المقدسة" لیکن یہاں مطلق ''الارض'' کا ذکر آیا ہے۔ لہٰذا کوئی خاص خطہ زمین مراد لینے کی کوئی وجہ نہیں۔

اسی طرح مفسرین نے ''وَعْدُ الْاٰخِرَةِ'' سے آخرت کا وعدہ مراد لیا ہے۔ یعنی اس دنیا کے بعد آنے والی زندگی جو دو وجہوں سے صحیح نہیں ہے۔

(۱) ......وَعْدُ الْاٰخِرَةِ کی تعبیر قرآن پاک میں صرف دو بار آئی ہے اور دونوں بار اس کا تعلق صرف بنواسرائیل سے ہے۔ پہلی بار ان کے آخری فساد کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے یہ تعبیر آئی ہے۔

اور دوسری بار یہاں یہ بیان کرنے کے لیے یہ تعبیر استعمال کی گئی ہے کہ جب ان کے آخری ''افساد فی الارض اور سرکشی'' کا وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ ان کو زمین کے ہر حصے سے سمیٹ کر یہاں ارض فلسطین میں لے آئے گا۔ اور واقعتاً ایسا ہو بھی رہا ہے کہ دنیا کے ہر حصے سے یہودیوں کو لا لا کر یہاں بسایا جا رہا ہے۔

(۲) وَعْدُ الْاٰخِرَۃِ...... کی تعبیر قرآن پاک میں ''یوم آخرت'' کے لیے کہیں بھی استعمال نہیں ہوئی ہے۔ مزید یہ کہ اس موقع ومحل میں بنواسرائیل کو یوم آخرت میں اکٹھا کرنے کی بات بالکل غیر منطقی سی ہے۔ اور پھر ان کے لیے اس تخصیص کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے کیونکہ آخرت کے روز تو تمام بنی نوع انسان کو ان کی قبروں سے نکال کر میدان حشر میں جمع کیا جائے گا۔

مزید یہ کہ دور فتن سے متعلقہ متواتر صحیح احادیث سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان آخری اور فیصلہ کن معرکہ ارض فلسطین میں ہوگا۔ جس مسیح موعود کے انتظار میں انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا ہے اور اپنے زعم باطل میں انہوں نے ان کو سولی دے دی ہے وہی حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں نازل ہوکر ان کے جھوٹے مسیح، مسیح دجال...... سے اس سرزمین کو پاک کریں گے۔

قول فیصل:

قرآن پاک میں جس نبی کا سب سے زیادہ ذکر آیا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور جس قوم کے فکری وعقائدی انحراف اور بدعملی کا سب سے زیادہ تذکرہ کیا گیا ہے وہ یہود ہیں۔ قرآن پاک میں یہود کو من حیث القوم ''نمونہ شر'' کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے معدودے چند افراد کے سوا پوری قوم تاریخ کے ہر دور میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی مرتکب رہی ہے۔

سورۃ الفاتحہ میں، جو درحقیقت ایک دعا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے مؤمن اور صالح بندوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اس سے سیدھے راستے کی طلب کرتے رہیں جو اس کے ان بندوں کا راستہ رہا ہے۔ جن پر اس نے ان کے صحیح عقیدہ وعمل کی وجہ سے ہمیشہ انعام فرمایا ہے۔ اور ان لوگوں کی راہ سے دور رہنے کے لیے اس سے توفیق اور مدد کی درخواست کرتے رہیں جن پر اس کا غضب ٹوٹا ہے یا جنہوں نے ہدایت کی بجائے گمراہی اختیار کی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَo صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ط غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَo ﴾ [البقرة:٥، ٦، ٧]

''ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے۔ ان کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ٹوٹا ہے اور جو گمراہ ہیں''

اس آیت مبارکہ میں ''اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' سے مراد یہود ہیں۔ جس کی قرآن پاک کی دوسری

آیتوں میں صراحت ہے۔ سورۃ المائدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ط مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ط اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ○ ﴾ [المائدہ:٦٠]

''اے نبی کہہ دو، کیا میں تمہیں اللہ کے ہاں ان سے زیادہ برے انجام والوں کی خبر دوں، وہ جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر وہ غضب ناک ہوا اور جن میں سے اس نے کچھ کو بندر اور سور بنا دیا اور جنہوں نے طاغوت کی بندگی کی۔ یہ اپنے درجے کے اعتبار سے زیادہ برے اور سیدھی راہ سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں''

بنواسرائیل یا یہود کی صفت ''مغضوب علیہم'' اس لیے قرار دی گئی ہے کیونکہ انہوں نے اپنی تاریخ کے ہر دور میں حق کو، حق جانتے ہوئے ٹھکرایا اور اللہ کے رسولوں کو یہ جانتے ہوئے قتل کیا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں...... سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اللہ تعالیٰ کو بری صفات سے موصوف کیا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ط غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ط بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ○ ﴾ [المائدہ:٦٤]

''یہودیوں نے کہا: اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ باندھے گئے ان کے ہاتھ۔ اور اپنی بیہودہ گوئی کے باعث وہ ملعون قرار دیے گئے۔ بلکہ اللہ کے ہاتھ تو کھلے ہوئے ہیں وہ جس طرح چاہتا، خرچ کرتا ہے''

سورۃ البقرہ میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے ''اللہ کی راہ میں'' انفاق کو ''قرض حسن'' سے تعبیر فرمایا اور اس کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً وَ اللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ ﴾ [البقرۃ:٢٤٥]

''کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس کرے۔ اللہ ہی گھٹاتا اور بڑھاتا ہے۔ اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے''

اس ارشاد الٰہی کا مذاق اڑاتے ہوئے یہودیوں نے کہا: نعوذ باللہ، اللہ فقیر محتاج...... ہے اور ہم غنی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ۝ ﴾ [آل عمران:۱۸۱]

''درحقیقت اللہ نے ان لوگوں کا قول سنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ ان کی یہ بات ہم لکھ لیں گے اور اس سے پہلے جو وہ نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامہ اعمال میں ثبت ہے اور فیصلہ کے دن ہم ان سے کہیں گے: چکھو عذابِ جہنم کا مزا''

اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ گندی بات وہ لوگ کہتے تھے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ نبیوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اللہ کے چہیتے ہیں۔

ایک بڑی عجیب بات ہے کہ ان کے بارے میں قرآن پاک کی یہ آیتیں نازل ہوتی تھیں اور وہ مسلمانوں سے ان کو سنتے تھے لیکن اس کا انکار نہیں کرتے تھے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلوب بالکل مسخ ہو چکے تھے اور ان کے عقائد مشرکین سے بھی زیادہ خراب ہو چکے تھے۔

قرآن پاک میں جن سابق قوموں کا ذکر آیا ہے ان میں ہمیشہ عقائدی اور عملی بگاڑ ان کے انبیاء اور رسولوں کی وفات کے بہت بعد میں پیدا ہوا سوائے بنو اسرائیل کے۔ وہ اپنے جن نبیوں اور رسولوں پر ایمان لاتے ان کی زندگی ہی میں معاصی کا ارتکاب کرتے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہایت گندے اور نازیبا کلمات کہتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فرعون کی غلامی سے نجات دی اور ان کے سامنے فرعون اور اس کے تمام لاؤ لشکر کو غرق کر دیا۔ لیکن جب انہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ارض مقدس، فلسطین میں داخل ہونے کا حکم دیا اور ان سے فرمایا کہ یہ سرزمین اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ: وہاں تو بڑے زور آور لوگ ہیں۔ جب تک وہ وہاں سے نہیں نکلیں گے ہم اس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے۔ چنانچہ کہنے لگے:

﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۝ ﴾ [المائدہ:۲٤]

''تم اور تمہارا رب دونوں جاؤ اور لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے''

قرآن پاک یہ صراحت کرتا ہے کہ اس موقع پر ان میں سے صرف دو آدمیوں نے ان کے اس بزدلانہ موقف کی نکیر کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ان لوگوں میں شمار کیا ہے جو اس سے ڈرتے تھے اور جن کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا۔ مگر انہوں نے اللہ کے ان صالح بندوں کی نصیحت بھی نہیں مانی جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پکار اٹھے:

﴿ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ۝ ﴾

[المائدہ:۲۵]

''موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! میں تو صرف اپنی ذات اور اپنے بھائی پر اختیار رکھتا ہوں پس تو ہمارے اور ان فاسقوں کے درمیان تفریق کردے''

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمالی اور اس ارض مقدس کو چالیس سال تک کے لیے ان پر حرام کر دیا۔ ان کو زمین میں ایسا کر دیا کہ وہ مارے مارے اور سرگرداں حالت میں پھرتے رہیں۔

وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول جانتے ہوئے اذیتیں دیتے تھے اور یہ نہیں سوچتے تھے کہ ان کے اس عظیم محسن نے ان کے ساتھ کیا کیا احسانات کیے ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چیخ اٹھے:

﴿ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ۝ ﴾ [الصف:۵]

''اے میری قوم کے لوگو! تم لوگ کیوں مجھے اذیت دیتے ہو حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں''

اپنے عظیم اور محسن رسول کے ساتھ یہودیوں کے اس اذیت ناک موقف کا ذکر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ درس دینے کے لیے کیا ہے کہ وہ اپنے نبی کے ساتھ ایسی روش نہ اختیار کریں جو یہودیوں نے اپنے نبی کے ساتھ اختیار کی تھی۔ ورنہ ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو یہودیوں کا ہو چکا ہے۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہودیوں کی روش اختیار کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے سے بصراحت منع فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰی فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِیْهًا۝ ﴾ [الاحزاب:۶۹]

''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ان لوگوں کی طرح مت بنو جنہوں نے موسیٰ کو اذیت دی تھی، پس اللہ نے ان کے الزامات سے اس کو بری فرمایا اور وہ اللہ کے نزدیک بڑا عالی مرتبت تھا''

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غنیمت کا مال تقسیم فرمایا۔ ایک انصاری نے کہا: اللہ کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر اس تقسیم سے اللہ کی خوشنودی نہیں ہے۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اس بات سے مطلع کر دیا۔ جسے سن کر آپ کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا

اور فرمایا:

((رَحِمَ اللّٰهُ مُوْسٰی ، فَقَدْ أُوْذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هٰذَا فَصَبَرَ))[1]

"اللہ موسیٰ پر رحم فرمائے انہیں اس سے بھی زیادہ اذیتیں دی گئیں مگر انہوں نے صبر کیا"

اسلام میں قتل ناحق بہت بڑا جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم میں پہلے قتل ناحق کے بعد بنو اسرائیل پر جو شریعت فرض قرار دی، اس میں کسی انسان کے ناحق جان لینے کو پوری انسانیت کا قتل اور کسی بے قصور انسان کے خون کی حفاظت کو پوری انسانیت کی جان بچانا قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ﴾ [المائدہ:۳۲]

"اسی وجہ سے ہم نے بنو اسرائیل پر یہ فرض کر دیا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور سبب کی بنا پر قتل کیا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی کی جان بچائی تو اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی"

مطلب یہ ہے کہ جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے تو وہ اپنے اس عمل سے تمام انسانوں کے قتل کی راہ کھول دیتا ہے۔ اور یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اس کے دل میں بنی نوع انسان کے کسی بھی فرد کے لیے ہمدردی کا جذبہ نہیں ہے۔ اس طرح وہ پوری انسانیت کا دشمن قرار پاتا ہے۔ اس کے برعکس جو کسی بے قصور انسان کی جان بچاتا ہے تو گویا وہ پوری انسانیت کی بقا کا جذبہ رکھتا ہے۔

آدم علیہ السلام کے جس بیٹے نے اپنے بھائی کی ناحق جان لی تھی اس کا زمانہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے بہت پہلے تھا جن کے بیٹوں کو بنو اسرائیل کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی جان کے تحفظ کا یہ قانون بنو اسرائیل پر کیوں فرض کیا گیا؟ تو اس اشکال یا سوال کا جواب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے جس مجرم بیٹے نے اپنے بے قصور بھائی کی جان لی تھی اس کے اس جرم کا محرک یہ تھا کہ اس کا بھائی اللہ کو محبوب کیوں ہے؟ یعنی بجائے اس کے کہ وہ اپنے اندر ایسی صفات پیدا کرتا جن کی وجہ سے اللہ کے نزدیک وہ بھی محبوب ہو جاتا۔ اس نے اپنے صالح اور متقی بھائی کی جان لے لی۔ چونکہ یہی ذہنیت اور نفسیت بنو اسرائیل کی بھی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قانون کو خصوصیت کے ساتھ بنو اسرائیل پر فرض کیا۔ اور عملاً ہوا بھی کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جس غلط کار بیٹے نے اپنے صالح بھائی کا خون ناحق بہا

---

[1] صحیح بخاری ح ۳۱۵۰، ۶۰۶۹، صحیح مسلم ح ۱۰۶۲

کر جس مجرمانہ فعل کا ارتکاب کیا تھا اس کا اعادہ بنو اسرائیل ...... اولاد یعقوب ...... نے اپنے معصوم بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں کرنا چاہا:

﴿ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ۝ ﴾ [یوسف:۹]

''یوسف کو قتل کر دو یا اسے کسی سرزمین میں پھینک دو تا کہ تمہارے باپ کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو جائے اس کے بعد نیک بن جانا''

غور کا مقام ہے کہ جو ذہنیت قابیل کے اندر کارفرما تھی ٹھیک وہی ذہنیت برادران یوسف کے اندر بھی کارفرما تھی۔ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کی جان اسی وجہ سے لی کہ وہ صالح اور متقی کیوں ہے؟ ٹھیک اسی طرح یوسف علیہ السلام کے دسوں بھائیوں نے ان کو اپنے درمیان سے اس وجہ سے ہٹا دینے کا فیصلہ کر ڈالا کہ وہ اپنے باپ کو محبوب کیوں ہیں؟ یعنی بجائے اس کے کہ اپنے اندر محبوبیت کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتے انہوں نے باپ کے محبوب کو قتل کر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس خود فریبی میں بھی مبتلا رہے کہ اپنے اس مجرمانہ اقدام کے بعد اپنے باپ کی نظروں میں محبوب بن جائیں گے۔ ان کا مجرمانہ ذہن ان کو یہ طفل تسلی بھی دیتا رہا کہ ''اس جرم کا ارتکاب کر لینے کے بعد نیک اور صالح بن جانے کے لیے پوری عمر پڑی ہے''! اس کے بعد بنو اسرائیل اللہ کے اس صریح حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ''خون ناحق بہاتے رہے اور قرآن پاک میں جن انبیاء اور رسولوں کا ذکر آیا ہے ان کی قوموں میں صرف بنو اسرائیل ہی ایسی قوم ہیں جنہوں نے اپنے نبیوں کو نبی جانتے ہوئے قتل کیا۔ اور سینہ ٹھونک کر اعلان کرتے رہے کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔

اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ط ﴾ [النساء:۱۵۷]

''ہم نے اللہ کے رسول مسیح، عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر ڈالا ہے۔ حالانکہ انہوں نے نہ تو اس کو قتل کیا ہے اور نہ سولی دی ہے۔ بلکہ وہ ان کے مشتبہ کر دیا گیا''

انبیاء علیہم السلام، اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ لوگوں میں اس پاکیزہ مقصد کے لیے بھیجتا رہا ہے کہ وہ ان کو معبود برحق اللہ تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دیں اور ان کو تمام معبودان باطل کی پرستش سے آزاد کریں۔ ان کو حق و صداقت کی تعلیم دیں۔ برائیوں اور منکرات سے ان کی زندگیوں کو پاک کریں۔ دوسری قوموں نے تو اللہ تعالیٰ کے ان نبیوں کی تکذیب پر اکتفا کیا یا زیادہ سے ان کو اذیتیں

دیں۔ لیکن بنو اسرائیل نے ان کی تکذیب کے ساتھ ساتھ ان میں سے بہتوں کا خون بھی بہایا۔

﴿ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ٥ ﴾ [البقرة:٨٧]

''کیا ایسا نہ ہوا کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشات نفس کے خلاف کوئی تعلیم لے کر تمہارے پاس آیا تو تم نے استکبار کیا اور کسی جماعت کو جھٹلایا اور کسی دوسری جماعت کو قتل کرتے رہے''

اوپر بنو اسرائیل یا یہودیوں کے جن جرائم کا ذکر کیا گیا ہے صرف وہی ان کے جرائم نہیں ہیں بلکہ ان کے جرائم میں ان کی مسلسل بدعہدیاں بھی ہیں۔ چاہے وہ انسانوں کے ساتھ ہوں یا اللہ تعالیٰ سے۔

﴿ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ٥ ﴾ [البقرة:١٠٠]

''کیا ایسا نہیں ہوتا رہا ہے کہ جب بھی انہوں نے کوئی عہد کیا تو ان کی ایک جماعت نے اس کو توڑ ڈالا۔ بلکہ ان میں سے اکثر ایمان سے عاری ہیں''

وہ گناہ کے کاموں اور ظلم و زیادتی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں اور حرام مال کھانا ان کا روز کا معمول رہا ہے۔

﴿ وَ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ٥ ﴾ [المائدة:٦٢]

''تم ان میں سے اکثر کو دیکھتے ہو کہ وہ گناہوں کے ارتکاب اور زیادتی کے کاموں اور حرام مال کھانے میں بڑی تیزی دکھاتے ہیں بے شک وہ نہایت برے کام کرتے رہے ہیں۔''

یہودیوں کے انہی جرائم: اللہ تعالیٰ کی مسلسل نافرمانیوں، بدعہدیوں، قتل انبیاء اور حرام خوریوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ حکم دیا ہے کہ: اہل کتاب اور اہل کفر دونوں کو دوست نہ بنائیں:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ٥ ﴾ [المائدة:٥٧]

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تمہارے پیش رو اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنالیا ہے، انہیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو''

مؤمن کی سب سے قیمتی متاع اس کا دین ہے۔ اللہ اور رسول سے محبت اس کا سرمایہ حیات ہوتا

ہے۔ چونکہ اللہ کے دین کا مذاق اڑانے والوں، اللہ اور رسول سے بغض رکھنے والوں میں یہود و نصاریٰ اور اہل کفر سب شامل ہیں اس لیے ان تینوں کو دوست بنانے سے منع فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ کے دین اور اس کے شعائر کا مذاق اڑانے والوں اور ان کو کھیل تماشہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ دینی غیرت و حمیت مر چکی ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اگر تم مؤمن ہو تو اللہ سے ڈرو۔ یعنی اگر تم صحیح معنوں میں مومن ہو تو دینی غیرت و حمیت کا اظہار کر کے اللہ کے غضب سے بچو۔ یہ آیت مبارکہ اپنے نزول کے بعد سے آج تک اور آج سے قیامت تک کے لیے اسلام سے نسبت رکھنے والوں کے ایمان کو جانچنے کے لیے ایک کسوٹی ہے۔

دوستی اور محبت ہمیشہ دو طرفہ ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی بھی انسان کسی ایسے انسان سے دوستی اور محبت نہیں رکھتا جو اس کا دشمن ہو۔ اس کے دین کا دشمن ہو اور اس کے درپہ آزار ہو۔ لہٰذا ایک مومن ایسے لوگوں کو کیونکر دوست بنا سکتا ہے جو اس کے دشمن ہیں، اس کے دین کے دشمن ہیں اور اس کے دینی شعائر کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان ایسے لوگوں کو اپنا دوست سمجھتا ہے، ان کو اسلام اور مسلمانوں کا بھی خواہ تصور کرتا ہے تو خود اس کا ایمان محل نظر ہے۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ اہل کتاب آپس میں ایک دوسرے سے شدید اختلاف اور عداوت رکھنے کے باوجود مسلمانوں کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ؔ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۝ ﴾[المائدہ:٥٧]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ یہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا دوست بناتا ہے تو اس کا شمار بھی انہی میں ہوگا۔ یقیناً اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا''

اگر یہود و نصاریٰ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے معاملات کا جائزہ لیا جائے تو بڑی آسانی سے اس حکم الٰہی کو سمجھا جاسکتا ہے۔

یہ آیت مبارکہ اہل کتاب اور اہل کفر کے ساتھ معاملات اور باہمی مفادات کی بنیاد پر معاہدے اور سمجھوتے کرنے سے اس شرط کے ساتھ نہیں روکتی کہ اہل ایمان کے جذبات ان کے حق میں وہی ہوں جو ان کے حق میں اُن کے ہیں تاکہ کبھی ان کے مکر و فریب میں نہ آئیں۔

عصر حاضر میں عیسائیوں کے حوالہ سے مسلمان جن تجربات سے گزر رہے ہیں، ان سے قرآن پاک کے اس اعلان بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ کی تائید ہوتی ہے۔ اس کی واضح مثال عیسائی دنیا کی جانب سے

نسل پرست اور دہشت گرد حکومت: اسرائیل کی مکمل اور لامحدود تائید وحمایت ہے۔ قیامِ اسرائیل سے لے کر اب تک فلسطین کے اصل باشندوں کی نسل کشی اور قتل عام ہو رہا ہے۔ مگر یورپ وامریکہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی بجائے اسرائیل کی بھرپور سیاسی، اقتصادی اور فوجی مدد کر رہے ہیں۔ جب فلسطینی اپنے اوپر ہونے والے ظلم وجارحیت کا جواب دیتے ہیں اور اپنے مسلمہ قانونی حقوق کا دفاع کرتے ہیں تو ان کو امن دشمن اور دہشت گرد کہا جاتا ہے۔

لہٰذا اپنی عظمت رفتہ کو بازیاب کرنے کے لیے عربوں کے سامنے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی مادی اور فوجی طاقت بنانے کی طرف توجہ دیں۔ دوسروں کا دست نگر بنے رہنے کی بجائے خود ایسی طاقت بننے کی کوشش کریں کہ دشمن کو ان کا اعتبار ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ﴾ [الانفال:٦٠]

''اور تم لوگ جہاں تک بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار، بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے تیار رکھو تا کہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے دشمنوں کو خوف زدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔''

اور رسول اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

((اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَاَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ))[1]

''طاقت ور مومن زیادہ بہتر اور اللہ کو کمزور مومن سے زیادہ محبوب ہے''

اور ایک عربی مثل ہے:

((رَهَبُوْتٌ خَيْرٌ مِنْ رَحَمُوْتٍ: لَأَنْ تُرْهَبَ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تُرْحَمَ))[2]

''درحقیقت تم سے خوف زدہ رہنا، تم پر رحم کیے جانے سے بہتر ہے''

---

[1] صحیح مسلم: ح ٦٧٧٤ (٢٦٦٤)
[2] القاموس المحیط: مادة رَهَبَ

باب سوم

حج اور زیارتِ مدینہ

احادیث میں شہر رسول اللہ ﷺ: مدینہ منورہ کے بڑے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے وہاں ہجرت کرنے سے قبل اس کا نام ''یثرب'' تھا۔ سورۃ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ اِذۡ قَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ يٰۤاَهۡلَ يَثۡرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمۡ فَارۡجِعُوۡا ﴾ [الاحزاب: ۱۳]

''یاد کرو اس وقت کو جب (منافقین کے) ایک گروہ نے کہا: اے یثرب کے لوگو! تمہارے لیے ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، لہٰذا پلٹ چلو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أُمِرْتُ بِقَرْيَةٍ تَأْكُلُ الْقُرَى يَقُوْلُوْنَ، يَثْرِبَ، وَهِيَ الْمَدِيْنَةُ، تَنْفِي النَّاسَ كَمَا يَنْفِي الْكِيرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ))[1]

''مجھے ایک ایسے گاؤں کا حکم دیا گیا ہے جو دوسرے شہروں پر غالب آ جائے گا۔ لوگ اسے یثرب کہتے ہیں۔ یہی مدینہ ہے جو اپنے اندر سے برے لوگوں کو اس طرح نکال باہر کر دے گا جس طرح بھٹی لوہے کے میل کو نکال باہر کر دیتی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کے مکہ سے مدینہ ہجرت سے پہلے یہ شہر وبائی امراض کا مرکز تھا۔ اسی وجہ سے جب رسول اللہ ﷺ نے اس کو اپنے قدوم سے شرف بخشا اور ابوبکر و بلال رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہجرت کر کے وہاں پہنچے تو ابوبکر و بلال رضی اللہ عنہما بیمار پڑ گئے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِيْنَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَفِي مُدِّنَا وَ صَحِّحْهَا لَنَا وَانْقُلْ حُمَّاهَا إِلَى الْجُحْفَةِ))[2]

''اے اللہ! تو ہمارے لیے مدینہ کو اسی طرح محبوب بنا دے جس طرح مکہ ہمیں محبوب ہے یا اس سے زیادہ۔ اے اللہ! ہمارے لیے صاع اور مد میں برکت دے اور ہمارے لیے مدینہ کو

[1] صحیح بخاری ح: ۱۸۷۱۔ صحیح مسلم: ح ۱۳۸۲۔
[2] صحیح بخاری: ح: ۱۸۸۹۔ صحیح مسلم: ح: ۱۳۷۶۔

صحت افزاء بنا اور اس کے بخار کو جحفہ منتقل فرما دے۔"

مدینہ میں بدعت کا ارتکاب اور بدعتی کو پناہ دینا اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت کا موجب ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

((مَا عِنْدَنَا شَیْءٌ إِلَّا كِتَابُ اللّٰهِ وَهٰذِهِ الصَّحِيْفَةُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ : الْمَدِيْنَةُ حَرَمٌ مَا بَيْنَ عَائِرٍ إِلَى كَذَا...... ثَوْرٍ...... مَنْ أَحْدَثَ فِيْهَا حَدَثًا أَوْ آوَى مُحْدِثًا، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ، لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ وَ قَالَ: ذِمَّةُ الْمُسْلِمِيْنَ وَاحِدَةٌ، فَمَنْ أَخْفَرَ مُسْلِمًا، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ، لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ وَمَنْ تَوَلَّى قَوْمًا بِغَيْرِ إِذْنِ مَوَالِيْهِ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ، لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ))[1]

"ہمارے پاس اللہ کی کتاب اور اس صحیفہ کے سوا کوئی چیز نہیں ہے جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہے۔ مدینہ عائر سے وہاں...... ثور...... تک حرم ہے۔ جس نے اس میں کوئی نئی بات پیدا کی یا نئی بات نکالنے والے کو پناہ دی تو اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ نہ اس کی فرض عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفل۔ اور آپ نے فرمایا: مسلمانوں کا عہد و امان ایک ہے۔ تو جس نے کسی مسلمان کے عہد کو توڑا اس پر اللہ تعالیٰ، تمام فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ نہ تو اس کی فرض عبادت قبول کی جائی گی اور نہ نفل۔ اور جس نے کسی قوم کو اپنے مالکوں کے اذن کے بغیر دوست بنایا تو اس پر اللہ تعالیٰ، تمام فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ نہ اس کی فرض عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفل۔

دجال مکہ اور مدینہ میں داخل نہ ہو سکے گا:

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

((لَيْسَ مِنْ بَلَدٍ إِلَّا سَيَطَؤُهُ الدَّجَّالُ إِلَّا مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةَ، لَيْسَ لَهُ مِنْ نِقَابِهَا نَقْبٌ إِلَّا عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ صَافِّيْنَ يَحْرُسُوْنَهَا، ثُمَّ تَرْجُفُ الْمَدِيْنَةُ

[1] صحیح بخاری ح: ۱۸۷۰۔ صحیح مسلم ح: ۱۳۷۰۔

ثَلَاثَ رَجَفَاتٍ، فَيُخْرِجُ اللّٰهُ كُلَّ كَافِرٍ وَ مُنَافِقٍ))[1]

''کوئی ایسا شہر نہ ہوگا جس میں دجال داخل نہ ہو سوائے مکہ اور مدینہ کے۔ ان میں سے ہر ایک کے داخلے کے راستوں میں سے ہر راستے میں فرشتے صف بستہ ہوں گے جو ان کی حفاظت کریں گے۔ پھر مدینہ تین بار ہلا مارا جائے گا۔ اور اللہ ہر کافر اور منافق کو نکال باہر کر دے گا۔''

حدیث کی کتابوں میں مدینہ منورہ کے فضائل میں اور بہت سی صحیح احادیث مروی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں اس مقدس شہر کی بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کے محبوب اور آخری معزز و مکرم نبی ﷺ کا شہر ہے۔ آپ کا اور مسلمانوں کا دار الہجرت ہے۔ اسلامی ریاست کا دار الحکومت ہے۔ اس میں نبی کریم ﷺ کی مسجد ہے اور اس مقدس شہر میں رسول اکرم فداہ ابی وامی ﷺ مدفون ہیں۔

لیکن مدینہ منورہ کے ان تمام فضائل کے باوجود نہ تو کسی حدیث میں اس کی زیارت کی ترغیب دی گئی ہے اور نہ اس کی زیارت کو اعمال حج میں شمار کیا گیا ہے۔

حج اسلام کے ارکان خمسہ کا پانچواں اور آخری رکن ہے۔ قرآن پاک میں بیت اللہ کعبہ مشرفہ کے قصد کو حج کہا گیا ہے۔

﴿ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ﴾ [آل عمران: ۹۷]

''اللہ کے لیے ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے جو وہاں تک جانے کی طاقت رکھتے ہوں۔''

حَجَّ يَحُجُّ کے اصل معنی ارادہ کرنے اور کسی کے پاس جانے کے ہیں۔ ''حج البیت'' سے مراد عبادت کی نیت سے اللہ کے گھر کی زیارت کرنا اور اس سے متعلقہ تمام ارکان کو ادا کرنا ہے۔ جن ارکان میں مدینہ منورہ کی زیارت شامل نہیں ہے۔

حج کی منادی ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ مشرفہ کی تعمیر کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے کی تھی اور اس وقت شہر مدینہ کا کوئی وجود نہیں تھا۔

مسجد نبوی:

اپنے مقام و مرتبے اور فضیلت کے اعتبار سے مسجد نبوی شریف مسجد حرام کے بعد دوسرے درجہ پر

---

[1] صحیح بخاری ح: ۱۸۸۱۔ صحیح مسلم ح: ۲۹۴۳۔

ہے جس میں ایک نماز دوسری مسجدوں میں ادا کی جانے والی ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے۔ اس میں ادا کی جانے والی ایک نماز مسجد نبوی میں ادا کے جانی والی سو (۱۰۰) نمازوں اور دوسری مسجدوں میں ادا کی جانے والے ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هٰذَا خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ))[1]

''میری اس مسجد میں ایک نماز مسجد حرام کے سوا دوسری مسجدوں میں ادا کی جانے والی ایک ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔''

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ ، وَ صَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَفْضَلُ مِنْ مِئَةِ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ))[2]

''میری مسجد میں ایک نماز اس کے علاوہ دوسری مسجدوں کی ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے۔ اور مسجد حرام میں ایک نماز اس کے علاوہ دوسری مسجدوں کی ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔''

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں حافظ بزار اور طبرانی کے حوالہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث نقل کی ہے جس کے الفاظ ہیں:

((اَلصَّلَاةُ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بِمِائَةِ أَلْفِ صَلَاةٍ وَالصَّلَاةُ فِي مَسْجِدِي بِأَلْفِ صَلَاةٍ وَالصَّلَاةُ فِي بَيْتِ الْمَقْدِسِ بِخَمْسِمِائَةِ صَلَاةٍ))[3]

''مسجد حرام میں ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر، میری مسجد میں ایک نماز ایک ہزار نمازوں کے برابر اور بیت المقدس میں ایک نماز پانچ سو نمازوں کے برابر ہے۔''

جس طرح کسی صحیح حدیث میں زیارت مدینہ کو اعمال حج میں نہیں شمار کیا گیا ہے، اسی طرح ایسی بھی

---

[1] صحیح بخاری ح: ۱۱۹۰۔ صحیح مسلم ح: ۱۳۹٤۔

[2] ابن ماجہ: ح ۱٤۲۷ (۱۱٦۳)۔ مسند احمد ح: ۱۵۳٤٤۔

[3] فتح الباری ص ۸۲، ۷ ج ا...... حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ حافظ بزار نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔

کوئی صحیح حدیث کتب حدیث میں منقول نہیں ہے جس میں مسجد نبوی کی زیارت اور اس میں نماز ادا کرنے کو اعمال حج میں شمار کیا گیا ہو۔ البتہ نبی اکرم ﷺ سے ایسی حدیث مروی ہے جس میں مسجد نبوی کو ان تین مسجدوں میں شمار کیا گیا ہے جن میں نماز ادا کرنے کی نیت سے سفر کرنا جائز ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

((لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ مَسْجِدِ الرَّسُوْلِ ﷺ وَ مَسْجِدِ الْأَقْصٰى))[1]

''تین مسجدوں کے سوا کسی اور مسجد کی طرف سفر کرنے کے لیے کجاوے نہ کسے جائیں: مسجد حرام، مسجد رسول ﷺ اور مسجد اقصیٰ۔''

کجاوا کسنے سے مراد سفر کرنا ہے۔ حدیث کا مطلب ہے کہ مذکورہ تینوں مسجدوں کے سوا کسی اور مسجد میں نماز ادا کرنے کی غرض سے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ان تین مسجدوں کے سوا دنیا کی تمام مساجد عام مساجد ہیں اور ان میں نماز ادا کرنا اپنے اجر و ثواب کے اعتبار سے یکساں ہے۔

اس حدیث سے یہ ثبوت تو ملتا ہے کہ مسجد نبوی کی زیارت اور اس میں نماز ادا کرنے کی نیت سے سفر کرنا مشروع ہے مگر اس کا حج سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہر وقت کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ حج و زیارت کی کتابوں میں مسجد نبوی میں چالیس نمازوں کے فضائل سے متعلق جو حدیث ملتی ہے اور بغرض حج سعودی عرب آنے والے جس پر عمل ضروری تصور کرتے ہیں اور معلمین کی جانب سے جن چالیس نمازوں کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے وہ حدیث صحیح نہیں ہے۔[2]

اوپر مسجد نبوی کے جو فضائل بیان کیے گئے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں ہیں کہ رسول اکرم ﷺ اس میں مدفون ہیں۔ بلکہ:

اولاً: تو نبی کریم ﷺ نے اپنی مسجد کے یہ فضائل اپنی حیات پاک میں بیان فرمائے ہیں۔

ثانیاً: جب نبی معظم ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ کو مسجد نہیں بلکہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں دفن کیا گیا تھا۔

ثالثاً: حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے عہد میں جب مسجد نبوی میں توسیع ہوئی تو جنوبی سمت

---

[1] صحیح بخاری ۱۱۸۹، صحیح مسلم ح: ۱۲۹۷، مسند احمد ح: ۷۱۹۱۔

[2] ملاحظہ ہو اس کتاب کی پہلی جلد ص ۱۶۲، ح: ۳۶۴۔

سے ہوئی اس طرح نبی مکرم ﷺ کی قبر مبارک مسجد سے باہر ہی رہی۔

رابعاً: ولید بن عبدالملک کے عہد میں جب مسجد نبوی کی توسیع ہوئی اور قبر مبارک کے مسجد میں داخل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو مدینہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی زندہ نہیں تھا۔ پھر بھی اس وقت بعض تابعین نے اس کی مخالفت کی تھی جن میں سرفہرست جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ تھے۔ اس توسیع کے بعد بھی قبر مبارک مسجد سے الگ ایک مستقل حجرے میں رہی جس کو تین طرف سے دیواروں سے محفوظ کر دیا گیا تھا تاکہ نماز ادا کرتے ہوئے کسی کا رخ اس کی طرف نہ ہو۔

اس وضاحت سے ان لوگوں کے دعوے کی جڑ کٹ جاتی ہے جو مسجد نبوی سے مسجدوں میں قبروں کے وجود پر استدلال کرتے ہیں اور اس کی فضیلت کو اس کے اندر نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کے وجود سے جوڑتے ہیں۔

مسجد نبوی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے:

جس طرح ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر اور اس کی متعین کردہ جگہ پر بیت اللہ کی تعمیر کی تھی ٹھیک اسی طرح خاتم الانبیاء اور افضل الرسول محمد ﷺ نے اللہ کی متعین کردہ جگہ پر اپنے مقدس ہاتھوں سے مسجد نبوی کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کی تعمیر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ خود بھی شریک تھے۔ یہ مسجد پہلے روز ہی سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی ارشاد الٰہی ہے:

﴿ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ ؕ فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ ○ ﴾ [التوبہ: ۱۰۸]

”جو مسجد پہلے روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی ہے اس کی بات زیادہ حق دار ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ (عبادت کرتے) ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور اللہ پاک لوگوں کو پسند کرتا ہے۔“

اس آیت سے پہلے کی آیت میں ”مسجد ضرار“ اور اس کی تعمیر کرنے والوں کی گندی ذہنیت اور ان کے گندے مقاصد کو بیان کرنے کے بعد اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسجد نبوی کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ یہ تقویٰ یعنی صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت، اس کے دین کی اقامت اور شعائر اللہ کی تعظیم کی غرض سے قائم کی گئی ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس وقت مدینہ میں دو مسجدیں تھیں: مسجد قبا اور مسجد نبوی۔ نبی

کریم ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کرتے ہوئے قبا میں ۱۴ راتیں یا ۲۴ راتیں قیام فرمایا تھا۔ آپ نے یہاں ایک مسجد تعمیر فرمائی تھی جو اسلام کی پہلی مسجد ہے۔ قبا سے مدینہ پہنچنے کے بعد نبی کریم ﷺ نے جو پہلا کام کیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھا۔

یہ دونوں مسجدیں اگرچہ تقویٰ پر قائم کی گئی تھیں لیکن قرآن پاک کی مذکورہ آیت میں ''تقوی پر قائم کی جانے والی مسجد'' کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ میری یہ مسجد ہے۔ چنانچہ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں:

میرے پاس سے عبدالرحمٰن بن ابی سعید خدری رضی اللہ عنہما کا گزر ہوا، تو میں نے ان سے کہا: تم نے اس مسجد کے بارے میں اپنے والد سے کیا سنا ہے جو تقویٰ پر قائم کی گئی ہے؟ انہوں نے کہا: میرے والد نے فرمایا ہے:

((دَخَلْتُ عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِي بَيْتِ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ، فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيُّ الْمَسْجِدَيْنِ الَّذِي أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَى؟ قَالَ: فَأَخَذَ كَفًّا مِنْ حَصْبَاءَ فَضَرَبَ بِهِ الْأَرْضَ، ثُمَّ قَالَ: هُوَ مَسْجِدُكُمْ هٰذَا...... لِمَسْجِدِ الْمَدِيْنَةِ...... قَالَ: فَقُلْتُ: أَشْهَدُ أَنِّي سَمِعْتُ أَبَاكَ هٰكَذَا يَذْكُرُهُ))[1]

''میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آپ کی بعض ازواج کے گھر میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! دونوں مسجدوں میں سے کون سی مسجد تقویٰ پر قائم کی گئی ہے؟ کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے مٹھی بھر سنگریزے لیے اور انہیں زمین پر مارتے ہوئے فرمایا: وہ تم لوگوں کی یہ مسجد ہے۔ مدینہ کی مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں: میں نے کہا: میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ میں نے تمہارے والد کو اسی طرح ذکر کرتے ہوئے سنا ہے۔''

سنن ترمذی میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنی خدرہ کے ایک آدمی اور بنی عمرو بن عوف کے ایک آدمی کے درمیان اس مسجد کے تعین میں بحث چھڑ گئی جو تقوی پر قائم کی گئی ہے۔ خدری نے کہا: وہ رسول اللہ ﷺ کی مسجد ہے اور دوسرے نے دعویٰ کیا وہ مسجد قبا ہے۔ پھر وہ دونوں اس مسئلے کے تصفیہ کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح مسلم ح:١٣٩٨ (٣٣٨٧)۔

((هُوَ مَسْجِدِی هٰذَا))[1]

"وہ میری یہ مسجد ہے۔"

رہیں وہ احادیث جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں پاک رہنے والوں سے مراد اہل قبا ہیں تو ان حدیثوں اور مسجد نبوی کو "تقویٰ پر قائم کی جانے والی" مسجد قرار دینے والی حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ اگرچہ دونوں مسجدیں تقویٰ پر قائم کی گئی ہیں لیکن مسجد نبوی میں یہ صفت مسجد قباء کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے نہایت واضح الفاظ میں یہ فرمادیا کہ "جو مسجد تقوی پر قائم کی گئی ہے وہ میری یہ مسجد ہے۔"

زیارت قبور:

بت پرستی کی جڑ اور بنیاد دراصل قبر پرستی ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کو قبروں کی زیارت سے منع فرما دیا تھا، تاکہ ان کی ذہنی اور قلبی تربیت ایسی فضا میں ہو جو شرک کی ہر آلائش سے پاک ہو۔ دین توحید میں داخل ہونے والوں کا بت پرستی سے کسی طرح کا کوئی تعلق باقی نہ رہ جائے۔ شرک کے جراثیم سے ان کے عقائد بالکل پاک ہوجائیں اور جب آپ نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں عقیدہ توحید بالکل راسخ ہو گیا ہے اور ان کے دلوں کو ایمان کی لذت حاصل ہوگئی ہے تو آپ نے ایک دوسرے مقصد کی خاطر قبروں کی زیارت کی اجازت دے دی تاکہ ان کے ذہنوں میں یہ بات تازہ ہوتی رہے کہ دنیا کی یہ زندگی ختم ہونے والی ہے اور اس عالم کے بعد ایک اور جہان شروع ہونے والا ہے۔ چنانچہ سلیمان بن بریدہ اپنے والد حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((نَهَیْتُکُمْ عَنْ زِیَارَةِ الْقُبُوْرِ، فَزُوْرُوْهَا))[2]

"میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے منع کر دیا تھا تو اب قبروں کی زیارت کرلیا کرو۔"

اس حدیث سے قبروں کی زیارت کا جواز ثابت ہوتا ہے جس میں اگرچہ امر کا صیغہ آیا ہے لیکن عربی قاعدے سے: اگر کوئی قرینہ نہ ہو تو نہی کے بعد امر، اباحت اور جواز پر دلالت کرتا ہے وجوب پر نہیں۔

ایک دوسری حدیث سے جو علقمہ بن مرثد نے، سلیمان بن بریدہ سے اور انہوں نے اپنے والد حضرت

[1] سنن ترمذی ح:۳۲۳، ۳۰۹۹۔ [2] صحیح مسلم ح:۹۷۷۔ نسائی ح:۲۰۳۱۔

بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ اس سے زیارت قبور کے جواز ہی کا مفہوم نکلتا ہے وجوب کا نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((قَدْ كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ ، فَقَدْ أُذِنَ لِمُحَمَّدٍ فِي زِيَارَةِ قَبْرِ أُمِّهِ ، فَزُوْرُوْهَا ، فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْآخِرَةَ))[1]

"درحقیقت میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے منع کر رکھا تھا۔ لیکن محمد کو اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی اجازت دے دی گئی ہے۔ تو قبروں کی زیارت کر لیا کرو۔ کیونکہ وہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔"

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کے جس اذن کا ذکر فرمایا ہے یہ آپ کی طلب پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی تو خود روئے اور اپنے پاس کے لوگوں کو بھی رلایا۔ پھر فرمایا:

((اِسْتَأْذَنْتُ رَبِّي فِي أَنْ اسْتَغْفِرَ لَهَا فَلَمْ يُؤْذَنْ لِي ، وَاسْتَأْذَنْتُهُ فِي أَنْ أَزُوْرَ قَبْرَهَا ، فَأَذِنَ لِي ، فَزُوْرُوا الْقُبُوْرَ ، فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْمَوْتَ))[2]

"میں نے اپنے رب سے اس مسئلے میں اجازت طلب کی کہ میں ان کے لیے استغفار کروں۔ مگر مجھے اجازت نہیں دی گئی اور میں نے ان سے اس مسئلے میں اجازت طلب کی کہ ان کی قبر کی زیارت کر لوں! تو اس نے مجھے اجازت دے دی، لہٰذا قبروں کی زیارت کر لیا کرو۔ کیونکہ وہ موت کو یاد دلاتی ہیں۔"

ان احادیث سے جو احکام نکلتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱)......قبروں کی زیارت جائز اور مباح ہے واجب یا مستحب نہیں۔

(۲)......قبروں کی زیارت کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ قبریں موت اور آخرت کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ لہٰذا موت اور آخرت کی یاد تازہ کرنے کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے قبروں کی زیارت ممنوع ہے۔

(۳)......موت اور آخرت کی یاد تازہ کرنے کے لیے مسلمانوں اور مشرکین کی قبروں کی زیارت یکساں حکم رکھتی ہے۔

---

[1] سنن ترمذی ح: ۱۰۵۴۔

[2] صحیح مسلم: ح ۹۷۶۔ سنن ابو داؤد ح: ۳۲۳۴۔ سنن نسائی ح: ۲۰۳۳۔ سنن ابن ماجہ ح: ۱۵۷۲۔

(۴)...... احادیث میں بزرگان دین اور صلحائے امت کی قبروں کی زیارت کا کوئی ذکر نہیں آیا ہے۔ لہٰذا ان کی قبروں کو زیارت کے لیے خاص کرنا لوگوں کے اپنے ذہنوں کی پیداوار ہے اور اس مقصد کے منافی ہے جس کے پیش نظر قبروں کی زیارت کی اجازت دی گئی ہے۔ کیونکہ بزرگان دین کی قبروں کی زیارت سے مشرکانہ اعتقاد کے زندہ ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ جس کا ثبوت ان مشرکانہ اعمال سے ملتا ہے جن کا ارتکاب بزرگان دین اور صلحائے امت کی قبروں کی زیارت کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ اس تناظر میں عام لوگوں کی قبروں کی زیارت اسلام کے توحیدی مزاج سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

(۵)...... احادیث میں قبروں میں مدفون لوگوں کے لیے دعا و استغفار کا کوئی ذکر نہیں ہے یا دوسرے لفظوں میں ایسی کوئی حدیث نہیں ملتی جس میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہو کہ وہ مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کے موقع پر ان کے اصحاب کے لیے دعا و استغفار کریں۔ دعا و استغفار کا حکم جن احادیث میں دیا گیا ہے وہ مردوں کو دفن کرنے کے بعد کے وقت کے لیے خاص ہیں۔[1]

(۶)...... اگر مسلمانوں کا گزر مسلمانوں کی قبروں سے ہو یا وہ مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کریں تو یہ دعا پڑھیں:

((اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَلَاحِقُوْنَ أَسْأَلُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ))[2]

''اے مومنو! اور مسلمانو کی بستی کے رہنے والو! تم پر سلامتی ہو۔ ہم بھی انشاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں۔ میں اللہ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت کا سوال کرتا ہوں۔''

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث ہے جس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب یہ سوال کیا کہ زیارت قبور کے موقع پر وہ کیا کہیں؟ تو آپ نے فرمایا:

((قُوْلِي: اَلسَّلَامُ عَلَى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَ يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِيْنَ وَإِنَّا شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ))[3]

''کہو: مومنوں اور مسلمانوں کی بستی والوں پر سلامتی ہو۔ اور اللہ ان لوگوں پر رحم فرمائے جو آگے جا چکے اور جو بعد میں جانے والے ہیں۔ ان شاء اللہ ہم تم سے ملنے والے ہیں۔

[1] سنن ابو داؤد ح: ۳۲۲۱۔ [2] صحیح مسلم ح:۹۷۵۔
[3] صحیح مسلم: ح: ۹۷٤ (۱۰۲)۔

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے زیارت قبور کے موقع پر گندی اور غلط بات زبان سے نکالنے سے منع فرمایا ہے: ارشاد نبوی ہے:

((نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ، فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يَزُوْرَ، فَلْيَزُرْ، وَلَا تَقُوْلُوْا هُجْرًا))[1]

''میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے روک دیا تھا۔ تو (اب) جو زیارت کرنا چاہے وہ زیارت کر لے اور کوئی بری بات مت کہو۔''

مطلب یہ ہے کہ میں نے پہلے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے منع کر دیا تھا اب اس کی اجازت دیتا ہوں۔ لہٰذا جو زیارت کرنا چاہے وہ زیارت کرے اور جو نہ چاہے نہ کرے۔ دونوں طرح سے جائز ہے۔ البتہ تم لوگ جب قبروں کی زیارت کرو تو اس موقع پر زبان سے کوئی غلط اور گندی بات مت نکالو۔ ''ھجر'' گندی، غلط اور خلاف شرع بات کو کہتے ہیں۔ زیارت قبور کے موقع پر جو بات بے ہودہ اور گندی ہوسکتی ہے وہ مشرکانہ بات کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اقوام سابقہ میں گمراہی پیدا ہونے کے بعد یہی ہوا تھا کہ انہوں نے قبروں میں مدفون بزرگوں اور صالحین کو پکارنا اور ان سے مرادیں مانگنا شروع کر دیا تھا۔ اب مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ یا ان کی بہت بڑی تعداد بزرگان دین اور صلحائے امت کی قبروں کو مزاروں اور عبادات گاہوں میں تبدیل کر چکی ہے۔ جہاں اہل قبور سے دعائیں مانگی جاتی ہیں، ان سے فریادیں کی جاتی ہیں، ان سے مدد مانگی جاتی ہے، ان سے اولاد طلب کی جاتی ہے اور رزق میں کشادگی، مصائب اور مشکلات سے نجات اور بیماریوں سے شفا طلب کی جاتی ہے۔ ان تمام باتوں سے نبی مکرم ﷺ نے صرف ایک لفظ ''ھجر'' کہہ کر منع فرمادیا اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک ان لوگوں پر لعنت فرماتے رہے جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنالیا۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي مَرَضِهِ الَّذِي لَمْ يَقُمْ مِنْهُ: لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارَى، اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ لَوْ لَا ذٰلِكَ أُبْرِزَ قَبْرُهُ غَيْرَ أَنَّهُ خَشِيَ أَوْ خُشِيَ أَنْ يُتَّخَذَ مَسْجِدًا))[2]

''رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس بیماری میں جس سے آپ جانبر نہ ہو سکے، فرمایا: یہود و

---

[1] سنن نسائی ح: ۲۰۳۲۔

[2] صحیح بخاری ح: ۱۲۳۰، ۱۳۹۰، صحیح مسلم ح: ۵۲۹۔

نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنالیا۔ اگر یہ خوف نہ ہوتا تو آپ کی قبر نمایاں کر دی جاتی۔ لیکن آپ کو اندیشہ ہوا یا اندیشہ محسوس کیا گیا کہ اس کو سجدہ گاہ بنالیا جائے گا۔''

ام المومنین کے اس قول: اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ کہیں نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کو سجدہ گاہ نہ بنالیا جائے تو آپ کی قبر مبارک نمایاں اور کھلی جگہ بنائی جاتی۔'' سے نبی معظم ﷺ کو حجرے میں دفن کرنے کی حکمت سمجھی جاسکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت:

حدیث کی کتابوں میں ایسی کوئی صحیح حدیث منقول نہیں ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی قبر مبارک کی زیارت کا حکم دیا ہو۔ یا اس کی زیارت کی ترغیب دی ہو اور اس کا کوئی اجر وثواب بیان کیا ہو۔ لہٰذا عام قبروں کی زیارت کا جو حکم ہے وہی حکم نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کا بھی ہے۔ بشرطیکہ وہاں کسی خلاف شرع عمل کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ جیسے نبی مکرم ﷺ سے دعا کرنا، آپ سے شفاعت کی درخواست کرنا، آپ کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرنا اور نبی کریم ﷺ سے اپنی پریشانیوں کے ازالہ، رزق میں کشادگی یا کسی بیماری سے شفاء کی درخواست کرنا وغیرہ۔ یا قبر مبارک کی جالیوں پر ہاتھ پھیرنا اور ان کو چومنا وغیرہ تو یہ حرام ہے۔ اس غرض کے لیے قبر مبارک کی زیارت بھی حرام ہے اور ویسا کرنے والے اسی لعنت کے مستحق ہیں جس لعنت کے مستحق نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے مطابق یہود و نصاریٰ اور ان کے نقش قدم کی پیروی کرنے والے۔

جن علماء نے مسجد نبوی کی زیارت کرنے والوں کے لیے رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت اور اس کی طرف رخ کر کے درود و سلام پڑھنے کو مستحب قرار دیا ہے تو ان کی یہ بات اپنے پیچھے کوئی شرعی دلیل نہیں رکھتی۔ ''مستحب'' ایک شرعی اصلاح ہے جس سے مراد ایسا عمل ہے جس کے کرنے پر ثواب اور نہ کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ کسی عمل کو مستحب قرار دینے کا مجاز اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ بات صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام پڑھنے کے لیے آپ کی قبر مبارک کے پاس حاضری ضروری نہیں ہے۔ بلکہ جو مسلمان جہاں کہیں بھی ہو وہاں سے آپ پر درود و سلام پڑھ سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مسجد نبوی میں حاضری دینے والے کے لیے قبر مبارک کی زیارت صرف جائز ہے مستحب نہیں ہے۔ اور یہ بھی اس صورت میں کہ جب یہ بار بار نہ کی جائے۔

اگر قبر مبارک کی زیارت مستحب ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اعمال سے اس کا متواتر ثبوت ملتا جو بہت بڑی تعداد میں مسجد نبوی سے پنج وقتہ نمازیں ادا کرتے تھے۔ جب کہ صرف عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے عمل سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جب آپ باہر سے مدینہ منورہ میں آتے اور مسجد نبوی میں تشریف لے جاتے تو قبر مبارک کے پاس آ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجتے۔ پھر اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَبَابَكْرٍ اور اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يا ابتاه...... کہہ کر وہاں سے چلے جاتے۔

اوپر کی وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ مدینہ منورہ، مسجد نبوی اور قبر مبارک کی زیارت کا نہ تو حج سے کوئی تعلق ہے اور نہ ان کی عام زیارت کا کسی حدیث میں حکم دیا گیا ہے۔ حالانکہ مدینہ منورہ کے فضائل بکثرت حدیثوں میں بیان ہوئے ہیں اور مسجد نبوی میں ایک نماز کو، مسجد حرام کے سوا دوسری مسجدوں میں ادا کی جانے والی ایک ہزار نمازوں سے افضل قرار دیا گیا ہے۔

رہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک تو وہ بلاشبہ سرور عالم، سید البشر، افضل الانبیاء اور اللہ تعالیٰ کے محبوب نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک ہے۔ لیکن نہ کسی حدیث میں اس کی کوئی فضیلت بیان ہوئی ہے اور نہ اس کی زیارت کی ترغیب دی گئی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس بکثرت احادیث میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اپنی قبر مبارک کو عید گاہ، جشن گاہ اور سجدہ گاہ بنانے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

مگر ان تمام وضاحتوں کے باوجود بعض نادانوں اور دین کے دشمنوں نے لوگوں میں ایسی من گھڑت اور جھوٹی روایتیں پھیلا دی ہیں جن میں حج اور قبر مبارک کی زیارت کو آپس میں جوڑ دیا گیا ہے۔ انہیں میں سے ایک روایت درج ذیل الفاظ میں ملتی ہے:

(۲۴۰)......مَنْ حَجَّ، وَلَمْ يَزُرْنِي ، فَقَدْ جَفَانِي۔

"جس نے حج کیا اور میری (قبر کی) زیارت نہ کی تو اس نے مجھ سے بے رخی برتی۔"

یہ روایت من گھڑت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جھوٹ ہے۔ اس کے جھوٹ ہونے پر خود اس کا مضمون دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے رخی برتنے والا اور آپ پر ظلم کرنے والا علمائے اسلام کے اتفاق سے "خارج از اسلام" ہے۔ قرآن پاک میں تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر آواز بلند کرنے والے کے اعمال کے اکارت جانے کا حکم لگایا گیا ہے۔ (الحجرات:۲)

تو پھر آپ سے بے رخی برتنے والا اور آپ پر ظلم کرنے والا کس طرح مومن باقی رہ سکتا ہے۔ اس تناظر میں ایسی روایت کیونکر صحیح ہو سکتی ہے جس میں ایک ایسا عمل نہ کرنے کی یہ سزا بیان کی گئی ہے جو

سرے سے مطلوب ہی نہیں ہے۔تمام ائمہ اسلام کے نزدیک مسجد نبوی اور قبر مبارک کی زیارت حج سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

اس روایت کی تخریج ابن عدی نے الکامل [1] میں، ابن حبان نے الضعفاء [2] میں اور ابن الجوزی نے الموضوعات [3] میں کی ہے۔

اس روایت کی مصیبت محمد بن محمد بن نعمان بن شبلی ہے یا اس کا دادا ہے۔

امام ابن حبان نے لکھا ہے: نعمان بن شبلی ثقہ راویوں کے نام سے مصائب آمیز روایتیں بیان کیا کرتا تھا۔ جب کہ امام دارقطنی کا قول ہے کہ اس موضوع روایت کا اصل ملزم محمد بن محمد ہے نعمان نہیں ہے۔

امام شوکانی نے بھی الفوائد المجموعہ [4] میں اس کو موضوع قرار دیا ہے۔

بعض لوگوں نے اس روایت کو صرف ضعیف کہا ہے۔ یہ سند کے اعتبار سے صرف ضعیف تو ہوسکتی ہے لیکن متن کے اعتبار سے بہر حال جھوٹ ہے۔

(۲٤۱)......مَنْ حَجَّ، فَزَارَ قَبْرِي بَعْدَ مَوتِي، كَانَ كَمَنْ زَارَنِي فِي حَيَاتِي۔

’’جس نے حج کیا پھر میری موت کے بعد میری قبر کی زیارت کی تو وہ اس شخص کی مانند ہے، جن نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔‘‘

اس باطل اور جھوٹی روایت کی سند سے قبل اس کا متن باطل ہے اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ کیونکہ جس خوش نصیب انسان کو نبی اکرم ﷺ سے آپ کی زندگی میں بحالت ایمان ملاقات اور آپ کی رفاقت حاصل تھی وہ رسول اللہ ﷺ کا صحابی تھا۔ اور صحابہ کا گروہ انبیاء علیہم السلام کے بعد امت کا سب سے مقدس گروہ ہے جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي، فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ)) [5]

’’تم لوگ میرے اصحاب کو برا مت کہو۔ اس لیے کہ اگر تم میں سے کسی نے احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کیا تو اس کا ثواب صحابہ کے خرچ کیے ہوئے ایک مد یا آدھے مد کے برابر بھی نہیں ہوسکتا۔‘‘

---

[1] الکامل: ص ۲۲۸ ج ۷۔ [2] الضعفاء: ص ۷۳ ج ۳۔
[3] الموضوعات: ص ۵۹۷، ۵۹۸ ج ۲، ح: ۱۱٦۸۔ [4] الفوائد المجموعة: ۱۱۸۔
[5] صحیح بخاری ح: ۳٦۷۳۔ صحیح مسلم: ۲۵٤۱۔

اور اگر کوئی ایسے اعمال کے ذریعہ صحابہ کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا جن کا حکم دیا گیا ہے اور جو فرض ہیں، جیسے: پنج وقتہ نمازیں، حج، زکوٰۃ اور روزہ و جہاد تو پھر ان کے درجے تک ایسے عمل کے ذریعہ کیونکر پہنچ سکتا ہے جو فرض، واجب، سنت اور مستحب کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ اس عمل کے لیے سفر ہی مشروع ہے۔ البتہ نبی کریم ﷺ کی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے سفر کرنا مستحب ہے۔ کیونکہ مسجد نبوی میں ایک نماز مسجد حرام کے علاوہ دوسری مسجدوں میں ادا کی جانے والی ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے۔ یعنی آپ کی قبر مبارک کی زیارت تو مسجد نبوی کی زیارت کرنے والوں اور اس میں نماز ادا کرنے والوں کے لیے صرف جائز ہے۔ احادیث میں اس زیارت کا کوئی اجر وثواب بھی نہیں بیان کیا گیا ہے اور نہ اس زیارت کا حج سے کوئی دور کا تعلق ہی ہے۔ ایسی صورت میں نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کرنے والا حاجی صحابی کا درجہ کیسے حاصل کر سکتا ہے؟

رہی اس روایت کی سند تو س کے راویوں میں ضعیف اور نا قابل اعتبار راویوں سے لے کر جھوٹے اور حدیثیں وضع کرنے والے راوی شامل ہیں۔

اس روایت کی تخریج جن ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں کی ہے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:
طبرانی نے المعجم الکبیر[1] اور الاوسط[2] میں، ابن عدی نے الکامل[3] میں دار قطنی نے سنن[4] میں اور بیہقی نے سنن[5] میں۔

اس روایت کا بنیادی راوی ابو عمر حفص بن سلیمان ہے جس نے اس کی روایت اللیث بن ابی سلیم سے کی ہے۔ اس نے مجاہد سے، مجاہد نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

حفص بن سلیمان بے حد ضعیف راوی ہے اور لیث بن ابی سلیم بھی ضعف ہے۔ حفص کو حافظ ابن حجر نے التقریب[6] میں متروک الحدیث اور یحییٰ بن معین نے اس کو جھوٹا قرار دیا ہے جیسا کہ الکامل میں ہے اور عبدالرحمٰن بن یوسف بن خرش[7] نے اس کو کذاب، متروک اور حدیثیں وضع کرنے والا قرار دیا ہے۔[8]

---

[1] المعجم الکبیر: ص ۲۰۳ ج ۳۔
[2] المعجم الأوسط: ص ۲۲۲ ج ٤ ح ۳٤۰۰۔
[3] الکامل: ص ۷۸۸۔ ۷۹۱ ج ۲
[4] سنن دار قطنی: ص ۲۷۹۔
[5] سنن بیہقی: ص ۲٤٦ ج ٥۔
[6] التقریب: ص ۱۱۱ ترجمہ۔ ۱٤۰٥
[7] الصارم المنکی: ص ٦۲۔
[8] الضعیفہ: ص ۱۲۰، ۱۲۲ ج ۱۔

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ مذکورہ روایت اپنی سند اور متن دونوں اعتبار سے باطل ہے۔

(۲۴۲)......مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ مَوْتِی ، فَکَأَنَّمَا زَارَنِی فِی حَیَاتِی))

''جس نے میری موت کے بعد میری زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔''

یہ روایت بھی باطل اور جھوٹ ہے۔ اس کا متن سابقہ روایت سے مشابہ ہے۔ صرف پہلا فقرہ: مَنْ حَجَّ نہیں ہے۔ اس متن کے خلافِ شرع ہونے پر سابقہ روایت کے ضمن میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

اس زیر بحث روایت کو امام دار قطنی نے اپنی سنن [1] میں اس سند سے روایت کیا ہے:

ہارون ابی قزعہ سے روایت ہے، وہ آل حاطب کے ایک آدمی سے روایت کرتے ہیں اور حضرت حاطب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا......

محدث محمد ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں:

یہ سند ضعیف ہے جس کی دو علتیں ہیں:

(۱)......سند میں جس راوی کے نام کی صراحت نہیں ہے وہ مجہول ہے۔

(۲)...... ہارون ابی قزعہ ضعیف ہے جس کو یعقوب بن شیبہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ عقیلی، ساجی اور ابن جارود نے بھی اس کو ''ضعفاء'' میں شمار کیا ہے۔ امام بخاری کا اس کے بارے میں قول ہے کہ: اس کا متابع نہیں ہے۔''

اور اس سند کی تیسری علت یہ ہے کہ اس میں اضطراب اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی سند متصل اور بعض نے مرسل بیان کی ہے۔ اسی طرح اس کے متن میں اور ہارون ابی قزعہ کے نام میں بھی اختلاف ہے۔ [2]

حافظ علامہ محمد بن احمد بن عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ روایت کے آخر میں اس فقرے کا اضافہ کیا ہے:

((وَمَنْ مَاتَ بِأَحَدِ الْحَرَمَيْنِ بُعِثَ مِنَ الْآمِنِيْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

''اور جو کوئی دونوں حرموں میں سے کسی ایک میں مرے گا تو ان لوگوں کے زمرے میں اپنی قبر سے اٹھایا جائے گا جو قیامت کے دن اس کی ہولناکی سے محفوظ ہوں گے۔''

ابن عبدالباری نے لکھا ہے کہ یہ حدیث بعینہٖ وہی حدیث ہے جو تقی الدین سبکی نے اپنی کتاب ''شفاء

---

[1] دار قطنی: ۲۷۹، ۲۸۰۔ [2] الضعیفہ: ص ۸۹، ۹۱ ج ۳، ح: ۱۰۲۱۔

الثقام فی زیارۃ خیر الانام" میں چھٹی اور ساتویں حدیث کے نام سے نقل کی ہے۔ جس کی سند ضعیف اور مختلف فیہ ہے۔ ان تینوں روایتوں کا مدار ہارون ابی قزعہ پر ہے جس کو بعض راویوں نے 'ابن قزعہ" کہا ہے۔ اسی طرح کسی نے سند میں اس کا ذکر کیا ہے تو کسی نے اس کو ساقط کر دیا ہے۔ رہا اس کا شیخ: آل حاطب کا ایک آدمی" تو وہ کوئی مبہم شخص ہے۔ جس کا بعض نے ذکر کیا ہے اور بعض نے نہیں کیا۔

اسی طرح جس نے یہ حدیث "ہارون ابی قزعہ" سے روایت کی ہے تو اس کو بعض نے "سوار بن میمون"، کہا ہے اور بعض نے میمون بن سوار۔ کچھ لوگوں نے تو اس کا نام "اسود بن میمون" قرار دیا ہے۔

لہٰذا جس شخص کو علم حدیث کی معمولی بھی معرفت ہوگی اس کو اس امر میں کوئی شک نہ ہوگا کہ جس حدیث کے متن اور سند میں اس قدر اختلاف اور اضطراب ہو وہ بلاشبہ نا قابل اعتبار اور ساقط ہوتی ہے۔

(۲۴۳)......مَنْ زَارَ قَبْرِي وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِي۔

"جس نے میری قبر کی زیارت کی تو اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔"

حافظ ابن عبدالباری نے "الصارم المنکی" [1] میں لکھا ہے: اس کی روایت دار قطنی اور بیہقی وغیرہ نے کی ہے۔

حافظ محمد عبدالرحمٰن سخاوی نے "المقاصد الحسنه" [2] میں لکھا ہے۔ یہ حدیث صحیح ابن خزیمہ [3] میں ہے اور انہوں نے اس کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ حدیث ابوالشیخ عبداللہ بن محمد اصبہانی، طبرانی، ابن عدی، دار قطنی اور بیہقی کی کتابوں میں بھی ہے لیکن حسب ذیل الفاظ میں:

((مَنْ زَارَ قَبْرِي كَانَ كَمَنْ زَارَنِي فِي حَيَاتِي))

"جس نے میری قبر کی زیارت کی تو وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔"

جن دوسری کتابوں میں یہ من گھڑت اور باطل روایت نقل ہوئی ہے ان کے نام ہیں:

(۱) کشف [4] الخفاء (۲) قاعدۃ جلیلہ [5] من التوسل والوسیلۃ (۳) ضعیف [6] الجامع (۴) الفوائد المجموعہ [7]۔ علامہ حافظ ابن عبدالباری تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] الصارم المنکی: ص ۳۰۔
[2] المقاصد الحسنة: ص ۴۸۳ ح ۱۱۴۵۔
[3] مجھے صحیح ابن خزیمہ میں یہ حدیث نہیں ملی۔
[4] کشف الخفاء: ص ۲۵۰ ج ۲۔
[5] قاعدہ جلیله من التوسل والوسیله: ص ۸۱۔
[6] ضعیف الجامع: ح ۵۶۰۷۔
[7] الفوائد المجموعة: ۱۱۷۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے رد میں ''شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام'' کے مؤلف[1] نے اپنی کتاب میں یہ پہلی حدیث نقل کی ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح یا حسن ہے۔ حالانکہ یہ حدیث نہ تو صحیح ہے اور نہ ثابت۔ بلکہ علم حدیث کے ائمہ کے نزدیک یہ حدیث منکر ہے اور اس کی سند ضعیف ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اس مسئلے...... نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت...... کے بارے میں معترض نے جتنی حدیثیں نقل کی ہیں، جن کی تعداد دس (۱۰) سے زیادہ ہے ان میں سے ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے بلکہ سب کی سب ضعیف اور ناقابل اعتبار ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض موضوع ہیں۔[2]

آگے لکھتے ہیں:

امام بیہقی نے شعب الایمان میں اس روایت کی سند اور متن ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ہمیں ابوسعید مالینی نے خبر دی، کہا: ہمیں ابواحمد عبداللہ بن عدی حافظ نے خبر دی، کہا: ہم سے محمد بن موسیٰ حلوانی نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن اسماعیل بن سمرہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے موسیٰ بن ہلال نے، عبداللہ عمری سے، انہوں نے نافع سے، اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((مَنْ زَارَ قَبْرِي وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِي))

''جس نے میری قبر کی زیارت کی تو اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔''

امام بیہقی اس روایت کی دوسری سند بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

یہ روایت: عن موسیٰ بن ہلال عبدی، عن عبیداللہ بن عمر کی سند سے بھی بیان کی جاتی ہے۔ ہم کو ابوعبداللہ حافظ نے خبر دی، کہا: ہم کو ابوالفضل محمد بن ابراہیم نے خبر دی، کہا: ہم سے محمد بن زنجویہ قشیری نے بیان کیا، کہا: ہم سے عُبید بن محمد بن قاسم بن ابی مریم وّراق نے بیان کیا جو اصل میں نیساپور کے تھے اور بغداد میں آباد ہوگئے تھے، کہا: ہم سے موسیٰ بن ہلال عبدی نے بیان کیا......۔

امام بیہقی فرماتے ہیں: موسیٰ بن ہلال نے چاہے عبیداللہ کہا ہو یا عبداللہ، وہ ''عن نافع عن ابن عمر'' سے اپنی روایت میں ''منکر''[3] ہے۔ اس روایت کو اس کے سوا کسی اور نے نہیں بیان کیا ہے۔

---

[1] تقی الدین سبکی۔ [2] الصارم المنکی: ص ۲۲۔

[3] منکر ایسے ضعیف راوی کو کہتے ہیں جو عدالت اور ضبط حدیث کی صفت سے متصف نہ ہو۔ یا جو بکثرت غلطیاں کرے یا غفلت اور بھول چوک کا مریض ہو۔ یا اس سے فسق و فجور کا ظہور ہوتا ہو اور اپنی روایت میں ثقہ راوی کی مخالفت کرے۔

امام بیہقی کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے حافظ ابن عبدالباری فرماتے ہیں:

صحیح یہ ہے کہ ''یہ روایت موسیٰ بن ہلال نے عبداللہ عمری بکر سے کی ہے۔ جب کہ امام ابواحمد عبداللہ بن عدی وغیرہ نے تصریح کی ہے۔''

''اور امام بیہقی نے اس حدیث پر منکر ہونے کا جو حکم لگایا ہے وہ صحیح اور واضح حکم ہے۔ جس میں اس فن سے ادنیٰ تعلق رکھنے والے کو بھی شک نہیں ہوگا۔ اس کا انکار اس علم سے ناواقف ہی کرے گا۔ کیونکہ موسیٰ بن ہلال عبدی جیسے مجہول الحال اور غیر معروف راوی کی، عبداللہ بن عمر عمری جیسے برے حافظے اور شدید بھول چوک سے متصف راوی سے اپنی روایت میں منفرد ہونا اس روایت کے عدم قبول اور اس کے رد کر دینے کا موجب ہے۔ اس لیے کہ وہ نافع سے حدیثیں روایت کرنے والے تمام حفاظ اور ثقہ راویوں، جیسے یحییٰ بن سعید انصاری، ایوب سختیانی، عبداللہ بن عون، صالح بن کیسان، اسماعیل بن امیہ قرشی، ابن جریج، اوزاعی، موسیٰ بن عقبہ، ابن ابی ذئب، مالک بن انس اور لیث بن سعد وغیرھم میں منفرد ہے۔ اگر اس روایت کی کوئی اصل ہوتی تو ان ائمہ حدیث میں سے بھی کسی نے نافع سے اس کی روایت کی ہوتی۔ لہٰذا یہ روایت بے بنیاد اور قابل رد و انکار ٹھہری۔[1]

اس کے بعد اس مایہ ناز محدث: محمد بن احمد بن عبدالباری نے اس باطل اور خلاف شرع روایت کا ۱۶ صفحات میں مکمل پوسٹ مارٹم کر کے اس کو سنداً اور متناً باطل ثابت کیا ہے۔ چونکہ یہ تفصیلات اردو قارئین کے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں ہے اس لیے ان سے صرف نظر کرتا ہوں۔

(۲۴۴)......مَنْ زَارَ قَبْرِی حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِی۔

''جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کو میری شفاعت حاصل ہوگئی یعنی وہ اس کا مستحق ہوگیا''

حافظ ابن عبدالباری فرماتے ہیں:

شیخ تقی الدین سبکی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس کی تخریج حافظ ابوبکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق بزار نے اپنی مسند میں اس سند سے کی ہے:

ہم سے قتیبہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبداللہ بن ابراہیم نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالرحمٰن بن یزید نے اپنے باپ سے، انہوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا ہے:

---

[1] الصارم المنکی: ص ۲۲۔

((مَنْ زَارَ قَبْرِي حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِي))

"یہ بعینہٖ پہلی حدیث ہے، جس میں "وَجَبَتْ" کی جگہ "حَلَّتْ" ہے۔ اس لیے اس کا علیحدہ ذکر کر رہا ہوں۔"

شیخ تقی الدین سبکی کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد ابن عبدالباری لکھتے ہیں:

"یہ حدیث جس کا ذکر "معترض" نے اپنی کتاب میں کیا ہے ضعیف اور منکر ہے۔ اس کی سند ساقط الاعتبار ہے اور اس جیسی سند سے روایت کی جانے والی حدیث کسی بھی امام اور حافظ حدیث کے نزدیک قابل قبول اور قابل استدلال نہیں ہے: قتیبہ بزار کا شیخ ہے جو "ابن المرزبان" ہے۔ بزار نے اس سے اس کے علاوہ بھی حدیثیں روایت کی ہیں۔

رہا قتیبہ کا شیخ عبداللہ بن ابراہیم تو وہ ابن عمرو غفاری ہے جس کی کنیت ابومحمد اور لقب مدنی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھا۔ وہ بے حد ضعیف اور منکر الحدیث تھا۔ بلکہ بعض ائمہ حدیث نے اس پر کذب بیانی اور وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔

امام ابوداؤد کا قول ہے: عبداللہ بن ابراہیم منکر الحدیث تھا۔ امام دارقطنی فرماتے ہیں: اس کی روایت کردہ حدیثیں منکر ہیں۔ امام ابوعبداللہ حاکم نے لکھا ہے کہ وہ ثقہ راویوں کے نام سے موضوع اور جھوٹی روایتیں بیان کیا کرتا تھا جو اس کے علاوہ کسی اور نے نہیں روایت کی ہیں۔ خود بزار نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: عبداللہ بن ابراہیم نے ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جن میں اس کا کوئی متابع نہیں ہے۔[1]

حافظ ابن حجر نے عبداللہ بن ابراہیم کو متروک الحدیث لکھا[2] ہے۔ امام ابن عدی فرماتے ہیں: اس کی روایت کردہ حدیثوں میں کوئی ثقہ راوی اس کا متابع نہیں ہے۔

یہ تو عبداللہ بن ابراہیم ابن ابی عمرو غفاری کا حال تھا۔ رہا اس کا شیخ: عبدالرحمٰن بن زید تو تمام ائمہ حدیث نے اس کو ضعیف اور ناقابل اعتبار راوی قرار دیا ہے: حافظ عمرو بن علی فلاس فرماتے ہیں: میں نے امام عبدالرحمٰن بن مہدی کو اس سے حدیث بیان کرتے ہوئے نہیں سنا۔ امام احمد نے بھی اس کو ضعیف قرار

---

[1] مطلب یہ ہے کہ وہ ان روایتوں میں منفرد ہے۔ ایک تو وہ خود ضعیف، منکر اور جھوٹا ہے اور اس پر یہ کہ اپنی روایتوں میں منفرد بھی ہے۔ سبکی نے حافظ بزار کا یہ قول نقل نہیں کیا۔ کیونکہ یہ ان کے مفاد میں نہیں تھا۔

[2] کذب بیانی کی وجہ سے جس کی حدیثوں کو نظر انداز کر دیا جائے وہ متروک الحدیث ہوتا ہے۔

دیا ہے۔ یحییٰ بن معین نے اس کی روایت کردہ حدیثوں کو دو کوڑی کے برابر بھی نہیں قرار دیا ہے۔ امام بخاری اور امام ابو حاتم فرماتے ہیں: امام علی بن مدینی نے اس کو حد درجہ ضعیف قرار دیا ہے۔ امام ابن عدی نے اس کی روایت کردہ جھوٹی حدیثوں کی مثال میں وہ حدیث پیش کی ہے جو اس سے عبداللہ بن ابراہیم نے اور اس نے سعید بن ابی سعید سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((عُرِجَ بِی إِلَی السَّمَاءِ فَمَا مَرَرْتُ بِسَمَاءٍ إِلَّا وَجَدْتُ فِیْهَا إِسْمِی مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ أَبُوْبَكْرٍ خَلْفِی))[1]

''مجھے آسمان کی بلندیوں پر لے جایا گیا تو میں کسی بھی آسمان سے نہیں گزرا مگر اس میں اپنا نام محمد رسول اللہ اور اپنے پیچھے ابو بکر کا نام پایا۔''

حافظ ابن عبدالباری کی ان محدثانہ وضاحتوں سے یہ بات برہن ہوگئی کہ:

((مَنْ زَارَ قَبْرِی حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِی))

''جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کو میری شفاعت حاصل ہوگئی۔''

اپنے سے سابقہ روایت کی طرح حسب ذیل روایت:

((مَنْ زَارَ قَبْرِی وَ جَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِی))

''جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔''

بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب جھوٹ ہے۔

اور شیخ تقی الدین سبکی جیسے مدعی علم حدیث کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔

(۲۴۵)...... مَنْ جَاءَ نِی زَائِرًا لَا تَعْمَلُهُ حَاجَةٌ إِلَّا زِیَارَتِی كَانَ حَقًّا عَلَی أَنْ اَكُوْنَ لَهُ شَفِیْعًا یَوْمَ الْقِیَامَةِ))

''جو میری زیارت کی غرض سے میرے پاس آئے گا میری زیارت کے سوا اس کی کوئی اور غرض نہ ہوگی تو میرے اوپر یہ واجب ہو جائے گا کہ قیامت کے روز میں اس کا شفیع اور شفاعتی بنوں۔''

یہ روایت بھی سند اور متن کے اعتبار سے ضعیف اور منکر ہے۔ اس کا ذکر نہ تو صحیحین میں، نہ سنن

---

[1] الصارم المنکی: ص ۴۱، ۴۲۔

اربعہ میں اور نہ مسند احمد میں آیا ہے۔ نہ ان ائمہ حدیث میں سے کسی نے اس کی روایت کی ہے جن کی روایتوں کا اعتبار ہے۔ نہ کسی ایسے امام حدیث نے اس کو صحیح قرار دیا ہے جس کی تصحیح معتبر اور معتمد علیہ ہے۔ اس کی روایت میں ایک ایسا راوی منفرد ہے جس کی شہرت اس زیر بحث روایت سے ہے یا ایک دوسری موضوع روایت سے جس کا ذکر حافظ طبرانی نے المعجم الکبیر [1] اور المعجم الاوسط [2] میں کیا ہے اور دونوں کی سند ایک ہے اور اس کے الفاظ ہیں:

((اَلْحِجَامَةُ فِي الرَّأْسِ أَمَانٌ مِنَ الْجُنُوْنِ وَالْجُذَامِ وَالْبَرَصِ وَالنُّعَاسِ وَالضِّرْسِ))

''سر میں پچھنا لگوانا جنون، جذام برص اونگھ اور داڑھ کے درد سے محفوظ رکھتا ہے۔''

علامہ حافظ محمد بن احمد بن عبدالہادی نے الصارم [3] المنکی میں زیر بحث روایت کی جو سند نقل کی ہے وہ درج ذیل ہے:

عبداللہ بن محمد عبادی سے روایت ہے۔ وہ مسلمہ بن سالم جہنی سے روایت کرتے ہیں۔ وہ عبیداللہ بن عمر سے وہ نافع سے، وہ سالم سے اور وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا......

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی روایت میں ایک ایسا شیخ منفرد ہے جس کو علم حدیث کی روایت اور تحمل کے میدان میں کوئی شہرت حاصل نہیں ہے اور نہ اس کا حال ہی معلوم و معروف ہے۔ اس کا نام مسلمہ بن سالم جہنی بصری ہے۔ اس سے اس حدیث کی روایت کرنے والا عبداللہ بن محمد عبادی ہے جس کا شماران رواۃ حدیث میں ہوتا ہے جن کی منفرد روایتیں ائمہ حدیث کے نزدیک نا قابل استدلال ہیں۔

محدث محمد ناصر الدین البانی نے بھی اس سند کو بے حد ضعیف قرار دیا ہے اور راوی کا نام مسلمہ کے بجائے ''مسلم'' لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محدثین کے حلقوں میں وہ دونوں ناموں: مسلم اور مسلمہ سے معروف [4] تھا۔

البانی لکھتے ہیں:

مسلم بن سالم جہنی کو امام ابوداؤد نے غیر ثقہ قرار دیا ہے اور حافظ ہیثمی نے مذکورہ سند کے ضعیف ہونے کی یہی علت قرار دی ہے۔

---

[1] المعجم الکبیر: ص ۲۹۲ ج ۱۲ ح: ۱۳۱۵۰۔

[2] المعجم الاوسط: ص ۲۷۶ ج ۵ ح ٤٥٤٤۔

[3] الصارم: ص ٤٩۔ [4] تقریب التہذیب: ص ٤٦٢ ترجمہ ٦٦٣٨۔

رہا عبداللہ بن محمد عبادی تو صرف حافظ ابوبکر محمد بن ابی مظفر سمعانی نے اس کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس کی جرح وتعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ لہٰذا وہ مجہول الحال[1] ہے۔

زیر بحث روایت:

((مَنْ جَاءَنِي زَائِرًا لَا تَعْمَلُهُ حَاجَةٌ إِلَّا زِيَارَتِي كَانَ حَقًّا عَلَيَّ أَنْ أَكُوْنَ لَهُ شَفِيْعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

"جو میری زیارت کی غرض سے میرے پاس آئے گا، میری زیارت کے سوا اس کی کوئی اور غرض نہ ہوگی تو میرے اوپر یہ واجب ہوجائے گا کہ قیامت کے روز اس کا شفیع اور سفارشی بنوں۔"

کے نا قابل قبول اور نا قابل استدلال ہونے کے لیے اوپر کی وضاحتیں کافی ہیں۔ البتہ اس کی جانب اشارہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت میں نبی کریم ﷺ کی قبر کی زیارت یا آپ کی وفات کے بعد آپ کی زیارت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا یہ روایت ان لوگوں کے دعویٰ کی دلیل بننے کے قابل بھی نہیں ہے جو نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کو مشروع قرار دیتے ہیں۔

(۲۴۶)......((مَنْ زَارَ قَبْرِي بَعْدَ مَوْتِي فَكَأَنَّمَا زَارَنِي فِي حَيَاتِي وَمَنْ حَجَّ وَلَمْ يَزُرْ قَبْرِي فَقَدْ جَفَانِي))

"جس نے میری موت کے بعد میری قبر کی زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔ اور جس نے حج کیا اور میری قبر کی زیارت نہیں کی تو اس نے مجھ سے بے رخی برتی۔"

یہ روایت بھی من گھڑت اور جھوٹ ہے جو دو روایتوں کو جوڑ کر ایک روایت کی شکل میں بنالی گئی ہے۔

علامہ حافظ ابن عبدالہادی نے فرماتے ہیں:

یہ روایت حد درجہ منکر ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ بلکہ من گھڑت اور موضوع ہے جس سے استدلال کرنا اور اس پر اعتقاد کرنا جائز نہیں ہے۔ جس کے درج ذیل اسباب ہیں:

(۱)...... یہ نعمان بن شبلی کی روایت کردہ ہے جس پر امام حافظ موسیٰ بن ہارون حمال نے وضع

---

[1] الضعیفہ ص ۱۵، ۱۶ ج ۸، ص ۵۲۰، ۵۲۳ ج ۱۲۔

حدیث کا الزام لگایا ہے۔[1] امام ابو حاتم بن حبان بستی کا قول ہے: وہ ثقہ راویوں کے نام سے نہایت مصائب آمیز روایتیں نقل کرتا تھا یا ان کو الٹ پلٹ کر روایت کیا کرتا تھا۔[2]

(۲)......اس کی سند میں محمد بن فضل بن عطیہ شامل ہے جو بہت بڑا جھوٹا تھا۔[3] امام یحییٰ بن معین نے بھی اس کو کذاب قرار دیا ہے۔ امام احمد کا قول ہے وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی روایت کردہ حدیثیں اہل کذب کی حدیثوں کی مانند ہیں۔ جوزجانی، فلاس اور ابو حاتم رازی نے بھی اس کو جھوٹا قرار دیا ہے۔[4] غرض یہ کہ تمام ائمہ حدیث نے اس کی تکذیب کی ہے۔[5]

(۳)......اس سند میں جابر جعفی بن شامل ہے جس کے بارے میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: میں نے جابر جعفی سے بڑا جھوٹا نہیں دیکھا ہے۔[6] امام نسائی نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔[7] بلکہ تمام ہی محدثین اور فقہاء نے اس کو کذاب قرار دیا ہے۔[8] وہ عقیدتاً رافضی تھا۔[9]

اس نہایت تاریک اور ناقابل استدلال سند کے بعد جس میں جھوٹے اور حدیثیں وضع کرنے والے راوی جمع ہو گئے ہیں، یہ روایت کس طرح قابل اعتماد ہو سکتی ہے اور ''اس سے وہی شخص استدلال کر سکتا ہے جو علم حدیث سے کورا اور احکام شرع سے نابلد ہو۔''[10]

(۲۴۷)......مَنْ زَارَ قَبْرِي أَوْ مَنْ زَارَنِي كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا أَوْ شَهِيدًا))

''جو میری قبر کی زیارت کرے گا یا میری زیارت کرے گا میں اس کے لیے شفاعت کرنے والا یا اس کے لیے گواہی دینے والا ہوں گا۔''

یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اپنی سند میں انقطاع راویوں کے غیر معروف ہونے اور راویوں

---

[1] معجم اسامی الرواۃ: ص ۲۷۹ ج ٤۔
[2] المجروحین: ص ۷۳ ج ۳۔
[3] المجروحین: ۲۷۸ ج ۲۔ الضعیفه: ص ۱۸٦، ۱۹۲، ج ۲۔
[4] احوال الرجال ص ۲۰۲ ترجمه: ۳۷٤۔ الجرح والتعدیل ص ٥٦ ج ۸۔
[5] التقریب ص ٤۳٦ ترجمه: ٦۲۲٥۔
[6] الضعفاء ص۱۹٦ ج ۲۔
[7] الضعفاء والمتروکین ص ۷۱ ترجمه ۱۰۰۔
[8] معجم اسامی الرواۃ ص ۳٤۹، ۳۳۲، ج ۱۔
[9] التقریب ص ۷٦ ترجمه ۸۷۸۔
[10] الصارم المنکی ص ۷٥۔

میں اضطراب اور اختلاف کی وجہ سے ساقط الاعتبار ہے۔ یہ روایت حقیقت میں ایک ہی ہے لیکن سند اور متن میں اضطراب اور اختلاف کی وجہ سے علم حدیث سے نابلد لوگوں نے اس کو تین روایتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس فحش غلطی کرنے والوں میں شیخ تقی الدین سبکی بھی شامل ہیں جن کو علم حدیث کی وسیع معرفت حاصل تھی مگر عقیدے کی خرابی، حق دشمنی اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے شدید بغض وعناد نے ان کو اندھا بنا دیا تھا جس کی وجہ سے اپنی کتاب ''شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام'' میں منکر اور موضوع روایتیں بھر دی ہیں۔

اس زیر بحث روایت کو امام بیہقی نے اپنی کتاب ''السنن الکبریٰ''[1] میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

یہ سند مجہول ہے۔ اس روایت کو حافظ ابوداؤد سلیمان بن داؤد بن جارود طیالسی بصری نے اپنی مسند میں اس سند سے نقل کیا ہے: ہم سے سوار بن میمون ابو جراح عبدی نے بیان کیا کہ: مجھ سے آل عمر کے ایک آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((مَنْ زَارَ قَبْرِی ، أَوْ قَالَ: مَنْ زَارَنِی كُنْتُ لَهُ شَفِيْعًا أَوْ شَهِيْدًا ، وَمَنْ مَاتَ فِیْ أَحَدِ الْحَرَمَيْنِ بَعَثَهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مِنَ الْآمِنِيْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

''جو میری قبر کی زیارت کرے گا، یا فرمایا جو میری زیارت کرے گا میں اس کے لیے شفاعت کرنے والا یا اس کے لیے گواہ بنوں گا۔ اور جو دونوں حرموں میں سے کسی ایک میں مرے گا اللہ عزوجل اس کو اس حال میں اٹھائے گا کہ وہ قیامت کے دن اس کی ہولناکی سے محفوظ لوگوں میں شامل ہوگا۔''

حافظ ابن عبد الہادی لکھتے ہیں:

''دوسرے لوگوں نے ابوداؤد طیالسی سے اس روایت کی سند اور عبارت میں اختلاف کیا ہے اور ان کے شیخ: سوار بن میمون کو بعض راویوں نے الٹ دیا ہے اور میمون بن سوار کر دیا ہے۔ یہ میمون بن سوار مجہول ہے جس کی عدالت اور ضبط کا حال غیر معروف ہے۔ اس کو روایت حدیث اور تحمل کے میدان میں کوئی شہرت نہیں حاصل ہے۔ ابوداؤد کی روایت میں ''سوار'' کا شیخ مبہم اور غیر معروف شخص ہے۔ جو مجہول

[1] السنن الکبریٰ للبیهقی: ص ۲۲۵ ج ۵۔

سے بری صفت ہے۔ بعض راویوں نے اس کا ذکر "عن رجل من آل عمر" سے کیا ہے۔ جیسا کہ اس روایت میں ہے۔ جب کہ دوسروں نے "عن رجل من ولد حاطب" کہا ہے اور کچھ نے تو "عن رجل من آل الخطاب" روایت کیا ہے۔[1]

سند کے دو روایوں کے مجہول اور مبہم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں مذکورہ اضطراب اور اختلاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ روایت نا قابل اعتماد ہے۔ اس روایت کے باطل ہونے کے جو مزید دلائل حافظ ابن عبدالہادی نے دیئے ہیں اور میمون بن سوار یا سوار بن میمون کے بارے میں امام بخاری اور حافظ عقیلی کے جو اقوال نقل کیے ہیں وہ تفصیل مزید کا درجہ رکھتے ہیں۔ جن کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

البتہ عقیل نے اپنی کتاب "الضعفاء"[2] میں اس روایت کی جو دوسری سند اور دوسرا متن نقل کیا ہے ان کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ رسول اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کو شرعی رنگ دینے کے لیے بیمار ذہنیت کے مالک لوگوں نے کیا کیا کوششیں صرف کی ہیں۔

حافظ عقیلی فرماتے ہیں:

ہم سے محمد بن موسیٰ نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے احمد بن حسن ترمذی نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالملک بن ابراہیم عدی نے بیان کیا، کہا: ہم سے شعبہ نے، سوار بن میمون سے، انہوں نے ہارون بن قزعہ سے، انہوں نے آل خطاب کے ایک آدمی سے اور اس نے نبی مکرم ﷺ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَنْ زَارَنِي مُتَعَمِّدًا كَانَ فِي جَوَارِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ مَاتَ فِي أَحَدِ الْحَرَمَيْنِ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِي الْآمِنِيْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

"جو میری زیارت قصداً کرے گا وہ قیامت کے دن میرے جوار میں ہوگا اور جو کوئی حرمین میں سے کسی ایک میں مرے گا اس کو اللہ ان لوگوں کے زمرے میں اٹھائے گا جو قیامت کے دن محفوظ ہوں گے۔"

حافظ عقیلی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: یہ روایت کمزور ہے۔

یہاں یہ بات نگاہ میں رہے کہ اس زیر بحث روایت کے پہلے سفر میں نبی مکرم و معظم ﷺ کی قبر

[1] الصارم المنکی: ص ۹۶، ۹۷۔ [2] الضعفاء: ص ۳۶۱ ج ٤۔

مبارک یا آپ کی وفات کے بعد آپ کی زیارت مذکور نہیں ہے۔ اس لیے یہ روایت قبوریوں کے حق میں نافع نہیں ہے۔ حافظ ابن عبدالہادی لکھتے ہیں۔

حافظ عقیلی کی روایت میں اسی طرح "عن رجل من آل الخطاب" آل خطاب کے ایک آدمی سے روایت ہے، آیا ہے جو ابوداؤد طیالسی کی روایت: "عن رجل من آل عمر" آل عمر کے ایک آدمی سے روایت ہے" کے مطابق ہے۔ یہ گویا "من حاطب" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ امام بخاری کی تاریخ میں "عن رجل من ولد حاطب" اولاد حاطب کے ایک آدمی سے روایت ہے" مذکور ہے، جب کہ عقیلی کی روایت میں "عمر" کا ذکر نہیں ہے اور طیالسی کی روایت میں ہے۔ اسی طرح امام بخاری نے وکیع کی جو روایت نقل کی ہے اس میں بھی "عمر" کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ابوداؤد طیالسی کی روایت میں "عمر" کا ذکر "وھم" ہے۔ اسی طرح ان کی روایت کا تمام تر "مدار" ہارون پر ہے جو ایک مجہول اور غیر معروف شیخ ہے۔ جس کا ذکر صرف اسی حدیث میں آیا ہے اور حافظ ابوالفتح ازدی نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ہارون متروک الحدیث اور نا قابل استدلال ہے۔"

حافظ ابن عبدالہادی آگے لکھتے ہیں:

اوپر کی بحث سے یہ واضح ہوا کہ اس زیر بحث روایت کا تمام تر "مدار" ہارون ابن قزعہ" پر ہے جو صرف اسی حدیث کی روایت سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی ایسا "حال" معلوم نہیں جس کے بنیاد پر اس کی "خبر" قبول کرنے کے قابل ہو۔ اس کا ذکر نہ تو ابن ابی حاتم نے "الجرح والتعدیل" میں کیا ہے۔ نہ امام ابو احمد حاکم نے "کتاب الکنی" میں اور نہ ہی امام نسائی نے کتاب الکنیٰ میں اس سے تعرض کیا ہے۔ وہ خود مجہول ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے مبہم اور غیر متعین شخص سے اپنی روایت میں منفرد بھی ہے جس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم کہ وہ کون ہے اور کس کا بیٹا ہے؟ لہٰذا اس طرح کے دو مجہول اور غیر معروف راویوں کی روایت کردہ حدیث کو ایسا کوئی بھی شخص حجت تسلیم نہیں کر سکتا جس کو حدیث کا وزن معلوم ہوگا۔ یا وہ اس علم سے کچھ بھی واقف ہوگا۔ مزید یہ کہ ہارون ابی قزعہ سے اس حدیث کا راوی: میمون بن سوار عبدی ایک ایسا شخص ہے جس کا نام مختلف فیہ ہے۔ کسی بھی امام حدیث نے اس کی توثیق نہیں کی ہے۔ بلکہ سب نے اس کو مطعون کیا ہے اور اس کی روایت کو رد کر دیا ہے۔"[1]

(۲۴۸)......مَنْ حَجَّ حِجَّةَ الْإِسْلَامِ وَزَارَ قَبْرِي وَغَزَا غَزْوَةً وَصَلَّى

[1] الصارم المنکی: ص ۹۷، ۹۸۔

عَلَیَّ فِی بَیْتِ الْمَقْدِسِ لَمْ یَسْأَلْهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِیْمَا افْتَرَضَ عَلَیْهِ))

''جس نے اسلامی حج کیا، میری قبر کی زیارت کی، اور کسی غزوہ میں حصہ لیا، بیت المقدس میں میرے اوپر درود بھیجا تو اللہ عزوجل ان اعمال کے بارے میں اس سے سوال نہیں کریں گے جو اس نے اس پر فرض کیے ہیں۔''

یہ روایت موضوع اور رسول اللہ ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے۔ امام شوکانی نے الفوائد المجموعہ[1] میں، ابوالحسن علی بن عراق نے تنزیہ الشریعہ[2] میں، حافظ سیوطی نے ذیل الاحادیث[3] الموضوع میں، محدث البانی نے الضعیفہ[4] میں اور حافظ ابن عبدالہادی نے الصارم المنکی[5] میں اس کو موضوع اور باطل قرار دیا ہے۔ اگر حافظ سیوطی کسی حدیث کو خاص طور پر جو فضائل سے متعلق ہو باطل اور موضوع قرار دے دیں تو پھر اس کے بارے میں کسی اور کی رائے جاننے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ وہ اس طرح کی حدیثوں کو موضوع کہنے کے لیے بڑی مشکل سے تیار ہوتے ہیں۔

اس زیر بحث حدیث کو کسی بھی محدث یا علم حدیث سے تعلق رکھنے والے نے صحیح نہیں کہا ہے۔ حتیٰ کہ اس حدیث سے استدلال کرنے والے شیخ تقی الدین سبکی نے بھی بصراحت اس کو صحیح نہیں کہا ہے البتہ اس کے بارے میں بعض ائمہ حدیث کی غیر مستند آراء کا حوالہ دے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کی غرض سے سفر مشروع ہے اور اس بات کی مطلقاً پروا نہیں کی کہ یہ روایت تو تمام فرائض کو کالعدم کر دینے اور ان کے ناقابل مواخذہ ہونے پر مبنی ہے۔

حافظ ابن عبدالہادی نے تقی الدین سبکی کا جواب دیتے ہوئے پورے وثوق سے کہا ہے کہ اس کی روایت عبدالرحمٰن بن مسعود، علقمہ، ابراہیم، منصور اور سفیان ثوری میں سے کسی نے نہیں کی ہے۔

اس جھوٹی روایت کی اصل آفت بدر بن عبداللہ ابوسہل مصیصی ہے جو وضاع حدیث تھا۔[6] رہے ابوالفتح محمد بن حسین ازدی تو ان کا دامن اس باطل روایت کو گھڑنے سے پاک ہے۔[7]

(۲۴۹)......مَنْ زَارَنِی بَعْدَ مَوْتِی فَکَأَنَّمَا زَارَنِی وَأَنَا حَیٌّ))

''جس نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں میری

[1] الفوائد: ص ۱۰۹، ج ۱۸۔
[2] تنزیہ الشریعہ: ص ۱۷۵، ح ۲۲۔
[3] الأحادیث الموضوعہ: ص ۱۲۲ ح ۵۷۱۔
[4] الضعیفہ: ص ۳۶۹، ۳۷۱ ح ۲۰۴۔
[5] الصارم المنکی: ص ۱۶۹ ح ۹۔
[6] تنزیہ الشریعہ ص ۴۱ ج ۱۔ معجم اسامی الرواۃ: ص ۴۸۳ ج ۱۔
[7] الضعیفہ: ص ۳۷۰ ج ۱۔

زیارت کی۔"

یہ روایت بھی اپنی سند اور متن کے اعتبار سے باطل اور جھوٹ ہے۔ کیونکہ یہ اس فاسد عقیدہ پر مبنی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو دینوی زندگی حاصل ہے۔ حالانکہ آپ کو قبر میں جو زندگی حاصل ہے وہ برزخی زندگی ہے۔ جس طرح شہداء کو برزخی زندگی حاصل ہے۔ مگر اس دنیا سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہی تمام محدثین اور فقہاء کا عقیدہ ہے۔

اس بے بنیاد اور منکر روایت کی سند نہایت تاریک ہے۔ جس کو بنانے اور گھڑنے والا عبداللہ عمری ہے۔ اس کی سند میں شامل دوسرے دو راوی: حسن بن محمد سوسی اور احمد بن سہل بن ایوب اہوازی ہیں جو منکر روایتیں روایت کیا کرتے تھے۔ لہٰذا ان کی دی ہوئی خبر یقیناً تصدیق و اعتماد ہے اور اس کا چوتھا راوی خالد بن یزید عمری مکی متروک الحدیث تھا جس پر کذب بیانی کا الزام تھا۔

امام ابن ابی حاتم فرماتے ہیں:

خالد بن یزید عمری نے سفیان ثوری، اسحاق بن یحییٰ بن طلحہ، عبداللہ عمری اور ابو العصر ثابت بن قیس سے روایت کی ہے۔ میں نے اپنے والد کو ایسا کہتے ہوئے سنا ہے اور اس سے علی بن حرب موصل نے روایت کی ہے۔ ابو زرعہ نے کچھ دنوں اس سے سن کر حدیثیں لکھیں پھر اس سے روایت کرنا چھوڑ دیا۔ میں نے یحییٰ بن معین کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ خالد بن یزید عمری کذاب ہے۔ میرے والد سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: جھوٹا ہے۔ میں مکہ میں اس کے پاس گیا تھا مگر اس کی مرویات نہیں لکھیں۔ کیونکہ اس کی روایت کردہ حدیثیں نا قابل اعتماد تھیں۔[1]

امام ابو حاتم بن حبان کا قول ہے۔

خالد بن یزید عمری ابو الولید مکہ میں مقیم تھا۔ مسلک اہل حدیث کا قائل تھا مگر سفیان ثوری کے نام سے حد درجہ منکر اور جھوٹی حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔[2]

(۲۵۰)......مَنْ زَارَنِي مُحْتَسِبًا إِلَى الْمَدِيْنَةِ كَانَ فِي جِوَارِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَفِي رِوَايَةٍ: مَنْ زَارَنِي بِالْمَدِيْنَةِ مُحْتَسِبًا كُنْتُ لَهُ شَفِيْعًا وَشَهِيْدًا۔

"جس نے مدینہ جا کر اجر و ثواب کی نیت سے میری زیارت کی تو قیامت کے روز وہ میرا

---

[1] الجرح والتعدیل ص ۳۶۰ ج ۳۔ الصارم المنکی ۱۷۲۔ معجم اسامی الرواۃ: ص ۶۲۴، ۶۲۵۔
[2] المجروحین: ص ۲۸۴ ج ۱۔

ہمسایہ ہوگا۔ ایک دوسری روایت میں ہے: جس نے اجر وثواب کی نیت سے مدینہ میں میری زیارت کی تو میں اس کے لیے شفاعت کرنے والا اور گواہی دینے والا ہوں گا۔''

یہ روایت موضوع تو نہیں ہے لیکن ضعف اور نا قابل اعتبار ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

تاریخ جرجان میں یہ روایت اس سند سے بیان ہوئی ہے:

ہم سے ابوبکر صرامی نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابوعوانہ موسیٰ بن یوسف قطان نے بیان کیا، کہا: ہم سے عباد بن موسیٰ ختلی نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابن ابی فدیک نے سلیمان بن یزید تغلبی سے، انہوں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ...... اس کے بعد البانی تحریر فرماتے ہیں:

یہ سند ضعیف ہے۔ کیونکہ اس سلیمان بن یزید کو امام ابوحاتم نے منکر الحدیث بتایا ہے اور ابن حبان کا قول ہے: اس کی روایت کردہ حدیثوں سے استدلال کرنا جائز نہیں ہے۔ سند کے دوسرے راوی: موسیٰ بن یوسف قطان کے حالات کسی نے نہیں لکھے ہیں۔ رہا ابوبکر صرابی جس کا نام محمد بن احمد بن اسماعیل ہے تو تاریخ جرجان کے مصنف نے اس کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ اس کی وفات ۳۵۸ھ میں ہوئی اور اس کی جرح وتعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔[1]

حافظ ابن عبدالہادی لکھتے ہیں:

یہ حدیث صحیح اور ثابت نہیں ہے بلکہ ضعیف ہے۔ اس کی سند منقطع ہے۔ اگر یہ ثابت بھی ہوتی تو اس میں زیر بحث مسئلے: ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت'' کی کوئی دلیل نہیں ہے۔[2]

(۲۵۱)......مَا مِنْ اَحَدٍ مِنْ أُمَّتِي لَهُ سَعَةٌ ثُمَّ لَمْ يَزُرْنِي فَلَيْسَ لَهُ عُذْرٌ۔

''میری امت کا کوئی بھی فرد جسے طاقت وفرصت حاصل ہو پھر بھی وہ میری زیارت نہ کرے تو اس کے لیے بھی عذر نہیں ہے۔''

یہ روایت بھی جھوٹ اور من گھڑت ہے۔ شیخ تقی الدین سبکی نے اس کی درج ذیل سند نقل کی ہے:

حافظ ابوعبداللہ محمد بن محمود بن نجار اپنی کتاب ''الدرة الثمينه فى فضائل المدينة'' میں لکھتے ہیں: ہمیں ابومحمد بن علی نے خبر دی کہا: ہمیں ابویعلی ازدی نے خبر دی: ہمیں ابواسحاق بجلی نے خبر دی، کہا: ہمیں سعید بن ابی سعید نیساپوری نے خبر دی، کہا: ہمیں ابراہیم بن محمد مودب نے خبر دی کہا: ہمیں

---

[1] الضعیفه: ص ۱۱۲ ج ۱۰۔ [2] الصارم المنکی: ص ۱۷۵۔

ابراہیم بن محمد نے خبر دی، کہا: ہم سے محمد بن محمد نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن مقاتل نے بیان کیا، کہا: ہم سے جعفر بن ہارون نے بیان کیا، کہا: ہم سے سمعان بن مہدی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((مَنْ زَارَنِي مَيِّتًا فَكَأَنَّمَا زَارَنِي حَيًّا، وَمَنْ زَارَ قَبْرِي وَ جَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِي يَوْمِ الْقِيَامَةِ: وَ مَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ أُمَّتِي لَهُ سَعَةٌ ثُمَّ لَمْ يَزُرْنِي فَلَيْسَ لَهُ عُذْرٌ))

''جس نے میری زیارت مردہ حالت میں کی تو گویا اس نے میری زیارت زندہ حالت میں کی۔ اور جس نے میری قبر کی زیارت کی تو قیامت کے دن اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔ میری امت کا کوئی بھی فرد جسے طاقت و فرصت حاصل ہو پھر بھی وہ میری زیارت نہ کرے تو اس کے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔''

حافظ ابن عبدالہادی لکھتے ہیں:

''معترض نے اس حدیث کا ذکر اسی طرح کیا ہے اور اس کی صحت وسقم کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔ حالانکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ ہے اور سمعان مہدی کے سر منڈھ دی گئی ہے۔ اللہ اسے گھڑنے والے کا منہ کالا کرے! سمعان مہدی تک اس کی سند تاریکی پر تاریکی ہے۔ رہا سمعان مہدی تو وہ ایسے حیوانوں میں سے ہے جن کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ آیا ان کا کوئی وجود ہے یا نہیں؟!

رہے تقی الدین سبکی تو اگر ان کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ یہ روایت موضوع ہے تو وہ لوگوں میں اس علم سے سب سے زیادہ بے بہرہ تھے۔ اگر ان کو یہ بات معلوم تھی کہ یہ روایت جھوٹ ہے پھر بھی اس کی صحت وسقم بیان کیے بغیر اس کو بطور دلیل نقل کر دیا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مصداق ہیں:

((مَنْ حَدَّثَ عَنِّي بِحَدِيْثٍ وَهُوَ يُرَى أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِيْنِ))[1، 2]

''جو میری نسبت سے ایسی حدیث بیان کرے جس کے بارے میں اس کا خیال ہو کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ دو جھوٹوں میں سے ایک ہے۔

(۲۵۲)......مَنْ زَارَنِي حَتَّى يَنْتَهِيَ إِلَى قَبْرِي كُنْتُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَهِيْدًا أَوْ شَفِيْعًا۔

---

[1] مقدمه صحيح مسلم: ج ۳۰ بحواله منّة المعنم: ج ۱ ، [2] الصارم المنكى: ص ۱۷۷۔

''جو میری زیارت کرے یہاں تک کہ میری قبر تک پہنچ جائے تو میں قیامت کے دن اس کے لیے گواہ یا شفاعت کرنے والا ہوں گا۔''

یہ روایت بھی بے حد منکر ہے، صحیح حدیث نہیں ہے۔

شیخ تقی الدین سبکی لکھتے ہیں:

حافظ ابو جعفر عقیلی نے اپنی کتاب ''الضعفاء'' میں فضالہ بن سعید بن زمیل مازنی کے حالات......

ترجمہ...... کے ضمن میں اس حدیث کا ذکر درج ذیل سند سے کیا ہے۔

ہم سے سعید بن محمد حضرمی نے بیان کیا، کہا: ہم سے فضالہ بن سعید بن زمیل مازلی نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن یحییٰ مازنی نے ابن جریج سے، انہوں نے عطاء سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((مَنْ زَارَنِی فِی مَمَاتِی کَانَ کَمَنْ زَارَنِی فِی حَیَاتِی، وَمَنْ زَارَنِی حَتَّی یَنْتَهِیَ إِلَی قَبْرِی کُنْتُ لَهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ شَهِیْدًا أَوْ قَالَ: شَفِیْعًا))

''جس نے میری وفات کے بعد کی حالت میں میری زیات کی تو وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے میری بندگی میں میری زیارت کی۔ اور جس نے میری زیات اس طرح کی کہ وہ میری قبر تک پہنچ گیا تو قیامت کے دن میں اس کے لیے گواہ ہوں گا۔ یا فرمایا: شفاعت کرنے والا۔''

سبکی نے آگے لکھا ہے:

حافظ ابن عساکر نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب میں اپنی سند سے کیا ہے جو حافظ ابو جعفر محمد بن عمرو عقیلی کے بعد سابقہ سند کی طرح ہے البتہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

((مَنْ زَارَنِیْ فِی الْمَنَامِ کَانَ کَمَنْ زَارَنِی فِی حَیَاتِی))

''جس نے نیند میں میری زیارت کی تو وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔''

حافظ ابن عبدالہادی لکھتے ہیں۔

یہ حدیث بھی بے حد منکر ہے، صحیح اور ثابت نہیں ہے جو حافظ عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج کے نام پر گھڑی گئی ہے۔ اس کی سند اور متن دونوں میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔

حافظ عقیلی کی کتاب "الضعفاء" کے ابن عساکر کے نسخے میں "من زارنی" جس نے میری زیارت کی" نہیں، بلکہ "مَن رآنی "جس نے مجھے دیکھا" آیا ہے۔ اس طرح حدیث معنیً صحیح ہو گی۔ کیونکہ صحیح حدیث کے الفاظ ہیں:

((مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي لِأَنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ بِي))[1]

"جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے مجھے ہی دیکھا ہے۔ اس لیے کہ شیطان میری شبیہ اختیار نہیں کر سکتا۔"

اور ایک دوسری روایت میں ہے:

((مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَسَيَرَانِي فِي الْيَقْظَةِ وَلَا يَتَمَثَّلُ الشَّيْطَانُ بِي))[2]

"جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ مجھے بیداری میں دیکھے گا اور شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا۔"

سند میں یہ تبدیلی کی گئی ہے کہ شعیب بن محمد کی جگہ "سعید بن محمد حضرمی" ذکر کیا گیا ہے جب کہ ماخذ ایک ہے۔

بہر حال یہ روایت ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ فضالہ بن سعید بن زمیل مازنی مجہول ہے اور صرف اسی روایت کے ضمن میں آیا ہے۔

رہا محمد بن یحییٰ مازنی تو وہ مجہول نہیں بلکہ معروف ہے۔ لیکن اس کی عدالت "مختلف فیہ" ہے۔ امام ابن عدی نے کتاب الضعفاء میں اس کو منکر الحدیث لکھا ہے۔[3]

حافظ عقیلی نے زیر بحث حدیث کے بارے میں لکھا ہے: فضالہ کی حدیث غیر محفوظ ہے اور وہ صرف اس حدیث سے معروف ہے۔[4]

امام ذھبی نے اس کی رایت کردہ اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔[5]

(۲۵۳)......مَنْ لَمْ يُمْكِنْهُ زِيَارَتِي ، فَلْيَزُرْ قَبْرَ إِبْرَاهِيمَ الْخَلِيلِ))

---

[1] صحیح بخاری: ح:٦١٩٧۔ صحیح مسلم: ح ٢١٣٤۔

[2] صحیح بخاری: ح٦٩٩٣۔ صحیح مسلم ٤٢٦٦۔

[3] الصارم المنکی: ص ١٨٠۔ الضعفاء ص ٢٢٣٨ ج ٦۔

[4] الارواء: ص ٣٣٥ ج: ٤

[5] معجم اسامی الرواۃ: ص ٣٩٩، ج ٣

''جس کے لیے میری زیارت ممکن نہ ہو اس کو چاہیے کہ وہ ابراہیم خلیل کی قبر کی زیارت کرے۔''

یہ روایت رسول اکرم ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے اور اس کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مستند کتب حدیث میں اس کا ذکر تو درکنار ان کتابوں میں بھی اس کو جگہ نہیں ملی ہے جو جھوٹی اور من گھڑت روایتوں کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ شیخ تقی الدین سبکی کے ترکش کا آخری تیر تھا جس سے انہوں نے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ پر ناکام وار کیا ہے۔

رسول اکرم فداہ ابی وامی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت سے متعلق کتابوں میں مذکور اور لوگوں میں زبان زد جھوٹی اور بے بنیاد روایات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان بد عقیدگیوں کا بھی تفصیلی جائزہ لیا جائے جو دین توحید ''اسلام'' سے نسبت رکھنے یا نسبت کا دعویٰ کرنے والے نام نہاد علماء، بزرگان دین، صلحاء اور عوام میں پھیل ہوئی ہیں۔ عالم اسلام میں عمومی طور پر اور برصغیر کے ملکوں میں خصوصی طور پر بزرگان دین کی قبروں اور مزاروں پر جن مشرکانہ اعمال اور منکرات کا ارتکاب ہوتا ہے وہ نہ تو عربوں کے صنم کدوں میں دیکھے گئے اور نہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں میں۔

صلحائے امت کی قبروں کی زیارت:

اوپر ''زیارت قبور'' کے عنوان کے تحت رسول اکرم ﷺ کے جو ارشادات نقل کیے گئے ہیں، اولاد تو ان میں عام قبروں کی زیارت کی رخصت دی گئی ہے۔ ثانیاً ان میں اس زیارت کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے موت اور اس فانی دنیا کے بعد آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اس طرح ان ارشادات نبویہ سے ضمناً یہ حکم بھی نکلتا ہے کہ اگر قبروں کی زیارت سے موت و آخرت کی یاد تازہ کا مقصد پیش نظر نہ ہو بلکہ کوئی اور ''مقصد'' ہو تو زیارت قبور کا سابقہ حکم برقرار ہے یعنی یہ زیارت ممنوع ہے۔

احادیث میں زیارت کے لیے مخصوص لوگوں کی قبروں کی عدم تخصیص کا سبب بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ موت اور آخرت کی یاد تازہ کرنے کا مقصد ہر طرح کی قبروں کی زیارت سے حاصل ہوتا ہے۔ چاہے وہ عوام کی قبریں ہوں یا خواص کی، مسلمانوں کی قبریں ہوں یا غیر مسلموں کی، البتہ مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کے موقع پر، چاہے وہ عام مسلمانوں کی قبریں ہوں یا مخصوص مسلمانوں کی، ان کو سلام کرنے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور عذاب سے نجات و عافیت طلب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ رہے

کفار تو ان کے لیے استغفار کرنا حرام ہے۔

چونکہ سابقہ قوموں میں شرک کی بیماری انبیاء اور صلحاء کی عقیدت میں غلو کی راہ سے داخل ہوئی ہے جیسا کہ قرآن پاک اور احادیث میں صراحت ہے۔ اس لیے عام لوگوں کی قبروں کی زیارت، مخصوص لوگوں کی قبروں کی زیارت سے موت اور آخرت کی یاد تازہ کرانے میں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد عام لوگوں سے کوئی خاص عقیدت وابستہ کی گئی ہو۔ ان کو اللہ اور بندوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ قرار دے کر ان سے ایسی چیزیں طلب کی گئی ہوں جنہیں دینے پر صرف اللہ تعالیٰ قدرت رکھتا ہے۔ لیکن اولیاء اللہ اور صلحاء کے حق میں ایسا اعتقاد سابقہ قوموں میں بھی رواج پا گیا تھا اور اس امت میں بھی ایسا اعتقاد عام ہے۔

اسی اندیشے کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول فداہ ابی وامی ﷺ نے متعدد مواقع پر قبروں کو سجدہ گاہیں اور عبادت گاہیں بنانے سے منع فرمایا ہے اور ایسا کرنے والوں پر لعنت فرمائی ہے، چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

((قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِی مَرَضِهِ الَّذِی لَمْ یَقُمْ مِنْهُ : لَعَنَ اللّٰهُ الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارَی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِیَائِهِمْ مَسَاجِدَ" لَوْلَا ذٰلِكَ أُبْرِزَ قَبْرُهُ، غَیْرَ أَنَّهُ خَشِیَ أَوْ خُشِیَ أَنْ یُتَّخَذَ مَسْجِدًا))[1]

"رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس بیماری میں جس سے آپ جاں بر نہ ہو سکے فرمایا: یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اگر یہ خوف نہ ہوتا تو آپ کی قبر نمایاں کر دی جاتی۔ لیکن آپ کو اندیشہ ہوا یا اندیشہ محسوس کیا گیا کہ اس کو سجدہ گاہ بنا لیا جائے گا۔"

حافظ ابن حجر فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں:

"أُبْرِزَ قَبْرُهُ" کا مطلب ہے کہ نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کو کھول دیا جاتا اور اس کو دیواروں کے درمیان بند نہ رکھا جاتا۔ ام المومنین کی مراد ہے: آپ کو گھر سے باہر دفن کیا جاتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات مسجد نبوی میں توسیع سے پہلے فرمائی تھی۔ اسی وجہ سے جب مسجد میں توسیع ہوئی تو ان کے حجرے کو مثلث شکل میں دیواروں سے گھیر دیا گیا تاکہ کسی کے لیے یہ ممکن نہ رہے کہ وہ استقبال قبلہ کے

---

[1] صحیح بخاری: ح ۱۳۹۰۔ صحیح مسلم: ح ۵۲۹۔

موقع پر اپنا چہرہ قبر کی طرف کر کے نماز پڑھے۔''[1]

حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پانچ دن قبل آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((إِنِّي أَبْرَأُ إِلَى اللّٰهِ أَنْ يَكُوْنَ لِي مِنْكُمْ خَلِيْلٌ ، فَإِنَّ اللّٰهَ قَدِ اتَّخَذَنِي خَلِيْلًا كَمَا اتَّخَذَ إِبْرَاهِيمَ خَلِيْلًا، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا مِنْ أُمَّتِي خَلِيْلًا لَا تَّخَذْتُ أَبَابَكْرٍ خَلِيْلًا، أَلَا وَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ أَنْبِيَآئِهِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ، أَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ ، فَإِنِّي أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ))[2]

''میں اللہ تعالیٰ سے اس بات سے اظہار برأت کرتا ہوں کہ تم میں سے کوئی میرا خلیل ہو۔ کیونکہ اللہ نے مجھے اپنا خلیل بنا لیا ہے جب کہ اس نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا تھا۔ اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو خلیل بناتا۔ آگاہ رہو! تم سے پہلے لوگ اپنے نبیوں اور صالح لوگوں کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا کرتے تھے۔ خبردار! تم لوگ قبروں کو سجدہ گاہیں مت بنانا۔ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔''

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: فرماتی ہیں:

ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک گرجا کا ذکر کیا جسے انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا جس میں تصویریں تھیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ أُوْلٰئِكَ إِذَا كَانَ فِيْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَمَاتَ، بَنَوا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا، وَصَوَّرُوا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوْرَ، فَأُوْلٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))[3]

''درحقیقت ان میں اگر کوئی صالح اور نیک آدمی ہوتا اور وہ مرجاتا تو اس کی قبر پر مسجد، عبادت گاہ، بنا لیتے اور اس میں یہ تصویریں بنا دیتے۔ قیامت کے دن یہ لوگ اللہ کے نزدیک بدترین لوگ ہوں گے۔''

---

[1] فتح الباری: ص ۸۳۶ ج ۱۔ [2] صحیح مسلم: ح ۵۳۷۔۱۱۱۸

[3] صحیح بخاری: ح ۴۲۷۔ صحیح مسلم: ح ۵۴۸

رسول اکرم ﷺ نے قبروں کو پختہ بنانے، ان پر بیٹھنے اور ان پر عمارتیں بنانے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ، وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ وَأَنْ يُبْنَى عَلَيْهِ))[1]

''رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ قبر پختہ کی جائے اور یہ کہ اس پر بیٹھا جائے۔ اور اس پر عمارت بنائی جائے''

رسول اللہ ﷺ زیادہ اونچی قبروں کو زمین کے برابر کروا دیتے تھے، مشہور تابعی ثمامہ بن شفی بیان کرتے ہیں:

ہم حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کے ساتھ روم میں تھے جہاں ہمارے ایک ساتھی کی وفات ہوگئی۔ فضالہ نے ہمیں حکم دیا ان کی قبر کو زمین کے برابر بنائیں۔ پھر فرمایا:

((سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَأْمُرُ بِتَسْوِيَتِهَا))[2]

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو قبروں کو برابر کر دینے کا حکم دیتے ہوئے سنا ہے''

قبر کو زمین کے برابر کر دینے کا مطلب ہے کہ اس کو صرف اتنی اونچی رکھا جائے کہ معلوم ہو یہ قبر ہے اور لوگ اس کا احترام کریں۔ چنانچہ ابو السہیاج اسدی سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا:

((أَلَا أَبْعَثُكَ عَلَى مَا بَعَثَنِي عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ لَا تَدَعَ تِمْثَالًا إِلَّا طَمَسْتَهُ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا إِلَّا سَوَّيْتَهُ))۔[3]

''کیا میں تم کو اس مہم پر نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا؟ یہ کہ تم کسی تمثال اور مجسمہ کو مٹائے بغیر اور کسی اونچی قبر کی برابر کیے بغیر مت چھوڑنا۔''

اوپر قبروں، قبروں کی زیارت اور انبیاء علیہم السلام اور صلحاء کی قبروں کو عبادت گاہیں بنانے والوں پر اللہ کی لعنت سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے صریح اور واضح ارشادات نقل کیے گئے ہیں جن کو اللہ کی اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور رسولوں کے بعد مقدس ترین لوگوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حرزِ جان بنائے

[1] صحیح مسلم: ح ۹۷۰، ۲۲۴۵۔
[2] صحیح مسلم: ح ۹۲۸، ۲۲۴۲۔
[3] صحیح مسلم: ح ۹۶۹، ۲۲۴۳۔

رکھا۔ ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے زمانوں میں بھی ان پر عمل جاری رہا۔ وسیع و عریض اسلامی دنیا میں لاکھوں کی تعداد میں ادھر ادھر پھیلی ہوئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبروں کو ''مرجع خلائق مزارات'' میں تبدیل نہیں کیا گیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں اسلام کے متوازی ایک نیا دین پیدا ہو گیا جو ''طریق ولایت، طریقت، الہامی نظام اور تصوف وغیرہ کے ناموں سے معروف ہے۔ اس وقت اس نئے دین سے متعلق بحث کرنا میرا مقصد نہیں ہے بلکہ میں صرف قبر پرستی کے حوالہ سے اس سے تعرض کرنا چاہتا ہوں اور یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس نئے دین کے ظہور پذیر ہونے سے قبل مسلمانوں میں قبر پرستی کی بیماری نہیں تھی۔ اس مسئلے کی وضاحت کے لیے تصوف میں تصور شیخ یا ولایت کے مفہوم کو واضح کرنا ضروری ہے۔

اسلام میں ولی اور شیخ کا وہ تصور نہیں ملتا جو تصور تصوف نہ دیا ہے۔ قرآن پاک کے مطابق ہر وہ شخص ولی ہے جو اللہ پر ایمان لائے، اس کا تقویٰ اختیار کرے، اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے ان کو بجالائے اور جن چیزوں سے منع فرمایا ہے ان سے باز رہے:

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ۝ ﴾ [يونس: ٦٢، ٦٣]

''آگاہ رہو! اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کسی خوف کا مقام ہے اور جو نہ رنجیدہ ہوں گے۔ اللہ کے دوست وہ ہیں جو ایمان لائے اور جو تقویٰ شعار ہیں۔

رہا تصور شیخ تو اس کا اس معنی میں کوئی وجود نہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان کوئی واسطہ اور وسیلہ ہے۔ یا کائنات میں اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے پائے جاتے ہیں جو صاحب تصرف ہیں۔ اسلامی عقائد کی رو سے کسی مخلوق کے بارے میں چاہے وہ انسان ہو، فرشتہ ہو یا جن اور نبی ہو یا ولی، یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ کائنات میں تصرف کی قدرت رکھتا ہے، وہ لوگوں کی مشکلات کو ختم کر سکتا ہے، ان کی مصیبتوں اور بلاؤں کو دور کر سکتا ہے ان کو بیماریوں سے شفاء دے سکتا ہے یا ان کو اولاد دے سکتا ہے، شرک اکبر ہے۔ یہ عقیدہ رکھنے والا مومن نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ۝ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ج فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝ ﴾ [يونس: ٣١، ٣٢]

''اے نبی! کہو کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کون ہے جس کے اختیار میں سماعت اور بینائی ہے؟ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ اور کون عالم کے امور کی تدبیر کرتا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے! پھر اللہ۔ تم کہو! پھر تم کیوں تقویٰ نہیں اختیار کرتے یہی اللہ تو تمہارا حقیقی رب ہے۔ اور حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے! آخرت تم لوگ کدھر پھرائے جا رہے ہو۔

لیکن اس کے باوجود صوفیا کا یہ عقیدہ ہے کہ ''اولیاء اللہ'' کائنات میں تصوف رکھتے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی اس طرح کے مسائل میں بہت محتاط الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ پھر بھی فرماتے ہیں:

''اور جاننا چاہیے کہ بعض اولیاء اللہ سے بعد انتقال کے بھی تصرفات وخوارق سرزد ہوتے ہیں اور یہ امر معنیً حدتواتر تک پہنچ گیا ہے۔''[1]

اسی وجہ سے ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اولیاء اللہ سے اس اعتقاد کے تحت استعداد یا استعانت کی جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قدرت سے پکارنے والے کی مدد کرنے پر قادر ہیں تو ان سے استمداد اور استعانت جائز ہے۔ اس بات کو انہوں نے اپنے خاص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

''جو استعانت واستمداد باعتقاد علم وقدرت مستقل ہو وہ شرک ہے۔ اور جو باعتقاد علم وقدرت غیر مستقل ہو اور وہ علم وقدرت کسی دلیل سے ثابت ہو جائے تو جائز ہے۔ خواہ مستمد منہ حی ہو یا میت۔''[2]

مولانا کو یہ معلوم ہے کہ قرآن پاک اور صحیح احادیث میں مسئلہ اسباب وعلل سے ماوراء امور میں غیر اللہ سے استمداد واستعانت حرام ہے۔ مگر ''کسی دلیل سے ثابت ہو جائے'' کہہ کر اس کو جائز بنا دیا۔

اسلام میں اذکار واوراد سراسر عبادت ہیں اور عبادت عنداللہ وہی مقبول ہوتی ہے جو کتاب وسنت سے ثابت ہو۔ لیکن ایک تو صوفیا نے بے شمار اذکار اور اوراد اپنے ذوق سے گھڑ لیے ہیں۔ دوم وہ ان کا ورد اکابر صوفیا کے توسط اور وسیلے سے کرتے ہیں۔ مولانا شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ برصغیر میں توحید خالص کے داعی کے طور پر مشہور ہیں۔ ان کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کتاب وسنت سے ماخوذ عقیدہ توحید کے موضوع پر ایک شاہکار تصنیف ہے۔ مگر خانوادہ تصوف سے تعلق رکھنے اور ''تحریک جہاد'' کے امیر سید احمد بن سید

---

[1] شریعت و طریقت ص ۳۲۷۔

[2] امداد الفتاویٰ: ص ۹۹ ج ٤ بحوالہ دین تصوف و طریقت ص ۱۰۲۔

عرفان کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کی وجہ سے ان کے قلم سے بھی ایسی باتیں نکل گئی ہیں جو ان کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کے مضامین کے منافی ہیں۔ چنانچہ وہ ''صراط مستقیم'' میں ''طریقۂ چشتیہ'' کے مطابق ذکر کا طریقہ واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

طالب کو چاہیے کہ پہلے باوضو دوزانو بطور نماز بیٹھ کر اس طریقے کے بزرگوں: حضرت معین الدین سنجری اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی وغیرہ حضرات کے نام کا فاتحہ پڑھ کر بارگاہ خداوندی میں ان بزرگوں کے توسط اور وسیلہ سے التجا کرے۔ نیاز اور بے انداز اور زاری بے شماری کے ساتھ اپنے کام کے فتح یاب کے لیے دعا کرکے ذکر دوضربی شروع کرے۔''[1]

مولانا کی اس عبارت نے ''تقویہ الایمان'' میں ان کے توحیدی مباحث پر پانی پھیر دیا۔ اس عبارت میں انہوں نے ''شرک'' کی جو دعوت ہے اس کی توجیہہ یہ کہہ کر نہیں کی جا سکتی کہ ''صراط مستقیم'' ان کی تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو ان کے امیر اور پیر و مرشد سید احمد کے ملفوظات سے عبارت ہے، جن کو انہوں نے قلم بند کیا ہے۔ اگر انہوں نے یہ عبارت لکھنے کے بعد اس سے اپنی براءت کا اظہار کر دیا ہوتا تو بلاشبہ وہ بری الذمہ ہو جاتے مگر احترام شیخ نے ان کو ایسا کرنے سے باز رکھا۔

ان دو مثالوں سے دنیا میں بزرگوں اور صلحائے امت کے مزارات کی کثرت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ دراصل بزرگوں کی قبروں کو مزارات میں تبدیلی کرنے والوں اور ان میں مدفون مردوں سے فریادیں اور التجائیں کرنے والوں کو اس سے کیا غرض کہ رسول اکرم فداہ ابی وامی ﷺ نے قبروں کو پختہ بنانے، ان کو عبادت گاہیں اور سجدہ گاہیں بنانے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

((أَلَا وَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِهِمْ وَصَالِحِيهِمْ مَسَاجِدَ، أَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ، إِنِّيْ أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ))[2]

''سن لو! درحقیقت جو لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں وہ اپنے نبیوں اور نیک لوگوں کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا کرتے تھے۔ خبردار قبروں کو سجدہ گاہیں مت بنانا۔ میں تم لوگوں کو اس سے منع کرتا ہوں۔''

مگر مسلمانوں میں اس غلط عقیدے کے پھیل جانے کی وجہ سے کہ اولیاء اللہ اور بزرگان دین اللہ کے مقرب بندے ہیں۔ ان کے توسط سے گناہ بخشوائے جا سکتے ہیں۔ مصائب و آفات سے محفوظ رہا جا

---

[1] صراط مستقیم: ص ۲۱۵۔ [2] صحیح مسلم: ح ۵۳۲

سکتا ہے اور مرادیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ بالآخر ان کی قبروں کو عبادت گاہوں اور بت کدوں میں تبدیل کر کے زبانِ حال سے اعلان کر دیا گیا:

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰىؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِیْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِیْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴾ [الزمر: ۳]

''ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرادیں گے۔
یقیناً اللہ ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔
بیشک اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکرِ حق ہو۔''

آیت مبارکہ کا یہ ٹکڑا اس اعلان کے بعد آیا ہے: ''اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ'' خبردار! دین خالص، صرف اللہ کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خالص اور بے آمیز اطاعت اور بندگی اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اور اللہ کے سوا کوئی دوسرا ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ اس کی بھی پرستش کی جائے۔ اللہ کے لیے خالص بندگی اور عبادت میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی واسطہ اور وسیلہ نہیں ہے ''وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ'' اور ہم انسانوں کی رگ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔'' اور...... وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِيْبٌؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔

''اور اے نبی! میرے بندے اگر تم سے میرے بارے میں پوچھیں تو میں ان سے بالکل قریب ہوں کہ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔''

درود وسلام پڑھنے کے لیے نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت:

یہ بات بار بار واضح کی جاتی رہی ہے اور واضح کی جاتی رہنی چاہیے کہ اسلام نام ہے قال اللہ اور قال الرسول کا۔ جس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور پرستش کے جو طریقے کتاب وسنت میں بتا دیے گئے ہیں صرف وہی صحیح، قابلِ عمل اور عند اللہ مقبول ہیں۔ بقیہ دوسرے طریقے جو انسانوں نے خود گھڑ لیے ہیں وہ کارِ معصیت اور مردود ہیں۔

چنانچہ اوپر کے صفحات میں بڑی تفصیل سے یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے کسی بھی حدیث میں اپنے صحابہ اور ان کے بعد آنے والوں کو اپنی قبر مبارک کی زیارت کا نہ کوئی حکم دیا ہے، نہ اس کی ترغیب دی ہے اور نہ اس کی کوئی فضیلت بیان کی ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں درود وسلام

پڑھنے کی غرض سے مدینۃ الرسول ﷺ کا سفر اور مسجد نبوی میں حاضری ایک غیر شرعی عمل ہے۔ البتہ اگر کوئی مسلمان مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی غرض سے مدینہ طیبہ کا سفر کرے تو یہ ایک پسندیدہ عمل ہے۔ کیونکہ جہاں مسجد نبوی ان تین مساجد میں سے ایک ہے کہ جن کی زیارت اور ان میں نماز ادا کرنے کی غرض سے سفر کرنا جائز ہے۔ وہیں مسجد نبوی میں ادا کی جانے والی ایک نماز ''مسجد حرام'' کے سوا دوسری مسجدوں میں ادا کی جانے والی ایک ہزار نماز سے بہتر ہے۔

لہٰذا جس خوش نصیب کو مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی نیت سے مدینہ طیبہ جانے کا موقع ملے تو اس کے لیے علمائے اسلام نے یہ مستحب قرار دیا ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ اور صاحبین حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی قبروں کی طرف رخ کر کے ان کو سلام کرے اور وہاں سے رخصت ہو جائے۔ اس کی دلیل وہ حدیثیں ہیں جن میں مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کرنے والوں یا ان قبروں کے پاس سے گزرنے والوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان کو سلام کریں اور ان کے لیے دعا کریں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ امام اسماعیل بن اسحاق قاضی اپنی کتاب ''فضل الصلاۃ علی النبی ﷺ'' میں روایت کرتے ہیں:

''ہم سے علی نے بیان کیا، کہا: ہم سے سفیان نے بیان کیا: کہا: مجھ سے عبداللہ بن دینار نے بیان کیا، کہا: میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا ہے کہ وہ جب سفر سے درس آتے تو مسجد میں داخل ہوتے اور کہتے:

((اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلٰی اَبِیْ بَكْرٍ، اَلسَّلَامُ عَلٰی اَبِیْ))

اور دو رکعتیں سنت ادا فرماتے۔[1]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے علاوہ کسی اور صحابی سے یہ منقول نہیں ہے کہ وہ ایسا کرتے رہے ہوں۔ چنانچہ خانوادہ عمری سے تعلق رکھنے والے جلیل القدر امام و حافظ ابو عثمان عبیداللہ بن عمر بن حفص بن عاصم بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں:

ہمیں نبی کریم ﷺ کے اصحاب میں سوائے عبداللہ بن عمر کے، کسی کے بارے میں یہ علم نہیں ہے کہ وہ ایسا کرتے تھے۔''[2]

---

[1] فضل الصلاۃ علی النبیؐ: ص ۱۹۲، ح ۹۹ [2] بحوالہ الصارم المنکی: ص ۲۴۳

لیکن موجودہ وقت میں جو لوگ مدینہ منورہ کا سفر کرتے ہیں ان میں شاذ و نادر ایسے لوگ ملیں گے جن کی زبانوں سے یہ سنا جاتا ہو کہ ''ہم مسجد نبوی'' میں نماز ادا کرنے کی غرض سے مدینہ منورہ جا رہے ہیں یا گئے تھے۔ اکثریت یہی کہتی ہے کہ ''ہم روضہ نبوی پر سلام پڑھنے گئے تھے۔''

یہ دراصل ان جھوٹی روایات کا اثر ہے جن کا پچھلے صفحات میں بڑی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ان جھوٹی روایات نے لوگوں کے عقائد بدل دیے۔ ان کے انداز فکر کو بدل دیا ہے۔ مطلوب کو غیر مطلوب اور غیر مطلوب کو مطلوب بنا دیا ہے۔ ان جھوٹی روایات کو گھڑنے والے اور پھیلانے والے ارباب تصوف ہی ہیں اور انہی کی کتابوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

ایک جھوٹا واقعہ:

فتح بیت المقدس کے موقع پر جب خلیفہ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیت المقدس تشریف لے گئے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ان سے یہ درخواست کی کہ وہ ان کو شام میں برقرار رہنے دیں۔ حضرت عمر نے ان کی درخواست قبول فرمالی اور ان کو وہاں رہنے کی اجازت دے دی۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ایک رات میں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ان سے فرما رہے تھے:

بلال! مجھ سے یہ بے رخی کیوں؟ کیا تمہارے لیے میری زیارت کا وقت نہیں آیا؟ جو خواب دیکھنے پر وہ نہایت غمگین حالت میں بیدار ہوئے اور سواری پر بیٹھ کر جانب مدینہ روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچتے ہی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس روتے ہوئے حاضر ہوئے اور اپنے چہرے کو قبر مبارک سے رگڑنے لگے۔ اتنے میں وہاں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما آ گئے۔ حضرت بلال نے ان کو سینہ سے لگا کر ان کو چومنا شروع کر دیا۔ انہوں نے کہا: ہم آپ سے اذان سننا چاہتے ہیں۔ حضرت بلال تیار ہو گئے اور مسجد کی چھت پر گئے اور کھڑے ہو کر اذان دینا شروع کیا۔ انہوں نے جب اللہ اکبر کہا: تو مدینہ منورہ ہل گیا اور لرز اٹھا۔ اور جب اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، کہا تو اس کی لرزش میں اضافہ ہو گیا۔ اور جب اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ کہا تو پردہ دار جوان لڑکیاں پردے سے باہر آ گئیں۔ لوگ پکار اٹھے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد اس دن سے زیادہ کبھی رونے والے اور رونے والیاں نہیں دیکھی گئیں۔

امام شمس الدین محمد بن احمد ذہبی فرماتے ہیں: اس روایت کی سند کمزور اور متن منکر ہے۔"[1]

حافظ علامہ محمد بن احمد بن عبدالهادی تحریر فرماتے ہیں:

اس اثر کا ذکر امام الحاکم ابو احمد محمد بن احمد نیشاپوری نے اپنے فوائد کے پانچویں حصہ میں کیا ہے اور انہی کی سند سے حافظ ابوالقاسم علی بن حسن ابن عساکر نے اپنی کتاب تاریخ دمشق میں کیا ہے۔ یہ اثر غریب اور منکر ہے۔ اس کی سند میں مجہول راوی شامل ہے اور اس کی سند متصل بھی نہیں ہے۔ بلکہ منقطع ہے۔ اس کی روایت محمد بن فیض غسانی نے ابراہیم بن محمد بن سلیمان بن بلال سے، اس نے اپنے باپ: محمد سے اور اس نے اس کے دادا سلیمان سے کی ہے۔ اس سند میں محمد بن فیض غسانی منفرد ہے اور اس کا شیخ: ابراہیم بن محمد ثقاہت، امانت اور ضبط میں کوئی درجہ[2] نہیں رکھتا۔ ابوزرعہ، ابوحاتم، محمد بن مسلم بن دارہ اور یعقوب بن سفیان فسوی جیسے حفاظ حدیث دمشق گئے جہاں وہ موجود تھا۔ لیکن ان میں سے کسی نے اس سے یہ قصہ یا کوئی اور حدیث روایت نہیں کی ہے۔ اگر وہ اہل الحدیث سے تعلق رکھتا ہوتا تو اس سے ضرور روایت کرتے۔ خاص طور پر ابوحاتم رازی جو شیوخ حدیث سے ملاقات کرنے کے بے حد حریص تھے۔

اور ابراہیم کا باپ محمد بن سلیمان ایسا شخص ہے جس سے بہت کم حدیثیں مروی اور اس کے حالات کی تفصیلات نہیں ملتیں جن کی روشنی میں اس کی مرویات قبول کی جاسکیں۔ امام بخاری نے اس کی صرف ایک حدیث نقل کی ہے اور اس کی ثقاہت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ نیز اس کو کسی بھی امام حدیث نے ثقہ نہیں قرار دیا ہے۔[3] اس طرح اس جھوٹے واقعہ کی سند کے تین راوی محمد بن فیض غسانی، ابراہیم بن محمد اور محمد بن سلیمان غیر معروف ہیں جن کو کسی بھی امام حدیث نے ثقہ نہیں قرار دیا ہے۔[4]

اس واقعہ کے من گھڑت اور جھوٹے ہونے کی سب سے بڑی دلیل اس کا متن ہے۔ اس میں مستعمل لفظ، الجفوۃ، جفا" کا مصدر ہے جو اس جھوٹی روایت میں آیا ہے جس پر تفصیل بحث اوپر گزر چکی

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ص ۲۱۳ ج ۳۔

[2] امام ذہبی نے ابراہیم کو مجہول لکھا ہے اور حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں اس قصہ کو موضوع لکھا ہے۔ معجم اسامی الرواۃ: ص ۶۳، ۶۴ ج ۱۔

[3] التاریخ الکبیر: ص ۹۸ ج ۱۔

[4] الصارم المنکی: ص ۳۳۷، ۲۴۱ اختصار اور تصرف کے ساتھ۔

ہے۔ جس کے الفاظ ہیں:

((مَنْ حَجَّ، وَلَمْ يَزُرْنِي فَقَدْ جَفَانِي))۔

”جس نے حج کیا اور میری زیارت نہیں کی تو اس نے مجھ سے بے رخی برتی۔“

سوال یہ ہے کہ جس عمل کا رسول اللہ ﷺ نے کبھی حکم نہیں دیا، اس کی ترغیب نہیں دلائی اور اس کا کوئی معمولی سا اجر وثواب نہیں بتایا اس کا تارک آپ سے بے رخی برتنے والا اور آپ پر سختی کرنے والا کیونکر قرار پا سکتا ہے جو اسلام کی نگاہ میں کفر کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر رسول اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت دین میں اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے تو قرآن پاک میں اس کو بیان ہونا چاہیے تھا اور نبی اکرم ﷺ کو اپنی زبان مبارک سے اس کو واضح کرنا چاہیے تھا۔ جس طرح آپ نے مختلف مواقع پر اپنی محبت کی اہمیت واضح فرمائی ہے اور اس کو ایمان کے لیے صحت کی شرط قرار دی ہے:

((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ))[1]

”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ، بچوں اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔“

اور ایک بار جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

اے اللہ کے رسول! یقیناً آپ مجھے اپنی ذات کے سوا بقیہ تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا، وَالَّذِيْ نَفْسِي بِيَدِهِ، حَتَّى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ))[2]

”نہیں، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، یہاں تک کہ میں تیرے نزدیک تیری جان سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔“

اس کے برعکس آپ نے اپنی قبر مبارک کی زیارت کا حکم دینا تو دور کی بات ہے اپنی قبر کے پاس میلا لگانے سے منع فرما دیا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

((لَا تَجْعَلُوا قَبْرِي عِيدًا، وَلَا تَجْعَلُوا بُيُوْتَكُمْ قُبُوْرًا، وَصَلُّوْا عَلَيَّ وَسَلِّمُوْا حَيْثُمَا كُنْتُمْ، فَسَيَبْلُغُنِي سَلَامُكُمْ وَصَلَاتُكُمْ))

---

[1] صحيح بخاري: ح ١٥۔ صحيح مسلم: ح ٤٤۔ [2] صحيح بخاري: ح ٦٦٣٢۔

''میری قبر کو جشن گاہ مت بنانا اور اپنے گھروں کو قبر مت بنانا۔ میرے اوپر جہاں بھی تم ہو، درود و سلام بھیجتے رہنا، کیونکہ مجھ تک تمہارا اسلام اور تمہارا درود پہنچ جائے گا۔''[1]

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے:

((لَا تَجْعَلُوا بُيُوْتَكُمْ قُبُوْرًا، وَلَا تَجْعَلُوا قَبْرِي عِيْدًا وَ صَلُّوْا عَلَيَّ فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ تَبْلُغُنِي حَيْثُمَا كُنْتُمْ))[2]

''اپنے گھروں کو قبر اور میری قبر کو جشن گاہ مت بنانا اور میرے اوپر درود بھیجتے رہنا کیونکہ تمہارا درود مجھ تک پہنچ جائے گا جہاں کہیں بھی تم ہو گے۔''

ان ارشادات سے تین باتیں معلوم ہوئیں:

(۱)...... میری قبر کے پاس درود و سلام کی عرض سے جم گھٹا نہ کرنا۔ جیسا جم گھٹا عید اور خوشی کے موقع پر کیا جاتا ہے۔

(۲)...... جہاں کہیں سے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا جائے گا وہ آپ تک پہنچ جائے گا جس کے لیے فرشتے مقرر ہیں۔[3] درود و سلام کی غرض سے قبر مبارک کی زیارت ضروری نہیں ہے۔

(۳)...... قبروں کی مانند گھروں کو شہر خموشاں نہ بنایا جائے۔ بلکہ ان کو نمازوں اور تلاوت قرآن کے ذریعہ آباد رکھا جائے۔ معلوم ہوا کہ قبریں نماز اور تلاوت کی جگہ نہیں ہیں۔

قرآن پاک کی ایک آیت سے غلط استدلال:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کی ترغیب دلانے والے اور اس کے خود ساختہ اجر و ثواب کی ترویج کرنے والے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بندے اور اللہ کے درمیان واسطہ اور وسیلہ قرار دینے والے سورۃ النساء کی درج ذیل آیت سے غلط استدلال کرتے ہیں:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴾

[النساء: ٦٤]

---

[1] فضل الصلاة على النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ح ۲۰۔

[2] ابوداؤد: ح ۲۰۴۲۔ مسند امام احمد: ح ۸۷۹۰۔

[3] فضل الصلاۃ: ح ۲۱۔

''جب وہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے اگر تمہارے پاس آ جاتے اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول ان کے لیے استغفار کرتا تو یقیناً اللہ کو بہت زیادہ توبہ قبول فرمانے والا اور نہایت مہربان پاتے۔

مذکورہ گروہ کے لوگ کہتے ہیں کہ ''یہ آیت عام ہے اور اس میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب بھی وہ کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھیں تو رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ اپنے گناہ، پر پشیمانی کا اظہار کریں، خود استغفار کریں اور رسول اللہ ﷺ ان کے لیے استغفار کریں تو اللہ تعالیٰ ان سے گناہ کو معاف فرما دے گا۔

جب نبی کریم ﷺ باحیات تھے تو اعتراف گناہ کے لیے آپ کی خدمت میں حاضری مطلوب تھی۔ اور اب جب کہ آپ کا ''وصال'' ہو چکا ہے تو اس غرض کے لیے آپ کی قبر مبارک کے پاس حاضر ہو کر خود استغفار کرنا چاہیے اور رسول اللہ ﷺ سے دعا اور استغفار کی درخواست کرنی چاہیے۔

لیکن یہ توجیہہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں جو طرز بیان اختیار فرمایا ہے وہ مذکورہ غلط اور روح توحید کی منافی تفسیر میں زبردست مانع ہے اور اس کو ماضی سے خاص کر دیتا ہے۔

آیت مبارکہ میں ''ظَلَمُوْا'' سے پہلے جو ''اِذْ'' آیا ہے، یہ اسم ظرف زمان ہے جو کسی فعل سے پہلے آتا ہے اور اس کو ماضی کے لیے خاص کر دیتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس کے بعد آنے والا فعل ماضی ہے یا مضارع۔ برخلاف ''اِذَا'' کے۔ جو فعل ماضی سے پہلے جب آتا ہے تو اس کو فعل مضارع میں بدل دیتا ہے۔

زیر بحث آیت کا تعلق منافقین سے ہے جو اوپری زبان سے تو اللہ اور رسول پر ایمان کا دعویٰ کرتے تھے مگر معاملہ پیش آنے پر وہ رسول اللہ ﷺ سے رجوع کرنے کی بجائے طاغوت سے رجوع کرتے تھے۔ پہلے تو ان کے دعوائے ایمان کو چیلنج کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ رسول پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا اس کی اطاعت ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے رسول مبعوث فرمائے ہیں ان کو ان کی قوموں کے لیے مطاع بنایا ہے۔ لہٰذا رسول کی اطاعت سے گریز دعوائے ایمانی کے منافی ہے۔ پھر فرمایا اگر یہ لوگ اپنے ایمان میں سچے تھے اور ان سے نبی کی نافرمانی ہو گئی تھی تو ان کو چاہیے تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا اعتراف کرتے، اپنی اس نافرمانی پر اللہ سے معافی کے طلب گار ہوتے اور رسول اللہ ﷺ بھی ان کے لیے استغفار کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان

پاتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہ کر کے اپنی دشمن اور بیمار ذہنیت کا ثبوت دیا۔

اس آیت کا تعلق اس لیے بس ماضی سے ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ذات اطہر سے رجوع ہو کر اعتراف گناہ کرنا اور آپ سے دعا و استغفار کی درخواست کرنا صرف آپ کی حیات پاک ہی میں ممکن تھا۔ آپ کی رحلت کے بعد یہ ممکن نہیں ہے۔ بلکہ ایک مومن کے لیے اب دینی مرجع کتاب وسنت ہے۔ اب نبی مکرم ﷺ نہ تو کسی کی درخواست سن سکتے ہیں، نہ اس کی رہنمائی کر سکتے ہیں اور نہ اس کے لیے دعا و استغفار ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ اعمال زندوں کے ساتھ مخصوص ہیں:

((إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنَ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهُ))[1]

"جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے۔ صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے استفادہ کیا جاتا رہے اور ایسی صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔"

چونکہ یہ تین چیزیں انسان کے اپنے اعمال اور اس کے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے اس دنیا سے جانے کے بعد بھی اس کو ان کا ثواب پہنچتا رہے گا۔ گویا ان تین چیزوں کی صورت میں اس کا عمل جاری ہے۔

لہٰذا مذکورہ آیت سے استدلال کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت اور آپ سے دعا و استغفار کی درخواست کو جائز بلکہ مستحب بتانا آیت میں تحریف کرنا ہے۔ اس سلسلے میں جن روایتوں کا سہارا لیا جاتا ہے ان میں سے کوئی بھی روایت صحیح اور قابل استدلال نہیں ہے۔ ان کے بارے میں تفصیلی گفتگو ان شاء اللہ آگے آرہی ہے۔ مگر پہلے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ زیر بحث آیت کی مماثل آیت دوسری جگہ آئی ہے۔ اس میں متقیوں کی صفات بیان ہوئی ہیں اور یہ آیت جس طرح نبی کریم ﷺ کے زمانے سے متعلق تھی اس طرح آج کے حالات سے بھی تعلق رکھتی ہے اور قیامت تک قابل عمل رہے گی۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۝ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۝ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

[آل عمران: ١٣٥]

---

[1] صحیح مسلم: ح ١٦٣١، ٤٢٢٣۔

"(اور متقی وہ ہیں) جو بہت برا کام اگر کوئی کر بیٹھتے ہیں یا ان سے اپنے آپ پر ظلم سرزد ہو جاتا ہے تو انہیں اللہ یاد آ جاتا ہے اور وہ اللہ سے معافی کے طلب گار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو معاف کر سکتا۔ اور وہ لوگ جانتے بوجھتے برے اعمال پر اصرار نہیں کرتے۔

غور فرمایئے لفظ "اِذْ" نے سورۂ النساء کی آیت کو ماضی کے ساتھ خاص کر دیا۔ جب کہ آل عمران کی اس آیت میں "اِذَا" کے استعمال نے اس کو ماضی، حال اور مستقبل کے لیے عام کر دیا۔ ان دونوں آیتوں کے ترجمہ میں اذ اور اذا کے فرق کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ دونوں جگہ ماضی کے افعال استعمال کیے گئے ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُوْلِی الْاَبْصَارَ

سورۃ النساء کی آیت نمبر ۶۴ سے رسول اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے استحباب، نبی ﷺ کو اللہ اور بندوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ بنانے اور آپ سے دعا و استغفار کی درخواست کرنے کو مشروع قرار دینے والے اپنے اس خیال اور عقیدے کی تائید میں بعض ایسی روایتوں کا سہارا لیتے ہیں جو ناقابل اعتماد ہیں۔

اس سلسلے میں سرفہرست ایک نامعلوم اعرابی کا قصہ ہے جس کا ذکر بعض مفسرین اور ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔

مذکور اعرابی کا قصہ جن لوگوں نے بیان کیا ہے، ان میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اس واقعہ کو نقل کرنے والے ابو صادق عبد اللہ بن ناجز، محمد بن عبد اللہ بن عمرو بن معاویہ بن عمرو بن عتبہ بن ابی سفیان متوفی ۵۲۸ھ اور محمد بن حرب ہلالی ہیں۔

سارے راوی اس بات پر متفق ہیں کہ یہ واقعہ رسول اکرم ﷺ کی وفات پر تین دن کے بعد پیش آیا اور ان راویوں میں سے ہر ایک اس کا عینی شاہد تھا۔ جب کہ عتبی اور محمد بن حرب ہلالی اس واقعہ سے ۲۰۰ دو سو سال بعد پیدا ہوئے تھے۔

قصہ کے الفاظ ہیں:

(۲۵۴)......قَدِمَ عَلَیْنَا اَعْرَابِیٌّ بَعْدَ مَا دَفَنَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بِثَلاَثَةِ أَیَّامٍ فَرمِی بِنَفْسِهِ إِلَی قَبْرِ النَّبِیِّ ﷺ وَ حَثَی عَلَی رَأْسِهِ مِنْ تُرَابِهِ وَقَالَ: یَا

رَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْتَ فَسَمِعْنَا قَوْلَكَ وَعَيْنَا عَنِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَمَا وَعَيْنَا عَنْكَ وَكَانَ فِيْمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ عَلَيْكَ، ﴿ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَحِيْمًا ﴾ وَقَدْ ظَلَمْتُ نَفْسِي وَجِئْتُكَ تَسْتَغْفِرُلِي، فَنُوْدِيَ مِنَ الْقَبْرِ: أَنَّهُ قَدْ غُفِرَلَكَ))

''جب ہم نے رسول اللہ ﷺ کی تدفین کردی اس کے تین دن بعد ایک اعرابی ہمارے پاس آیا اور اپنے آپ کو نبی ﷺ کی قبر کے پہلو میں ڈال دیا اور اپنے سر پر قبر کی مٹی ڈالی اور بولا: اے اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا اور ہم نے آپ کا ارشاد سنا۔ ہم نے اللہ عزوجل کے ارشاد کو سمجھ کر اپنے سینے میں محفوظ کرلیا، لیکن آپ کے ارشاد کو محفوظ نہ کیا۔ اللہ عزوجل نے آپ پر جو کچھ نازل فرمایا اس میں یہ بھی ہے: جب وہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے اگر وہ تمہارے پاس آجاتے اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول ان کے لیے استغفار کرتا تو یقیناً اللہ کو بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور نہایت مہربان پاتے۔ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے'' اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ میرے لیے استغفار فرمائیں''۔ تو قبر سے ندا آئی: بیشک تمہاری مغفرت ہوگئی۔''

عبرت کا مقام ہے کہ ابھی رسول اکرم فداہ ابی وامی ﷺ کی وفات پر صرف تین دن گزرے ہیں۔ آپ کا ایک صحابی قبر پر حاضری دیتا ہے اور سر پر قبر کی مٹی ڈالتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ دیکھ رہے ہیں کچھ نہیں کہتے۔ پھر آپ کو پکارتا ہے۔ آپ سے استغفار کی درخواست کرتا ہے۔ جس کے فوراً بعد قبر سے ندا آتی ہے کہ تیری بخشش ہوگئی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ [1] اور قرطبی [2] اس واقعہ کو مختصراً بلا کسی سند کے نقل کر کے آگے بڑھ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس کی روایت کرنے والے ابو صادق عبداللہ بن ناجز ہیں جو ثقاہت کے سب سے نچلے درجے پر تھے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا تھا۔ اس لیے ان کی روایت متصل نہیں مرسل ہے۔ [3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ص ۴۱۰، ج ۱۔ [2] تفسیر قرطبی: ص ۱۸۴ ج ۳۔

[3] تقریب التهذیب ص ۵۷۱، ترجمہ: ۸۱۶۷۔

حافظ ابن عبدالہادی نے اس کی جو سند لکھی ہے وہ درج ذیل ہے:

ابوالحسن علی بن ابراہیم بن عبداللہ بن عبداللہ کرخی، علی بن محمد بن علی سے روایت کرتے ہیں، کہا: ہم سے احمد بن محمد بن ہیثم طائی نے بیان کیا، کہا: مجھ سے میرے والد نے اپنے والد سے، انہوں نے سلمہ بن کہیل سے، انہوں نے ابوصادق سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ انہوں نے فرمایا......

یہ سند اور واقعہ نقل کرنے کے بعد ابن عبدالہادی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

یہ واقعہ موضوع، منکر اور من گھڑت ہے جس پر کسی حال میں بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اس کی سند تاریکی پر تاریکی ہے۔ احمد بن ہیثم کا دادا: ہیثم اگر ابن عدی طائی ہے تو وہ متروک اور کذاب ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا ہے تو مجہول ہے۔ حافظ ابوالفضل عباس بن محمد دوری کہتے ہیں: میں نے یحییٰ بن معین کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ہیثم بن عدی کوفی ثقہ نہیں تھا وہ کذب بیانی کرتا تھا[1]۔ حافظ ابوالحسن احمد بن عبداللہ صالح عجلی اور ابوداؤد فرماتے ہیں: وہ کذاب تھا[2]۔ نسائی نے بھی اس کو متروک لکھا ہے۔[3] امام بخاری نے لکھا ہے: محدثین نے اس کو ترک[4] کر دیا[5] تھا۔

رہے عتبی تو ان سے یہ واقعہ کسی قابل اعتماد سند سے ثابت نہیں ہے۔ ان کے بارے میں بھی یہی منقول ہے کہ وہ مسجد نبوی میں موجود تھے کہ ایک اعرابی آیا...... اور محمد بن حرب ہلالی کی سند سے بھی یہی مذکور ہے کہ ''میں مدینہ گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کی اور اس کے بالمقابل بیٹھ گیا۔ یہاں تک کہ ایک اعرابی آیا......

ان تینوں زمانوں میں سینکڑوں سال کا فاصلہ ہے اور ہر زمانے میں اسی اعرابی کے واقعہ کا پیش آنا کیا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ بے بنیاد اور من گھڑت واقعہ ہے۔

---

[1] التاریخ لا بن معین ترجمہ: ۱۷۶۷۔ [2] المیزان: ص ۳۲٤ ج ٤۔

[3] الضعفاء والمتروکین: ص ۲٤۱ ترجمہ: ٦۳۷۔

[4] التاریخ الکبیر: ص ۲۱۸ ج ۸ والصغیر ص ۱۱۷۔ [5] الصارم المنکی: ص ۳۲۱۔

(۲۵۵)......((أَصَابَ النَّاسَ قَحطٌ فِي زَمَانِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ، فَجَاءَ رَجُلٌ إِلَى قَبْرِ النَّبِيِّ ﷺ ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِسْتَسْقِ اللّٰهَ لِأُمَّتِكَ فَإِنَّهُمْ قَدْ هَلَكُوْا فَأَتَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَنَامِ فَقَالَ: اِئْتِ عُمَرَ فَأَقْرِئْهُ مِنِّي السَّلَامَ وَأَخْبِرْهُ أَنَّكُمْ مُسْقُوْنَ وَقُلْ لَهُ: عَلَيْكَ الْكَيْسَ الْكَيْسَ))۔

''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں لوگ قحط سے دوچار ہوئے تو ایک شخص نبی ﷺ کی قبر مبارک کے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول: اپنی امت کے لیے اللہ سے بارش طلب فرمائیے۔ کیونکہ لوگ ہلاکت کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ اس کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا: عمر کے پاس جاؤ ان کو میرا اسلام کہو اور ان کو بتاؤ کہ تم لوگ بارش سے سیراب ہوگے اور ان سے کہو ''عقلمندی اور ذہانت سے کام لو۔'' وہ شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو اپنا خواب سنایا جس کے جواب میں حضرت عمر نے کہا:

((يَا رَبِّ مَا آلُو إِلَّا مَا عَجَزْتُ عَنْهُ))

''اے میرے رب! میں صرف اسی کام میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہوں جسے انجام دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔''

یہ روایت حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں درج ذیل سند کے ساتھ نقل کی ہے:

حافظ ابوبکر بیہقی کہتے ہیں: ہم کو ابونصر بن قتادہ اور ابوبکر فارسی نے خبر دی، دونوں نے کہا: ہم سے ابوعمرو بن مطر نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابراہیم بن علی ذہلی نے بیان کیا، کہا: ہم سے یحییٰ بن یحییٰ نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابومعاویہ نے اعمش سے، انہوں نے ابوصالح سے اور انہوں نے مالک سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا...... حافظ ابن کثیر نے یہ روایت اور سند نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''یہ سند صحیح ہے۔''[1]

یہی روایت حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ کے حوالہ سے نقل کی ہے اور لکھا ہے:

''مالک الدار سے، جو حضرت عمر کا خازن تھا ابوصالح سمان کی یہ روایت صحیح ہے'' اور اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ:

سیف بن عمر نے ''الفتوح'' میں یہ روایت کی ہے کہ جس نے یہ خواب دیکھا تھا وہ ایک صحابی: بلال

---

[1] البدایہ والنہایہ: ص ۳۱۸، ج۵

بن حارث مزنی تھے۔[1]

حافظ ابن کثیر اور حافظ ابن حجر نے یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ: اس روایت کی سند صحیح ہے یا روایت صحیح الاسناد ہے۔ لیکن انہوں نے اس کے متن پر صحت وسقم کا کوئی حکم نہیں لگایا۔ فعلاً یہ سند ابو صالح سمان، ذکوان، تک صحیح ہے۔ لیکن جب کوئی امام حدیث کسی روایت کے بارے میں یہ کہے کہ یہ روایت صحیح الاسناد ہے یا اس کی سند صحیح ہے تو اس سے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس سند کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ مگر کسی روایت کے صحیح ہونے کے لیے صرف اس کی سند کا صحیح ہونا یا اس کے راویوں کا ثقہ ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس روایت کے صحیح ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ روایت ''شذوذ'' اور ''علت'' سے پاک ہو۔

کسی حدیث کے شاذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ: اس کا راوی اس کی روایت میں منفرد بھی ہو اور ثقاہت کے اس درجے پر بھی نہ ہو کہ تنہا اس کی روایت کردہ حدیث قابل قبول ہو۔ چنانچہ حافظ ابن صلاح اپنے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

اگر راوی کسی حدیث کی روایت میں منفرد ہو تو اس کے بارے میں غور وفکر سے کام لیا جائے گا۔ اگر وہ اُس کی منفرد روایت میں اس حدیث کا مخالف پایا جائے گا جس کا راوی حفظ وضبط حدیث میں اس سے اونچا مقام رکھتا ہے تو اس کی یہ منفرد روایت شاذ کہہ کر رد کر دی جائے گی۔

لیکن اگر وہ اپنی اس روایت میں کسی دوسرے راوی کا مخالف نہیں ہوگا بلکہ تنہا اس کا راوی ہوگا، کسی اور نے اس حدیث کی روایت نہ کی ہوگی تو پھر اس کی حالت کا مطالعہ کیا جائے گا۔ اگر وہ عادل، حافظ اور فن روایت میں ماہر اور ضبط حدیث میں قابل اعتماد ہے تو اس کی وہ منفرد روایت قبول کر لی جائے گی۔ لیکن اگر وہ حفظ ومہارت فن میں بھروسے کے قابل ثابت نہ ہو تو پھر اس کی یہ انفرادیت اس کی روایت کردہ حدیث کو ''صحیح'' کے دائرے سے خارج کر دے گی۔[2]

علم حدیث کے متفق علیہ امام حافظ ابن صلاح کی مذکورہ وضاحت کی روشنی میں جب ہم اس زیر بحث روایت کے راوی ''مالک الدار'' کے حالات پر غور کرتے ہیں تو اس کو ایک مجہول الحال اور غیر معروف راوی پاتے ہیں۔ جس کی ثقاہت یا عدالت وضبط حدیث کے بارے میں ''علمائے رجال'' میں سے کسی نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ علم الرجال یا فن جرح وتعدیل کے متفق علیہ امام ابو حاتم محمد بن ادریس بن

[1] فتح الباری: ص ۷۱٦، ج ۱
[2] مقدمہ ابن صلاح: ص ٥٦۔

منذر تمیمی حنظلی رازی کے مایہ ناز فرزند امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم نے اپنی مشہور کتاب ''الجرح والتعدیل'' [1] میں اس ''مالک الدار'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''اس سے ابوصالح سمان کے سوا کسی نے کوئی حدیث روایت نہیں کی ہے۔ فن رجال پر گہری اور وسیع نظر رکھنے کے باوجود اس کی ثقاہت کے بارے میں کسی بھی امام کا قول نقل نہیں کیا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ ان کے نزدیک بھی وہ غیر معروف شخص تھا۔

یہی بات حافظ منذری نے "الترغیب والترغیب" [2] میں مالک الدار سے ابوصالح سمان کی روایت کردہ ایک دوسری حدیث یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک دوسرے واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

''اس واقعہ کو حافظ طبرانی نے المعجم الکبیر میں نقل کیا ہے جس کے راوی ''مالک الدار'' تک ثقہ ہیں۔ رہا مالک الدار تو میں اس کو نہیں جانتا۔''

اوپر کی وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں مذکورہ واقعہ کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ ''یہ واقعہ ابن ابی شیبہ نے مالک الدار سے ابوصالح سمان کی روایت سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔'' تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اس واقعہ کی سند ابوصالح سمان تک صحیح ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے واقعہ کی پوری سند حذف کر کے "راویة ابی صالح عن مالك الدار" کہنے پر اکتفا کیا ہے۔ اگر ان کے نزدیک پوری سند صحیح ہوتی تو وہ یوں کہتے: یہ روایت ''مالک الدار'' سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیثوں کے ذکر کے موقع پر وہ اور دوسرے محدثین حدیث کی پوری سند حذف کر کے اوپر کے آخری راوی کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''فلاں سے صحیح سند کے ساتھ روایت ہے۔''

اس طرح یہ واقعہ ''مالک الدار'' کے مجہول اور غیر معروف ہونے کی وجہ سے سند کے اعتبار سے صرف ''شاذ'' ہی نہیں رہا بلکہ باطل اور مردود ہوگیا۔

اب رہی اس روایت کی علت تو اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر جا کر آپ سے دعا کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ جب کہ قرآن وحدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی صراحت آچکی ہے اور تمام ائمہ حدیث وفقہ کے اتفاق سے آپ اس فانی دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ سے دعا کی درخواست صحیح نہیں رہی۔ کیونکہ دعا کرنا ایک عمل ہے اور عمل کا سلسلہ وفات پا جانے کے بعد منقطع ہو جاتا ہے۔ اس طرح اپنے متن میں اس علت اور سبب کی وجہ سے بھی یہ روایت باطل اور مردود ہے۔

---

[1] الجرح والتعدیل: ص ۲۱۳ ج ٤۔ [2] الترغیب والترهیب: ص ۵۵۱ ج ۱۔

اس روایت کے مردود اور ناقابل قبول ہونے کی ایک دوسری علت یہ ہے کہ اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے اپنی قبر مبارک کی زیارت کرنے والے کے خواب میں آ کر اس کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے یہ کہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ اپنے معاملات میں ''دانش مندی اور سوجھ بوجھ'' سے کام لیں۔ یہ دعویٰ نبی کریم ﷺ کے ان ارشادات کے خلاف ہے جن میں آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فراست و دانائی اور حق کی راہ میں ان کی استقامت و ثابت قدمی اور باطل کے خلاف ان کی شدت کی تعریف فرما چکے ہیں۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں سیف بن عمر کی کتاب ''الفتوح الکبیر'' کے حوالہ سے جو یہ لکھا ہے کہ خواب دیکھنے والے ایک صحابی: حضرت بلال بن حارث مزنی تھے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے تو سیف بن عمر کا یہ دعویٰ مردود ہے۔ کیونکہ وہ باتفاق جمیع محدثین روایت میں ضعیف اور ناقابل اعتبار[1] تھا۔ مزید یہ کہ امام ابو حاتم نے اس کو متروک لکھا ہے۔ امام ابن حبان نے اس کو بددین...... زندیق...... قرار دیا ہے اور اس پر ثقہ راویوں کے نام سے موضوع اور جھوٹی روایتیں بیان کرنے کا الزام لگایا ہے۔ امام ابوداؤد کا قول ہے کہ روایت حدیث میں وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ یعنی ناقابل اعتبار اور ناقابل اعتماد تھا۔[2]

لہٰذا مذکورہ واقعہ اپنی سند اور متن دونوں اعتبار سے مردود اور ناقابل اعتبار ہے۔ خلیفہ دوم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عمل کے خلاف ہونے کی وجہ سے منکر اور باطل ہے۔ کیونکہ یہ ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ''قحط'' پڑنے کی حالت میں نماز استسقاء ادا فرمائی تھی اور رسول اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے بارش کے لیے دعا کروائی تھی،[3] رسول اکرم کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر آپ سے دعا کی درخواست نہیں کی تھی۔

اہل قبور اور غیر اللہ کو وسیلہ اور ذریعہ بنانے والوں کو قرآن پاک کی واضح اور صریح آیات اور وہ صحیح احادیث نظر نہیں آتیں جن میں غیر اللہ کو پکارنے، قبروں میں مدفون بزرگان دین، صالحین اور اولیاء سے مدد کی درخواست کرنے اور قبروں پر عرس منانے اور میلہ لگانے سے منع کیا گیا اور ایسا کرنے والوں پر لعنت کی گئی ہے۔ لیکن ان کو وہ بے بنیاد، ناقابل اعتماد اور ضعیف روایتیں ضرور نظر آ جاتی ہیں، جن سے ان کے فاسد عقائد کی تائید ہوتی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس طرح کی روایتوں کو گھڑنے والے اور ان

---

[1] التقریب: ص ۲۰۲ ترجمہ: ۴۷۲۳۔
[2] الضعفاء والمتروکین: ص ۱۴۹، ترجمہ ۲۸۳۔ میزان الاعتدال ص ۲۵۵ ج ۲، ترجمہ: ۳۶۲۷۔
[3] صحیح بخاری: ح ۱۰۱۰۔

کو لوگوں میں پھیلانے والے یہی لوگ ہیں۔

رہی وہ روایت جس میں آیا ہے کہ امت کے اعمال رسول اکرم ﷺ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں تو یہ روایت مرسل ہے جو نا قابل استدلال ہے۔ چنانچہ بکر بن عبداللہ مزنی سے روایت ہے: کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

(۲۵٦)......حَيَاتِي خَيْرٌ لَكُمْ تُحَدِّثُونَ وَ يُحَدَّثُ لَكُمْ ، فَإِذَا أَنَا مِتُّ كَانَتْ وَفَاتِي خَيْرًا لَكُم، تُعْرَضُ عَلَيَّ أَعْمَالُكُمْ ، فَإِنْ رَأَيْتُ خَيْرًا حَمِدْتُ اللّٰهَ وَإِنْ رَأَيْتُ غَيْرَ ذٰلِكَ اسْتَغْفَرْتُ اللّٰهَ لَكُمْ))

''میری زندگی تمہارے لیے بہتر ہے تم بات کرتے ہو اور تم سے بات کی جاتی ہے۔ پس جب میں وفات پا جاؤں گا تو میری وفات بھی تمہارے لیے بہتر ہوگی۔ تمہارے اعمال میرے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ اگر میں ان کو بہتر دیکھوں گا تو اللہ کی حمد بیان کروں گا اور اگر اس کے برعکس دیکھوں گا تو تمہارے لیے اللہ سے استغفار کروں گا۔''

یہ روایت مرسل [1] ہے۔ اس طرح کے غیبی اور عقائدی امور میں مرسل روایت قابل استدلال نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ کی موجودہ زندگی برزخی زندگی ہے جس کی کُنہہ اور حقیقت کا ادراک ہم نہیں رکھتے۔ لہٰذا اس برزخی زندگی کے احوال کے بارے میں ایک مرسل روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے راوی بکر بن عبداللہ مزنی ہیں جو تابعین کے طبقہ وسطی سے تعلق رکھتے تھے۔

بکر بن عبداللہ مزنی سے یہ روایت ایک دوسری سند سے بھی مروی ہے لیکن وہ بھی مرسل ہے اور مرسل روایت کسی دوسری مرسل روایت کو تقویت نہیں دیتی۔ [2]

رسول اکرم ﷺ کی طرف زائرین کے ذریعے سلام بھیجنا

عام طور پر مسلمانوں میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی کسی کو مدینہ کے سفر پر روانہ ہوتے دیکھتا ہے یا دوست احباب میں کسی کے بارے میں مدینہ منورہ جانے کی خبر ملتی ہے تو ان سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ جب آپ مسجد نبوی میں حاضر ہوں اور نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کریں تو میری طرف سے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔

---

[1] اگر سند رسول اللہ ﷺ تک متصل نہ ہو بلکہ تابعی اور رسول اکرم ﷺ کے درمیان کی کڑی، صحابی غائب ہو اور تابعی آپ سے روایت کرے تو یہ مرسل ہوتی ہے۔ کیونکہ تابعی نے وہ حدیث نبی کریم ﷺ سے نہیں سنی ہوتی۔

[2] فضل الصلاۃ علی النبی ﷺ: ح ۲۵، ۲٦۔

تو کیا یہ عمل شروع ہے اور اس کی کوئی حقیقت ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ عمل غیر مشروع ہے اور اس کے حق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور ائمہ حدیث وفقہ رحمہم اللہ کے عمل سے کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔ مزید یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجنے کے لیے قبر مبارک کی زیارت یا اس کا قرب کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ ائمہ اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریب سے یا دور سے جہاں سے بھی سلام کیا جائے آپ اس کو خود نہیں سنتے۔ کیونکہ اس دنیا سے آپ کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے۔ بلکہ ہمارا درود وسلام فرشتوں کے ذریعہ آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔ قبر مبارک کے قریب سے درود وسلام سننے سے متعلق لوگوں میں جو حدیث زبان زد ہے وہ جھوٹ اور من گھڑت ہے۔[1]

برصغیر کے ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت حنفی مسلک کی پیرو ہے اور صوفیاء کی اکثریت بھی حنفی ہے۔ تصوف سے متعلق جو بات مسلم ہے وہ یہ کہ تصوف کی کتابوں میں عقائد سے لے کر اعمال تک اور عبادات سے لے کر تزکیہ نفس کے طریقوں تک بیشتر باتیں کتاب وسنت سے ماخوذ نہیں ہیں۔ بلکہ صوفیاء کے ذوق کی پیداوار ہیں۔ حتیٰ کہ ''توحید خالص'' جو اسلام کی روح ہے اور جس کو اولاد آدم میں زندہ رکھنے کے لیے انبیاء اور رسولوں کو بھیجا جاتا رہا ہے وہ بھی صوفیاء کے نزدیک وہ نہیں ہے جس کی دعوت کتاب وسنت میں دی گئی ہے۔ بلکہ صوفیاء کی اپنی خاص توحید ہے جو ان کے ذوق کی پیداوار ہے۔ اسے معلوم کرنے کے لیے تصوف کی کسی بھی مستند کتاب سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ اپنی قبر مبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرح زندہ رہنے جس طرح آپ پہلے زندہ تھے اور اس طرح لوگوں کی باتوں، دعاؤں اور عرض ومعروض سننے کا عقیدہ، جس طرح آپ پہلے سنتے تھے، صوفیاء کا پھیلایا ہوا ہے۔ اس مسئلے کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ ''بشریتِ رسول'' کے عنوان کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ عقیدہ کہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر مبارک میں دنیوی زندگی حاصل ہے۔ نہ ائمہ احناف کا ہے، نہ کسی بھی فقہی مسلک کے امام کا اور نہ محدثین میں سے کسی کا۔ بلکہ یہ صوفیاء کے ذہن کی پیداوار ہے۔ سابقہ تفصیلات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس مسئلے میں صوفیاء کا عقیدہ محدثین اور فقہاء میں سے کسی کا بھی نہیں ہے۔

اس سلسلے میں مردوں کے ''عدم سماع'' کے موضوع پر عراق کے مایہ ناز عالم اور محقق علامہ نعمان بن محمود آلوسی رحمہ اللہ کی کتاب: ''الآيات البينات في عدم سماع الاموات عند الحنفية

---

[1] ملاحظہ ہو اس کتاب کی جلد اوّل ص ۲۱۹، ۲۲۰۔

السادات" ایک نہایت منفرد کتاب ہے جو کتاب وسنت کے واضح دلائل سے مزین ہے۔ علامہ نعمان مشہور عراقی مفسر قرآن علامہ محمود آلوسی کے لائق فرزند تھے۔

جو اصحاب علم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کو برزخی زندگی نہیں بلکہ دنیوی زندگی حاصل ہے اور آپ زائرین کے درود وسلام کو بذات خود سنتے ہیں، ان کے سلام کا جواب دیتے ہیں اور زائرین کی درخواست پر ان کے لیے دعا واستغفار کرتے ہیں۔ ان سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے اس صحیح العقیدہ عالم کی کتاب دل ودماغ کو تعصب سے پاک کر کے ضرور پڑھیں اور اپنی ان تحریروں سے اظہار برأت کردیں جو قبر پرستی کی وباء کو عام کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ جو اس میدان میں بڑا کردار ادا کر رہی ہیں اور لوگوں کی گمراہی کا سبب بن رہی ہے۔

قبر مبارک کی زیارت کی دعا

سوال: بعض کتابوں میں نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے موقع پر کی جانی والی دعاؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک دعا ان الفاظ میں بیان کی جاتی ہے:

(۲۵۷)......اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُحَمَّدَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَ أَشْهَدُ إِنَّكَ بَلَّغْتَ رِسَالَةَ رَبِّكَ وَنَصَحْتَ لِأُمَّتِكَ وَجَاهَدْتَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ عَبَدْتَ اللّٰهَ حَتّٰى أَتَاكَ الْيَقِيْنُ، فَجَزَاكَ اللّٰهُ أَفْضَلَ مَاجَزٰى نَبِيًّا عَنْ أُمَّتِهِ وَرَفَعَ دَرَجَتَكَ الْعُلْيَا، وَ تَقَبَّلَ شَفَاعَتَكَ الْكُبْرٰى وَأَعْطَاكَ سُؤْلَكَ فِي الْاٰخِرَةِ وَالْأُوْلٰى كَمَا تَقَبَّلَ مِنْ إِبْرَاهِيْمَ، اَللّٰهُمَّ أُحْشُرْنَا فِي زُمْرَتِهِ وَتَوَفَّنَا عَلٰى سُنَّتِهِ وَأَوْرِدْنَا حَوْضَهُ وَاسْقِنَا بِكَأْسِهِ مَشْرَبًا رَوِيًّا لَا نَظْمَأُ بَعْدَهُ أَبَدًا۔))

"اے اللہ کے رسول آپ پر اللہ کی سلامتی، اس کی رحمت اور برکتیں نازل ہوں۔ اے محمد بن عبداللہ آپ پر اللہ کی سلامتی۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ بلاشبہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا، اپنی امت کو خیر وبھلائی کی نصیحت کردی، اللہ کی راہ میں حکمت اور

بہترین نصیحت و موعظت کے ساتھ جہاد کیا۔ اور اللہ کی عبادت کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کے پاس یقین، موت، آ گیا۔ اللہ آپ کو اس سے بہتر جزا دے جو اس نے کسی نبی کو ان کی امت کی طرف سے دی ہے۔ آپ کے اعلیٰ درجات کو مزید بلند کرے۔ آپ کی شفاعت کبریٰ کو قبولیت سے نوازے۔ دنیا و آخرت میں آپ کی درخواست اور طلب آپ کو عطا کرے۔ جس طرح اس نے ابراہیم کی دعا قبول فرمائی۔ اے اللہ! تو ہمیں ان کے زمرے میں اٹھا، ان کی سنت پر وفات دے، ان کے حوض پر لے جا اور ان کے ہاتھ سے ایسی سیر کر دینے والی شراب پلا جس کے بعد ہم کبھی پیاسے نہ ہوں۔"

تو کیا یہ دعا صحیح ہے اور رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے وقت یہ دعا کرنی چاہیے؟

جواب: اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ احادیث میں مخصوص طور پر اور نام لے کر نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کا کوئی ذکر نہیں آیا ہے۔ یعنی نہ تو اس کا حکم دیا گیا ہے اور نہ اس کی ترغیب دی گئی ہے لہٰذا یہ زیارت بھی باقی قبروں کی زیارت کے حکم میں داخل ہے اور اس کی اگر کوئی شرعی دلیل ہے تو وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل ہے۔ عمل صحابہ کے بارے میں یہ اصول ہے کہ کسی صحابی کا وہ عمل جو نصوص سے ثابت کسی حکم کے خلاف نہ ہو اور دوسرے صحابہ اس کے مخالف نہ رہے ہوں تو اس کے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ امید ہے کہ اس پر اجر بھی ملے گا۔

رہی مذکورہ دعا تو اس کا لفظ لفظ اس کے من گھڑت ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے اس کی پابندی نہ کرنا بہتر ہے۔ اور کوئی بھی دعا قبر مبارک کی طرف چہرہ کر کے مانگنی بالاتفاق جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے عمل سے ثابت ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق اور جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو سلام کر کے وہاں سے رخصت ہو جاتے تھے۔ ائمہ اسلام میں تنہا حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ایسے ہیں جن کے نزدیک قبر کی طرف رخ کر کے سلام کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ بلکہ سلام اور دوسری دعائیں قبلہ رخ ہو کر کرنی چاہئیں۔

دعاؤں کے سلسلے میں ہمیشہ ماثور دعاؤں کو اختیار کرنا چاہیے۔ لوگ خود اپنی زبانوں میں بھی دعائیں مانگ سکتے ہیں۔ یہ بات ہرگز ذہن سے اوجھل نہیں ہونے دینی چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے آپ سے دعا کرنا شرک اکبر ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ اس بات کا سزاوار ہے کہ اس سے دعائیں مانگی جائیں۔ اسی طرح شفاعت کبریٰ کی درخواست بھی آپ سے کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ

ﷺ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے یہ شفاعت فرمائیں گے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرنی چاہیے اور اسی سے التجا کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں اس شفاعت کا مستحق بنائے۔ اس شفاعت کے مستحق وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے نبی مکرم ﷺ کے لائے ہوئے دین میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہوگی۔

نبی کریم ﷺ سے محبت اور آپ کی تعظیم کا مطلب ہے کہ آپ کی اطاعت اور اتباع کی جائے۔ جن جن چیزوں کو آپ نے پسند فرمایا یا ان کو پسند کیا جائے، جن باتوں کا حکم دیا ان پر عمل کیا جائے۔ جن باتوں کو ناپسند فرمایا اور جن کاموں سے منع فرمایا ان سے باز رہا جائے۔ لیکن آپ کی محبت، تعظیم اور محبت کے نام پر ایسے کام کرنا جن کا آپ نے حکم نہیں دیا ہے یا جن سے آپ نے منع فرمایا ہے، آپ سے عداوت ہے آپ کی تعظیم اور آپ سے محبت ہرگز نہیں ہے۔

اس تناظر میں نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کو واجب یا مستحب قرار دینے اور اس غرض کے لیے سفر کرنے پر غور کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایسا کرنا واجب یا کم از کم مستحب اور پسندیدہ عمل ہوتا تو کم از کم ایک بار بھی رسول اکرم ﷺ نے اس کا حکم دیا ہوتا یا اس کی طرف اشارہ فرمایا ہوتا۔

روضہ شریفہ میں نماز:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَا بَيْنَ بَيْتِي وَ مِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ وَمِنْبَرِي عَلَى حَوْضِي))[1]

"میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے۔"

رَوْضَةٌ کے معنی سرسبز و شاداب قطعہ زمین کے ہیں۔ خوبصورت باغ کو بھی روضہ کہتے ہیں۔ اس کی جمع ریاض آتی ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے اپنے کسی ارشاد میں یہ واضح نہیں فرمایا ہے کہ آپ نے اپنے گھر اور منبر کے درمیانی مقام کو کس اعتبار سے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ قرار دیا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ "المنهاج فی شرح مسلم" میں تحریر فرماتے ہیں:

علماء سے روضۃ من ریاض الجنۃ کے بارے میں دو اقوال منقول ہیں:

---

[1] صحیح بخاری: ح ۱۱۹۶، ۱۸۸۸۔ صحیح مسلم: ح ۱۳۹۰، ۳۳۶۸، ۳۳۷۰۔

(۱) یہ جگہ بعینہٖ جنت میں منتقل کر دی جائے گی۔

(۲) اس جگہ عبادت جنت میں جانے کی باعث ہوگی۔[۱]

حافظ ابن حجر فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں:

روضۃ من ریاض الجنۃ کا مطلب ہے کہ یہ جگہ...... وہاں ذکر کے حلقات کے نتیجے میں خاص طور پر نبی کریم ﷺ کے عہد میں رحمتوں کے نزول اور سعادت کے حصول کے اعتبار سے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔[۲] لیکن ان دونوں اقوال میں سے اس قول: اس جگہ عبادت جنت میں جانے کی باعث ہوگی یا اس جگہ ذکر و اذکار کے حلقات منعقد کرنے کی وجہ سے وہاں رحمتوں کے نزول اور حصول سعادت کی وجہ سے اس کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ قرار دیا گیا ہے۔'' کو قبول کرنے میں جو چیز مانع ہے وہ یہ کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی مسجد میں ایک نماز کو مسجد حرام کے سوا دوسری مساجد میں ادا کی جانے والی ایک ہزار نمازوں سے افضل قرار دیا ہے۔ اگر ''روضۃ'' میں نماز یا دوسری کسی عبادت کی کوئی خاص فضیلت ہوتی تو آپ نے اسے واضح فرما دیا ہوتا۔ مگر آپ نے ایسا نہیں فرمایا۔

لہٰذا رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مبارک ایک خوبصورت تمثیل ہے اور اس کا مطلب ہے کہ وہ جگہ جس کو زبان نبوت نے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ قرار دیا ہے وہ دوسری زندگی میں حقیقتاً جنت کا ایک حصہ ہوگی۔ اس کی تائید حدیث کے آخری فقرے: ((وَ مِنْبَرِیْ عَلَی حَوْضِیْ))...... ''میرا منبر میرے حوض پر ہے......'' سے ہوتی ہے۔ واللہ اعلم الصواب۔

سوال یہ ہے کہ: کیا رسول اکرم ﷺ کے گھر اور منبر کے درمیان پائے جانے والے مذکورہ حصہ کی فضیلت اس امر کی بھی مستلزم ہے کہ اس جگہ نماز پڑھنا مسجد نبوی کے دوسرے حصوں میں نماز پڑھنے سے زیادہ افضل ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں: کیا ''روضۃ'' میں دو رکعتیں ادا کرنا مشروع ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی خاص جگہ کی قدسیت یا فضیلت اس جگہ نماز ادا کرنے یا کوئی اور عبادت کرنے کی مستلزم قطعاً نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی خاص جگہ نماز ادا کرنے یا کسی بھی عبادت کے مشروع ہونے کے لیے کتاب و سنت سے صریح نص درکار ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ میں ''مقام ابراہیم'' کو جائے نماز بنانے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

---

[۱] شرح نووی: ص ۸۶۲۔ [۲] شرح نووی: ص ۱۰۵۰ ج ۱۔

﴿ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ ﴾

[البقرہ: ۱۲۵]

''یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے بار بار آنے کی جگہ اور جائے امن بنا دیا۔ تم لوگ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز ادا کرنے کی جگہ بنا لو۔''

یوں تو پورا حرم جائے نماز ہے اور اس میں ادا کی جانے والی ایک نماز مسجد نبوی کے سوا دنیا کی دوسری مسجدوں میں ادا کی جانے والی ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔ لیکن پورے حرم کی اس افضلیت کے ساتھ ساتھ ''مقام ابراہیم'' کو یہ خصوصیت حاصل ہے۔ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ: تین باتوں میں میری بات اللہ تعالیٰ کے ارشادات کے مطابق رہی۔ جس میں سے پہلی بات یہ تھی کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

((يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! لَوِ اتَّخَذْتَ مَقَامَ إِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى))

''اے اللہ کے رسول! کاش آپ مقام ابراہیم کو جائے نماز بنا لیں۔''

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

ابونعیم نے ''دلائل النبوة'' میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی جو حدیث نقل کی ہے اس میں آیا ہے کہ: نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کا ہاتھ پکڑا اور ان کو لے کر مقام ابراہیم سے گزرے اور فرمایا: یہ مقام ابراہیم ہے۔ اس پر انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! آپ اس کو نماز کی جگہ کیوں نہیں بنا لیتے۔''

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں: درحقیقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ درخواست کی تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل کیا جائے۔ کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے پیش نظر یہ درخواست کی تھی:

((اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا))[1]

''میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔''

واضح رہے کہ طواف کعبہ کے بعد مقام ابراہیم میں کسی جگہ دو رکعتیں ادا کرنا سنت ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے بارے میں جو طویل حدیث مروی ہے اس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے البیت الحرام کا سات بار طواف کیا، مقام ابراہیم پر آئے اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

((وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى))[2]

---

[1] ص ۱۹۳۸ ج۲۔ [2] صحیح مسلم: ح ۱۲۱۸ ۲۹۵۰۔

"کی تلاوت فرمائی اور دو رکعتیں ادا کیں۔"

اس طویل وضاحت کا مقصد یہ بتانا تھا کہ کسی بھی جگہ نماز ادا کرنے یا کوئی بھی عبادت کرنے کی مشروعیت کتاب وسنت کی صریح نص سے ثابت ہوتی ہے۔ جب کہ "روضہ شریفہ" میں نماز ادا کرنے یا کوئی بھی عبادت کرنے کا ذکر نبی کریم ﷺ کی کسی بھی حدیث میں نہیں آیا ہے۔ تو پھر وہاں دو رکعتیں ادا کرنے کے لیے لوگوں میں مزاحمت کیوں ہوتی ہے؟

مسجد قبا میں ایک نماز عمرہ کے برابر ہے

مسجد قباء اسلام کی پہلی مسجد ہے۔ مسجد نبوی کی طرح یہ بھی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر مسجد نبوی سے پہلے ہوئی تھی لیکن اس کا درجہ مسجد نبوی سے کم ہے۔ اس میں ایک نماز عمرہ کے برابر ہے۔ رسول اللہ ﷺ ہر ہفتہ والے دن مسجد قباء سواری پر یا پیدل تشریف لے جاتے اور اس میں دو رکعتیں ادا فرماتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔

((إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَأْتِي قُبَاءَ مَاشِيًا وَرَاكِبًا، فَيُصَلِّي فِيهِ رَكْعَتَيْنِ))[1]

"نبی کریم ﷺ کبھی پیدل اور کبھی سوار قبا تشریف لے جاتے اور اس میں دو رکعتیں نماز ادا فرماتے تھے۔"

حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَطَهَّرَ فِي بَيْتِهِ ثُمَّ أَتَى مَسْجِدَ قُبَاءَ، فَصَلَّى فِيهِ صَلَاةً كَانَ لَهُ كَأَجْرِ عُمْرَةٍ))[2]

"جو اپنے گھر میں طہارت حاصل کرے، پھر مسجد قبا آئے اور اس میں نماز ادا کرے تو اس کا اجر عمرہ کے اجر کے برابر ہے۔"

مسجد قباء میں نماز پڑھنے کی یہ فضیلت ان لوگوں کے لیے ہے جو یا تو وہاں مسجد قباء کے گرد ونواح میں مقیم ہوں یا مدینہ میں مقیم ہوں، یا مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی نیت سے باہر سے مدینہ گئے ہوں۔ لیکن مسجد قباء میں نماز ادا کرنے کی نیت سے وہاں کا سفر جائز نہیں ہے۔ کیونکہ صرف تین مسجدوں میں نماز ادا کرنے کی نیت سے سفر کرنا جائز ہے۔ اسی طرح مسجد نبوی میں زیارت کی نیت سے مدینہ منورہ کا سفر کرنے والوں کے لیے بقیع کے قبرستان کی زیارت کرنا بھی مشروع ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ بقیع

---

[1] صحيح بخاري: ١١٩١، ١١٩٣، ١١٩٤، ٧٣٢٦۔ صحيح مسلم: ح ١٢٩٩، ٣٣٩٠۔

[2] صحيح الجامع: ح ٦١٥٤۔ سنن ابن ماجه: ح ١٤٢٢۔ سنن نسائي: ح ٦٩٨۔

کی زیارت فرماتے تھے اور وہاں مدفون مسلمانوں کے لیے یہ دعا فرماتے تھے۔

((يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَ الْمُسْتَأْخِرِيْنَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِأَهْلِ بَقِيْعِ الْغَرْقَدِ))[1]

"اللہ ہم میں سے آگے جانے والوں اور پیچھے رہ جانے والوں، بعد میں جانے والوں، پر رحم فرمائے اللہ! تو اہل بقیع غرقد کی مغفرت فرما۔"

شہدائے احد اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبروں کی زیارت بھی مشروع ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فعلی سنت ہے۔ کیونکہ آپ ان کی زیارت فرمایا کرتے تھے۔

لیکن ان قبروں کی زیارت اگر ان سے دعا مانگنے، ان سے مشکلات کے حل، بیماری سے شفاء، دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے یا اس طرح کے دوسرے امور کی درخواست کی غرض سے کی جائے تو یہ حرام ہے۔

مدینہ میں وفات پا جانے والا مسلمان شفاعت کا مستحق ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((مَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ يَمُوْتَ بِالْمَدِيْنَةِ، فَلْيَمُتْ بِهَا، فَإِنِّي أَشْفَعُ لِمَنْ يَمُوْتُ بِهَا))[2]

"جو مدینہ میں مرنے پر قدرت رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہاں ہی مرے۔ کیونکہ میں وہاں مرنے والے کی شفاعت کروں گا۔"

کوئی بھی انسان کسی جگہ اپنی خواہش سے مرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی مدینہ میں تادم واپسیں قیام کی استطاعت رکھتا ہو تو وہ ایسا کرنے سے دریغ نہ کرے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مانند ہے۔

﴿ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ [البقرہ: ۱۳۲]

"پس ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔"

مطلب یہ ہے کہ تم مرتے دم تک مسلمان ہی رہنا۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى رَسُوْلِنَا وَحَبِيْبِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى وَآلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَسَلَّمَ

---

[1] صحیح مسلم: ح ۹۷۴، ۹۷۵۔ [2] سنن ترمذی: ح ۳۹۱۷

باب چہارم

معاشرت

اسلام میں عورت کا مقام و درجہ

انسانوں کے خالق و رب اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴾ [الاحزاب:۳۵]

”درحقیقت مسلم مرد اور مسلم عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں، راست باز مرد اور راست باز عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، اللہ کے آگے جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔“

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی تمام بنیادی قدریں جمع کر دی ہیں اور ان میں مردوں اور عورتوں کو مساوی درجات عطا فرمائے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقام و مرتبے، فرائض و واجبات اور اعمال کے اجر و ثواب کے اعتبار سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر ان میں کوئی فرق ہے تو صرف دائرہ کار میں۔

اسی طرح اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ کہ رسول اکرم فداہ ابی وامی ﷺ نے جب دین توحید کی دعوت دی تو اس کو مردوں اور عورتوں نے یکساں طریقے سے اور یکساں جذبے اور آمادگی کے ساتھ قبول کیا۔ ایمان کی راہ میں پیش آنے والی آزمائشوں اور ابتلاؤں میں دونوں

نے یکساں صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا۔ اپنی جسمانی ساخت میں کمزور ہونے کے باوجود عورتیں اس میدان میں مردوں سے پیچھے نہ رہیں۔ بلکہ ان سے آگے نکل گئیں جس کی واضح ترین مثال ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کی ذات گرامی ہے۔ جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے غار حرا میں حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد اور قرآن پاک کی پہلی آیات کے نزول کا واقعہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر مبارک ۵۵ برس تھی۔ اپنے عظیم شوہر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے وہ واقعہ اس حال میں سنا تھا کہ آپ لرزاں وترساں تھے اور فرما رہے تھے:

((أَيْ خَدِيْجَةُ! لَقَدْ خَشِيْتُ عَلَى نَفْسِيْ))[1]

"اے خدیجہ! مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے۔"

پھر یہ واقعہ جس انداز میں پیش آیا تھا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تصور میں نہ تھا۔ خود حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے وہم وگمان میں بھی کبھی یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس طرح کا واقعہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ فرشتے کی اچانک آمد، اس کی زبردست ہستی، اس کا بزور آپ کو بھینچنا اور پھر نہایت پاکیزہ اور اچھوتا کلام سنانا۔ یہ ساری باتیں آپ کو خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھیں۔[2] آپ سے زیادہ اُمّا لمومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو خوف زدہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ صنف نازک تھیں اور سن رسیدہ بھی۔ مگر نہیں، ان کی نگاہوں کے سامنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تمام اعلیٰ صفات اور آپ کے عظیم اخلاق آ گئے۔ وہ پورے یقینِ قلب کے ساتھ گویا ہوئیں: "کَلّا" ہرگز نہیں۔ یعنی آپ کی جان کو کوئی بھی خطرہ لاحق نہیں ہے۔

((أَبْشِرْ، فَوَاللّٰهِ، لَا يُخْزِيكَ اللّٰهُ أَبَدًا، فَوَاللّٰهِ إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَصْدُقُ الْحَدِيْثَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ......))

"آپ خوش ہو جائیے، اللہ کی قسم! اللہ آپ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں، لوگوں کا بار اٹھاتے ہیں، نادار اور محروم کو کما کر دیتے

---

[1] صحیح بخاری: ح ۳، ۴۹۵۲، ۴۹۵۵، ۴۹۵۷، ۶۹۸۲۔ صحیح مسلم: ح ۱۶۰

[2] انبیاء علیہم السلام اسی طرح اچانک منصب نبوت سے سرفراز کیے جاتے رہے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جاہل معاشرے اور اس کے مشرکانہ ماحول سے سخت بیزار تھے۔ مگر یہ بات آپ کے ذہن ودماغ میں نہیں تھی کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ آپ کو ایمان کی تفصیلات اور کتاب کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ (شوریٰ: ۵۲)

ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی راہ میں پیش آنے والے مصائب میں مدد دیتے ہیں۔''[1]

غور کا مقام ہے کہ ام المومنین نے نبی اکرم ﷺ کے جو اوصاف ومحاسن بیان فرمائے وہ ایک انسان کامل کے اوصاف ومحاسن ہیں اور جو عظیم انسان ان اوصاف حمیدہ سے موصوف ہو وہ ایک غیر معمولی انسان ہے جس کے خوف زدہ ہونے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ ان اوصاف سے، بیوی سے زیادہ کوئی اور واقف نہیں ہوسکتا۔ ام المومنین نے آپ کا حوصلہ بڑھانے اور آپ کو ڈھارس دینے کے لیے نبی کریم ﷺ کی کوئی ظاہری اور جسمانی صفت بیان نہیں فرمائی۔ حالانکہ آپ جسمانی حسن و جمال اور جسمانی طاقت وتوانائی میں بھی بے مثال تھے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ سن کر ان کو یہ یقین کامل ہوگیا تھا کہ نبی مکرم ﷺ ایک غیر معمولی انسان ہیں اور آپ کے پاس آنے والی عظیم ہستی جنوں اور شیطانوں کے قبیل سے نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ وہ جس مشرکانہ معاشرے میں زندگی گزار رہی تھیں اس میں جبریل علیہ السلام اور دوسرے فرشتوں کے بارے میں کسی خاص تصور کا امکان نہیں تھا جو ہر طرح کے شر سے پاک نورانی وجود ہیں۔

اس کے بعد نبوت کے باقاعدہ اعلان اور دعوت حق کے آغاز سے لے کر اپنی زندگی کی آخری سانس تک ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم فداہ ابی وامی ﷺ کا جس طرح ساتھ دیا اور جس طرح آپ کی معنوی اور مادی حمایت کی وہ ایثار و قربانی اور محبت و فدائیت کی ایک ایسی روشن داستان ہے جو انسانی تاریخ میں شاذ و نادر ہی دہرائی جاتی ہے۔ ام المومنین کا یہی وہ عظیم کردار تھا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کی تمام عورتوں کی سردار کے منصب پر سرفراز فرمایا اور اس منصب میں ان کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کو بھی شامل فرمایا۔[2]

یہی نہیں بلکہ مردوں اور عورتوں میں صرف ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کے ذریعہ اپنا سلام بھیجا۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((أَتَی جِبْرِيْلُ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! هٰذِهِ خَدِيْجَةُ قَدْ أَتَتْ، مَعَهَا إِنَاءٌ فِيْهِ إِدَامٌ أَوْ طَعَامٌ أَوْ شَرَابٌ، فَإِذَا هِيَ أَتَتْكَ فَاقْرَأْ عَلَيْهَا السَّلَامَ مِنْ رَبِّهَا وَمِنِّيْ، وَبَشِّرْهَا بِبَيْتٍ فِي الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ لَا صَخَبَ

[1] صحیح بخاری: ح ۳، ۴۹۵۳۔ صحیح مسلم: ح ۱۶۰۔ ۴۰۳

[2] صحیح بخاری: ح ۳۴۳۲، ۳۸۱۵۔ صحیح مسلم: ح ۲۴۲۰، ۶۲۷۱

فِيْهِ وَلَا نَصَبَ)) [1]

''حضرت جبریل علیہ السلام نبی ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ خدیجہ آرہی ہیں۔ ان کے پاس ایک برتن ہے جس میں سالن یا کھانا یا مشروب ہے۔ (راوی کو شک ہے)۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچ جائیں تو ان کو ان کے رب کا اور میرا سلام سنا دیجیے۔ اور ان کو جنت میں ایک ایسے گھر کی خوشخبری دے دیجیے جو کھوکھلے موتیوں سے بنا ہوگا اور اس میں شور و شغب اور تھکن نام کی کوئی چیز نہ ہوگی۔''

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں حافظ طبرانی، امام نسائی اور حافظ ابن السنی کے حوالہ سے اس ربانی سلام پر ام المومنین رضی اللہ عنہا کا جو جواب نقل کیا ہے وہ ان کے علم و فہم اور دانائی کی گہرائی اور وسعت پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّلَامُ وَعَلَى جِبْرِيْلَ السَّلَامُ وَعَلَيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ، وَعَلَى مَنْ سَمِعَ السَّلَامَ إِلَّا الشَّيْطَانَ)) [2]

''بیشک اللہ ہی سلام ہے۔ جبریل پر سلام اور اے اللہ کے رسول آپ پر سلام اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں۔ اس پر بھی سلام جس نے سلام سنا سوائے شیطان کے۔''

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی انہی خصوصیات اور انہی اعلیٰ صفات کی وجہ سے نبی مکرم ﷺ ان کی وفات کے بعد پوری زندگی ان کی یاد کو اپنے دل سے نہ نکال سکے۔ ہمیشہ ان کی تعریف اور ان کا ذکر خیر کرتے رہے۔

اسی طرح دعوتِ حق کی راہ میں جو پہلا خون بہا وہ بھی ایک خاتون حضرت سمیہ بنت خیاط رضی اللہ عنہا کا پاک اور مقدس خون تھا۔ جنہوں نے راہ حق میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے خواتین اسلام کا سر بلند کر دیا۔ وہ نہایت ضعف اور پیری میں حلقہ بگوش اسلام ہوئی تھیں۔ باندی تھیں اس لیے ابلیس کے بندوں نے ان کو دل کھول کر ستایا۔ ان پر نہایت روح فرسا مظالم ڈھائے۔ مگر ابلیس اور اس کے اہل کار اس عظیم اور اللہ تعالیٰ کی محبوب بندی کے پایۂ استقامت میں معمول لغزش پیدا نہ کر سکے۔ اور انہوں نے اللہ کی راہ میں جان دے کر حیات جاوداں حاصل کر لی۔ ارشاد الٰہی ہے:

[1] صحیح بخاری: ح ۳۸۲۰، ۷۴۹۷۔ صحیح مسلم: ح ۲۴۳۲

[2] ص ۱۷۰۷ ج ۲

﴿ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴾ [البقرہ: ١٥٤]

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انہیں مردہ مت کہو۔ وہ تو زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں اہل ایمان کی بعض صفات اور پھر ان کی بعض دعاؤں کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے:

﴿ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ط بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ج فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴾ [آل عمران: ١٩٥]

''اللہ نے ان کی دعا کا جواب دیتے ہوئے ان سے فرمایا: بیشک میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے گھر بار چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے۔ میرے لیے لڑے اور مارے گئے، ان سب کے قصور کالعدم کر دوں گا اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں۔ اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے۔''

یہ آیت مبارکہ واضح کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ مکافات اور اس کا نظام جزا و سزا اعمال کا بدلہ دینے میں مردوں اور عورتوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرے گا۔

اسلام کی آمد سے قبل آسمانی مذاہب کے ماننے والوں اور خود ساختہ طریق ہائے حیات پر چلنے والوں کا یہ نظریہ اور خیال تھا کہ عورت ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ چنانچہ یہودیوں اور عیسائیوں کا یہ عقیدہ تھا اور اب بھی ہے کہ جنت سے حضرت آدم علیہ السلام کے نکالے جانے اصل سبب اور محرک عورت تھی۔ مشرکانہ مذاہب میں بھی عورت کو پاپ اور گناہوں کا ''سوتا'' قرار دیا جاتا تھا۔ عرب جاہلیت میں تو لڑکیوں کی پیدائش کو باعث عار و شرم تصور کیا جاتا تھا۔ اس عار اور شرم سے چھٹکارا پانے کا ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں تھا کہ لڑکیوں کو ان کی پیدائش کے فوراً بعد ان کو زندہ دفن کر دیا جائے۔ اس گندی اور

ظالمانہ ذہنیت کا نقشہ قرآن پاک میں نہایت مؤثر انداز ہ میں کھینچا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ ﴾ [النحل: ۵۸، ۵۹]

''جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ نہایت دکھی ہو جاتا ہے۔ اس بُری خبر کی وجہ سے لوگوں سے چھپا پھرتا ہے۔ سوچتا ہے کہ اس کو ذلت کے ساتھ لیے رہے یا مٹی دبا دے۔ افسوس کیا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔''

قیامت میں ایسے مجرموں کے ساتھ جو معاملہ کیا جائے گا اس کا تصور بھی دل ہلا دینے والا ہے۔

﴿ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ ﴾ [التکویر: ۸۔۹]

''اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ میں ماری گئی۔''

مطلب یہ کہ قیامت میں تو ہر طرح کے مجرمین اور خطا کاروں سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال ہوگا۔ لیکن لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے والے اللہ کے نزدیک اس قدر مغضوب ہوں گے کہ روئے سخن ان کی طرف ہوگا ہی نہیں۔ بلکہ زندہ دفن کی جانے والی لڑکیوں سے سوال کیا جائے گا کہ ان کو کس گناہ اور کس قصور میں اس بھیانک طریقے سے قتل کیا گیا تھا؟ تب وہ اپنے رب سے اپنے اوپر ہونے والے اس ظلم کی داستان بیان کریں گے۔

ایسے تاریک، گندے اور غیر انسانی معاشرے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے محمد رسول اللہ ﷺ کو چار بیٹیاں اور دو بیٹے عطا کیے۔ تین بیٹیاں: زینب رضی اللہ عنہا، رقیہ رضی اللہ عنہا اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا تو بعثت سے قبل اور چوتھی: حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد پیدا ہوئیں۔ رہے بیٹے تو حضرت قاسم رضی اللہ عنہ قبل از بعثت پیدا ہوئے اور کمسنی ہی میں انتقال کر گئے۔ جبکہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا لقب طیب و طاہر تھا اور وہ بعثت کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ وہ بھی انتقال کر گئے۔

نبی رحمت فداہ ابی و امی ﷺ نے اپنی ان چاروں بیٹیوں اور ان کی عظیم ماں، ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو جو شفقت و محبت دی اس کا تصور تک اس وقت مفقود تھا۔

یوں تو رسول اکرم ﷺ پوری دنیا کے لیے رحمت تھے، جس لقب سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سرفراز

فرمایا ہے۔لیکن عورتوں کے ساتھ آپ کی محبت وشفقت اور رحمت آپ کی تمام صفات عالیہ میں نمایاں تھی۔

نبی کریم ﷺ کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتَّى تَبْلُغَا ، جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهُوَ وَضَمَّ أَصَابِعَهُ))[1]

''جس نے دولڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہوگئیں۔تو وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ میں اور وہ اس طرح قریب ہوں گے''۔آپ نے اپنی انگلیاں ملا کر اس قرب کو واضح فرمایا۔''

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میرے پاس ایک عورت آئی جس کے ساتھ اس کی دولڑکیاں تھیں۔اس نے مجھ سے کچھ مانگا مگر میرے پاس ایک کھجور کے سوا کچھ نہ تھا۔میں نے وہ کھجور اسے دے دی، تو اس نے اس کے دو ٹکڑے کرکے ایک ایک ٹکڑا ان بچیوں کو دے دیا۔حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ سے عراک بن مالک کی روایت میں ہے کہ ''میں نے اس کو تین کھجوریں دیں۔جن میں سے ایک ایک کھجور اپنی لڑکیوں کو دے دی اور تیسری کھجور خود کھانی چاہی۔جونہی وہ اس کو اپنے منہ تک لے گئی ان لڑکیوں نے اسے مانگ لیا۔اس نے اس کے دوٹکڑے کرکے ان کو دے دیے اور خود کچھ نہ کھایا۔ام المومنین فرماتی ہیں: مجھے اس کی یہ ادا بہت پسند آئی۔پھر وہ عورت اٹھی اور چلی گئی۔نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو میں نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا۔آپ نے فرمایا:

((مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هَذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ فَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ ، كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ))[2]

''جو شخص ان لڑکیوں سے متعلق آزمائش میں ڈالا جائے، پھر وہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرے تو وہ اس کے اور جہنم کے درمیان رکاوٹ بن جائیں گی۔''

جس طرح نبی اکرم ﷺ ایک عظیم باپ تھے اسی طرح ایک عظیم شوہر بھی تھے۔جس کا ثبوت آپ کے ارشادات سے ملتا ہے۔چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ فرمایا:

((خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي))[3]

---

[1] صحيح مسلم: ح ٢٦٢٩

[2] صحيح بخاري: ح١٤١٨ـ ٥٩٩٥ـ صحيح مسلم: ٢٦٢٩

[3] جامع ترمذي: ح ٣٨٩٥ـ سنن ابن ماجه: ح ٢٠٠٨ـ ١٦٢٢

”تم میں بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے لیے بہتر ہو اور تم میں اپنی بیویوں کے لیے سب سے بہتر میں ہوں۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَكْمَلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِيْمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا، وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ))[1]

”مومنوں میں کامل ترین ایمان والا وہ ہے جو ان میں سب سے زیادہ بااخلاق ہو اور تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے بہتر ہو۔“

ایک اشکال اور اس کا جواب

اگر اسلام میں عورت کا یہی بلند مقام اور درجہ ہے تو پھر مردوں کے ”قوّام“ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اور حدیث میں عورتوں کے ”ناقصاتِ عقل و دین“ ہونے سے کیا مراد ہے؟

اس اشکال کا جواب ہے کہ جہاں تک مرد کی ”قوّامیت“ کا مسئلہ ہے کہ جس کا ذکر سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳۴ میں آیا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ مرد عورت کا محافظ، نگہبان اور سرپرست ہے۔ کیونکہ ”قوّام“ ”قَامَ يَقُوْمُ عَلَى“ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اور ”قام یقوم علی“ کے معنی ہیں: سرپرستی کرنا، حفاظت کرنا، نگہبانی کرنا، نظام اور معاملات کو چلانا۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کے اندر ایسی ذہنی اور جسمانی خصوصیات رکھ دی ہیں کہ وہ عورت کے مقابلے میں مذکورہ ذمہ داریاں زیادہ حسن و خوبی کے ساتھ ادا کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس کو ”قوّام“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ مرد شرف اور کرامت میں عورت سے برتر ہے۔ یا عورت کا درجہ معاشرے میں پست اور کمتر ہے۔ جس کی بناء پر اس کو معمولی حیثیت دی جائے یا سامان متاع کہا جائے۔ فرض کر لیجیے کہ ایک خاندان صرف ایک مرد، اس کی ماں، بہنوں اور بیٹیوں پر مشتمل ہے۔ مرد ان کا قوام اور سرپرست ہے تو کیا اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ یہ مرد ”قوام“ ہونے کی وجہ سے اپنی ماں سے افضل و برتر ہو گیا؟ اگر نہیں تو قوام کا مطلب ہے سرپرستی اور حفاظت کرنے والا۔ اور عورتوں کے ”ناقصات عقل و دین“ سے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک میں ان کی اس حالت کی ترجمانی کی گئی ہے جو ان کو مختلف اوقات میں لاحق ہوتی ہے۔ حدیث میں ان کی مستقل صفت کے طور پر نہیں بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ حدیث میں اس کی وضاحت موجود ہے۔[2]

[1] جامع ترمذی: ح ۱۱۶۴ [2] صحیح بخاری: ح ۳۰۴، ۱٤٦٢ ـ صحیح مسلم: ح ۸۰

نقصان عقل کی مثال میں رسول اللہ ﷺ نے دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا ہے۔ جو سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۸۲ سے ماخوذ ہے۔ اور گواہی کا تعلق عقل سے اتنا نہیں ہے جتنا اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے سے ہے جس میں گواہی مطلوب ہوتی ہے۔ عورت اپنا دائرہ کار کے مختلف ہونے اور مالیات وغیرہ جیسے مسائل سے دور رہنے کی وجہ سے اس طرح کے امور سے مکمل واقفیت نہیں رکھتی ہے۔ زیر بحث مسئلے کے بعض پہلو اس کے احاطہ علم میں ہو سکتے ہیں اور بعض نہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ''نسیان کی جگہ'' ''ضلال'' کا فعل اختیار کیا ہے:

﴿ أَنْ تَضِلَّ إِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدٰهُمَا الْأُخْرٰى ﴾

''اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔''

''ضلال'' کا لفظ نہایت وسیع مفاہیم رکھتا ہے۔ مثلاً: گمراہی، ناواقفیت، حد سے تجاوز وغیرہ۔

نقصان دین کی مثال میں نبی مکرم ﷺ نے مخصوص ایام میں عورت کے نماز ترک کر دینے کی حالت بیان فرمائی ہے۔ یعنی اللہ کے فرائض میں سے کسی فرض کو ترک کرنا عورت کی صفت نہیں ہے بلکہ حالت اور مجبوری ہے۔

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد میں عورت کی توہین اور تذلیل کا پہلو نہیں بلکہ تنبیہ کا پہلو ہے۔ جس طرح سورۃ الاحزاب میں تمام انسانوں کو ''ظَلُومًا جَهُولًا'' کہا گیا ہے۔ جبکہ انسانوں میں رسولوں، نبیوں اور مومنین صادقین کی بھی بہت بڑی تعداد شامل ہے۔ تو وہاں بھی تنبیہ مراد ہے۔

مزید یہ کہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات، آپ کے سلوک اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل اور رویہ کا ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس سے عورتوں کی تذلیل و توہین اور تحقیر کا ثبوت ملتا ہو۔ یہ ذہنیت تو بعد میں مسلمانوں میں پیدا ہوئی کہ عورت ساری برائیوں کی جڑ، فحاشی و بدکاری کا سبب ہے۔ سوجھ بوجھ سے عاری، نیز عقل سے کوری ہوتی ہے۔ اس کی حیثیت سامان متاع اور ایک ایسی لونڈی کی ہے جس کو کوئی بھی امتیاز حاصل نہیں۔

ذیل میں ایسی موضوع اور منکر روایات پیش کی جا رہی ہیں جن سے ہمارے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کی کمتری کا نظریہ کتاب و سنت سے ماخوذ نہیں بلکہ من گھڑت ہے۔

عورتوں سے صلاح و مشورہ؟

(۲۵۸)......شَاوِرُوْهُنَّ يَعْنِي النِّسَاءَ وَخَالِفُوْهُنَّ۔))

''عورتوں سے مشورہ کرو اور عمل ان کے مشورے کے خلاف کرو۔''

یہ روایت باطل ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔[1] اس سے ملتی جلتی ایک اور روایت ہے جس کو حافظ ابوالحسن بن سعید عسکری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب کیا ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((خَالِفُوا النِّسَاءَ فَإِنَّ فِيْ خِلَافِهِنَّ بَرَكَةٌ))

''عورتوں کی مخالفت کرو، کیونکہ ان کی مخالفت میں برکت ہے۔''

اس روایت کی نسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح نہیں ہے۔ اس باطل روایت کی سند درج ذیل ہے:

علی بن جعد جوہری کہتے ہیں: ابوعقیل سے روایت ہے۔ وہ حفظ بن عثمان سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا......

یہ سند دو علتوں کی بناء پر نا قابل اعتبار ہے:

۱۔ حفص بن عثمان بن عبیداللہ مجہول ہے۔ امام ابن ابی حاتم نے اس کا ذکر ابوعقیل کی اسی روایت کے ضمن میں کیا ہے اور اس کی جرح و تعدیل کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا۔[2]

۲۔ اس سند کی دوسری علت اس کا بنیادی راوی ابوعقیل ہے۔ جس کے متعلق حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب[3] میں اس کو ضعیف لکھا ہے اور امام احمد فرماتے ہیں: ابوعقیل نے ایسے لوگوں سے حدیث روایت کی ہے جن کو میں نہیں جانتا۔''[4]

یہ تو اس کی سند کا حال تھا۔ رہا اس کا متن تو وہ منکر ہے اور اس صحیح حدیث کے خلاف ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ کرنے اور اس مشورے پر عمل کرنے کا ذکر آیا ہے۔ جبکہ آپ اللہ کے رسول تھے۔ واقعہ یوں ہے کہ حدیبیہ میں مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان صلح کا معاہدہ ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا:

((قُوْمُوْا فَانْحَرُوْا، ثُمَّ احْلِقُوْا))

''اٹھو قربانی کرو، پھر بال منڈاؤ۔''

---

[1] المقاصد: ح ۸۵۵۔ الفوائد المجموعہ: ص ۱۳۰۔

[2] الجرح والتعدیل: ص ۱۸۲ ج ۲ — [3] تقریب التہذیب: ترجمہ: ۷۶۳۳

[4] الضعیفہ: ص ۶۲۰ ج ۱، ح ۴۲۰

لیکن آپ کا یہ حکم سن کر کوئی بھی صحابی نہ اٹھا۔ آپ نے تین بار اس کا حکم دیا اور جب ان میں سے کوئی نہ اٹھا تو رسول اکرم ﷺ اپنے خیمے میں تشریف لے گئے اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے، صحابہ کرام سے ظاہر ہونے والی اس سرد مہری کا تذکرہ فرمایا۔ اس پر ام المومنین رضی اللہ عنہا نے عرض کیا:

اے اللہ کے رسول! کیا آپ ایسا چاہتے ہیں؟ آپ تشریف لے جایئے، اپنا اونٹ ذبح فرمایئے اور حجام کو بلا کر اپنا سر منڈوا لیجیے۔ یہ سن کر رسول اکرم ﷺ خیمہ سے باہر نکلے، کسی سے کوئی بات نہیں کی، اپنا اونٹ ذبح کیا، اپنے حجام کو بلا کر اس سے بال منڈوائے۔ جب صحابہ نے یہ دیکھا تو وہ بھی اٹھے، قربانیاں کیں اور ان میں سے ایک نے دوسرے کے بال مونڈے۔[1] غور فرمایئے کہ اس نازک موقع پر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا مشورہ کس قدر صائب اور درست تھا۔

(۲۵۹)...... طَاعَةُ الْمَرْأَةِ نَدَامَةٌ

''عورت کی اطاعت باعث ندامت اور پشیمانی ہے۔''

اس روایت کو امام شوکانی[2] محدث البانی[3] اور حافظ سخاوی[4] نے باطل اور موضوع قرار دیا ہے۔

حافظ سخاوی نے المقاصد میں لکھا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ کیا تھا۔ اس سے صاحب فضل عورت سے صلاح ومشورہ کرنے کے جواز کا ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ وہ صاحب فضل اور صاحب عقل تھیں۔ امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک جوینی فرماتے ہیں: ہم سوائے ام سلمہ کے کسی عورت کو نہیں جانتے جس نے کوئی درست رائے دی ہو۔[5]

امام الحرمین جیسے عالم دین کی عورت کے بارے میں یہ رائے اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ عورت کی بے عقلی ایک نظریہ اور عقیدہ بن چکی ہے۔ اس کی ناسمجھی کے بارے میں جھوٹی روایات نے کافی اثرات چھوڑے ہیں۔

(۲۶۰)...... لَا يَفْعَلَنَّ أَحَدُكُمْ أَمْرًا حَتّٰى يَسْتَشِيْرَ، فَإِنْ لَّمْ يَجِدْ مَنْ يَسْتَشِيْرُهُ فَلْيَسْتَشِرْ امْرَأَتَهُ۔ ثُمَّ لِيُخَالِفْهَا فَإِنَّ فِيْ خِلَافِهِنَّ الْبَرَكَةَ۔

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کوئی کام نہ کرے جب تک کہ اس کے بارے میں

---

[1] صحیح بخاری: ح ۲۷۳۱۔۲۷۳۲ [2] الفوائد المجموعہ: ص ۱۲۹،
[3] الضعیفہ: ص ۶۲۳ ج ۱ [4] المقاصد الحسنہ: ص ۲۹۷
[5] المقاصد: ص ۲۹۸

مشورہ نہ کرلے اور اگر اس کو کوئی ایسا نہ ملے جس سے وہ مشورہ کرے تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی سے مشورہ کرے۔ پھر اس پر واجب ہے کہ وہ اس کے خلاف عمل کرے۔ کیونکہ عورتوں کی مخالفت میں برکت ہے۔''

یہ روایت بھی باطل ہے اور مذکورہ بالا جھوٹی روایتوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کیونکہ پہلی اور اس روایت کی سندوں میں، عنبسہ بن عبدالرحمٰن، عثمان بن عبدالرحمٰن طرائفی، محمد بن سلیمان بن ابی کریمہ اور عبس بن ابراہیم ہاشمی جیسے جھوٹے، ناقابل اعتماد اور ضعیف راوی شامل ہیں۔[1]

(۲۶۱)......هَلَكَتِ الرِّجَالُ حِيْنَ أَطَاعَتِ النِّسَاءَ.

''مرد اس وقت برباد ہو گئے جب انہوں نے عورتوں کی بات مان لی۔''

یہ روایت سند کے اعتبار سے تو موضوع نہیں ہے لیکن اپنے متن اور مضمون کے اعتبار سے انہی جھوٹی روایتوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو اوپر گزری ہیں۔ جن کا مقصد لوگوں میں یہ خیال عام کرنا ہے کہ عورتیں عقل وفہم سے عاری مخلوق ہیں اور ان کی باتوں یا ان کے مشوروں پر عمل کرنا تباہی و بربادی کا سبب ہے۔ اسی وجہ سے عمل کی دنیا میں ان کا کوئی اعتبار باقی نہیں رہا ہے۔

آج مرد حضرات بیٹیوں کی شادی کے مسئلے میں ان کی ماؤں سے مشورہ کرنا اپنی کسر شان اور بیٹیوں کی رضامندی معلوم کرنا اپنی جھوٹی قوامیت کے لیے توہین تصور کرتے ہیں۔ بیٹیوں کو ان کی مرضی معلوم کیے بغیر جن کے ساتھ چاہتے ہیں باندھ دیتے ہیں۔ جبکہ اسلام کی نظر میں ایسا کرنا حرام ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَأْذَنَ))[2]

''کنواری لڑکی کا نکاح اس سے اجازت لیے بغیر یا اس کی مرضی معلوم کیے بغیر کیا جائے۔''

ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں:

((الْبِكْرُ يَسْتَأْذِنُهَا أَبُوْهَا))[3]

''کنواری لڑکی کا باپ اس کی مرضی معلوم کرے۔''

---

[1] الفوائد المجموعة: ص ۱۲۹ـ ۱۳۰ـ المقاصد الحسنة ص ۲۹۷

[2] صحیح بخاری ح ۵۱۳۶، صحیح مسلم ح ۱۳۱۹　[3] صحیح مسلم ح ۱۴۲۱ـ

معلوم ہوا کہ کسی شخص کا اپنی بیٹی کو ایسے شخص کے ساتھ نکاح پر مجبور کرنا جسے وہ ناپسند کرتی ہو یا اس کی مرضی معلوم کیے بغیر اس کا کسی کے ساتھ نکاح کر دینا حرام ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ دوسری لفظوں میں ایسا نکاح ہوتا ہی نہیں اور دنیا جن کو میاں بیوی تصور کر رہی ہوتی ہے وہ فی الواقع میاں بیوی نہیں ہوتے اور ان کے اس گناہ کا ذمہ دار لڑکی کا باپ ہوتا ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی[1] اور حافظ سخاوی[2] نے اس زیر بحث روایت کے بارے میں لکھا ہے:

اس کی روایت امام ابن عدی نے الکامل میں[3] حافظ ابو نعیم نے اخبار اصفہان[4] میں، ابن ماسی نے جزء الانصاری[5] میں اور حاکم نے المستدرک[6] میں اس سند سے کی ہے:

بکار بن عبدالعزیز بن ابی بکرہ نے اپنے باپ عبدالعزیز سے اور انہوں نے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے کہا:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک خوش خبری دینے والا آیا اور آپ کو مسلمانوں کے لشکر کی فتح کی نوید سنائی۔ اس وقت آپ کا سر مبارک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں تھا۔ یہ سن کر آپ کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے لیے سجدے میں گر گئے۔ فارغ ہونے کے بعد قاصد سے سوال کرنے لگے: اس نے جنگ کے واقعات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ دشمن کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ ''ان کی والی ایک عورت ہے۔ امام احمد کی روایت میں ہے: وَلِیَ اَمْرَھُمْ اِمْرَأَۃٌ..... ان کے معاملات کی باگ ڈور ایک عورت کے ہاتھ میں ہے۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا:

((هَلَكَتِ الرِّجَالُ حِيْنَ أَطَاعَتِ النِّسَاءَ))

''مرد اس وقت برباد ہو گئے جب انہوں نے عورتوں کی بات مانی۔''

امام حاکم نے اس روایت کو صحیح الاسناد بتایا ہے اور امام ذہبی نے ان کی اس بات کی توثیق کی ہے۔

لیکن محدث محمد ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں:

یہ حاکم اور ذہبی کی بھول ہے: ذہبی میزان الاعتدال میں بکار بن عبدالعزیز کے حالات۔ ترجمہ۔ بیان کرتے ہوئے امام یحییٰ بن معین کے حوالہ سے یہ لکھ چکے ہیں کہ ''اِنَّہٗ لَیْسَ بِشَیْءٍ'' درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یعنی بالکل ہی واہیات اور ناقابل اعتبار راوی ہے۔ اور امام عبداللہ بن عدی کا قول

---

[1] الضعیفہ: ص ٦٢٥۔٦٢٦ ج ١ [2] المقاصد الحسنۃ: ص ٥٣٤ ح ١٢٧٧
[3] الکامل: ص ٣٨ ج ١ [4] اخبار اصفہان: ٣٤ ج ٢
[5] جزء الانصاری: ص ١١ ج ١ [6] المستدرک: ح ٧٨٥٩

ہے کہ اس کا شمار ان ضعیف راویوں میں ہوتا ہے جن کی ''مرویات'' صرف لکھی جانے کے قابل ہیں''

البانی اس کے بعد لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں اس روایت کی اصل دوسرے الفاظ میں وہ ہے جو امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمْ إِمْرَأَةً)) [1]

''وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پا سکتی جس نے کسی عورت کو اپنا حاکم بنا دیا ہے۔''

اور ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کے پوتے بکار نے اس کو ان الفاظ میں روایت کر دیا ہے۔[2]

(۲۶۲)......مَنْ أَطَاعَ امْرَأَتَهُ كَبَّهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِي النَّارِ عَلَى وَجْهِهِ

''جو اپنی بیوی کی بات مانے گا اللہ عزوجل اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دے گا۔''

یہ روایت حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج حافظ سیوطی نے "ذيل الاحاديث الموضوعه" [3] میں دیلمی کی اس سند سے کی ہے جو انہوں نے عبدالمطلب بن شعیب بن حیان ازدی سے کی ہے۔

ہم سے عبداللہ بن صالح نے بیان کیا، کہا: ہم سے عمرو بن ہاشم نے، ابن ابی کریمہ سے، انہوں نے جعفر بن محمد سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے جابر سے، انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا...... حافظ سیوطی نے یہ روایت نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اس کی صحت و سقم کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اسی وجہ سے حافظ ابن عراق نے اس پر تعضیب کرتے ہوئے لکھا ہے:

حافظ سیوطی نے حدیث کی صحت و سقم کے بارے میں بیاض چھوڑ دی ہے۔ گویا وہ اس کی علت بیان کرنا چاہتے تھے لیکن اس کا ان کو موقع نہیں ملا۔ میں بھی یہ کہتا ہوں کہ مجھے بھی اس کی علت معلوم نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ اس کی سند میں شامل محمد بن عبدالرحمٰن صائغ، مظفر بن حسین، علی بن محمد بن عمر نہاوندی، محمد بن حسن بن قتیبہ اور مطلب بن شعیب بن حیان ازدی کے حالات مجھے معلوم نہیں ہوئے۔[4] مطلب یہ ہے کہ یہ سب مجہول ہیں۔

محدث محمد ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح بخارى: ح ٤٤٢٥، ٧٠٩٩ [2] الضعيفه: ص ٦٢٥-٦٢٦ ج ١

[3] ذيل الاحاديث الموضوعة: ص ١٣٢ ح ٦٢٣ [4] تنزيهه الشريعه: ص ٢١٥ ج ٢ ح ٥٣

اگر ان کو مذکورہ راویوں کے ترجمے نہیں ملے تھے تو ان کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ ان کے اوپر کے بعض راویوں کے بارے میں خاموشی اختیار کریں۔ اس طرح ان سے نیچے کے راویوں کی ثقاہت و عدم ثقاہت معلوم کرنے کی انہوں نے کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ حالانکہ انہوں نے جن راویوں کی جانب اشارہ کیا ہے ان میں سے بعض ضعیف ہیں اور ایک مجہول ہے۔ رہا عمرو بن ہاشم بیرونی تو اس کا ترجمہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں موجود ہے۔ امام ذہبی نے ''المغنی'' میں لکھا ہے:

اس کو ثقہ قرار دیا گیا ہے۔ حافظ محمد بن مسلم بن دارہ نے اس کو ضعیف بتایا ہے اور حافظ نے التقریب[1] میں لکھا ہے ''سچا تھا مگر غلطیاں کرتا تھا۔''

عبداللہ بن صالح معروف ہے جو ضعیف تھا۔ مطلب بن شعیب بن حیان ازدی کی اگرچہ توثیق کی گئی ہے اور ابن عراق اس کو معلوم نہ کر سکے۔ مگر اس کا تعلق ائمہ حدیث سے نہیں تھا۔ بلکہ اس کا شمار طبرانی کے شیوخ میں ہوتا تھا۔ شیخ حماد انصاری کی کتاب میں اس کا ترجمہ بھی موجود ہے۔ البانی آگے لکھتے ہیں:

ابن عراق نے حافظ سیوطی کے سکوت کی جو علت بیان کی ہے وہ معقولیت پر مبنی نہیں ہے۔ کیونکہ اس حدیث کے راویوں کا ضعف ایسا ہے جو سیوطی جیسے حافظ پر مخفی نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت حافظ سیوطی نے اس کے بارے میں جو سکوت اختیار کیا ہے وہ اس روایت کے موضوع اور باطل ہونے کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ ہم آہنگی رکھتے تھے اور ان کی جو باتیں شریعت کے خلاف نہیں ہوتی تھیں ان کو مانتے بھی تھے۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حجۃ الوداع میں ماہواری آجانے کی وجہ سے حج سے پہلے عمرہ نہیں کرسکی تھیں تو آپ نے ان کی خواہش پر حج کے بعد ان کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دیا کہ وہ ان کو تنعیم لے جائیں تاکہ وہ وہاں سے احرام باندھ کر عمرہ کریں۔ حالانکہ لوگ مدینہ کی طرف واپسی کی تیار کر رہے تھے۔[2]

محدث البانی رحمہ اللہ کی اس محدثانہ وضاحت کے بعد اس جھوٹی روایت کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی حاجت باقی نہیں رہی۔

(۲۶۳)...... إِنَّ النِّسَآءَ سُفَهَآءُ، إِلَّا الَّتِي أَطَاعَتْ زَوْجَهَا

''درحقیقت تمام عورتیں نادان اور بیوقوف ہیں سوائے اس عورت کے جو اپنے شوہر کی

---

[1] ص ۳۶۲ ترجمہ ۵۱۱۷

[2] الضعیفہ: ص ۹۳۹۔ ۹۴۱ ج ۱۴ ح ۶۹۰۴

اطاعت کرے۔''

یہ روایت ان الفاظ میں بھی ملتی ہے:

((إِنَّ النِّسَآءَ هُمْ سُفَهَآءُ: إِلَّا الَّتِي أَطَاعَتْ قَيِّمَهَا))

''بیشک عورتیں ہی نادان اور احمق ہیں سوائے اس کے جو اپنے سرپرست کی اطاعت کرے۔''

دونوں طرح کے الفاظ میں یہ روایت صحیح نہیں بلکہ منکر ہے۔ جس کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ کے حوالہ سے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۶ میں لفظ ''اَلسُّفَهَاءَ'' کی تفسیر میں نقل کیا ہے اور اس پر صحت وسقم کا حکم لگانے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ گویا یہ مسلمہ امر ہے کہ عورتیں احمق اور نادان ہوتی ہیں سوائے ان کے جو شوہروں کی مطیع وفرماں بردار ہوں۔ رہیں وہ عورتیں جو شوہر والی نہ ہوں اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مطیع ہوں، ان کے بارے میں منکر روایتیں پھیلانے والے کیا رائے رکھتے ہیں؟

محدث محمد ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں:

یہ منکر روایت اس سند سے مروی ہے:

عثمان بن ابی عاتکہ سے روایت ہے وہ علی بن یزید سے روایت کرتے ہیں، وہ قاسم سے اور وہ ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں

تو یہ سند ضعیف ہے۔ امام ذہبی نے ''الکاشف'' میں علی بن یزید آلہانی کو ضعیف لکھا ہے، لیکن متروک نہیں قرار دیا۔ البتہ المغنی میں لکھا ہے کہ محدثین نے اس کی تضعیف کی ہے اور امام دارقطنی نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔[1]

البانی نے آخر میں لکھا ہے: اصل میں یہ روایت موقوف ہے جس کو کسی راوی نے مرفوع بنا دیا ہے۔[2]،[3]

---

[1] الضعفاء والمتروکین ص ۱۹۳ ترجمہ ۴۰۸۔ میزان الاعتدال ترجمہ ۵۹۶۶ میں آیا ہے کہ امام بخاری نے اس کو منکر الحدیث لکھا ہے۔ امام نسائی کا قول ہے: وہ ثقہ نہیں تھا۔ ابوزرعہ کہتے ہیں: وہ قوی نہیں تھا۔

[2] جس حدیث کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہو وہ مرفوع ہوتی ہے اور جس کی نسبت صحابہ کی طرف ہو وہ موقوف ہوتی ہے۔

[3] الضعیفہ: ص ۱۳۶ ج ۱۳، ص ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰ ج ۱۲

کیا عورت کا وجود عبادت میں مانع ہے؟

ارباب تصوف نے جس طرح نئی نئی عبادتیں، تزکیہ نفس اور وصول الی اللہ کے نت نئے طریقے گھڑ لیے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے تجرد کی زندگی کو عند اللہ محبوب قرار دینے کے لیے ایسی روایتیں گھڑ کر رسول اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دی ہیں کہ جن میں عورتوں کی مذمت کی گئی ہے اور ان کے وجود کو اللہ کی عبادت میں مانع اور رکاوٹ قرار دیا گیا ہے۔ ان صحیح حدیثوں کی من مانی تاویلیں کی گئی ہیں جن سے تجرد کی زندگی کو غیر اسلامی قرار دیا گیا ہے۔ نکاح سے اعراض کرنے والوں کو طریقۂ نبوی سے خارج بتایا گیا ہے:

(٢٦٤)......لَوْلَا النِّسَآءُ لَعُبِدَ اللّٰهُ حَقًّا حَقًّا۔

''اگر عورتیں نہ ہوتیں تو اللہ کی صحیح اور حقیقی عبادت کی جاتی۔''

یہ روایت نبی کریم ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ: ''چونکہ عورتوں کا وجود ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی صحیح اور حقیقی عبادت نہیں ہو رہی ہے۔''

اس طرح یہ روایت اپنی سند سے پہلے اپنے متن کے اعتبار سے جھوٹ ہے۔ کیونکہ اولاد آدم کے سردار، تمام انبیاء اور رسولوں کے سرتاج محمد رسول اللہ ﷺ آغاز آفرینش سے لے کر تا قیامت پیدا ہونے والے تمام انس وجن میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ عبادت گزار بندے تھے اور آپ بیوی بچے رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ آپ کا تعلق بے پناہ محبت وشفقت اور حسن سلوک کا ترجمان اور مظہر تھا۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ إِلَى بُيُوْتِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ يَسْأَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ ﷺ فَلَمَّا أُخْبِرُوْا كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا، فَقَالُوْا: وَأَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ؟ قَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ، قَالَ أَحَدُهُمْ: أَمَّا أَنَا فَأُصَلِّي اللَّيْلَ أَبَدًا وَقَالَ آخَرُ: أَنَا أَصُوْمُ الدَّهْرَ وَلَا أُفْطِرُ، وَقَالَ آخَرُ: أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا، فَجَاءَ إِلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: أَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ أَمَا وَاللّٰهِ إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لٰكِنِّيْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ،

وَأُصَلِّي وَارْقُدْ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي)) [1]

''تین افراد نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے گھروں میں، رسول اللہ ﷺ کی عبادت کا حال معلوم کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے۔ اور جب ان کو آپ کی عبادت کی خبر دی گئی تو انہوں نے اس کو اپنے خیال میں کم محسوس کیا اور بولے: نبی کریم ﷺ کے مقابلے میں ہم کہاں؟ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہوں کو اللہ نے بخش دیا ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا: میں نے تو ہمیشہ رات بھر نمازیں پڑھتا رہوں گا۔ دوسرا بولا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔ کسی دن روزہ ترک نہ کروں گا۔ اور تیسرے نے کہا: میں تو عورتوں سے بالکل الگ تھلگ رہوں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور فرمایا: کیا تمہیں لوگوں نے ایسی اور ایسی باتیں کہی ہیں؟ رہا میں تو اللہ کی قسم! تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ اس کا متقی و پرہیزگار بندہ ہوں۔ مگر میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ نمازیں بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ تو جو کوئی میری اس سنت سے اعراض کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

یہ حدیث پاک اسلام کے اعتدال پسندانہ مزاج کو بیان کرنے میں اس قدر واضح ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اس حدیث نے جہاں یہ واضح کر دیا ہے کہ اسلام میں کس طرح کی عبادت مطلوب ہے وہیں یہ بھی بتا دیا کہ عورت سے تعلق اللہ تعالیٰ کی خشیت اور تقویٰ پر اثر انداز نہیں ہوتا اور آخر میں یہ واضح فرما دیا گیا کہ اس حدیث میں بیان کردہ طریقۂ نبوی سے روگردانی کرنے والا کسی اور شریعت سے تعلق رکھتا ہو تو رکھتا ہو لیکن شریعت محمدی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

رات کے وقت نبی اکرم ﷺ کی عبادتوں اور نمازوں کی مکمل تفصیلات صحیح احادیث میں بیان کر دی گئی ہیں۔ یہ عبادتیں پیارے نبی ﷺ امہات المومنین سے الگ تھلگ ہو کر ادا نہیں فرماتے تھے بلکہ ان میں سے کسی نہ کسی کے حجرے میں اور ان کی موجودگی میں ادا فرماتے تھے۔ احادیث میں رات کے وقت آپ کی نمازوں کی زیادہ تر تفصیلات ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہیں۔ بارہا ایسا ہوتا کہ رحمۃ للعالمین فداہ ابی و امی ﷺ نماز ادا فرماتے اور ام المومنین رضی اللہ عنہا آپ کے سامنے لیٹی ہوتیں۔ ان کے پاؤں رسول اللہ ﷺ اور قبلہ کے درمیان ہوتے۔ جب آپ سجدے میں جاتے تو وہ اپنے

---

[1] صحیح بخاری: ح ۵۰۶۳۔ صحیح مسلم: ح ۱۴۰۱

پاؤں سمیٹ لیتیں۔[1]

اسی طرح ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ تہجد کی نماز ادا فرماتے اور وہ آپ کے بالمقابل لیٹی ہوتیں۔ ایسا بھی ہوتا کہ وہ حالت حیض میں ہوتیں اور ان کے کپڑے اس وقت آپ کے جسم مبارک سے لگتے جب آپ سجدے میں جاتے۔[2]

نبی کریم ﷺ کے قیام اللیل سے متعلق احادیث میں جو چیز قابل غور ہے وہ یہ کہ نبی معظم ﷺ ازواج مطہرات کو اپنے ساتھ نماز تہجد کے لیے بیدار نہیں کرتے تھے بلکہ جب آپ اپنی طویل نماز سے فارغ ہو جاتے اور فجر کی اذان میں کچھ وقت باقی ہوتا تو ان کو جگاتے اور فرماتے وتر پڑھ لو۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے احادیث میں اس کا بہت ذکر ملتا ہے کہ جب آپ کے وتر کا وقت آتا تو فرماتے: ’’قُومِيْ فَأَوْتِرِيْ يَا عَائِشَةُ! ..... عائشہ! اٹھو اور وتر پڑھ لو۔[3]

نبی اکرم ﷺ کی سیرت پاک کا ایک نہایت تابناک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ اپنی ازواج مطہرات کے احساسات کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ آپ نے ان سے رات میں عبادت کے لیے اجازت لی۔ حالانکہ آپ عام انسان یا عام شوہر نہیں تھے بلکہ رسول رب العالمین تھے اور مطاع مطلق تھے۔ آپ کی یہ حیثیت سب کے لیے تھی۔ چنانچہ مشہور تابعی حضرت عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا: رسول اللہ ﷺ کے تعلق سے آپ نے جس عجیب شیء کا مشاہدہ کیا ہوا سے بیان فرمائیے۔ یہ سن کر وہ خاموش رہیں۔ پھر فرمایا:

میری راتوں میں سے جب ایک رات آئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَا عَائِشَةُ! ذَرِيْنِيْ اتَعَبَّدِ اللَّيْلَةَ لِرَبِّيْ))

’’اے عائشہ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس رات اپنے رب کی عبادت کروں۔‘‘

میں نے عرض کیا: اللہ کی قسم مجھے آپ کا قرب پسند ہے اور جو چیز آپ کے لیے باعث مسرت ہے وہ مجھے بھی عزیز ہے۔[4]

---

[1] دیکھئے: صحیح بخاری ح ۳۸۲، ۳۸۳، ۵۱۵، صحیح مسلم ح ۵۱۲۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۵۔

[2] صحیح بخاری: ۳۳۳، ۳۷۹، ۵۱۷۔ صحیح مسلم ح۵۱۳۔ ۱۱۲۶۔

[3] صحیح مسلم: ح ۷۴۴۔ ۱۷۳۴

[4] الترغیب الترھیب: ص ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ج۲ ح۱۴۶۸

ازواج مطہرات کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کے برتاؤ اور حسن سلوک کی جو تفصیلات اوپر بیان ہوئی ہیں یہ زیبِ داستان کے لیے نہیں ہیں بلکہ ان تمام لوگوں کے لیے نمونہ عمل ہیں جو آپ کو اپنا رسول مانتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی سیرت پاک کو مسلمانوں کے لیے قابل تقلید نمونہ عمل بنایا ہے۔

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴾ [الاحزاب:٢١]

''درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔''

اس آیت پاک میں جو چیز قابل غور ہے وہ یہ کہ نبی مکرم ﷺ کی سیرتِ پاک صرف ان لوگوں کے لیے نمونہ عمل ہے جو اللہ سے خیر اور بھلائی کی امید رکھتے ہوں۔ آخرت پر جن کا ایمان ہو اور اللہ کی یاد سے ان کے دل اور زبانیں معمور رہتی ہوں۔

رہے وہ لوگ جنہوں نے اپنے لیے شریعت محمدی کے سوا کوئی اور طریقہ یا شریعت اختیار کر لیا ہو ان کے لیے رسول پاک ﷺ کی سیرت پاک میں کوئی نمونہ عمل نہیں ہے۔

اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں دنیا کو نفع بخش اور قابل استفادہ شیء قرار دیا ہے اور اس دنیا کی بہترین متاع عورت کو قرار دیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

((الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ))[1]

''دنیا ایک متاع ہے اور دنیا کی بہترین متاع صالح بیوی ہے۔''

اوپر کی وضاحتوں کے بعد زیر بحث روایت:

((لَوْلَا النساءُ لَعُبِدَ اللّٰهُ حَقًّا حَقًّا))

کی سند کے باطل ہونے کی وضاحت ضروری نہیں رہ جاتی۔ لیکن اہل علم کے لیے اس کی سند پر بھی روشنی ڈال دیتا ہوں۔

علامہ ابوالحسن علی بن محمد بن عمران لکھتے ہیں:

اس حدیث کی سند میں بشر بن حسین جیسا جھوٹا اور حدیثیں گھڑنے والا راوی شامل ہے۔ اس لیے یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔[2]

---

[1] صحیح مسلم: ح ١٢٦٨۔ ٣٦٤٨۔ [2] تنزیهه الشريعة: ص ٢٠٢ ج ٢

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

یہ موضوع حدیث دو طریقوں سے مروی ہے۔ پہلے طریق کا راوی محمد بن عمران ہمدانی ہے۔ کہتا ہے: ہمیں عیسیٰ بن زیاد دورقی نے خبر دی، انہوں نے کہا: ہم سے عبدالرحیم بن زید عمی نے اپنے باپ سے، اس نے سعید بن مسیب سے اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

امام ابن عدی نے اس کی تخریج کے بعد لکھا ہے: یہ ایک منکر حدیث ہے جس کو میں صرف اسی طریق سے جانتا ہوں۔ عبدالرحیم بن زید عمی کی مرویات میں اس کا کوئی ثقہ متابع نہیں ہے۔ امام بخاری نے اس کو متروک قرار دیا ہے اور امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم کا قول ہے کہ: عبدالرحیم کی روایت کردہ حدیثیں ترک کر دینے کے قابل ہیں۔ کیونکہ وہ سب منکر ہیں۔

امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں: وہ جھوٹا اور خبیث تھا۔

یہ زیر بحث روایت دوسری سند سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس کے الفاظ ہیں:

(٢٦٥)......لَوْلَا النِّسَاءُ دَخَلَ الرِّجَالُ الْجَنَّةَ۔

اگر عورتیں نہ ہوتیں تو مرد جنت میں داخل ہوتے (چونکہ عورتیں ہیں اس لیے مرد جنت میں داخل نہیں ہوں گے)

تو اس کا راوی بشر بن حسین متروک اور کذاب تھا۔[1]

تعلیم نسواں:

مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جو عورتوں کو تمام برائیوں کی جڑ سمجھتا ہے۔ اس کا نعرہ یہ ہے کہ عورتوں کو ذہنی اور فکری ترقی کرنے اور ان کو لکھنے پڑھنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ یہ نعرہ درج ذیل الفاظ میں ملتا ہے:

(٢٦٦)......لَا تُسْكِنُوْهُنَّ الْغُرَفَ وَلَا تُعَلِّمُوْهُنَّ الْكِتَابَةَ، وَعَلِّمُوْهُنَّ الْمِغْزَلَ وَسُوْرَةَ النُّوْرِ

عورتوں کو بالا خانوں میں نہ رکھو، ان کو لکھنے کی تعلیم نہ دو، ان کو سوت کاتنے اور سورۃ النور کی تعلیم دو۔

---

[1] الضعیفہ: ص١٣٩-١٤٠ ج١- الفوائد المجموعہ: ص١١٩

یہ روایت حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج امام ابن حبان نے الضعفاء[1] میں حافظ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں[2] امام بیہقی نے شعب الایمان[3] میں اور امام ابن الجوزی نے الموضوعات[4] میں اس سند سے کی ہے:

محمد بن ابراہیم ابوعبداللہ شامی سے روایت ہے، کہا: ہم سے شعیب بن اسحاق دمشقی نے، ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے......

امام بیہقی نے لکھا ہے کہ یہ سند منکر ہے۔

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اس کا ذکر امام حاکم نے اپنی مستدرک میں کیا ہے۔ تعجب ہے کہ اس کا موضوع ہونا ان پر کس طرح مخفی رہ گیا۔'' امام ابن حبان نے لکھا ہے کہ محمد بن ابراہیم شامی، شامیوں کے نام سے حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔ اس سے حدیث کی روایت صرف ''اعتبار'' کے لیے جائز ہے۔ اس نے ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے۔[5]

محدث محمد ناصر الدین البانی نے اس کو موضوع قرار دیا ہے۔ کیونکہ امام دارقطنی نے محمد بن ابراہیم شامی کو کذاب لکھا ہے۔ ابن عدی کا قول ہے کہ اس کی بیشتر مرویات غیر محفوظ یعنی شاذ ہیں۔[6]

علامہ ابوعبدالرحمٰن شرف الحق عظیم آبادی نے ''عون المعبود'' میں مختلف ائمہ حدیث کے حوالہ سے اس زیر بحث روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔[7]

امام شوکانی نے نیل الاوطار میں سنن ابوداؤد کی حدیث...... أَلا تُعَلِّمِيْنَ هٰذِهِ رُقْيَةَ النَّمِلَةِ..... تم اس کو ''نملہ'' کی جھاڑ پھونک کیوں نہیں سکھا دیتیں......'' کی شرح کرتے ہوئے اس زیر بحث روایت کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

''اس حدیث میں لکھنے کی تعلیم سے نہی اس عورت سے متعلق ہے جس کو لکھنے کی تعلیم دینے سے فساد کا اندیشہ ہو۔[8] مطلب یہ ہے کہ اگر فساد کا اندیشہ نہ ہو تو اس کو تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اس پر محدث البانی نے

---

1. الضعفاء: ص ٣٠٢ ج ٢
2. تاریخ بغداد: ص ٢٢٤ ج ١٤
3. شعب الإیمان ص ٤٧٧۔٤٧٨ ح ٢٤٥٤
4. الموضوعات: ص ٦٣ ج ٣ ح ١٢٧٤
5. الموضوعات: ص ٦٤۔ ٦٥ ج ٣
6. الضعیفه: ص ٣٠ ج ٥
7. عون المعبود: ص ١٦٦١
8. نیل الاوطار: ص ١٨٤٤ ج ٢

ان کی سخت گرفت کی ہے۔ فرماتے ہیں:

لکھنے کی تعلیم سے جو اندیشہ ہے وہ عورتوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ کیونکہ کتنے ایسے مرد ہیں جن کے لیے کتابت وتحریر کا علم ان کے دین واخلاق کے حق میں باعث ضرر ونقصان ہے۔ تو کیا اس اندیشے میں مردوں کو بھی لکھنے کی تعلیم سے روک دیا جائے گا؟

آگے لکھتے ہیں:

کسی عبارت کی تاویل دراصل اس کی تصحیح کا ایک حصہ ہے۔ بایں معنی کہ جب ہم کسی نص کی تاویل کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہم اس کو صحیح مان رہے ہیں۔ گویا شوکانی کو یہ وہم تھا کہ زیر بحث روایت "لَا تُعَلِّمُوْهُنَّ الْكِتَابَةَ" صحیح ہے۔ جبکہ امر واقعہ اس کے خلاف ہے۔ پھر اس تاویل کی کیا ضرورت تھی؟!

علامہ عظیم آبادی رسول اکرم ﷺ کے ارشاد:

((أَلَا تُعَلِّمِيْنَ هَذِهِ رُقْيَةَ النَّمِلَةِ كَمَا عَلَّمْتِيْهَا الْكِتَابَةَ)) [1]

"تم اس کو نملہ کی جھاڑ پھونک کیوں نہیں سکھا دیتیں جس طرح تم اس کو لکھنا سکھا چکی ہو۔"

کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس حدیث میں خطاب حضرت شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا سے ہے اور جن کو تعلیم دینے کا حکم ہے وہ حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا ہیں۔

اور "النملة" پہلو میں نکلنے والی سوزش دار پھنسیوں کو کہتے ہیں۔

علامہ عظیم آبادی نے امام ابن تیمیہ اور ابن القیم رحمہم اللہ کے حوالہ سے عورتوں کے لیے کتابت کی تعلیم حاصل کرنے کو جائز قرار دیا ہے اور ملا علی قاری کے اس قول کی سخت گرفت کی ہے کہ سلف میں عورتوں کو لکھنے کی تعلیم دینا جائز رہا ہوگا مگر خلف میں عورتوں کے اندر فساد پھیل جانے کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

عظیم آبادی نے اس قول کی نکیر کی ہے اور امام بخاری رحمہما اللہ کی کتاب "الادب المفرد" کی ایک حدیث سے صحابیات میں لکھائی پڑھائی کے وجود کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد ابن خلکان کی "وفیات" کے حوالہ سے چند مشہور محدثات اور عالمات کا تذکرہ کیا ہے جن میں سے ایک مشہور محدثہ اور کاتبہ فخر النساء شہدہ بنت ابی نصیر اور دوسری عائشہ بنت احمد قرطبیہ تھیں۔

یہ تو بڑے لوگوں کی بڑی باتیں تھیں جنہوں نے عورتوں کے لیے لکھنے کی تعلیم حاصل کرنے کو جائز

---

[1] ابو داؤد: ح ۳۸۸۷

قرار دے کر ان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مگر آج کے دور میں تو پڑھنا اور لکھنا دوسرے لفظوں میں تمام دینی اور دنیاوی تعلیم حاصل کرنا مردوں اور عورتوں دونوں پر فرض ہے۔ اگر ماضی میں دینی علوم کا حصول مردوں پر فرض تھا تو عورتوں پر بھی فرض تھا۔ جن لوگوں نے ان کو اس سے مستثنیٰ کر دیا تھا، ان کے اس عمل کے پیچھے کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں تھی۔ بلکہ انہوں نے اپنے خاص ذوق اور اپنی پسند سے یا اپنی جاہلانہ روایات سے مغلوب ہو کر ایسا کیا تھا۔ اگر فرائض و واجبات میں مرد و عورت دونوں شریک ہیں، اللہ اور رسول کے احکام کے دونوں مخاطب ہیں تو پھر مردوں پر تعلیم کو فرض قرار دینا اور عورتوں پر حرام کر دینا کہاں کی عقلمندی اور کہاں کی دینداری ہے؟ جو لوگ عورتوں میں فساد اور بگاڑ کی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو مردوں میں پھیلے ہوئے فساد اور بگاڑ سے ناواقف ہیں یا ان کے لیے اس فساد اور بگاڑ کو جائز اور عورتوں کے لیے حرام سمجھتے ہیں۔ جبکہ اللہ اور رسول نے اولاد آدم میں اس طرح کی کوئی تفریق نہیں کی ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے مسلمانوں پر طلب علم کو فرض قرار دیا ہے۔ علم میں پڑھنا اور لکھنا دونوں شامل ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ)) [1]

''ہر مسلمان پر علم طلب کرنا فرض ہے۔''

اس حدیث میں ''مسلمۃ'' مسلمان عورت...... نہیں ہے، اس کے باوجود اس حدیث میں جس علم کا حصول فرض قرار دیا گیا ہے اس کی مخاطب اسی طرح مسلمان عورت بھی ہے جس طرح مسلمان مرد۔ اس لیے کہ دونوں کے فرائض و واجبات ایک ہیں۔ اسی وجہ سے ''مسلمہ'' کا لفظ نہیں لایا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس حدیث کی رو سے ان تمام علوم کا حصول مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں پر فرض ہے جن کا ان کے دینی اور دنیوی صلاح سے تعلق ہے کیونکہ آج زندگی کا دائرہ کافی وسیع ہو چکا ہے۔ انسانی ضروریات بہت وسیع ہو چکی ہیں۔ غیر مسلم قومیں ہر میدان میں نہایت تیزی سے ترقی کر رہی ہیں۔ ایسے حالات میں مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنے وجود کی بقاء اپنی عزت نفس اور اپنے وقار کے تحفظ کے لیے موجودہ دور کے تمام علوم وفنون میں غیر مسلموں سے اگر آگے نہ ہوں تو کم از کم ان کے برابر ضرور ہوں۔ آج ایک محدث، مفسر اور فقیہہ کی جتنی ضرورت ہے اس سے کچھ کم ایک پختہ عقیدہ وایمان والے صالح سائنس دان، ڈاکٹر اور انجینئر کی بھی ضرورت ہے تاکہ مسلمان کسی بھی میدان میں دوسروں کے دست نگر اور محتاج نہ ہوں۔

---

[1] سنن ابن ماجه: المقدمه/ باب فضل العلماء والحث على طلب العلم/ حديث ٢٢٤، صححه الألباني رحمه الله/ في نسخة مكتبة المعارف للنشر والتوازيع با لرياض

(۲٦٧)......لَا تُعَلِّمُوْا نِسَائَكُمُ الْكِتَابَةَ وَلَا تُسْكِنُوْهُنَّ الْعَلَالِيَ ، وَقَالَ: خَيْرُ لَهْوِ الْمُؤْمِنِ السِّبَاحَةُ وَخَيْرُ لَهْوِ الْمَرْأَةِ الْمِغْزَلُ۔[1]

''اپنی عورتوں کو لکھنا مت سکھاؤ اور ان کو عالیشان گھروں میں مت آباد کرو۔ اور کہا: مومن کی بہترین تفریح تیراکی ہے اور عورت کی بہترین تفریح سوت کاتنا ہے۔''

یہ روایت پہلی روایت کی ہم مثل ہے اور جھوٹ ہے۔

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں:

یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس کی سند میں جوز بن نصر شامل ہے جس کے بارے میں امام ابن حبان کا قول ہے کہ وہ ثقہ راویوں کے نام سے ایسی روایتیں بیان کرتا تھا جن کی روایت انہوں نے نہیں کی ہے۔ امام ابن عدی فرماتے ہیں کہ اس نے ثقہ راویوں کے نام سے باطل روایتیں بیان کی ہیں اور ان سے منسوب کر کے حدیثیں گھڑی بھی ہیں۔[2]

(۲٦٨)......اِتَّقُوْا الدُّنْيَا وَاتَّقُوْا النِّسَاءَ ، فَإِنَّ إِبْلِيْسَ طَلَّاعٌ وَرَصَّادٌ وَصَيَّادٌ وَمَا هُوَ بِشَيْءٍ مِنْ فُخُوْخِهِ بِأَوْثَقَ لِصَيْدِهِ فِي الْأَتْقِيَاءِ مِنْ دُخُوْخِهِ فِي النِّسَاءِ۔

دنیا اور عورتوں سے بچو کیونکہ ابلیس بڑا مہم جو لوگوں کی گھات میں رہنے والا اور ماہر شکاری ہے۔ خدا ترسوں کو اپنا شکار بنانے کے لیے اس نے اپنے جو جال بچھا رکھے ہیں ان میں سب سے مضبوط عورتوں کا جال ہے۔''

یہ ایک موضوع اور من گھڑت عبارت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔

اس کی تخریج حافظ سیوطی نے الجامع الصغیر[3] میں امام شیرویہ بن شہردار دیلمی نے مسند الفردوس[4] میں اور علاؤ الدین علی متقی نے کنز العمال[5] میں اس سند سے کی ہے:

سعید بن سنان سے روایت ہے، وہ ابی الزاہریہ سے روایت کرتے ہیں وہ کثیر بن مرہ سے وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے اور رسول اللہ ﷺ سے......

---

[1] سنن ابن ماجه: ح٢٢٣-١٨٢ [2] الموضوعات: ص٦٢ ج٣ ح:١٢٧٤
[3] الجامع الصغير: ح:١١٦ [4] مسند الفردوس: ص٤٥ ج١
[5] كنز العمال: ح٤٤٤٨١

اس موضوع روایت کے راویوں سعید بن سنان کے بارے میں حافظ ابن حجر تقریب التہذیب [1] میں لکھتے ہیں: وہ متروک تھا اور امام دارقطنی نے اس کو "ھالك" ہلاک ہونے والا قرار دیا ہے [2] کیونکہ وہ جھوٹی روایتیں بیان کرتا تھا۔

رہا اس جھوٹی روایت کا متن تو وہ کسی تبصرے کا محتاج نہیں ہے۔ ابلیس کے اہل کار عورتوں سے کم مکار نہیں ہیں۔ دنیا میں شیطان کے ایجنٹ، بے حیائی اور فحاشی کے اڈے چلانے والے مرد ہیں عورتیں نہیں۔

(۲۶۹)......أَيُّمَا امْرَأَةٍ خَرَجَتْ مِنْ غَيْرِ أَمْرِ زَوْجِهَا كَانَتْ فِي سَخَطِ اللّٰهِ حَتّٰى تَرْجِعَ إِلَى بَيْتِهَا أَوْ يَرْضَى عَنْهَا

"جو عورت بھی اپنے شوہر کے حکم کے بغیر گھر سے باہر نکلے تو وہ اللہ کے غضب میں رہتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے گھر واپس آ جائے یا اس کا شوہر اس سے راضی ہو جائے۔"

یہ عبارت حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی روایت حافظ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت [3] نے جو خطیب بغدادی کے لقب سے معروف ہیں، حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ اصفہانی کی سند سے کی ہے۔

ابراہیم بن ہدبہ سے روایت ہے، کہا: ہم سے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے......

حافظ ابونعیم نے ابراہیم بن ہدبہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے باطل روایتیں بیان کی ہیں۔ اور مثال میں یہی روایت پیش کی ہے۔ اس کے بارے میں امام یحییٰ بن معین کا یہ قول نقل کیا ہے: ابراہیم کذاب اور خبیث تھا۔ دوسرے تمام ائمہ حدیث نے بھی اس کو جھوٹا اور اس کی مرویات کو باطل قرار دیا ہے۔ [4]

(۲۷۰)......إِنَّ الْمَرْأَةَ إِذَا خَرَجَتْ مِنْ بَيْتِهَا وَزَوْجُهَا كَارِهٌ لِذَلِكَ، لَعَنَهَا كُلُّ مَلَكٍ فِي السَّمَاءِ، وَكُلُّ شَيْءٍ مَرَّتْ عَلَيْهِ. غَيْرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ. حَتّٰى تَرْجِعَ.

"عورت جب اس حالت میں اپنے گھر سے نکلتی ہے کہ اس کے شوہر کو اس کا یہ نکلنا ناپسند ہو تو

---

[1] تقریب التهذیب: ص۱۷۷ ترجمه ۲۳۳۳
[2] الضعفاء والمتروکین: ص۱۴۵ ترجمه ۲۷۰
[3] تاریخ بغداد: ص۴۰۰-۴۰۱ ج۶ [4] الضعیفه: ص۸۸-۸۹ ج۳

آسمان میں ہر فرشتہ، اور جنوں اور انسانوں کے سوا جن چیزوں سے اس کا گزر ہوتا ہے اس پر لعنت بھیجتے ہیں جن کا سلسلہ اس کی گھر واپسی تک جاری رہتا ہے۔"

یہ روایت موضوع تو نہیں ہے البتہ بے حد ضعیف اور نا قابل اعتبار ہے۔ اس کی تخریج حافظ طبرانی نے المعجم الاوسط[1] میں سوید بن عبدالعزیز کے طریق سے کی ہے:

سوید بن عبدالعزیز نے محمد بن زید سے روایت کی، انہوں نے عمر بن دینار سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے، انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے......

حافظ طبرانی نے لکھا ہے: عمرو بن دینار سے اس کی روایت صرف محمد بن زید نے کی ہے جس کی روایت میں سوید بن عبدالعزیز منفرد ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی کہتے ہیں:

سوید بن عبدالعزیز بے حد ضعیف ہے۔ امام احمد نے اس کو متروک الحدیث قرار دیا ہے اور امام یحییٰ بن معین اور نسائی کا قول ہے: وہ ثقہ نہیں تھا۔

اس حدیث کو حافظ نور الدین علی بن ابی بکر ہیثمی نے مجمع الزوائد[2] ومنبع الفوائد میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

اس کی روایت طبرانی نے المعجم الاوسط میں کی ہے اور اس کی سند میں سوید بن عبدالعزیز ہے جو متروک تھا۔[3]

واضح رہے کہ واعظین اور خطباء عورتوں کے فرائض اور واجبات بیان کرتے ہوئے ایک اور حدیث کا ذکر کرتے رہتے ہیں جس میں یہ فقرہ آیا ہے:

((وَأَلَّا تَخْرُجَ مِنْ بَيْتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ، فَإِنْ فَعَلَتْ لَعَنَهَا اللّٰهُ وَمَلَائِكَةُ الْغَضَبِ حَتّٰى تَتُوْبَ أَوْ تُرَاجِعَ وَإِنْ كَانَ ظَالِمًا))

"بیوی پر شوہر کا یہ حق ہے کہ وہ اس کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر نہ نکلے اور اگر وہ ایسا کرے گی تو اس پر اللہ اور غضب کے فرشتوں کی لعنت برستی رہے گی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اس عمل سے توبہ کرلے یا شوہر کو راضی کرنے کے لیے اس سے مراجعت کرے۔ اگر چہ شوہر

---

[1] المعجم الأوسط: ص ۳۱۲ ج ا ح ۵۱۷ [2] مجمع الزوائد: ص ۳۱۳ ج ٤
[3] الضعيفة: ص ٥٥٤-٥٥٦ ج ١١

ظالم ہی کیوں نہ ہو۔''

تو یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ اس کو حافظ سلیمان بن داؤد طیالسی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور حافظ سیوطی نے اسے الجامع الصغیر میں نقل کیا ہے۔

خطباء اور واعظین کا یہ فرض ہے کہ عورتوں کے فرائض و واجبات بیان کرتے ہوئے انہی احادیث سے استدلال کریں جن کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ہو اور یہ بھی واضح کریں کہ اسلام کی نظر میں مرد کی جنس برتر اور عورت کی جنس کمتر نہیں ہے۔ بلکہ اگر ان کے درمیان فرق مراتب ہے اور ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہے تو ایمان، عمل صالح اور تقویٰ کی بنیاد پر ہے جنس کی بنیاد پر نہیں۔

(۲۷۱)...... إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَا يُعَذِّبُ حِسَانَ الْوُجُوْهِ سُوْدَ الْحِدَقِ۔

''اللہ تعالیٰ حسین چہروں اور سرگیں آنکھوں والیوں کو عذاب نہیں دے گا۔''

یہ حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اسلام حسن پرستی کی نہیں عبادتِ الٰہی کی تعلیم دیتا ہے۔ آخرت کی کامیابی ایمان اور حسن عمل پر موقوف ہے حسن صورت پر نہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ وَلَا إِلَى صُوَرِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوْبِكُمْ وَأَشَارَ بِأَصَابِعِهِ إِلَى صَدْرِهِ)) [1]

''بیشک اللہ تمہارے جسموں اور تمہاری شکلوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔ آپ نے اپنی انگلیوں سے اپنے سینے کی طرف اشارہ فرمایا۔''

سورۃ المنافقون میں اللہ اور رسول کے سب سے بڑے (دشمنوں) یعنی منافقین کا وصف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

﴿ وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۖ وَإِنْ يَقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۖ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۖ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۖ أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ ﴾ [المنافقون:٤]

''اور جب تم انہیں دیکھو گے تو ان کی جسامت تمہیں بھلی لگے گی اور اگر وہ بولیں گے تو تم ان کی بات سنو گے...... مگر یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار سے لگا دیے گئے ہیں۔ ہر زور

---

[1] صحیح مسلم: ٢٥٦٤۔ ٦٥٤٢

دار آواز کو اپنے خلاف سمجھتے ہیں، یہ دشمن ہیں اس لیے ان سے ہوشیار رہو ان پر اللہ کی مار، یہ کدھر بہکے، پھرے جاتے ہیں۔"

معلوم ہوا کہ جزاوسزا کے اسباب میں حسن صورت کا کوئی شمار نہیں ہے۔

اس کی تخریج امام دیلمی نے مسند الفردوس میں اس سند سے کی ہے:

ہمیں بجیر بن منصور نے جعفر بن محمد بن حسین ابزی سے، انہوں نے علی بن احمد حروری سے، انہوں نے جعفر بن احمد دقاق سے، انہوں نے عبدالملک بن محمد رقاشی سے، انہوں نے عمرو بن مرزوق سے، انہوں نے شعبہ سے، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہوئے خبر دی......

محدث محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

اس موضوع روایت کے باطل ہونے کی علت محمد رقاشی اور اس سے نیچے کے تمام راوی ہیں جو سب کے سب مجہول ہیں۔ میں نے راویوں کی جرح وتعدیل سے بحث کرنے والی کتابوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں پایا۔ صرف رقاشی کا ذکر ملا ہے جو ابن ماجہ کے رجال میں سے ہے اور تہذیب التہذیب [1] میں اس کا مفصل حال مذکور ہے۔ تاریخ بغداد [2] میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ ان کتابوں میں اس کے جو احوال بیان ہوئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ فی نفسہ سچا تھا، لیکن بغداد آمد کے بعد اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی مرویات کی سندوں اور متنوں میں بے تحاشا غلطیاں کرنے لگا تھا۔ یہ روایت شاید اس کے اس دور کی روایت کردہ ہے۔

ابن عراق نے تنزیہ الشریعۃ [3] میں لکھا ہے:

"میرے خیال میں اس حدیث کی مصیبت جعفر بن احمد دقاق ہے۔"

محدث البانی آگے لکھتے ہیں:

مجھے اس حدیث کے باطل ہونے میں ادنیٰ سا شک بھی نہیں ہے کیونکہ یہ اسلامی شریعت کے احکام اور تعلیمات کے خلاف ہے۔ [4]

(۲۷۲)......عَلَيْكُمْ بِالْوُجُوْهِ الْمِلَاحِ وَالْحِدَقِ السُّوْدِ، فَإِنَّ اللّٰهَ يَسْتَحِيْ أَنْ يُعَذِّبَ وَجْهًا مَلِيْحًا بِالنَّارِ۔

---

[1] تهذيب التهذيب: ص٤١٩ـ ٤٢١ ج٦
[2] تاريخ بغداد: ص٤٢٥ـ٤٢٧
[3] تنزيه الشريعة: ص ١٧٤ج١
[4] الضعيفه: ص٢٥٥ـ ٢٥٦ ج١

''ملیح چہروں اور سرنگیں آنکھوں والیوں کو اختیار کرو۔ کیونکہ اللہ ملیح چہرے کو آگ کا عذاب دینے سے شرمائے گا۔''

یہ روایت بھی جھوٹ ہے اور سابقہ روایت کی بہن ہے۔ حسن پرست صوفیا کی گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

شیخ ابن عراق لکھتے ہیں:

اس کی سند میں حسن بن علی عدوی شامل ہے جس کے بارے میں حافظ سیوطی کا قول ہے کہ اس کا متابع اسی جیسا کذاب لاحق بن حسین ہے۔[1]

ملا علی قاری نے لکھا ہے: اس کو گھڑنے والے خبیث پر اللہ کی لعنت ہو۔[2]

(۲۷۳)......يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ! اتَّقِيْنَ اللّٰهَ، وَالْتَمِسُوْا مَرْضَاةَ أَزْوَاجِكُنَّ، فَإِنَّ الْمَرْأَةَ لَوْ تَعْلَمُ مَا حَقُّ زَوْجِهَا، لَمْ تَزَلْ قَائِمَةً مَا حَضَرَ غَدَاؤُهُ وَعَشَاؤُهُ۔

''اے عورتوں کی جماعت اللہ سے ڈرو اور اپنے شوہروں کی رضا تلاش کرو۔ کیونکہ اگر عورت کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے شوہر کا حق کیا ہے تو اس کے دوپہر اور رات کے کھانوں کے وقت وہ کھڑی رہے گی۔''

یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ اس کی تخریج حافظ بزار نے اپنی مسند البحر الزخار[3] میں اور انہی کی سند سے حافظ ابونعیم نے تاریخ اصفہان[4] میں حکم بن یعلی بن عطاء محاربی کی سند سے کی ہے:

کہا: ہمیں عبدالغفار بن قاسم نے عمرو بن مرہ سے، انہوں نے عبداللہ بن مسلمہ سے، انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے خبر دی......

حافظ بزار نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صرف اسی سند سے مروی ہے۔''

محدث محمد ناصر الدین البانی کہتے ہیں:

یہ موضوع ہے اور اس کی مصیبت یہی عبدالغفار ہے جس کے بارے میں امام علی بن مدینی اور امام

[1] تنزیہ الشریعة: ص۱۷٤ ج۱
[2] الضعیفه: ص۲٥٦ ج۱
[3] البحر الزخار: ص۲۹۰۔۲۹۱ ج۲
[4] تاریخ اصفهان: ص٤٧ ج۲

ابوداؤد کا قول ہے: وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔"

اور حکم بن یعلی متروک ہے۔ لیکن اس روایت کے دوسرے فقرے کی شاہد وہ حدیث ہے جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((لَوْ تَعْلَمُ الْمَرْأَةُ حَقَّ الزَّوْجِ مَا قَعَدَتْ مَا حَضَرَ غَدَاؤُهُ وَعَشَاؤُهُ حَتَّى يَفْرُغَ فِيْهِ))

"اگر عورت کو معلوم ہو جائے کہ شوہر کا کیا حق ہے تو وہ اس کے دوپہر اور رات کے کھانے کی اثناء میں اس کے فارغ ہو جانے کے وقت تک نہیں بیٹھے گی۔"

یہ حدیث بزار اور طبرانی نے فضیلت بن سلیمان نمیری کے طریق سے کی ہے:

فضیل بن سلیمان نمیری نے کہا: ہم سے موسیٰ بن عقبہ نے عبید اللہ بن سلیمان اغر سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

محدث البانی لکھتے ہیں:

فضیل بن سلیمان نمیری اگرچہ شیخین کے رجال میں سے ہے لیکن جمہور آئمہ حدیث کے نزدیک ضعیف ہے۔ صرف ابن حبان نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے امام ذہبی نے الضعفاء[1] میں لکھا ہے: "اس کے اندر کمزوری ہے۔ ابو حاتم وغیرہ کا قول ہے کہ وہ قوی نہیں ہے۔ ابو زرعہ کہتے ہیں کہ ضعیف ہے اور ابن معین کے نزدیک قوی نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر نے التقریب[2] میں لکھا ہے: سچا تھا مگر بڑی غلطیاں کرتا تھا۔

تو اس طرح کے راوی کی روایت کردہ حدیث کسی موضوع حدیث کے لیے قابل استدلال شاہد نہیں بن سکتی۔[3]

(۲۷٤)......يُسَلِّمُ الرِّجَالُ عَلَى النِّسَاءِ وَلَا يُسَلِّمُ النِّسَاءُ عَلَى الرِّجَالِ۔

"مرد عورتوں کو سلام کریں مگر عورتیں مردوں کو سلام نہ کریں۔"

---

[1] الضعفاء: ص ٥١٥ ترجمه ٤٩٥٨ [2] التقريب: ص٣٨٤، ترجمه ٥٤٢٧
[3] الضعيفه: ص٤٦-٤٧ ج١٣

یہ بھی موضوع ہے اور رسول اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اس کی تخریج امام ابوبکر احمد بن محمد ابن سنی نے عمل الیوم واللیلہ [1] میں اور امام ابن حبان نے الضعفاء [2] میں بشر بن عون کے طریق سے کی ہے:

کہا: ہم سے بکار بن تمیم نے مکحول سے اور انہوں نے واثلہ بن اسقع سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

امام ابن حبان نے یہ حدیث بشر بن عون کے ترجمہ کے ضمن میں نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ بشر کا ایک مجموعۂ حدیث ہے جس میں سو ۱۰۰ حدیثیں شامل ہیں اور سب کی سب موضوع ہیں لہٰذا اس سے استدلال کرنا کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے۔

اسی طرح امام ابن الجوزی نے یہ روایت ''العلل المتناهیه'' میں نقل کی ہے اور لکھا ہے: یہ صحیح نہیں ہے۔ [3]

حافظ ابن حجر نے فتح الباری [4] میں اس روایت کو ابونعیم سے منسوب کیا ہے۔ ان کی بھی ایک کتاب کا نام ''عمل یوم ولیلة'' ہے۔ پھر لکھا ہے: اس کی سند بے حد کمزور۔ واہی۔ ہے۔ اسی طرح کی ایک روایت عمرو بن حدیث سے بھی مروی ہے جو موقوف ہے اور اس کی سند عمدہ ہے۔''

حافظ ابن حجر نے یہ بات صحیح بخاری کے باب: تسلیم الرجال علی النساء والنساء علی الرجال۔ مردوں کے عورتوں کو سلام کرنے اور عورتوں کے مردوں کو سلام کرنے کا باب'' ...... کے تحت لکھی ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب اس روایت کیا رد میں قائم کیا ہے جس کی تخریج عبدالرزاق نے معمر سے اور انہوں نے یحییٰ بن کثیر سے کی ہے۔ جس کے الفاظ ہیں:

((بَلَغَنِی اَنَّهُ یُکْرَهُ اَنْ یُسَلِّمَ الرِّجَالُ عَلَی النِّسَاءِ وَالنِّسَاءُ عَلَی الرِّجَالِ))

''مجھے خبر ملی ہے کہ مردوں کا عورتوں کو سلام کرنا اور عورتوں کا مردوں کو سلام کرنا مکروہ ہے۔''

مگر حافظ ابن حجر نے اس روایت کو مقطوع اور معضل قرار دیا ہے۔ مزید یہ بھی لکھا ہے کہ ایک حدیث حضرت اسماء بنت یزید سے بھی مروی ہے جس کو امام ترمذی نے حسن قرار دیا ہے۔ جس کے الفاظ ہیں: مَرَّ عَلَیْنَا النَّبِیُّ ﷺ فَسَلَّمَ عَلَیْنَا...... نبی کریم ﷺ ہمارے پاس سے گزرے اور ہم کو سلام کیا'' [5]

---

[1] عمل الیوم واللیلة: ص ۲۴۲
[2] الضعفاء: ص ۱۹۰ ج ۱
[3] العلل المتناهیة: ص ۲۳۴ ج ۲
[4] فتح الباری: ص ۲۷۳۱ ج ۳
[5] جامع ترمذی: ح ۲۶۹۷

لیکن یہ حدیث چونکہ امام بخاری کی شرط پر پوری نہیں اترتی اس لیے انہوں نے اپنی صحیح میں اس کو نقل نہیں کیا۔ اسی پر اکتفاء کیا جو ان کی شرط کے مطابق تھی۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے آگے لکھا ہے کہ اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو مردوں کا عورتوں کو سلام کرنا اور عورتوں کا مردوں کو سلام کرنا جائز ہے اور دلیل میں صحیح مسلم کی وہ حدیث پیش کی ہے جس میں حضرت ام ھانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں عام الفتح کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ کو غسل کرتے ہوئے پایا اور میں نے آپ کو سلام کہا۔[1]

اور امام بخاری نے "الادب المفرد"[2] میں حسن بصری سے صحیح سند کے ساتھ یہ حدیث روایت کی ہے کہ ''عورتیں مردوں کو سلام کرتی تھیں۔''

ان تمام حدیثوں سے زیر بحث روایت کے متن کی نکارت واضح ہو رہی ہے:

(۲۷۵)......إِذَا قَالَتِ الْمَرْأَةُ لِزَوْجِهَا: وَاللّٰهِ مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ ، فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهَا

''جب عورت اپنے شوہر سے یہ کہے: اللہ کی قسم میں نے تمہاری جانب سے کبھی کوئی خیر و بھلائی نہیں دیکھی تو اس کے اعمال اکارت چلے جاتے ہیں۔''

یہ روایت بھی صحیح نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج امام ابن عدی نے الکامل[3] میں سلام بن رزین کی سند سے کی ہے۔

اس نے کہا: عمرو بن سلیمان سے روایت ہے، وہ یوسف بن ابراہیم تیمی سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

امام عبداللہ بن عدی نے یہ حدیث یوسف بن ابراہیم کے ترجمہ کے ضمن میں نقل کی ہے اور اس کے بارے میں امام بخاری کا یہ قول نقل کیا ہے: صاحب عجائب...... تھا

امام بخاری کی یہ جرح بہت شدید ہے۔

محدث محمد ناصر الدین البانی کہتے ہیں:

---

[1] صحیح مسلم: ح۱۶۶۹ [2] الادب المفرد: ح۱۰۷۸

[3] الکامل: ص۱۶۷ ج۷

عمرو بن سلیمان کے بارے میں "میزان الاعتدال" میں ہے: "لَمْ اَعْرِفْهُ" مجھے اس کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں ہے۔ پھر ذہبی نے اس کی روایت کردہ جو حدیثیں نقل کی ہیں ان میں سے ایک یہی زیر بحث روایت بھی ہے۔ جس کو انہوں نے منکر بتایا ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ نام محرف۔ بدلا ہوا۔ نہ ہو اور صحیح نام: عمر بن سلیم ہو جس کا لقب "باہلی" ہے۔ کیونکہ ائمہ حدیث نے یوسف بن ابراہیم سے روایت کرنے والوں کے ضمن میں عمر بن سلیم باہلی کا نام ہی لکھا ہے جو سچا تو تھا، مگر صاحب اوہام تھا۔ جب کہ التقریب میں ہے:[1] اور سلام بن رزین کے بارے میں امام ذہبی نے لکھا ہے: غیر معروف تھا اور اس کی روایت کردہ حدیث باطل ہے۔[2]

(۲۷۶)......إِنَّ الْفُسَّاقَ هُمْ أَهْلُ النَّارِ، قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْفُسَّاقُ؟ قَالَ: النِّسَاءُ، قَالَ رَجُلٌ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ أَلَيْسَ أُمَّهَاتُنَا وَأَخَوَاتُنَا وَأَزْوَاجُنَا، قَالَ: بَلٰى، وَلٰكِنْ إِذَا أُعْطِيْنَ لَمْ يَشْكُرْنَ وَإِذَا ابْتُلِيْنَ لَمْ يَصْبِرْنَ۔

"بیشک فساق ہی جہنمی ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اور فساق کون ہیں؟ فرمایا عورتیں۔ ایک صحابی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا عورتیں ہماری مائیں، بہنیں اور بیویاں نہیں ہیں؟ فرمایا: کیوں نہیں۔ لیکن جب ان کو عطا کیا جاتا ہے تو شکر نہیں کرتیں اور جب آزمائی جاتی ہیں تو صبر نہیں کرتیں۔"

یہ روایت صحیح نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج امام حاکم نے اس سند سے کی ہے:

ہم کو ابراہیم بن عصمۃ عدل نے خبر دی، کہا: ہم سے سری بن خزیمہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے مسلم بن ابراہیم نے بیان کیا کہا: ہم سے ہشام نے یحییٰ بن ابی کثیر سے، انہوں نے ابو راشد حبرانی سے، اور انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن شبلی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔

اس سند میں سری بن خزیمہ ایک نامعلوم شخص ہے جس کا کتب رجال میں کوئی ذکر نہیں[3] اور یحییٰ بن

---

[1] التقریب: ص ۳۵۱ ترجمہ ۴۹۱۰۱
[2] المستدرك: ص ۱۶۹۰ ح ۸۸۲۳
[3] الضعیفه: ص ۲۷۱ ج ۲

ابی کثیر مدلس [1] تھے۔ انہوں نے اس کی روایت ''عن'' سے کی ہے اور مدلس کا عنعنہ مردود ہے۔

رہا اس روایت کا متن تو وہ حد درجہ منکر ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے عورتوں کے لیے ''فساق'' کا لفظ کیسے نکل سکتا ہے، نعوذ باللہ۔ آپ ان سب کو جہنمی کیونکر قرار دے سکتے ہیں جبکہ صحابیات رضوان اللہ علیہن نے آغاز دعوت سے لے کر آپ کی وفات تک قدم قدم پر آپ کا ساتھ دیا اور ان کے حق میں یہ بات ''جب ان کو دیا جاتا ہے اور عطا کیا جاتا ہے تو شکر نہیں کرتیں اور جب آزمائی جاتی ہیں تو صبر نہیں کرتیں۔'' کس قدر خلاف واقعہ ہے۔ اسلام کی راہ میں فقر و محتاجی کا سامنا جس طرح صحابہ نے کیا بالکل اسی طرح صحابیات نے بھی کیا تھا۔ جو کچھ اللہ کی نعمتیں ان پر نازل ہوتی رہیں ان پر شاکر و قانع رہیں۔ جس طرح ابتلاء و آزمائش میں صحابۂ کرام ثابت قدم رہے ٹھیک اسی طرح صحابیات بھی ثابت قدم رہیں۔ ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ کسی صحابیہ نے اسلام کی راہ میں شدید تعذیب سے تنگ آ کر اپنی زبان سے کلمہ کفر نکال دیا ہو یا اسلام سے پھر گئی ہو۔

اوپر عورتوں سے متعلق جو جھوٹی روایات نقل کی گئی ہیں ان سے عورتوں کے بارے میں جو عمومی تصور پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ عورت بحیثیت جنس کے فتنہ و فساد کی جڑ، ناقابل اعتماد بد دین، بد اخلاق، بے عقل اور بے صبر مخلوق کا نام ہے۔ کتاب و سنت میں دونوں کے دائرہ کار اور میدان عمل کے الگ الگ ہونے کے سوا ان کے درمیان کوئی تفریق نہ کیے جانے کے باوجود ان کے درمیان وہی امتیازی ذہنیت کارفرما ہے جو ذہنیت غیر مسلموں میں کارفرما تھی اور آج بھی کارفرما ہے۔

اولاً تو اسلام میں شرف و فضیلت کے میدان میں وجہ برتری...... ایمان اور عمل صالح کو قرار دیا گیا ہے۔ چاہے اس سے مرد موصوف ہو یا عورت۔

دوم حقوق و واجبات کے حوالہ سے ماں کو جو عورت ہے باپ پر جو مرد ہے فضیلت دی گئی ہے۔ صحیح احادیث میں تو بصراحت ماں کو باپ کے مقابلے میں تین گناہ زیادہ حسن سلوک کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ [2] جس سے مرد پر عورت کی فضیلت کا ثبوت ملتا ہے۔

اور قرآن پاک میں متعدد مقامات پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ [3] عجیب

---

[1] التقریب ص ۵۲۵ ترجمہ ۷۶۳۲۔ الضعیفہ ص ۵۳ ج ۱٤

[2] صحیح بخاری ح ۵۹۷۱۔ صحیح مسلم ح ۲۵٤۸۔ ۶۵۰۱۔

[3] الاسراء ۲۳۔۲٤: العنکبوت: ۸ لقمان: ۱۲۔ الاحقاف: ۱۵۔

بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قربانیوں کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں تو باپ کو نظر انداز کر دیا ہے [1] جو اس بات کی دلیل ہے کہ ماں کی قربانیوں کے مقابلے میں باپ کی قربانیاں ہیچ ہیں۔

رہی عورت بمعنی بیوی تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الروم میں بیوی کی تخلیق کو اپنی ربوبیت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے۔[2] یوں تو کائنات کی ہر شیء اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر دلالت کرتی ہے اور اس کی عظیم قدرت، اس کی حاکمیت، اس کے تصرف و تدبیر کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ خود کسی چیز کو اپنی نشانی قرار دے تو اس سے اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ [الروم:۲۱]

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔ اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ درحقیقت اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے ''تخلیق ازواج'' کا پہلا مقصد یہ بتایا ہے کہ مرد اپنی بیویوں کے پاس سکون و اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ کاروبار حیات میں مصروف رہنے کے بعد جب گھر آتے ہیں تو بیوی کے پہلو میں ان کو سکون، اطمینان اور راحت ملتی ہے۔

آگے فرمایا: ''وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً'' اس نے تمہارے درمیان مودت پیدا کر دی۔ مودت ایسی محبت کو کہتے ہیں جو دو طرفہ اور متبادل ہو۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہوں۔ ''وَّرَحْمَةً'' اور اس نے تمہارے درمیان رحمت پیدا کر دی۔ یعنی شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے لیے رحیم و شفیق اور ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔

اس آیت مبارکہ کو سامنے رکھیے اور پھر ان ''تصورات'' پر غور کیجیے جو مردوں نے عورتوں سے متعلق عمومی طور پر اور بیویوں سے متعلق خصوصی طور پر اپنے ذہنوں میں قائم کر رکھے ہیں کہ وہ ہر فساد کی جڑ ہیں۔ کیا ان تصورات کے ہوتے ہوئے مردوں کو اپنی بیویوں کے پہلو میں سکون و اطمینان قلب مل سکتا ہے۔ جس ''مخلوق'' کے بارے میں یہ عقیدہ اور خیال ہو کہ وہ نا قابل اعتماد ہے، سراپا شر ہے، امین و راز دار بنائے جانے کے قابل نہیں ہے۔ کیا وہ سکون دے سکتی ہے؟ اس سے محبت کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اور

[1] دیکھئے سورہ: لقمان: ١٤ ـ الاحقاف: ١٥
[2] سورۃ الروم: ٢١

یہ گمان ہو سکتا ہے کہ وہ مہربان اور شفیق ہو سکتی ہے۔

قرآن پاک کی اس آیت مبارکہ کو سامنے رکھیے اور پھر رسول اکرم فداہ ابی و امی ﷺ کی خدمت میں پہلی بار حضرت جبریل امین کی آمد اور قرآن پاک کی پہلی آیات کے نزول، آپ کی لرزاں و ترساں گھر واپسی اور ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے یہ فرمانا: خدیجہ! مجھے اپنی زندگی کا ڈر ہے۔ ان تمام واقعات پر ترتیب وار غور کیجیے اور ام المومنین رضی اللہ عنہا کے جواب: "کَلّا" ہرگز نہیں۔ آپ کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں لاحق ہے...... پر ٹھہر کر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات پاک کا یہ حیرت ناک اور غیر متوقع واقعہ اور ام المومنین کا عظیم موقف مذکورہ آیت مبارکہ کی بہترین تفسیر ہے۔ اس کے بعد رسولِ رحمت ﷺ نے دوسری ازواج مطہرات کے ساتھ اپنے روز و شب گزارے اور ان کے ساتھ آپ کا جو عظیم برتاؤ رہا اور انہوں نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ جس مودت و رحمت کا اظہار کیا اور دین کی راہ میں جس مکمل تعاون کا مظاہرہ کیا وہ سب اللہ تعالیٰ کے مذکورہ قول کی عملی تفسیر تھا۔

اللہ تعالیٰ نے صرف بیوی کے اوصاف بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ آپ نے مسلمان شوہروں کو اپنی بیویوں کے ساتھ رہنے کے آداب بھی سکھائے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّآ أَن يَأْتِينَ بِفَـٰحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا شَيْـًٔا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝ ﴾ [النساء: ١٩]

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو۔ اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انہیں دے چکے ہو۔ الا یہ کہ وہ کسی صریح بے چلنی کی مرتکب ہوں۔ اور ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ پس اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز جو تمہیں ناپسند ہو مگر اللہ تعالیٰ اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔"

اس آیت میں صرف بعض معاشرتی احکام اور آداب نہیں بیان کیے گئے بلکہ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مسلمان مرد اپنے کردار کو دیکھ سکتے ہیں۔

کفاءت کا مسئلہ

(۲۷۷)......اَلْأَحْـرَارُ مِنْ اَهْلِ التَّوْحِيْدِ كُلُّهُمْ أَكْفَاءُ إِلَّا أَرْبَعَةَ: اَلْمَوْلَى وَالْحَجَّامُ وَالنَّسَّاجُ، وَالْبَقَّالُ

''اہل توحید کے سب آزاد لوگ ایک دوسرے کے کفو ہیں، سوائے چار کے: غلام، نائی، پارچہ باف اور سبزی فروش۔''

یہ حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج ربیع بن حبیب ازدی بصری نے اپنی مسند[1] یا الجامع الصحیح میں کی ہے۔

ربیع بن حبیب ازدی بصری کا تعلق خوارج کے اباضیہ فرقے سے تھا۔ اس فرقے کا نام اباضیہ عبداللہ بن اباض کی طرف نسبت سے پڑا ہے جس نے آخری اموی خلیفہ: مروان بن محمد کے زمانے میں خروج کیا تھا۔

اباضیہ فرقے کا عقیدہ ہے کہ ''اہل قبلہ'' سے تعلق رکھنے والے اس کے مخالفین کافر تو ہیں، مگر مشرک نہیں ہیں، ان کے ساتھ شادی بیاہ جائز ہے۔ ان کی وراثت کا مال بھی حلال ہے اور ان کے ساتھ جنگ کی صورت میں ان سے حاصل ہونے والا مال غنیمت حلال ہے۔ خفیہ طور پر ان کو قتل کرنا یا ان کو غلام اور لونڈی بنانا حرام ہے۔ ایسا صرف حالت جنگ اور حجت قائم ہو جانے کے بعد حلال ہے۔ اسی طرح اباضیہ اپنے مخالف مسلمانوں کے علاقوں اور شہروں کو ''دار التوحید'' مانتا ہے۔ سوائے سلطان کے کیمپ کے جو دار بغی و عدوان ہے۔[2]

ربیع بن حبیب ازدی خود غیر معروف ہے۔ اس کے احوال نہ تو اہل سنت کی کتابوں میں ملتے ہیں اور نہ اباظیوں کی کتابوں میں۔ اس کا ذکر صرف اس کی کتاب مسند یا الجامع الصحیح کے شارح عبداللہ بن حمید سالمی عمانی اباظی نے کیا ہے اور اس کو ان القاب سے نوازا ہے: الامام الکامل والہمام الفاضل الشہیر بین الاواخر والاوائل۔ اور چونکہ اس روایت کی کوئی سند بیان نہیں ہوئی ہے اس لیے محض اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ اپنی کتاب میں اس کو نقل کرنے والا مذکورہ القاب کا حامل تھا۔ کوئی بھی انسان جس کو جو لقب دینا چاہے دے سکتا ہے۔ اعتبار تو اس کا ہے کہ آیا وہ اس لقب کا مستحق بھی ہے یا نہیں؟ مزید یہ کہ کسی بڑے سے عالم فاضل یا امام کی کوئی بات اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ اس کا کہنے

[1] مسند ربیع بن حبیب: ص۱۳۸ ح۵۱۳ [2] الملل والنحل: ص۱۰۷

والا علم و معرفت کے بڑے اعلیٰ درجے پر فائز تھا۔ بلکہ ہر کسی کی بات دلیل کی بنیاد پر قابل قبول ہوتی ہے۔ رہی حدیث...... تو وہ اس وقت قابل ہو گی جب اس کی نسبت رسول اکرم ﷺ سے صحیح سند سے ثابت ہو۔ اس کا متن اللہ کی کتاب اور کسی صحیح حدیث کے خلاف نہ ہو۔ مذکورہ روایت کی جہاں کوئی سند نہیں ہے وہیں کتاب اللہ اور صحیح احادیث کے خلاف بھی ہے۔

شادی بیاہ کے مسئلہ میں جس کفاءت کو فقہاء نے شرط قرار دیا ہے، کتاب و سنت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

نسب میں برابری اور کفاءت کے مسئلے میں کوئی بھی حدیث ثابت نہیں ہے۔ رہی وہ حدیث جس کی تخریج حافظ بزار نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی سند سے کی ہے، اور جس کے الفاظ ہیں:

((الْعَرَبُ بَعْضُهُمْ أَكْفَاءُ بَعْضٍ وَالْمَوَالِيْ بَعْضُهُمْ أَكْفَاءُ بَعْضٍ)) [1]

''عرب ایک دوسرے کے مساوی اور کفوٗ ہیں اور غیر عرب ایک دوسرے کے مساوی اور کفوٗ ہیں۔'' وہ حدیث ضعیف اور نا قابل استدلال ہے۔

اس کے برعکس ایسی متعدد صحیح احادیث کتب حدیث میں مروی ہیں جن سے صرف دین اور اخلاق میں کفاءت اور مساوات کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ)) [2]

''عورت سے نکاح چار چیزوں کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے: اس کا مال، اس کا خاندانی شرف، اس کا حسن و جمال اور اس کا دین دیکھ کر۔ تو دین والی کو پا کر سرخرو ہو جا۔ تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔''

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے لوگوں کی عادات کا ذکر فرمایا ہے اور ان چیزوں کا ذکر فرمایا ہے جن کا عام طور پر لڑکیوں سے نکاح کے موقع پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ لڑکی کا انتخاب اس کے مال کو

---

[1] نیل الاوطار: ص۱۳۱۸ ج۲

[2] صحیح البخاری: ح۵۰۹۰۔ صحیح مسلم: ح۱۴۶۶۔ جامع ترمذی: ح۱۰۸۶

دیکھ کر کرتے ہیں، دوسرے اس کے حسب نسب اور خاندانی شرف کو دیکھتے ہیں۔ کچھ لوگ کسی لڑکی یا عورت سے اس کی خوبصورتی اور حسن کی بنیاد پر شادی کرتے ہیں۔ جبکہ بعض لوگوں کے پیش نظر لڑکی اور عورت کی دینداری ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے کسی لڑکی یا عورت میں اس چوتھی اور آخری صفت کو نکاح کے لیے وجہ ترجیح قرار دیا ہے۔

حضرت ابو حاتم مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا أَتَاكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِينَهُ وَخُلُقَهُ فَانْكِحُوهُ، إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ)) [1]

”جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص آئے جس کے دین واخلاق سے تم راضی ہو تو اس سے نکاح کرو۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں بہت بڑا فتنہ برپا ہو جائے گا۔“

اس حدیث میں رسول اکرم ﷺ نے لڑکیوں کے لیے دیندار اور با اخلاق مردوں کے انتخاب کی ترغیب دی ہے۔ اس طرح یہ واضح فرما دیا ہے کہ نکاح میں جس کفاءت کا اعتبار ہے وہ حسب نسب اور مال کی کثرت اور حسن و جمال میں مساوات اور برابری نہیں بلکہ دین واخلاق میں کفاءت و برابری ہے۔ اگر حسب ونسب، مال اور حسن و جمال کی شرطوں کے مفقود ہونے کی وجہ سے لڑکوں کو رشتہ دینے سے انکار کیا جاتا ہے تو لڑکیاں نکاح کے بغیر بیٹھی رہ جائیں گی اور معاشرے میں فتنہ وفساد برپا ہوگا۔ بے حیائی اور بدکاری کو ہوا ملے گی۔

یہ تو رسول اکرم ﷺ کے ارشادات تھے۔ عملی طور پر رسول اکرم ﷺ نے اپنے آزادہ کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے کر دیا تھا، جس کا ذکر سورۃ الاحزاب میں آیا ہے۔ حالانکہ دونوں کے حسب نسب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کہاں ایک غلام اور کہاں ایک سرداروں کی بیٹی قریش زادی اور رسول اکرم ﷺ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی شادی حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے کر دی تھی جو قریش زادی تھیں۔ [2]

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ نے جو قرشی

---

[1] جامع ترمذی: ح ١٠٨٤، ١٠٨٥

[2] صحیح مسلم: ح ١٤٨٠-٣٧١٣، ٣٧١٤

تھے اور غزوہ بدر میں شرکت کا شرف حاصل کر چکے تھے، اپنے آزاد کردہ غلام حضرت سالم رضی اللہ عنہ کا نکاح اپنی بھتیجی حضرت ہند بنت ولید بن عتبہ رضی اللہ عنہا سے کر دیا تھا۔[1]

تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان قولی اور فعلی حدیثوں کے بعد نکاح کے لیے حسب نسب اور خاندانی شرافت میں برابری اور کفاءت کو شرط قرار دینا، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے؟

اگر فقہاء یہ کہتے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو رشتۂ ازدواج میں باندھنے سے قبل ان کے درمیان مزاج میں ہم آہنگی، اجتماعی اور مالی امور میں توافق وغیرہ کی رعایت کی جائے تا کہ شادی کامیاب ہو اور ان امور کو بھی نکاح کے صحیح ہونے کی شرط نہ قرار دی جائے تو یہ بات کسی حد تک قابل قبول ہو سکتی تھی۔

مگر یہ ایک منکر اور اسلامی روح کے خلاف بات ہے کہ مسلمان لڑکے اور لڑکی میں نکاح کے صحیح ہونے کی شرط حسب نسب، خاندانی شرافت اور مال و دولت میں برابری کو قرار دیا جائے۔ جس شرط کا اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں کوئی ذکر نہیں ہے۔

قرآن پاک میں تو یہاں تک صراحت ہے:

﴿ وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ ۚ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴾ [النور:۳۲]

"اور تم لوگ اپنے میں سے مجرد لوگوں کا اور اپنے میں سے صالح غلاموں اور لونڈیوں کا نکاح کر دو۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو خوشحال کر دے گا۔ اور اللہ بڑی وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔"

اس آیت مبارکہ میں غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کا نکاح کر دینے کی تلقین کی گئی ہے اور نکاح کی راہ میں غربت حائل ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ غربت کو خوشحالی میں بدل دے گا۔ لہٰذا غربت اور تنگ دستی کو نکاح نہ کرنے کا بہانہ بنانے سے گریز کیا جائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((ثَلَاثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللّٰهِ عَوْنُهُمْ: الْمُجَاهِدُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُكَاتَبُ الَّذِيْ يُرِيْدُ الْأَدَاءَ وَالنَّكَاحُ الَّذِيْ يُرِيْدُ الْعَفَافَ))

---

[1] صحیح بخاری: ح۵۰۸۸

"تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن کی مدد اللہ نے اپنے ذمہ لے لی ہے: اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا، وہ غلام جس نے اپنی آزادی کی قیمت ادا کرنے کے لیے اپنے مالک سے معاہدہ کر رکھا ہو اور وہ نکاح کرنے والا جو پاکدامن رہنا چاہتا ہے۔"[1]

اسلام کی نگاہ میں ذات پات کا تصور:

بات صرف شادی بیاہ میں کفاءت اور برابری تک محدود نہیں ہے بلکہ مسلمانوں میں ذات پات کے تصور نے نہایت سنگین اور گھناونی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ بیماری صرف عوام کے اندر نہیں ہے بلکہ اس میں علماء اور پیشوایان امت بھی مبتلا ہیں۔ حالانکہ ذات و برادری اور قبیلہ و خاندان کا تعصب، کسی قبیلے، خاندان، کسی نسل اور قوم کی کسی دوسرے قبیلے، خاندان، نسل اور قوم پر برتری اور تفوق کا تصور اسلامی عقیدہ نہیں بلکہ جاہلی تصور اور عقیدہ ہے جو اسلامی روح اور مزاج کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَفَخْرَهَا بِالْآبَاءِ، مُؤْمِنٌ تَقِيٌّ وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ، أَنْتُمْ بَنُوْ آدَمَ وَ آدَمُ مِنَ التُّرَابِ، لَيَدَعَنَّ رِجَالٌ فَخْرَهُمْ بِأَقْوَامٍ، إِنَّمَا هُمْ فَحْمٌ مِنْ فَحْمِ جَهَنَّمَ أَوْ لَيَكُوْنَنَّ أَهْوَنَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الْجِعْلَانِ الَّتِيْ تَدْفَعُ بِأَنْفِهَا النَّتْنَ))[2]

"درحقیقت اللہ نے تم سے جاہلیت کے غرور و نخوت اور آباء و اجداد پر اس کے تکبر کو دور کر دیا ہے۔ لوگوں کی صرف دو ہی قسمیں ہیں: خدا ترس مومن یا فاجر و بدبخت۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔ لوگ ان قوموں پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو جہنم کا ایندھن بن چکے ہیں۔ یا پھر وہ اللہ کے نزدیک اس کیڑے سے زیادہ ذلیل ہوں جو اپنی ناک سے گندگی کو دفع کرتا ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن لوگوں میں خطبہ دیا اور فرمایا:

((يَاأَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَاظُمَهَا بِآبَائِهَا، فَالنَّاسُ رَجُلَانِ، رَجُلٌ بَرٌّ تَقِيٌّ كَرِيْمٌ عَلَى اللّٰهِ، وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ هَيِّنٌ عَلَى اللّٰهِ، وَالنَّاسُ بَنُوْ آدَمَ وَخَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ مِنَ التُّرَابِ، قَالَ

[1] جامع ترمذی: ح ١٦٥٥۔ سنن ابن ماجہ: ح ٢٥١٨ [2] سنن ابوداؤد: ح ٥١١٦

اللّٰهُ: ﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴾)) [1]

''اے لوگو! بیشک اللہ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور آباو اجداد پر اس کے فخر کو دور کر دیا ہے۔ لوگ دو طرح کے ہیں، ایک نیک، خدا ترس اور اللہ کے نزدیک باعزت انسان۔ دوسرا بدکار نامراد اور اللہ کے نزدیک ذلیل۔ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔ اللہ کا ارشاد ہے: اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے باعزت وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو۔''

حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں رسول اکرم ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، إِلَّا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى أَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوَى، أَبَلَّغْتُ؟ قَالُوا بَلَّغَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ......)) [2]

''لوگو! خبر رہو، تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی برتری نہیں حاصل ہے مگر صرف تقویٰ کی بنیاد پر۔ کیا میں نے تم کو پیغام پہنچا دیا؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ نے پیغام پہنچا دیا۔''

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مومن کو کسی مومن پر کوئی برتری اور فضیلت حاصل ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ عربی ہے یا غیر عربی۔ گورا ہے یا کالا، کسی اعلیٰ برادری یا ذات سے اس کا تعلق ہے یا کسی نچلی اور پست برادری سے بلکہ لوگوں میں فضیلت اور برتری کا معیار صرف یہ ہے کہ کون ایمان، عمل صالح اور تقویٰ میں بڑھا ہوا ہے۔

اسی حجۃ الوداع میں رسول اکرم ﷺ نے طبقاتی اونچ نیچ پر ایک نہایت کاری ضرب یہ لگائی کہ عرفات سے مزدلفہ جاتے ہوئے اپنے ساتھ اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما

[1] جامع ترمذی: ح ۳۲۷۰ [2] مسند امام احمد: ح ۲۳۸۸۵

کو اپنی اونٹنی پر سوار فرمایا اور مزدلفہ سے منیٰ جاتے ہوئے اپنے چچا زاد بھائی حضرت فضل بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہما کو اپنے ساتھ سوار فرمایا۔[1]

ذی الحجہ ۱۰ ہجری کے آخری ایام میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع سے مدینہ منورہ واپس ہوئے۔ صفر ۱۱ ہجری کے آخری ایام میں بلقاء اور فلسطین میں رومیوں پر لشکر کشی کی غرض سے ایک فوج تشکیل دی جس میں مہاجرین اور انصار کے نہایت سر برآوردہ صحابہ شامل تھے۔ اس فوج کا قائد اور سپہ سالار حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو بنایا جن کی عمر اس وقت صرف ۱۸ برس کی تھی۔ اس وقت جب بعض لوگوں نے ان کی امارت پر اعتراض کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اگر تم اس کی امارت اور قیادت پر معترض ہو تو اس سے قبل تم لوگ اس کے باپ کی امارت پر بھی طعنہ زن کر چکے ہو۔ حالانکہ اللہ کی قسم وہ امارت کے مستحق تھے اور میرے نزدیک محبوب ترین لوگوں میں شامل تھے۔ یہ اسامہ ان کے بعد لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔[2]

اسی صحیح بخاری میں خود حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اور حسن ابن علی رضی اللہ عنہم کو ایک ساتھ پکڑ کر فرماتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّهُمَا فَأَحِبَّهُمَا))[3]

"اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما۔"

غرضیکہ اسلام میں طبقاتی اونچ نیچ، قبائلی، نسلی اور خاندانی بنیادوں پر لوگوں میں تفریق کرنا نہایت مبغوض اور ناپسندیدہ عمل ہے جو اس کی روح اور تعلیمات کے منافی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دیا ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ [الحجرات: ۱۰]

"مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔"

﴿ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ﴾ [التوبہ: ۷۱]

"اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔"

اولیاء ولی کی جمع ہے اور ولی حقیقی اور قلبی دوست کو کہتے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم: ح۱۲۱۸۔ ۲۹۵۰۔ البدایہ والنہایہ ص ۲۶۰ ج ۴۔ سیر اعلام النبلاء: ص۱۰۸ ج۴

[2] صحیح بخاری: ح۴۴۶۹ [3] صحیح بخاری: ح۳۷۳۵

قرآن وحدیث کی مذکورہ وضاحتوں کی روشنی میں پورے یقین قلب کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ذات پات، قبیلہ، خاندان اور نسل وقوم، اسی طرح زبان اور رنگ کی بنیاد پر لوگوں میں تفریق کرنا اور ایک کو دوسرے سے برتر یا کمتر قرار دینا اسلام کی روح اور مزاج کے منافی ہے۔ لہٰذا مناقب وفضائل کی کتابوں میں متداول وہ روایات جن میں مذکورہ بنیادوں پر باہمی فخر ومباہات کی دعوت دی گئی ہے، یا اس کی تائید کی گئی ہے سب جھوٹ ہیں۔ رسول اکرم ﷺ سے ان کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا اپنے عربی ہونے پر فخر کرنا اور لوگوں کو یہ دعوت دینا کہ وہ آپ کے عربی ہونے کی وجہ سے محبت کریں قرآنی تعلیمات اور آپ کی سیرت پاک اور آپ کی عالمی دعوت کے منافی ہے۔

(۲۷۸) إِنَّ قُرَيْشًا أُعْطِيَتْ مَا لَمْ يُعْطَ النَّاسُ ، أُعْطُوْا مَا مَطَرَتِ السَّمَاءُ وَمَا جَرَتْ بِهِ الْأَنْهَارُ وَمَا سَالَتْ بِهِ السُّيُوْلُ

’’بیشک قریش کو وہ کچھ عطا کیا گیا ہے جو دوسرے لوگوں کو عطا نہیں کیا گیا۔ ان کو وہ چیز دی گئی ہے جس کی وجہ سے آسمان پانی برساتا ہے، جس سے نہریں جاری ہیں اور سیلاب کا پانی رواں دواں رہتا ہے۔‘‘

یہ حدیث صحیح نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج حافظ ابونعیم نے معرفۃ الصحابہ[1] میں حسن بن سفیان کی سند سے کی ہے:

حسن بن سفیان سے روایت ہے، کہا: ہم سے شباب عصفری نے بیان کیا، کہا: ہم سے یحییٰ بن عبدالرحمٰن نے، محمد بن حرب خولانی سے، انہوں نے سعید بن سنان سے، انہوں نے ابو زاہریہ سے، انہوں نے ح لیس رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

تو یہ سند موضوع ہے جس کی مصیبت سعید بن سنان۔ اس کی کنیت ابومہدی اور لقب حمصی تھا۔ حافظ ابن حجر نے التقریب[2] میں اس کو متروک لکھا ہے۔ امام دارقطنی نے اس پر حدیثیں گھڑنے کا الزام[3] لگا ہے۔[4]

(۲۷۹)...... إِذَا ذَلَّتِ الْعَرَبُ ذَلَّ الْإِسْلَامُ

---

1. معرفة الصحابة: ص ۹۰۲ ج ۲ ح ۲۳۲۶
2. ص ۱۷۷ ترجمه: ۲۳۳۳
3. الضعفاء والمتروكين: ص ۱٤۵ ترجمه: ۲۷۰
4. تنزيه والشريعة: ص ٦۳ ج ۱ ، ترجمه: ۱٤- الضعيفه: ص ۱۱۲۳-۱۱۲٤ ج ۱۲

''جب عرب ذلیل ہوں گے تو اسلام بے وقعت ہو جائے گا۔''

یہ روایت جھوٹ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اسلام اللہ کا بنایا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔ اللہ کا دین اور اس کی روشنی ہے۔ اسلام کبھی ذلیل اور بے وقعت نہیں ہوگا۔ اسلام کی آمد اور رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل عرب کسی شمار میں نہیں تھے۔ لیکن اسلام قبول کر کے اور اللہ کے رسول ﷺ کی دعوت پر لبیک کہہ کر اور اسلام کی متعین کردہ راہ پر چل کر اونٹ اور بکریوں کے چرواہوں سے دنیا کے حکمران بن گئے۔ جب اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرنے کی بجائے دوبارہ اپنے عرب ہونے پر فخر کرنے لگے تو دنیا کی نظروں سے گر گئے لیکن اسلام باقی رہا۔ اسلام کی عزت عربوں کی عزت پر کبھی بھی موقوف نہیں تھی۔ بلکہ ان کی عزت اس پر عمل کرنے پر موقوف تھی، ہے اور رہے گی۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے غلط عمل سے غیر مسلمانوں کی نگاہوں میں اسلام کی غلط تصویر بنتی ہے۔ اس کی طرف ان کے میلان میں کمی ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اس کو سمجھ جاتے ہیں تو اس کی توقیر کرنے لگتے ہیں۔

اسلام کی بدولت عثمانیوں یا ترکوں نے دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر آٹھ صدیوں تک حکومت کی۔ ان کے ذریعہ اسلام کی روشنی وسط یورپ تک پہنچ گئی۔ لیکن جب عربوں کی طرح وہ بھی اپنے عمل سے اسلام کی غلط ترجمانی کرنے لگے تو ان کی عظمت وشوکت قصۂ پارینہ بن گئی۔ مگر اس کے باوجود اسلام باقی ہے اور باقی رہے گا۔ (ان شاء اللہ)

آج پوری دنیا اسلام کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے اس کے خلاف اپنی ساری توانائیاں وقف کیے ہوئے اس کو پھیلنے سے روکنے کے لیے یورپ و امریکہ اپنی ساری مادی، فوجی، فکری اور عملی صلاحیتیں لگائے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کی روشنی گل کرنے میں ناکام ہیں۔ خود امریکی اور یورپی قوموں کے اندر سے اسلام کے نام لیوا اور اس کی متعین کردہ راہ پر چلنے والے پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ روایت جس طرح اپنے معنی اور مضمون کے اعتبار سے باطل ہے اسی طرح اپنی سند کے اعتبار سے بھی من گھڑت ہے۔ رسول اکرم ﷺ سے اس کی نسبت صحیح نہیں ہے۔

اس کی تخریج حافظ ابونعیم نے ''اخبار اصفہان'' [1] میں اور حافظ ابویعلی نے اپنی مسند [2] میں اس سند سے کی ہے: ہم سے منصور بن ابی مزاحم نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن خطاب بصری نے، علی بن زید

[1] اخبار اصفهان: ص ۳۴۰ ج ۲ [2] مسند ابو یعلیٰ: ص ۴۰۲ ج ۳ ح ۱۸۸۱

سے، انہوں نے محمد بن منکدر سے، انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے بیان......

امام ابن ابی حاتم فرماتے ہیں:

''میں نے اپنے والد سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا جس کی روایت منصور بن ابی مزاحم نے محمد بن خطاب سے، انہوں نے علی بن زید سے، انہوں نے محمد بن منکدر سے اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ جب عرب ذلیل ہو جائیں گے تو اسلام ذلیل و بے وقعت ہو جائے گا۔'' تو میرے والد نے جواب دیا:

''یہ حدیث باطل ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔''[1]

(۲۸۰)......سَأَلْتُ رَبِّیْ عَزَّوَجَلَّ أَنْ لَا یُدْخِلَ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ بَیْتِی النَّارَ فَأَعْطَانِیْهَا

''میں نے اپنے رب عزوجل سے درخواست کی کہ وہ میرے اہل بیت میں سے کسی کو جہنم میں داخل نہ کرے۔ تو اس نے مجھے یہ عطا فرما دیا۔ یعنی میرے اہل بیت میں سے کسی کو جہنم میں داخل نہیں کرے گا۔''

یہ حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اسلام میں جہنم سے نجات کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے ہونا شرط نہیں ہے۔ بلکہ ایمان اور عمل صالح سے متصف ہونا شرط ہے۔ یہ تو یہودیوں کا دعویٰ اور عقیدہ ہے کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں۔ اس لیے اولاً تو ہم جہنم میں نہیں جائیں گے ثانیاً اگر گئے بھی تو صرف چند دنوں کے لیے۔ لیکن اسلام میں قانون جزا و سزا قرآن پاک کی زبان میں یہ ہے:

﴿ إِنَّهُ مَنْ يَّأْتِ رَبَّهُ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ ط لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى ○ وَ مَنْ يَّأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَأُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ○ ﴾ [طه:۷٤۔۷۵]

''جو مجرم بن کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوگا اس کے لیے جہنم ہے جس میں وہ نہ جئے گا نہ مرے گا۔ اور جو اس کے حضور مومن بن کر حاضر ہوگا اور اس نے نیک عمل کیے ہوں گے تو ایسے لوگوں کے لیے بلند درجات ہیں۔''

مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نبی کی اولاد میں صرف اس کا شمار ہوتا ہے جو اس کے طریقے پر عمل

[1] علل الحدیث ص۲۱٤ ج۳۲ ح۲٦٤۲

پیرا ہوا اور جو اس کے طریقے پر عمل پیرا نہ ہو وہ نبی کے اہل میں شمار نہیں ہوتا۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿ وَ نَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ○ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ﴾ [هود ٤٥-٤٦]

''نوح نے اپنے رب کو پکارا: اے میرے رب، میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا بہتر حاکم ہے۔ فرمایا اے نوح درحقیقت وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے۔''

جب رسول اکرم ﷺ پر قرآن پاک کی درج ذیل آیت نازل ہوئی:

﴿ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ ﴾ [الشعراء: ٢١٤]

''اے محمد! اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ۔''

تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے رشتہ داروں کو جمع کیا اور فرمایا:

((یَا مَعْشَرَ قُرَیْشٍ اِشْتَرُوْا اَنْفُسَكُمْ ، لَا أُغْنِیْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا ، یَا بَنِیْ عَبْدَ مَنَافٍ لَا أُغْنِیْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا ، یَا عَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لَا أُغْنِیْ عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا ، وَیَا صَفِیَّةَ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَا أُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا ، وَیَا فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَلِیْنِیْ مَا شِئْتِ مِنْ مَالِیْ ، لَا أُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا)) [1]

''اے معشر قریش! اپنے آپ کو خرید لو۔ یعنی اپنے آپ کو جہنم سے بچالو۔ میں تم لوگوں کو اللہ کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔ اے بنی عبد مناف! میں تم کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ اے عباس بن عبد المطلب! میں تم کو اللہ کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔ اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی، میں تمہیں اللہ کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا اور اے فاطمہ محمد کی بیٹی تو میرے مال میں سے جو چاہے مانگ لے، میں تجھے اللہ کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔''

جو لوگ رسول اللہ ﷺ سے فریادیں کرتے ہیں، آپ کا وسیلہ پکڑتے ہیں، آپ کی قبر مبارک کی زیارت کے موقع پر رو رو کر دعائیں مانگتے ہیں، قبر مبارک کی جالیاں چومتے ہیں یا پیروں فقیروں کی

---

[1] صحیح بخاری: ح ٤٧٧١۔ صحیح مسلم: ح ٢٠٦

قبروں کے سامنے کھڑے ہو کر دعائیں کرتے ہیں، ان میں مدفون مردوں سے مرادیں مانگتے ہیں۔ یا جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پیروں اور ولیوں سے دعائیں مانگنا اور ان سے مدد مانگنا اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگنا ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہیں اور قیامت کے دن یہ ان کو اللہ تعالیٰ سے بخشوا لیں گے ایسے خود فریبوں کو چاہیے کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے مذکورہ ارشاد اور اس سے قبل ذکر کردہ آیات قرآنی پر غور کریں اور اپنے ان اعمال کو ان کی روشنی میں رکھ کر دیکھیں: آیا وہ کتاب وسنت کے احکام کے مطابق ہیں یا شیطان نے ان کو ان کی آنکھیں میں خوشنما بنا دیا ہے۔

﴿ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [النحل:٦٣]

''اللہ کی قسم! تم سے پہلے بہت سی قوموں میں ہم رسول بھیج چکے ہیں۔ پس شیطان نے ان کے برے کرتوت انہیں خوشنما بنا کر دکھائے۔ وہی آج ان کا سرپرست ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

اوپر جس موضوع اور جھوٹی روایت کا ذکر کیا گیا ہے اور جس کے مضمون اور متن کے باطل ہونے کے دلائل کے ضمن میں یہ وضاحتیں کی جا رہی ہیں، اس روایت کی تخریج حافظ ابن بشران نے اپنی کتاب ''الامالی''[1] میں کی ہے۔

ہم کو ابوسہل احمد بن محمد بن عبداللہ بن زیاد قطان نے خبر دی، کہا: ہم سے محمد بن یونس نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابوعلی حنفی نے بیان کیا، کہا: ہم سے اسرائیل نے ابوحمزہ ثمالی سے، انہوں نے ابورجاء سے، انہوں نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا......

محدث محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں:

یہ سند موضوع ہے۔ ابوحمزہ ثمالی جس کا نام ثابت بن ابی صفیہ ہے، ثقہ نہیں تھا۔ جیسا کہ امام نسائی وغیرہ نے صراحت کی ہے اور محمد یونس کریمی مشہور حدیثیں وضع کرنے والا ہے۔[2]

اہل بیت سے محبت

اوپر کی وضاحتوں سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ اہل بیت سے محبت مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ ان

[1] الأمالي: ص٥٦ ج١ [2] الضعيفه: ص٤٩٤ ج١

وضاحتوں سے یہ بتانا مقصود تھا کہ ذات پات اور قبیلہ و خاندان پر فخر کرنا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ جہاں تک رسول اکرم فداہ ابی و امی ﷺ کے اہل بیت سے محبت کا تعلق ہے تو یہ ایمان کی پہچان ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے عربوں، خصوصاً بنو ہاشم سے محبت اور قلبی لگاؤ ایک سچے اور مخلص مومن کے دل کی آواز ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ انہی بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔ رہے آپ کے اہل بیت تو جو دل ان کی محبت سے خالی ہو وہ کسی مومن کا دل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ہمیں تو اس پاک سرزمین سے بھی محبت ہے۔ اس لیے کہ اس پر رسول اکرم ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ رضوان اللہ علیہم کے نقوش پا ثبت ہیں۔ اس سرزمین پر حرمین شریفین اور مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ جزیرۂ عرب کی فضاؤں میں رسول اللہ ﷺ، آپ کے اہل بیت اور صحابہ کرام کی سانسوں کی خوشبو بسی ہے۔

عربی زبان سے محبت

عربی زبان اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن پاک کی، نبی اکرم ﷺ کی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زبان ہے۔ اس زبان سے ہماری محبت اور قلبی تعلق فطری ہے۔ لیکن قرآن پاک اور صحیح احادیث میں اس زبان کی نہ کوئی فضیلت بیان ہوئی ہے اور نہ کہیں یہ صراحت ہے کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی۔ آخرت اور جنت و جہنم کے احوال کا تعلق غیبیات سے ہے جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کے بتانے سے بعض احوال کا علم رسول اللہ ﷺ کو حاصل تھا۔ مگر آپ نے اپنے کسی ارشاد میں یہ نہیں بتایا ہے کہ اہل جنت عربی بولیں گے۔ لہٰذا:

(۲۸۱)......أَحِبُّوْا الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ: لِأَنِّي عَرَبِيٌّ وَالْقُرْاٰنُ عَرَبِيٌّ وَكَلَامُ أَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ۔

''تین باتوں کی وجہ سے عربوں سے محبت کرو۔ اس وجہ سے کہ میں عربی ہوں۔ قرآن عربی ہے، اور اہل جنت کی بات چیت عربی میں ہوگی۔''

یہ ایک موضوع روایت ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی نہیں ہے۔[1]

(۲۷۲)......وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ وَحْيٍ قَطُّ عَلٰى نَبِيٍّ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ إِلَّا بِالْعَرَبِيَّةِ ثُمَّ يَكُوْنُ هُوَ بَعْدُ يُبَلِّغُهٗ بِلِسَانِهِمْ۔

[1] اس موضوع روایت کے بارے میں تفصیلی بحث اس کتاب کی پہلی جلد کے ص ۲۹۴ پر گزر چکی ہے۔

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اللہ نے کبھی بھی کوئی وحی اپنے کسی نبی پر، اپنے اور اس کے درمیان نازل نہیں فرمائی مگر عربی زبان میں۔ پھر وہ نبی اس وحی کو اپنی قوم تک اس کی اپنی زبان میں پہنچاتا رہا ہے۔''

یہ روایت جھوٹ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی نہیں ہے۔ قرآن پاک اور صحیح احادیث کے بھی خلاف ہے۔

اس روایت کی تخریج امام ابن الجوزی [1] نے امام ابن عدی [2] کے طریق سے کی ہے:

ابن عدی کہتے ہیں: ہم سے ابراہیم بن علی عمری نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالغفار بن عبداللہ بن زبیر نے بیان کیا۔ کہا: ہم سے عباس بن فضل انصاری نے، سلیمان سے، انہوں نے زہری سے، انہوں نے سعید بن میسب سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے......

یہ روایت نقل کرنے کے بعد امام ابن الجوزی فرماتے ہیں:

یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ سلیمان ارقم کے بارے میں امام احمد کا قول ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس سے حدیث روایت نہیں کی جاتی۔ امام یحییٰ فرماتے ہیں وہ ایک پیسہ کے برابر بھی نہیں تھا۔ عمرو بن علی کا قول ہے: وہ ثقہ نہیں تھا۔ امام نسائی، ابوداؤد اور دارقطنی نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔ امام ابن حبان نے اس پر یہ الزام لگایا ہے: وہ ثقہ راویوں کے نام سے من گھڑت اور موضوع روایات بیان کیا کرتا تھا۔

رہا عباس بن فضل تو اس کے بارے میں امام یحییٰ بن معین کا قول ہے: وہ کچھ بھی نہیں اور امام نسائی نے اس کو ''متروک'' کہا ہے۔ [3]

یہ تو اس روایت کی سند کا حال تھا، رہا اس کا متن تو وہ قرآن پاک اور صحیح حدیثوں کے خلاف ہے۔ سورۃ ابراہیم میں ارشاد ربانی ہے۔

﴿ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ﴾

---

[1] الموضوعات: ص١٥٩۔ ١٦٠ ج١ ح٢٤١

[2] الكامل: ص١١٠٠۔١١٠٥ ج٣   [3] الضعفاء والمتروكين: ص٧٤

''ہم نے جو رسول بھی بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تا کہ وہ انہیں کھول کھول کر سمجھا سکے۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جتنے رسول بھی مبعوث فرمائے ہیں ان کی اپنی قوموں کی زبانوں میں اور ان پر جو کتابیں بھی نازل فرمائی ہیں وہ بھی ان کی زبانوں میں تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام ان کے سامنے خوب کھول کھول کر واضح کریں۔

مسند امام احمد میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَمْ يَبْعَثِ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا بِلُغَةِ قَوْمِهِ))[1]

''اللہ نے جو نبی بھی مبعوث فرمایا ہے اس کی قوم کی زبان کے ساتھ مبعوث فرمایا۔''

شیخ احمد بن عبدالرحمٰن البنا ساعاتی الفتح الربانی فی ترتیب مسند[2] الامام احمد الشیبانی میں تحریر فرماتے ہیں:

یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد...... وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ کے عین مطابق ہے۔

حافظ سیوطی صوفی المشرب ہونے کی وجہ سے فضائل و مناقب کے باب میں کسی موضوع روایت کو موضوع ماننے پر مشکل سے تیار ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس زیر بحث روایت:

((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ وَحْيٍ قَطُّ عَلَى نَبِيٍّ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ إِلَّا بِالْعَرَبِيَّةِ ثُمَّ يَكُوْنُ هُوَ بَعْدُ يُبَلِّغُهُ بِلِسَانِهِمْ))

کو بھی صرف ضعیف ماننے اکتفا کیا ہے اور لکھا ہے: سلیمان بن ارقم اگر چہ متروک تھا مگر اس پر کذب بیانی کا الزام نہیں تھا۔ پھر اس موضوع اور باطل روایت کی شاہد کے طور پر ایک دوسری روایت نقل کی ہے جو خود موضوع ہے۔ جس کے الفاظ ہیں:

(۲۸۳)......كَانَ جِبْرِيْلُ يُوْحَى اِلَيْهِ بِالْعَرَبِيَّةِ وَيَنْزِلُ هُوَ اِلَى كُلِّ نَبِيٍّ بِلِسَانِ قَوْمِهِ))[3]

''جبریل علیہ السلام کی طرف عربی زبان میں وحی کی جاتی تھی اور وہ ہر نبی کے پاس اس کی قوم کی

---

[1] مسند الامام أحمد: ص ۱۸۵ ج ۵
[2] الفتح الربانی: ص ۳۶ ج ۲۰
[3] اللآلی المصنوعة: ص ۱۸ ج ۱

زبان میں اس کو لے کر نازل ہوتے تھے۔''

حافظ سیوطی کو دوسروں سے پہلے یہ بات معلوم تھی کہ کوئی موضوع روایت کسی موضوع روایت کی شاہد نہیں ہو سکتی۔ یہ جانتے ہوئے بھی انہوں نے یہ زیر بحث روایت شاہد کے طور پر پیش کر دی اور اس کی سند بھی بیان کر دی:

''ابن مردویہ محمد بن سائب کلبی سے روایت کرتے ہیں، وہ ابو صالح سے اور وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے......

جبکہ الاتقان[1] میں وہ خود یہ لکھ چکے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو تفسیری روایات منقول ہیں ان میں سب سے کمزور اور ناقابل اعتبار روایات وہ ہیں جو کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس کی سند سے مروی ہیں۔ لیکن اس موضوع روایت سے استدلال کرتے وقت شاید ان کو اپنی بات یاد نہیں رہی۔

واضح رہے کہ محمد بن سائب کلبی نے امام سفیان ثوری سے خود یہ اعتراف کیا ہے کہ اس نے ابو صالح میزان بصری سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جتنی حدیثیں روایت کی ہیں وہ سب جھوٹ ہیں۔[2]

حافظ ابن حجر نے التقریب[3] میں اس کے بارے میں لکھا ہے: کلبی پر کذب بیانی اور رافضی ہونے کا الزام تھا۔

(۲۸۴)...... إِنَّ أَبْغَضَ الْكَلَامِ إِلَى اللّٰهِ الْفَارِسِيَّةُ، فَكَلَامُ الشَّيْطَانِ الْخُوزِيَّةُ وَكَلَامُ أَهْلِ النَّارِ الْبُخَارِيَّةِ، وَكَلَامُ أَهْلِ الْجَنَّةِ الْعَرَبِيَّةُ.

''اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ زبان فارسی ہے اور شیطان کی زبان خوزی ہے۔ اہل جہنم کی زبان بخاری ہے اور اہل جنت کی زبان عربی ہے۔''

یہ روایت موضوع ہے جس کے متن سے اس کے موضوع ہونے کی بو آ رہی ہے۔ امام ابن الجوزی نے یہ روایت گھڑنے کا الزام اسماعیل بن زیاد پر عائد کیا ہے جو کذاب تھا۔[4]

حرفت اور پیشہ

جس طرح ذات و برادری اور قبیلہ اور خاندان کی بنیاد پر لوگوں کے مراتب متعین کیے گئے ہیں، اسی

---

[1] الاتقان: ص ٤٧١ ج ٢ — [2] معجم اسامی الرواۃ: ص ٦١٨ - ٦٢٠ ج ٣

[3] التقریب: ص ٤١٥ ترجمہ: ٥٩٠١ — [4] الموضوعات: ص ١٥٨-١٥٩ ج ١

طرح صنعت، حرفت اور پیشہ کے اعتبار سے بھی لوگوں کے درجات متعین کیے گئے ہیں۔ یہ ذہنیت صرف عوام الناس نہیں رکھتے، بلکہ اس میں علماء اور اکابرامت بھی مبتلا ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مشہور بزرگ کا فتویٰ ہے:

''سید، شیخ، مغل اور پٹھان وغیرہ شریف اقوام، نجیب الطرفین ہیں جبکہ بقیہ برادریاں مثلاً جولاہا، تیلی وغیرہ چھوٹی اور رذیل اقوام ہیں...... جولاہوں اور نائیوں کو مسلمان گھرانوں میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔''

فقہ کی مشہور کتاب ''الہدایہ'' میں کتاب النکاح فصل فی الکفاءۃ کے تحت آیا ہے:

قریش ایک دوسرے کے کفوٗ اور عرب ایک دوسرے کے کفوٗ ہیں۔ اس کی بنیاد نبی کریم ﷺ کا قول مبارک ہے:

((قُرَيْشٌ بَعْضُهُمْ أَكْفَاءٌ لِبَعْضٍ، بَطْنٌ بِبَطْنٍ وَالْعَرَبُ بَعْضُهُمْ أَكْفَاءٌ لِبَعْضٍ، قَبِيْلَةٌ بِقَبِيْلَةٍ، وَالْمَوَالِيْ بَعْضُهُمْ أَكْفَاءٌ لِبَعْضٍ، رَجُلٌ بِرَجُلٍ))

''قریش کے لوگ ایک دوسرے کے کفوٗ ہیں، ایک خاندان دوسرے خاندان کا۔ عرب ایک دوسرے کے برابر ہیں، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے۔ غیر عرب ایک دوسرے کے برابر ہیں، ایک مرد دوسرے مرد کے۔''

حافظ جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف زیلعی نے ''نصب الرایہ'' میں امام حاکم کی ''المستدرک'' کے حوالہ سے اس حدیث کو درج ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے:

((الْعَرَبُ بَعْضُهُمْ أَكْفَاءٌ لِبَعْضٍ: قَبِيْلَةٌ بِقَبِيْلَةٍ وَرَجُلٌ بِرَجُلٍ، وَالْمَوَالِيْ بَعْضُهُمْ أَكْفَاءٌ لِبَعْضٍ، قَبِيْلَةٌ بِقَبِيْلَةٍ، وَرَجُلٌ بِرَجُلٍ، إِلَّا حَائِكٌ أَوْ حَجَّامٌ))

''عرب ایک دوسرے کے برابر ہیں، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے۔ ایک مرد دوسرے مرد کے۔ اور غیر عرب۔ عجم۔ ایک دوسرے کے برابر ہیں، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے۔ اور ایک مرد دوسرے مرد کے، سوائے جولاہے اور نائی ہے۔''

حافظ زیلعی نے اس حدیث کی جو سند نقل کی ہے وہ درج ذیل ہے:

ہم سے اصم نے بیان کیا، کہا: ہم سے صغانی نے بیان کیا، کہا: ہم سے شجاع بن ولید نے بیان کیا، کہا: ہم سے ہمارے بعض بھائیوں نے ابن جریج سے، انہوں نے عبداللہ بن ابی ملیکہ سے، اور انہوں

نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

حافظ زیلعی نے صاحب "التنقیح" کے حوالہ سے اس سند کو منقطع بتایا ہے۔ کیونکہ شجاع بن ولید نے اپنے بعض شیوخ کا نام نہیں لیا ہے۔"

زیلعی نے سند میں انقطاع کا ذکر تو کر دیا مگر یہ نہیں بتایا کہ عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج نے عبداللہ بن ابی ملیکہ سے یہ روایت بذریعہ "عن" کی ہے۔ جبکہ وہ بہت بڑے "مدلس" تھے اور مدلس کا "عنعنہ" مردود ہے۔

زیلعی نے اس کے بعد لکھا ہے کہ ایک دوسری سند سے حافظ ابو یعلی نے اس کو اپنی "مسند" میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ حافظ ابن عبدالبر نے اس کو منکر اور موضوع قرار دیا ہے "ابن جریج عن ابن ابی ملیکہ" کی سند سے بھی اس کی صحت کی نفی کی ہے۔[1]

درحقیقت یہ روایت جتنے "طرق" سے بھی مروی ہے ان سب میں ایسی کوئی نہ کوئی علت ضرور موجود ہے جو اس کو ناقابل اعتبار بنا دیتی ہے۔

یہ تو اس روایت کی سند کا حال تھا۔ رہا اس کا متن تو اس کا صدور رسول اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے ناممکن ہے۔ کیونکہ اولاً تو صحابہ کرام میں بھی لوہار، حجام، پارچہ باف وغیرہ موجود تھے۔ دوم اسلام کی نگاہ میں حلال روزی کمانے کے لیے خاص پیشوں کا تعین نہیں کیا گیا ہے اور نہ کسی خاص پیشہ یا حرفت کی ترغیب دی گئی ہے۔ نہ کسی پیشہ یا حرفت کی مذمت کی گئی ہے۔ دراصل پیشوں اور حرفتوں کی بنیاد پر لوگوں میں فرق مراتب کرنا اسلامی نہیں بلکہ ہندوانہ ذہنیت اور عقیدہ ہے۔

(۲۸۵)......أَكْذَبُ النَّاسِ الصَّبَّاغُوْنَ وَالصَّوَّاغُوْنَ۔

"لوگوں میں سب سے زیادہ جھوٹے رنگریز اور سنار ہیں۔"

یہ حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند[2] میں اس سند سے کی ہے:

ہم سے ہمام نے فرقد سبخی سے، اس نے یزید بن عبداللہ شخیر سے، اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے......

اس سند میں فرقد سبخی کے علاوہ تمام راوی ثقہ ہیں۔ فرقد بصرہ کا ایک زاہد تھا جس کو امام ابو حاتم نے غیر ثقہ قرار دیا ہے۔ اس کے بارے میں یہی رائے امام نسائی نے بھی ظاہر کی ہے۔ امام بخاری کا قول

---

[1] الهدايه مع نصب الرايه: ص ۲۲۹ ج ۳ [2] مسند طيالسی: ص ۲۶۲ ج ۱

ہے کہ اس کی مرویات میں ''منکرات'' کی بھرمار ہے جس کی ایک مثال اس کی روایت کردہ یہ حدیث بھی ہے۔ امام ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ جتنی سندوں سے بھی مروی ہے ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی حد درجہ ضعیف یا منکر اور کذاب موجود ہے۔

امام ابن القیم نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ''حس'' اس کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ کیونکہ کپڑا رنگنا اور زیور بنانا ایک پیشہ اور حرفت ہے۔ اس کی بنیاد پر کسی کو جھوٹا قرار دینا کیونکہ صحیح ہو سکتا ہے۔ اگر صحیح معنوں میں کسی کو جھوٹا کہا جا سکتا ہے تو وہ ایسے لوگ ہیں جن کے عقائد باطل ہوں۔ جیسے رافضی، کاہن اور نجومی وغیرہ۔ بعض لوگوں نے ''صباغ'' کی یہ تاویل کی ہے کہ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو حدیث میں ایسے الفاظ کا اضافہ کرے جو اس کے حسن کو بڑھا دیں اور صواغ وہ ہے جو ایسی حدیثیں گھڑے جن کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں۔ لیکن یہ سراسر تکلف ہے اور جب اس کی کوئی قابل اعتماد سند ہی نہیں ہے تو پھر اس تکلف کی کیا ضرورت؟[1]

(۲۸۶)......شِرَارُ أُمَّتِي الصَّائِغُوْنَ وَالصَّبَّاغُوْنَ

''میری امت کے بدترین لوگ سنار اور رنگ ریز ہیں۔''

یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ حافظ سیوطی کی کتاب ''الجامع الصغیر''[2] میں حافظ دیلمی کی کتاب مسند الفردوس کا حوالہ دیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ ضعیف ہے۔

یہی حدیث علامہ علاؤ الدین علی متقی نے کنز العمال[3] میں بھی مسند الفردوس کے حوالہ کے ساتھ نقل کی ہے۔

(۲۸۷)......لَا تَسْتَشِيرُوْا الْحَاكَةَ وَالْمُعَلِّمِيْنَ۔

''پارچہ بافوں اور معلموں سے مشورہ مت لو۔''

یہ روایت جھوٹ ہے نبی ﷺ کا ارشاد مبارک نہیں ہے۔ اس کی تخریج حافظ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں کی ہے اور وہیں سے حافظ ابو الحسن علی بن احمد بن عراق کنانی نے تنزیہہ الشریعۃ[4] المرفوعہ میں نقل کی ہے اور لکھا ہے:

یہ روایت غلام خلیل کے طریق سے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور عبید اللہ بن زحر کے

---

[1] الضعیفہ: ص ۲۷۵۔ ۲۷۶ ج ۱
[2] الجامع الصغیر: حدیث نمبر ۳۳۸۲
[3] کنز العمال: حدیث نمبر ۴۹۱۳
[4] تنزیہ الشریعۃ: ص ۲۵۴ ج ۱

طریق سے اس میں یہ اضافہ ہے:

((فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى سَلَبَهُمْ عُقُوْلَهُمْ وَنَزَعَ الْبَرْكَةَ مِنْ إِكْتِسَابِهِمْ))

''کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کی عقلیں سلب کر لی ہیں اور ان کی کمائی سے برکت اٹھالی ہے۔''

ابن عراق آگے لکھتے ہیں:

اس جھوٹی روایت کی آفت عبیداللہ بن زحر ہے۔ جس کے بارے میں امام ابن حبان نے لکھا ہے کہ وہ ثقہ راویوں کے نام سے موضوع روایات بیان کیا کرتے تھا۔

ابن عراق مزید لکھتے ہیں:

یہ روایت صلصال بن دھمس کی سند سے بھی مروی ہے۔ جو اس کے پوتے محمد بن ضوء بن صلصال نے کی ہے اور اس کے الفاظ ہیں:

(۲۸۸)......((لَا تُشَاوِرُوْا الْحَاكَةَ وَلَا الْحَجَّامِيْنَ وَلَا الْمُعَلِّمِيْنَ ، فَإِنَّ اللّٰهَ سَلَبَهُمْ عُقُوْلَهُمْ وَمَحَقَ أَكْسَابَهُمْ))

''پارچہ بافوں۔ جولاہوں۔ پچھنا لگانے والوں اور معلموں سے مشورہ مت کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کی عقلیں چھین لی ہیں اور ان کی کمائی برباد کر دی ہے۔''

یہ روایت نقل کرنے کے بعد ابن عراق نے لکھا ہے:

''محمد بن ضوء بہت بڑا جھوٹا تھا اور علانیہ فسق و فجور کا ارتکاب کرتا تھا۔ حافظ سیوطی نے یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی ہے۔ جس کی تخریج حافظ ابو عبداللہ محمد بن محمود بن نجار نے اپنی تاریخ میں کی ہے پھر لکھا ہے: یہ منکر ہے۔''

(۲۸۹)......لَا تَشَاوِرُوا الْحَجَّامِيْنَ وَلَا الْحَاكَةَ وَلَا تُسَلِّمُوْا عَلَيْهِمْ۔

''پچھنا لگانے والوں اور جولاہوں سے مشورہ مت لو اور نہ ان کو سلام کرو۔''

ابن عراق لکھتے ہیں:

حافظ دیلمی نے یہ روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کی ہے۔ اس کی سند میں عبدالرزاق کا بھانجا احمد بن عبداللہ بن داؤد شامل ہے۔ جس کو امام دارقطنی نے جھوٹا قرار دیا ہے۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

(۲۹۰)......((عَمَلُ الْاَبْرَارُ مِنْ رِجَالِ اُمَّتِی الْخِیَاطَةُ وَعَمَلُ الْاَبْرَارِ مِنَ النِّسَاءِ الْمِغْزَلُ))

"میری امت کے صالح مردوں کا عمل سلائی ہے اور میری امت کی صالح عورتوں کا عمل سوت کا تنا ہے۔"

یہ حدیث نہیں جھوٹ ہے۔ اس کی تخریج امام ابن الجوزی نے الموضوعات [1] میں حافظ خطیب بغدادی کے طریق سے کی ہے۔ جنہوں نے اس کو سلیمان بن ارقم کے ترجمہ کے ضمن میں نقل کیا اور لکھا ہے کہ: اس کی سند میں شامل ابوداؤد سلیمان بن عمرو نخعی بہت بڑا جھوٹا تھا۔ امام ابن المدینی نے اس پر حدیثیں گھڑنے کا بھی الزام لگایا ہے۔

امام ابو احمد عبداللہ بن عدی نے "الکامل" [2] میں سلیمان بن عمرو کے ترجمہ کے ضمن میں یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے اس کو وضع کرنے والا یہی ہے۔

(۲۹۱)......شِرَارُ النَّاسِ التُّجَّارُ وَالزُّرَّاعُ

"لوگوں میں سب سے زیادہ بُرے تاجر اور کاشتکار ہیں۔"

یہ روایت بھی جھوٹ ہے۔ اس کی روایت حافظ ابو عبداللہ حسین بن ابراہیم جوزقانی نے الاباطیل [3] والمناکیر میں کی ہے اور اس کو باطل بتایا ہے۔

حافظ سیوطی نے حافظ جوزقانی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی سند میں ایک سے زیادہ مجہول الحال اور نامعلوم راوی شامل ہیں۔ [4] اس طرح ابن عراق نے بھی تنزیہ [5] الشریعۃ میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ اس کی سند میں ایک سے زیادہ مجہول راوی شامل ہیں اور یہ تحقیق نہیں کی کہ اس کی شاہد وہ حدیث ہے جس کی تخریج حافظ ابونعیم نے کی ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((یَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ! اِنَّ التُّجَّارَ یُبْعَثُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقَی اللّٰهَ وَبَرَّ وَصَدَقَ))

"اے تاجروں کے گروہ قیامت کے روز تاجر بدکاروں کی صورت میں اٹھائے جائیں گے

---

[1] الموضوعات: ص ۳۳ ج ۳ ح ۱۲۴۲
[2] الکامل: ص ۱۰۹۷-۱۰۹۸ ج ۳
[3] الاباطیل والمناکیر: ح ۵۱۵
[4] اللآلی المصنوعة: ص ۱۲۰ ج ۲
[5] تنزیه الشریعة: ص ۱۹۱ ج ۲

سوائے اس کے جو اللہ سے ڈرتا ہے، نیک ہے اور صدق گوئی سے کام لیتا ہے۔“[1]

تو ابن عراق کا اعتراض برمحل نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث ضعیف ہے۔

(۲۹۲)......عَلَيْكُمْ بِالتِّجَارَةِ فَإِنَّ فِيهَا تِسْعَةُ أَعْشَارِ الرِّزْقِ

تم لوگ تجارت کو لازم پکڑو۔ کیونکہ اس میں رزق کے دس حصوں میں سے نو حصے موجود ہیں۔

یہ روایت مرسل ہے اور مرسل روایت کا شمار ضعیف حدیثوں میں ہوتا ہے۔ اس کا ذکر امام غزالی نے ”احیاء العلوم“[2] میں کیا ہے۔ حافظ زین الدین عراقی نے احیاء العلوم کے حاشیہ پر مطبوع اپنی کتاب: المغنی عن حمل الاسفار[3] میں لکھا ہے کہ ”اس کی روایت ابراہیم حربی نے نعیم بن عبدالرحمٰن کی روایت کردہ ضعیف حدیثوں کے ضمن میں کی ہے۔ اس کے راوی تو ثقہ ہیں مگر نعیم بن عبدالرحمٰن تابعی ہیں۔ لہٰذا یہ روایت مرسل ٹھہری اور مرسل روایت کا شمار ضعیف حدیثوں میں ہوتا ہے۔ شیخ تاج الدین سبکی نے اس روایت کو اپنی کتاب: الاحادیث[4] التی لا اصل لھا“ میں بے اصل قرار دیا ہے۔

اسلام میں کسب حلال کی بہت اہمیت ہے جس ذریعہ سے بھی حاصل ہو۔ جو تجارت دھوکا دہی، فریب، خیانت اور مال تجارت میں ملاوٹ سے پاک ہو ایسی تجارت سے حاصل ہونے والی آمدنی حلال کمائی میں شمار ہوتی ہے۔ حضرت رافع بن خدیج سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! کونسی کمائی عمدہ ہے؟ فرمایا:

((عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُوْرٍ))

”آدمی کا اپنے ہاتھ کا عمل اور گناہ سے پاک تجارت۔“[5]

مطلب یہ ہے کہ انسان جو کمائی اپنی محنت اور صاف ستھری تجارت سے حاصل کرتا ہے وہ حلال اور عمدہ کمائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے محنت کر کے روزی کمانے کی ترغیب دی ہے، حضرت مقداد بن معدی کرب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ من عَمَلِ يَدَيْهِ وَإِنَّ نَبِيَّ

---

[1] جامع ترمذی: ح ۱۲۱۰۔ ابن ماجہ ح ۲۱۴۶ [2] احیاء العلوم: ص ۸۹ ج ۲۔
[3] مغنی عن حمل الأسفار: ص ۸۹ ج ۲ [4] الاحادیث التی لأاصل لھا: ح ۳۱۱
[5] مسند احمد: ح ۱۷۳۹۷

اللّٰهِ دَاوُدَ علیہ السلام كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ))

کبھی کسی نے اپنے ہاتھ کی محنت سے حاصل ہونے والی روزی سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا۔ اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی محنت سے کمائی ہوئی روزی کھاتے تھے۔"[1]

اللہ تعالیٰ اس بات کو بھی پسند کرتا ہے کہ جو کام بھی کیا جائے عمدہ طریقے سے کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ إِذَا عَمِلَ أَحَدُكُمْ عَمَلًا أَنْ يُتْقِنَهُ))[2]

"بیشک اللہ یہ پسند کرتا ہے کہ تم میں سے کوئی بھی شخص جب کوئی کام کرے تو اسے نہایت عمدہ طریقے سے کرے۔"

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ انسان کا ہر اچھا حلال کام اور اپنے ہاتھوں کی محنت سے اس کا روزی کمانا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایک مستحسن صفت ہے۔ اس صفت سے جو شخص موصوف ہو، معاشرے میں اس کا درجہ بلند ہوتا ہے پست نہیں۔

تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت وغیرہ ایسے اعمال ہیں، جن میں انسان اپنی جسمانی توانائی، ہاتھوں کی طاقت اور ذہنی صلاحیت سب کچھ استعمال کرتا ہے تاکہ اس کی محنت بار آور اور نتیجہ خیز ہو۔ وہ اس دنیا کی ضرورتیں پوری کر سکے۔ ایسے اعمال اگر صحیح دائرہ کار میں رہ کر انجام دیے جائیں بایں معنی کہ کسی کی حق تلفی نہ کی جائے، کسی کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ قانون اور ضابطے کی خلاف ورزی نہ کی جائے تو ایسے اعمال معاشرے میں کسی انسان کی پستی کا سبب کس طرح ہو سکتے ہیں۔ ان کو انجام دینے والا حقیر اور رذیل کیسے ہوسکتا ہے۔

درحقیقت اسلام کے سوا دوسرے مذاہب خاص طور پر ہندو مذہب میں انسان پیدائشی طور پر شریف اور رذیل ہوتا ہے۔ برصغیر کے مسلمان بھی اس ہندوانہ ذہنیت سے متاثر ہیں۔ اسلامی فتوحات کے زمانے میں جب دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے لوگ مسلمان ہوئے تو وہ اسلام کے نظریۂ مساوات کو ہضم نہ کر سکے۔ وہ جس طبقاتی اونچ نیچ کا عقیدہ اسلام لانے سے قبل رکھتے تھے، اس سے اپنے دل و دماغ کو پاک نہ کر سکے۔ بعد میں چل کر ان کا یہی عقیدہ اسی روایات گھڑنے اور لوگوں میں ان کو عام کرنے

---

[1] صحيح بخاري: ح ٢٠٧٢

[2] صحيح الجامع ح ١٨٨٠، الصحيحه ح ١١١٣، كنز العمال ٩١٢٧

کا محرک بنا جن سے انسانوں کو پیدائشی طور پر مختلف طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جن میں سے کچھ شریف اور کچھ رذیل ہیں۔ چونکہ برصغیر کے ملکوں اور ان کے ہمسایہ ملکوں کے علماء بھی اس عقیدہ میں مبتلا رہے ہیں اور ابھی تک ہیں۔ اس لیے مسلمانوں یا اسلام سے نسبت کا دعویٰ کرنے والوں کی اکثریت ذات اور برادری کے اعتبار سے فرق مراتب کا عقیدہ رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک بعض ذاتیں اور برادریاں شریف ہیں اور بعض رذیل وحقیر۔ جیسا کہ اوپر نقل کردہ ایک مشہور بزرگ کے فتویٰ میں دعویٰ کیا گیا ہے۔

ہندوؤں نے دوسرا کام یہ کیا کہ اپنے من گھڑت مختلف طبقوں کے لیے کچھ اعمال اور پیشے مخصوص کر دیے جو بعد میں شرافت اور رذالت کی علامت اور پہچان بن گئے۔ کی تقالید اور روایات سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے بھی انہی اعمال اور پیشوں کی بنیاد پر لوگوں کے درجات متعین کر دیے۔ اس طرح برصغیر کے مسلمانوں میں مختلف ذاتیں بن گئیں۔ ایک اللہ، ایک رسول اور ایک کتاب پر ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود ان کے درمیان کئی ایک پکی دیواریں حائل ہیں۔

جبکہ اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ تمام انسان ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہیں۔ ان کے درمیان فرق ذات پات اور صنعت وحرفت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایمان وعمل کی بنیاد پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو دین توحید۔ فطرت۔ پر پیدا کیا ہے۔ ان میں سے جو اپنے ایمان اور عمل سے اس فطرت کی ترجمانی کریں گے وہ اللہ کے محبوب اور برگزیدہ بندے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے کن طبقوں سے ان کا تعلق ہے اور جو اس دین فطرت سے انحراف کرے گا تو وہ اللہ کے نزدیک مبغوض اور ملعون ہے۔ چاہے وہ انسانوں کے متعین کردہ نہایت اعلیٰ ذات اور بلند طبقہ میں سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو۔

کتاب کی اس جلد میں عقائد، اعمال، قصص الانبیاء، مناقب و زیارت قبور اور معاشرے کے جس مسئلے سے بھی تعرض کیا گیا ہو اس سے متعلق جھوٹی اور باطل روایات پیش کرنے اور ان کا پوسٹ مارٹم کرنے سے پہلے اس مسئلے کو قرآن پاک اور صحیح احادیث کی روشنی میں اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے۔ تاکہ ان اثراتِ بد کو سمجھنے میں آسانی ہو جو جھوٹی روایات نے امت مسلمہ میں چھوڑے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے ملتجی ہوں کہ میری اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے۔ اس کو لوگوں کی عقائدی اور فکری

ہدایت کا ذریعہ بنائے اور میری نادانستہ غلطیوں کے اثرات سے ان کو محفوظ رکھے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

سید سعید احسن عابدی

(جدہ مملکت سعودیہ)

یکم ربیع الاول ۱۴۲۸ھ

مآخذ

تفسیر وعلوم القرآن

نام کتاب	مصنف	ناشر
(۱) ابن کثیر	حافظ عماد الدین اسماعیل بن کثیر	دار القرآن بیروت
(۲) الاتقان فی علوم القرآن	حافظ جلال الدین سیوطی	دار الکتاب العربی بیروت
(۳) احسن البیان	مولانا محمد جونا گڑھی/ حافظ صلاح الدین یوسف	دار السلام۔ ریاض
(٤) احکام القرآن	قاضی محمد بن عبداللہ ابن العربی	المکتبہ العصریہ۔ بیروت
(٥) البرھان فی علوم القرآن	علامہ بدر الدین محمد بن عبداللہ زرکشی	المکتبۃ العصریہ۔ بیروت
(٦) بیان القرآن	مولانا اشرف علی تھانوی	تاج پبلشرز۔ دہلی
(۷) تفهيم القرآن	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	ترجمان القرآن۔ لاہور
(۸) تدبر قرآن	مولانا امین احسن اصلاحی	فاران فاؤنڈیشن۔ لاہور
(۹) تیسیر الکریم الرحمن فی تفسیر کلام المنان	علامہ عبدالرحمٰن آل سعدی	دار احیاء التراث العربی۔ بیروت
(۱۰) الجامع لأحكام القرآن	امام محمد بن احمد انصاری قرطبی	دار الفکر۔ بیروت
(۱۱) فتح القدیر	امام محمد بن علی بن محمد شوکانی	المکتبہ العصریہ۔ بیروت
(۱۲) الکشاف	علامہ جار اللہ محمود بن عمر زمخشری	مکتبہ العبیکان۔ ریاض
(۱۳) المحرر الوجیز	امام عبدالحق بن عطیہ اندلسی	دار ابن حزم۔ بیروت

(١٤) معالم التنزیل	امام حسین بن مسعود بغوی	دار ابن حزم۔ بیروت

حدیث و شروح حدیث

(١) صحیح بخاری مع فتح الباری	امام محمد بن اسماعیل بخاری/ حافظ ابن حجر رحمہما اللہ	بیت الافکار الدولیہ۔ بیروت و مملکت سعودیہ
(٢) صحیح مسلم مع المنہاج	امام مسلم بن حجاج/ امام محی الدین نووی	بیت الافکار الدولیہ۔ بیروت
(٣) سنن ابوداؤد	امام سلیمان بن اشعث سجستانی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(٤) سنن ترمذی	امام محمد بن عیسیٰ ترمذی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(٥) سنن نسائی	امام احمد بن شعیب نسائی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(٦) سنن ابن ماجہ	امام محمد بن یزید قزوینی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(٧) صحیح ابن خزیمہ	امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ	المکتبہ الاسلامی۔ بیروت
(٨) صحیح ابن حبان	امام محمد بن حبان خراسانی	دار المعرفۃ۔ بیروت
(٩) کتاب السنۃ	امام عمرو بن ابی عاصم شیبانی	المکتبہ الاسلامی۔ بیروت
(١٠) المؤطا	امام مالک بن انس	الیمامہ۔ بیروت
(١١) المعجم الاوسط	امام سلیمان بن احمد طبرانی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(١٢) الترغیب والترھیب	امام عبدالعظیم بن عبدالقوی منذری	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(١٣) الجامع الصغیر	حافظ جلال الدین سیوطی	المکتبہ الاسلامی۔ بیروت
(١٤) سنن دارمی	امام عبداللہ بن احمد بن عبدالرحمٰن دارمی	دار المعرفہ، بیروت
(١٥) کنز العمال	علامہ علاء الدین علی متقی	بیت الافکار الدولیہ۔ بیروت
(١٦) المستدرک	امام محمد بن عبداللہ الحاکم	دار احیاء التراث العربی۔ بیروت
(١٧) تحفۃ الاحوذی	علامہ محمد بن عبدالرحمٰن مبارکپوری	بیت الافکار۔ الادولیہ۔ بیروت
(١٨) التعلیق الممجّد	علامہ ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی	دار القلم۔ دمشق
(١٩) عون المعبود	علامہ شرف الحق عظیم آبادی	بیت الافکار الدولیہ۔ بیروت

(۲۰) منة المنعم	مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری	دارالسلام۔ ریاض

ضعیف، منکر اور موضوع روایات

(۱) الاباطیل والمناکیر	حافظ حسین بن ابراہیم جورقانی	الجامعہ السلفیہ۔ بنارس
(۲) الاسرار المرفوعة	علامہ نورالدین علی بن محمد ملا علی قاری	المکتب الاسلامی۔ بیروت
(۳) احادیث القصاص	امام ابن تیمیہ	المکتب الاسلامی۔ بیروت
(٤) تنزیه الشریعة	علی بن محمد بن عراق	دارالکتب العلمیہ۔ بیروت
(٥) الدرر البهیه	یوسف خطار	دمشق۔ شام
(٦) الدرر المنتثرة	حافظ جلال الدین سیوطی	مکتبہ الوراق۔ ریاض
(۷) سلسلة الاحادیث الضعیفه	محدث محمد ناصر الدین البانی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(۸) الصارم المنکی	حافظ محمد بن احمد بن عبدالهادی	مؤسسۃ الریات۔ بیروت
(۹) الفوائد المجموعه	امام محمد بن علی شوکانی	دارالکتب العلمیہ۔ بیروت
(۱۰) الفوائد الموضوعه	مرعی بن یوسف مقدسی	دارالوراق۔ ریاض
(۱۱) کشف الخفاء	اسماعیل بن محمد عجلونی	دارالکتب العلمیہ۔ بیروت
(۱۲) اللآلی المصنوعه	حافظ جلال الدین سیوطی	دارالکتب العلمیہ۔ بیروت
(۱۳) اللآلی المنثورة	محمد بن عبداللہ زرکشی	المکتب الاسلامی۔ بیروت
(١٤) معرفة التذکرة	محمد بن طاہر مقدسی	مؤسسۃ الکتب الثقافیہ۔ بیروت
(١٥) المقاصد الحسنة	حافظ محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی	دارالکتاب العربی۔ بیروت
(١٦) موسوعة الاحادیث الضعیفه	علی حسن علی الحلبی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(۱۷) الموضوعات الکبری	امام ابوالفرج ابن الجوزی	مکتبہ اضواء السلف۔ ریاض
(۱۸) نصب الرایه	حافظ جمال الدین عبداللہ زیلعی	دارالکتب العلمیہ۔ بیروت

علم الحدیث والرجال

(۱) الباعث الحثیث	علامہ احمد محمد شاکر	دارالفیحاء۔ دمشق

(۲) تقریب التهذیب	حافظ ابن حجر عسقلانی	مؤسسة الرسالة - بیروت
(۳) تیسیر مصطلح الحدیث	ڈاکٹر محمود طحان	مکتبہ المعارف - ریاض
(٤) طبقات علماء الحدیث	حافظ محمد بن احمد بن عبدالهادی	مؤسسة الرسالہ - بیروت
(٥) علل الحدیث	امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم	دار ابن حزم - بیروت
(٦) معجم اسامی الرواة	محدث محمد ناصر الدین البانی	دار ابن حزم - بیروت
(۷) مقدمه ابن صلاح	امام عثمان بن عبدالرحمٰن ابن صلاح	مؤسسة الکتب الثقافیة - بیروت
(۸) الوسیط	ڈاکٹر محمد بن محمد ابوشہبہ	عالم المعرفة - جده

سیرت و تاریخ

(۱) البدایه والنهایه	حافظ ابن کثیر	المکتبة العصریہ - بیروت
(۲) الرحیق المختوم	مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری	دار ابن کثیر - بیروت
(۳) السیرة النبویه فی ضوء المصادر الاصلیه	ڈاکٹر مہدی رزق اللہ	مرکز الملک فیصل - ریاض
(٤) السیرة النبویه الصحیحه	ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری	مکتبة العبیکان - ریاض
(٥) السیرة النبویه	عبدالملک بن ہشام	دار المعرفة - بیروت
(٦) السیرة النبویه	امام محمد بن احمد ذہبی	دار الکتاب العربی - بیروت
(۷) سرور عالم ﷺ	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	ترجمان القرآن - لاہور
(۸) سیر أعلام النبلاء	امام ذہبی	المکتبة التوفیقیہ - قاہره
(۹) الشفاء بتعریف المصطفیٰ	قاضی عیاض بن موسیٰ یحصبی	دار الارقم - بیروت
(۱۰) فقه السیرة	شیخ محمد غزالی	دار القلم - دمشق
(۱۱) فقه السیرة	ڈاکٹر محمد سعید رمضان	دار الفکر - بیروت
(۱۲) الکامل	حافظ علی بن محمد ابن الاثیر	بیت الافکار الدولیہ بیروت والریاض
(۱۳) محمد رسول الله ﷺ	شیخ محمد صادق عرجون	دار القلم - دمشق

توحید و عقائد

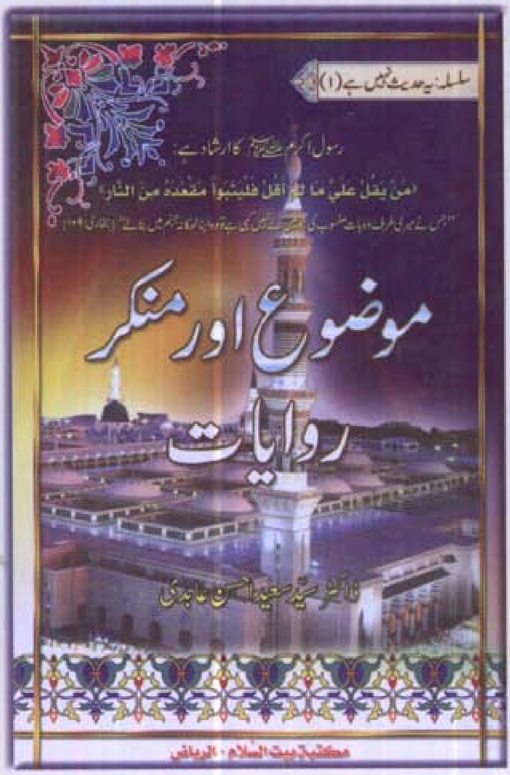
(١) الآيات البينات في عدم سماع الأموات	علامہ نعمان بن محمود آلوسی	المکتب الاسلامی۔ بیروت
(٢) الاسماء والصفات	امام احمد بن حسین بیہقی	مکتبہ السوادی۔ جدہ
(٣) اسماء الله وصفاته	ڈاکٹر عمر سلیمان عبداللہ اشقر	دار النفائس۔ بیروت
(٤) اقتضاء الصراط المستقيم	امام ابن تیمیہ	دار الکتاب العربی۔ بیروت
(٥) تحذير الساجد من اتخاذ القبور مساجد	محدث محمد ناصر الدین البانی	مکتبہ المعارف۔ ریاض
(٦) شرح العقيدة الطحاويه	علامہ ابن ابی العز	المکتب الاسلامی۔ بیروت
(٧) العقيدة الطحاويه	امام احمد بن محمد طحاوی	دار الافتاء۔ ریاض
(٨) عقيدة المسلم	شیخ عبدالعزیز بن باز	دار الداعی۔ ریاض
(٩) قاعدة جليله في التوسل والوسيلة	امام ابن تیمیہ	المکتبۃ العصریہ۔ بیروت
(١٠) القواعد المثلى في صفات الله	شیخ محمد بن صالح عثیمین	مکتبہ اضواء السلف۔ ریاض
(١١) كتاب الايمان	امام عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ	مکتبۃ المعارف۔ ریاض
(١٢) كتاب التوحيد	امام ابن خزیمہ	دار الحدیث۔ قاہرہ
(١٣) كتاب التوحيد	شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب	دار الداعی۔ ریاض
(١٤) محبة الرسول ﷺ	عبدالرؤف محمد عثمان	دار التربیہ والتراث۔ بیروت

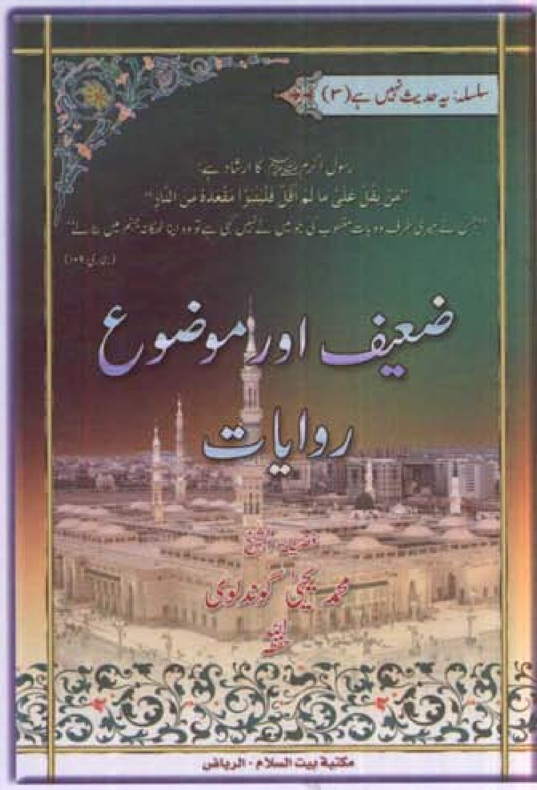
تصوف و سلوک

(١) تصوف کیا ہے؟	مولانا محمد منظور نعمانی	الفرقان بک ڈپو۔ لکھنو
(٢) تصوف اور شریعت	ڈاکٹر عبدالحق انصاری	مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی

(۳) تلبیس ابلیس	امام ابن الجوزی	مکتبہ دار البیان۔ بیروت
(٤) التنسك الاسلامی	ڈاکٹر محمد غلاب	المجلس الاعلی للشؤن الاسلامیہ۔ قاہرہ
(٥) دین تصوف وطریقت	مولانا سید محمد علی حسین	الاوراق پبلشر۔ حیدر آباد، ہند
(٦) الرسالة القشیریه	شیخ ابو القاسم عبد الکریم القشیری	المکتبۃ العصریہ۔ بیروت
(٧) شریعت وطریقت	مولانا اشرف علی تھانوی	مرکزی ادارۂ تبلیغ۔ دہلی
(٨) فضائل اعمال	مولانا محمد زکریا کاندھلوی	ادارۂ بیت القرآن۔ دہلی
(٩) فقه التصوف	امام ابن تیمیہ	دار الفکر العربی۔ بیروت
(١٠) مدارج السالکین	امام ابن القیم	المکتبۃ العصریہ۔ بیروت

سلسلہ: یہ حدیث نہیں ہے





ناشر و تقسیم کار

مکتبہ بیت السلام

پوسٹ بکس: 16737- الریاض:11474- سعودی عرب

فون:4460129- فیکس:4462919

موبائل: 0505440147 - 0542666646

ISBN: 978-603-00-0947-3